اُردو اور پاکستانی زبانوں میں

لسانی و ادبی تحقیق و تدوین کے اُصول



پروفیسر ڈاکٹر عطش دُرانی

A National Organization of Excellen
publishing quality books
on literature, Education and textbooks
at affordable prices

(اُردو اور پاکستانی زبانوں میں)

لسانی و ادبی تحقیق و تدوین کے اُصول

BOOKS GIVE US WINGS
NATIONAL BOOK FOUNDATION

A National Organization of Excellen
publishing quality books
on literature, Education and textbooks
at affordable prices

(اُردو اور پاکستانی زبانوں میں)

لسانی و ادبی تحقیق و تدوین کے اُصول

ایم فل اور پی ایچ ڈی کے لیے رہنما کتاب

لسانی و ادبی تحقیق و تدوین کے اُصول

(اُردو اور پاکستانی زبانوں میں)

پروفیسر ڈاکٹر عطش دُرّانی

(تمغۂ امتیاز، ستارۂ امتیاز)

نیشنل بک فاؤنڈیشن

اسلام آباد



نگران: پروفیسر ڈاکٹر انعام الحق جاوید (تمغۂ حسن کارکردگی)

مصنف: پروفیسر ڈاکٹر عطش درانی (تمغۂ امتیاز، ستارۂ امتیاز)

سرورق: شہزاد احمد

کمپوزنگ: نوازش علی ککو

طبع اوّل: مئی 2016ء

تعداد: 1000

قیمت: -/390 روپے

کوڈ نمبر: GNU-579

آئی ایس بی این: 978-969-37-0957-5

طابع: گل اعوان پرنٹرز، اسلام آباد

نیشنل بک فاؤنڈیشن کی دیگر مطبوعات کے بارے میں معلومات کے لیے رابطہ کریں:

ویب سائٹ http://www.nbf.org.pk یا فون 92-51-9261125

یا ای میل books@nbf.org.pk

پیش لفظ

نیشنل بک فاؤنڈیشن جہاں عام مطالعہ کے فروغ کے لیے کتابیں شائع کر رہا ہے، وہیں درسی اور نصابی کتب کی طرف بھی بھرپور توجہ دی جارہی ہے اور ایسے موضوعات پر بھی کتب شائع کرنے کی کوششیں جاری ہیں جو ایک طرف طلبہ اور اساتذہ کے کام آسکیں اور دوسری طرف زبانوں کے فروغ، نفاذ اور ترقی کے لیے بھی مفید ہو سکیں۔ تحقیق ایک ایسا موضوع ہے، جس کے لیے جدید ترین اصولوں اور تقاضوں، خاص طور پر HEC کے مقرر کردہ معیاروں پر پورا اُترنے کے رہنما اصولوں اور کتابوں کی اشاعت ضروری ہے۔ اُردو اور پاکستانی زبانوں میں لسانی اور ادبی تحقیق اور عالمانہ تدوین کے اصولوں پر اسی نقطۂ نظر سے یہ کتاب ممتاز ماہرِ تعلیم اور محقق ڈاکٹر عطش دُرّانی سے تیار کرائی گئی ہے۔

پاکستان اور دنیا بھر میں جن کالجوں اور یونیورسٹیوں میں آج اُردو، سندھی، پشتو، پنجابی، سرائیکی، بلوچی، براہوی یا کسی بھی پاکستانی زبان کی تدریس ہو رہی ہے، وہاں تحقیق کے معیار کو بلند کرنے کے لیے ایسی رہنما جامع کتاب یقیناً بہت مفید ثابت ہوگی۔ ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سطح کے لیے اگر اس میں بتائے گئے اصولوں اور تکنیکوں کو پیشِ نظر رکھ کر تحقیق کو فروغ دیا گیا تو وہ دن دور نہیں جب اُردو اور پاکستانی زبانیں تحقیق کی عالمی سطح پر نمایاں ہوں گی۔ یقیناً ان حوالوں سے یہ جدید تر کتاب ایک عمدہ اضافہ ہوگا۔

پروفیسر ڈاکٹر انعام الحق جاوید
(تمغۂ برائے حسنِ کارکردگی)
مینیجنگ ڈائریکٹر
نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد

فہرستِ ابواب

جدید دبستانِ تحقیق میں پیش رفت

اُردو اور پاکستانی زبانوں میں ادبی تحقیق اور تدوین کے موضوع پر یہ میری نویں پیشکش ہے۔ اُردو اور پاکستانی زبانوں میں جدید دبستانِ تحقیق کی باقاعدہ بنیاد ۲۰۰۲ء میں اس وقت پڑی، جب ڈاکٹر صابر کلوروی مرحوم نے ادبی تحقیق کے موضوع پر بارہ گلی میں سیمینار منعقد کرانے کا پروگرام بنایا اور مجھے حکم ملا کہ اسے یادگار بنادوں۔ اس کی نظری اور جزوی ابتدائیں تو ڈاکٹر نجم الاسلام اور ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے کاموں سے ہو چکی تھی۔ گفتگو اور مباحث اس کے علاوہ تھے۔ زبانوں کے شعبوں اور بعض پروفیسروں کی طرف سے طرزِ کہن پر اڑنے کا ایک شدید ردِ عمل بھی تھا۔ بہت جلد ہائر ایجوکیشن کمیشن (HEC) کی پابندیوں نے توثیق کر دی کہ اُردو اور پاکستانی زبانوں میں عالمی سطح کی تحقیق انجام نہیں دی جا رہی کیونکہ اس کے لیے مطلوبہ تحقیقی ڈیزائن اور کوئی نظریہ (Theory) استعمال میں نہیں آ رہا۔ چنانچہ کسی نہ کسی طور کئی جامعات کے تحقیقی جرائد کے لیے رسمی معیارات وضع ہونا شروع ہوئے۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے بورڈ آف ایڈوانس سٹڈیز اینڈ ریسرچ (BASAR) ۲۷، ۲۸ نومبر ۲۰۱۳ء کی روداد اس پر شاہد ہے۔

۲۰۰۳ء میں پاکستانی زبانوں کے شعبے میں ڈاکٹر انعام الحق جاوید کی تحریک پر ایم فل کے لیے مجھے کورس مطالعاتی رہنما اُصولِ تحقیق (زبان و ادبیات) تیار کرنے کے لیے کہا گیا۔ یہ ابتداء تھی۔

۲۰۰۸ء ہی میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو نے مجھ سے ادبی تحقیق کے لیے ایم فل کا کورس اُصولِ تحقیق تیار کرایا جو ۲۰۰۹ء میں شائع ہوا۔ اس میں جدید مواد کمپیوٹر اور ویب سائٹوں کے حوالے سے شامل کیا گیا اور یوں ادبی علمیت کے تحقیقی انتقاد کی طرف ایک قدم بڑھا۔ اس دوران میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو کے لیے ایم فل کمپیوٹر اور اطلاعیات (۲۰۱۰ء) اور پی ایچ ڈی سطح کے لیے اطلاقی تحقیق (۲۰۱۱ء) کے کورس نیز اس کے مستقبل پر کئی کاوشیں شائع ہوئیں۔ اس دوران میں میری باقی مطبوعات بھی پیش ہوتی رہیں۔ ۲۰۱۲ء میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے پاکستانی زبانوں کے شعبے میں آنے کے بعد میں نے ۳ رجنوری ۲۰۱۳ء کو پی ایچ ڈی سطح کے کورس کے لیے رہنمائے تحقیقی تجویز کے اُصول دیے۔ ۲۱، ۲۲ رجنوری ۲۰۱۳ء، ۲۷، ۲۸ رنومبر ۲۰۱۳ء اور ۱۹ ردسمبر ۲۰۱۳ء کو علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے بورڈ آف ایڈوانس سٹڈیز (BASAR) کے رکن کے طور پر اُردو اور پاکستانی زبانوں کی تحقیقی سمت درست کرنے کا موقع ملا، جو مارچ ۲۰۱۴ء تک اوپن یونیورسٹی کے بورڈ آف ایڈوانس سٹڈیز کے حوالے سے اسلامیات، ایجوکیشن اور سائنس کو بھی محیط ہوا۔ اس پر خیال گزرا کہ کیوں نہ ادبی تحقیق کے جدید ترین

اصول، تکنیک، طریقے اور مبادی کو ان تمام کاوشوں کے مجموعے کے طور پر مرتب کیا جائے تاکہ اُردو کے طلبہ جدید تحقیق کی اس گھاٹی پر آسانی سے چڑھ سکیں۔

اُصولِ تحقیق میں باقاعدہ سند یافتہ ہونے کے باعث اُردو اور پاکستانی زبانوں کے اصولی مباحث پر میرے کام کرنے کا استحقاق موجود ہے۔ ایم اے ایجوکیشن کے کورس Techniques of Research میں میری باقاعدہ استاد ڈاکٹر مسز نسیم شوکت تھیں۔ دیگر اساتذہ میں ڈاکٹر احسان اللہ خان اور ڈاکٹر عبدالرشید آزاد اہم ہیں۔ کورس پڑھنے اور برسوں ادبی تحقیق کے ایم فل/ پی ایچ ڈی سطح کے کورس تیار کرنے اور پڑھانے کے بعد بھی یہ خواہش کہ جدید ترین تحقیقی طریقیات (Research Methodology) پر کچھ اور بھی جانا جائے ۲۷، ۲۸ر جنوری ۲۰۱۱ء کو NUST کے کورس تحقیقی طریقیات (Research Methodology) نے پوری کردی۔

نیشنل بک فاؤنڈیشن/ وفاقی ٹیکسٹ بک بورڈ میں آنے (مئی ۲۰۱۳ء) کے بعد سے میری توجہ جدید تر اُصولوں کو زیادہ سے زیادہ واضح اور جامع کرنے پر رہی اور اب اسے لسانی و ادبی تحقیق و تدوین کے نام سے تیار کیا گیا ہے۔ طلبہ، اساتذہ، محققین اور مدونین کے اصرار پر تدوینِ متن کو دو ابواب کی صورت میں از سرِ نو شامل کیا گیا ہے۔ یاد رہے کہ یہ اُصولِ تحقیق کے موضوع پر ایک تصنیف اور ایک رہنما درسی کتاب ہے۔ وما علینا الا البلاغ۔

ڈاکٹر عطش دُرّانی

۱۴ر مارچ ۲۰۱۶ء

۱۔ دُرّانی سٹریٹ

بنی گالا، اسلام آباد

أُصول

پہلا باب

تحقیق کی مبادیات

اُردو اور پاکستانی زبانوں میں زبان، لسانیات اور ادب کے موضوعات پر تحقیق (Research) کو عام طور پر محض کتابوں یا مسودوں کی تدوین اور معلومات کی تلاش (search) تک محدود سمجھنے کی روش جاری رہی ہے۔ تحقیق محض تصنیف کا ایک موضوعی اور اتفاقی شعبہ بنا دیا گیا، کہاں اس میں سائنسی معروضی تکنیک پر توجہ دی جاتی۔ اُردو اور پاکستانی زبانوں یا سائنس سے قطع نظر تحقیق یا Research ایک باقاعدہ، منفرد اور مکمل علمی میدان یا ''ڈسپلن'' ہے۔ آج تک اُردو اور پاکستانی زبانوں میں صرف تلاش اور اس کے ماحصل کو تحقیق قرار دیا جاتا رہا ہے۔ جبکہ جدید طریقوں اور تکنیکوں کے حوالے سے زبان وادب کے علّتی (Causational) مطالعے میں تحقیق کے اُصول استعمال میں لائے جاتے ہیں۔

کسی بھی لسانی پہلو یا روّیے اور ادبی رائے یا نظریے کی صداقت تحقیق ہی سے سامنے آسکتی ہے، جس کے لیے باقاعدہ تحقیقی اُصول اور طریقے متعین ہیں۔ اس کے اقدامات طے شدہ ہیں۔ انھی کے مطابق عمل ہوگا تو تحقیق تسلیم ہوگی بصورتِ دیگر اعلیٰ عالمانہ بصیرت یا سکالرشپ تو مان لی جائے گی، اسے تحقیق نہیں کہا جاسکے گا۔ گویا تحقیق معلوم کو مزید معلوم اور ثابت کرنے کا نام ہے۔

ادبی تحقیق کا گرو (Guru) بننے کے لیے علمِ تحقیق کے اُصولوں، تکنیکوں اور طریقوں پر عبور رکھنا، لسانیات، شماریات، سماجیات، نفسیات وغیرہ کا گہرا درک ہونا اور عالمانہ نقد ونظر اور بصیرت کا حامل ہونا ضروری ہے، جس کے پس منظر میں ادبی تحقیق کا کوئی نظریہ (Theory) بھی کارفرما ہوگا۔

1- تحقیق کی تعریف

عام طور پر تحقیق محض تلاش اور تفتیش، تدوین اور تالیف سمجھا جاتا رہا ہے۔ تحقیق کے لیے کوئی مواد تلاش کر کے درج کر دینے ہی پر اکتفا کر لیا جاتا اور اس کی جدید تعریف کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کی حدود اور مبادیات کا لحاظ رکھنا ضروری نہیں سمجھا گیا۔ حالانکہ ضروری یہ ہے کہ تحقیق کو جدید اصطلاحی مفہوم کی روشنی میں دیکھا جائے، تاکہ ادبی تحقیق بھی دنیائے تحقیق میں اپنا مقام پیدا کر سکے۔

تحقیق کے لغوی اور اصطلاحی معنوں میں بہت فرق ہے۔ ''تحقیق'' عربی زبان کا لفظ ہے۔ جس کا مادہ ''حق'' ہے۔ عربی لغت میں باب ''تفعیل'' پر وضع شدہ لفظ تحقیق کا مطلب ہے ''حق یا سچائی ثابت کرنا''۔ لغات میں اس کے معنی تلاش، تفتیش، کھوج، دریافت، پرکھ پرچول، چھان بین وغیرہ کے ہیں، انگریزی میں

یہ لفظ Research (باز تلاش) کا مترادف سمجھا جاتا ہے۔ ویبسٹر ڈکشنری میں اس کے معنی مخصوص اور مفصل تنقید یا تجربہ کے ہیں تا کہ اس سے نئے حقائق معلوم ہونے کے ساتھ ساتھ درست تعبیرات بھی ہو سکیں۔

رشید حسن خان نے محض حقائق (Facts) کی بازیافت کو تحقیق کہا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کے نزدیک ''تحقیق کے لغوی معنی کسی شے کی حقیقت کا اثبات ہے اور اصطلاح میں یہ ایک ایسے طرزِ مطالعہ کا نام ہے جس میں موجود مواد کے صحیح اور غلط ہونے کو بعض مسلمات کی روشنی میں پرکھا جاتا ہے''۔ قاضی عبدالودود کے نزدیک ''تحقیق کسی امر کو اس کی اصل شکل میں دیکھنے کا نام ہے''۔ ڈاکٹر گیان چند کے نزدیک ''ریسرچ ایک حقیقتِ پنہاں یا حقیقتِ مبہم کو افشا کرنے کا باضابطہ عمل ہے''۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے نزدیک ''تحقیق صداقت یا سچائی کی تلاش کا نام ہے اور اس صداقت تک محققین منطقی (Logical) اور معروضی (Objective) عمل کے ذریعے پہنچتے ہیں''۔

گویا تحقیق ایک باضابطہ، تعقلی اور تجربی طریقہ ہے جس سے مسائل کا حل تلاش کیا جاتا ہے۔ ادبی ولسانی تحقیق کاروں کو یہ بات ملحوظ رکھنی چاہیے۔ یعنی اصطلاح میں کسی حقیقت کی تلاش کے لیے ''منضبط جستجو یا طریق کار'' کا نام تحقیق ہے۔ محض ''تلاش'' (Search) تحقیق نہیں کہلا سکتی، جیسا کہ سمجھا جا رہا ہے۔

اُردو اور پاکستانی زبانوں میں اب تک تحقیق کو محض حقیقت کی تلاش اور تصدیق وتصحیح سمجھا گیا ہے۔ حقائق بتاتے ہیں کہ اُردو میں ابھی تک ادبی تاریخ ہی تحقیق کا موضوع رہی ہے اور محققین کی اکثریت صحت، وضاحت وغیرہ ہی کو تحقیقی ذمہ داری سمجھتی رہی ہے۔

ڈاکٹر احسان اللہ خان اور ڈاکٹر عبدالرشید آزاد تحقیق کو باقاعدہ اور عمیق تجزیاتی، منظم طریق کار یا سرگرمی قرار دیتے ہیں۔ مجموعی طور پر ہم تحقیق ایسے باضابطہ طریق کار کو کہہ سکتے ہیں جو حقائق کی دریافت، بازدریافت اور تقابلی طور پر حدودِ علم کی توسیع کا سبب بنے۔ گویا تحقیق نتیجہ نہیں طریق کار ہے اور ایک منظم اور باقاعدہ طریق کار ہے۔

لغوی طور پر تلاش، تفتیش اور تحقیق ایک پہلو سے مترادفات کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن جب ہم تحقیقی میدان (Discipline) کی بات کرتے ہیں تو تلاش اور تفتیش اس کے ذیلی اجزاء قرار پاتے ہیں۔ گویا تحقیق کا مقصد محض صداقت کی تلاش اور حقائق کی تفتیش یا بازیافت نہیں جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ یہ ایک نہایت ذمہ داری، دقت نظری اور ریاضت کا کام ہے۔ بعض کے نزدیک تحقیق سوال کرنے اور اس کا معروضی جواب پانے کا نام ہے۔ بعض کے نزدیک متغیرات (Variables) اور کارکردگی (Performance) کی پیمائش میں تعلق معلوم کرنے کو تحقیق کہتے ہیں۔ بعض اس کے طریق کار اور بعض محض حاصلات کو تحقیق کا نام دیتے ہیں جبکہ تحقیق بعض مفروضات (Assumptions) کے ساتھ تقابل کرتے ہوئے فرضیات (Hypotheses) کے حقائق دریافت کرنے میں مدد دیتی ہے۔

تحقیق تکنیکی طور پر یہ ''باز تلاش'' یا معلومات کی کھلے دل ودماغ کے ساتھ یعنی غیر جانبداری سے آشنائی اور حقائق معلوم کرنے کے باقاعدہ طریق کار اور تفتیش کا نام ہے۔ یہ ایسے مظاہر کا فہم بڑھانے کے لیے

معلومات یا کوائف کو جمع کرنے اور تجزیہ کرنے کے منظم طریق کار کا نام ہے، جن سے ہمیں دلچسپی ہے یا ہم جن سے متعلق ہوتے ہیں۔ اس سے ہم اپنی تلاش کی تصدیق اور توثیق منظم، معروضی اور وقت کے ساتھ کرتے ہیں۔ عموماً اس میں سائنسی طریق استعمال کیا جاتا ہے۔

مقصد کے لحاظ سے تحقیق کی ایک قسم اطلاقی تحقیق ہے۔ اطلاقی تحقیق کا بنیادی مقصد دریافت (Exploration) ہوتا ہے جس کے ساتھ تشریح اور انسانی علم کی ترقی کے ایک طریق کار اور نظام کی تشکیل منسلک ہوتی ہے مگر یہ دریافت کسی بات/امر کے ساتھ مخصوص ہوتی ہے۔ اس ضمن میں "سائنٹیفک" (Scientific) کا لفظ فن، علم اور سائنس کے درمیان کچھ مغالطے (Fallacies) پیدا کرتا ہے۔ دراصل اس سے مراد طبعی علوم یا سائنس کا طریق کار نہیں بلکہ غیر موضوعی یا معروضی (Objective) طریق کار ہے۔ ہم آرٹ اور ادب کی تحقیق میں بھی جب تک معروضی طریق کار استعمال نہیں کریں گے، اس کے نتائج میں وقعت (Validity) پیدا نہیں ہوگی اور وہ معتبر اور واثق (Reliable) نہیں ہوں گے۔ اس لیے جدید معروضی طریق کار کو سائنٹیفک کا نام دیا جاتا ہے۔ دستاویزی یا تاریخی تحقیق کی بنیادیں بھی سائنٹیفک تحقیق کی طلبگار ہیں۔

تحقیق کو عام طور پر حاصلِ تحقیق کے معنی میں استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ کسی جملے میں "میری تحقیق" کے الفاظ دراصل تحقیقی نتائج کے مترادف کے طور پر استعمال ہوتے ہیں اور عمل کاری (Process) کی بجائے حاصلات (Findings) کو ظاہر کرتے ہیں۔ یہ علمی طور پر غلط طریقہ ہے۔

اپنے تکنیکی معنوں میں "تحقیق" اس منظم اور سائنسی طریق کار کا نام ہے جس سے ہم معروضی حقائق تک پہنچتے ہیں جو کسی عالم یا محقق کو موجود نظریے (Theory) میں ترمیم و اضافہ کرنے میں مدد دیتی ہے۔ ہر تحقیق بنیادی طور پر کسی فلسفے اور نظریے یا تھیوری کی روشنی ہی میں انجام دی جاتی ہے۔

تحقیقی فلسفے پر ہم آگے چل کر گفتگو کریں گے۔ ہر تحقیق اسی فلسفے کی چوحدی (Paradigm) یا حیطۂ کار کے اندر کام کرتی ہے۔ چونکہ نظریہ یا تھیوری پیش گوئی کر سکتی ہے، اگر اس پیش گوئی کی راہ میں آنے والی کوئی الجھن یا دشواری (Difficulty) کسی اور سمت اشارہ کرتی ہو تو اس الجھن کو فرضیہ (Hypothesis) قرار دے کر اس پر تحقیق کی جاتی ہے اور نتائج کی روشنی میں حاصل ہونے والے حقائق کو دعویٰ (Thesis) بنا کر نظریے یا تھیوری میں ترمیم و اضافہ کیا جاتا ہے۔

تحقیق صداقت کی تلاش تو ہے لیکن ایک معروضی (Objective) عمل کے ذریعے سے اور معروضی صداقت صرف وہی سچائی نہیں ہوتی جو کوئی ایک شخص موضوعی طور پر جانتا ہو بلکہ ضروری ہے کہ دوسرے بھی اسی کی مانند اس کیفیت کو معروضی طور ہی پر جان سکیں۔ زبان و ادب کے شعبے میں تحقیق کھرے اور کھوٹے کی چھان بین یا تصدیق کرنے کو کہا گیا ہے لیکن سائنسی میدان ہو یا ادب یہ تلاش اور تصدیق جب تک ایک باضابطہ طریق کار یا رسمیات کی پابند نہ ہو تحقیق نہیں کہلا سکتی۔ یہ پابندی منطقی اور معروضی ہوتی ہے۔ علمیاتی سطح پر اس تحقیق کا ایک حیطۂ کار یا نظریہ ہوتا ہے، جس کی حدود کے اندر سارا تحقیقی عمل انجام پاتا ہے۔

انٹرنیٹ اور ویب پر تحقیق (Research) کی حسب ذیل تعریفات ملتی ہیں:

-1 تحقیق ایک واضح انسانی سرگرمی ہے جو مواد کی تفتیش پر تعلقی ہے اور اطلاق پر مبنی ہے (وکی پیڈیا Wikipedia)۔

-2 باضابطہ تلاش یا جائزہ تاکہ حقائق، اصول، نظریے، اطلاقات کو دیکھا اور تلاش نو کی جا سکے (وکشنری۔Wiktionary)۔

مجموعی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تحقیق ایک عالمانہ تفتیش ہے، جو کوئی معاشرہ نئے علم کی تخلیق کے لیے انجام دیتا ہے۔ ادبی تحقیق تخلیق کار کی دنیا اور تجربات کو محسوس کرنے کے لیے پیدا ہونے والے سوالوں کا جواب تلاش کرتی ہے۔ یہ سوالات کرداروں، منظروں، ثقافتوں، اسلوبوں، خیالوں اور ادبی تحریکوں سے متعلق ہو سکتے ہیں اور ان کا جواب سماجی، ثقافتی، نفسیاتی اور فلسفیانہ علوم کے حوالے سے دیا جا سکتا ہے۔ جس کے لیے ادب میں سماجی/عمرانی تحقیق کے اصولوں کو برتا جاتا ہے۔

ادبیات اور لسانیات سماجی موضوعات ہیں جن کا تعلق عمرانیات، نفسیات اور فنون کے ساتھ بیک وقت ہوتا ہے، چنانچہ ادبی و لسانی تحقیق کو عمرانی، نفسیاتی اور فنی تحقیق کے تقاضوں کے تحت انجام دینا لازم ہے۔ اس لیے ایسی ادبی یا لسانی تحقیق جو ان علوم کے تحقیقی اصولوں کے تحت انجام نہ دی جائے کہ وہ کوئی انسانی مسئلہ حل نہیں کرتی، محض ایک نظری (Theoretical) کارروائی اور کارِ فضول (Academic Work) قرار پاتی ہے۔

تحقیق کے جدید تقاضے یہ ہیں کہ متعلقہ میدان میں:

1- نئی معلومات کا اضافہ ہو اور وہ سابقہ معلومات کے ساتھ منطقی طور پر مربوط ہو سکیں۔

2- یہ ارتباط رسمی اور باضابطہ طریق پر ہو جس کی باقاعدہ تصدیق اور توثیق ہو سکے اور

3- جس سے تحقیق کے نئے موضوعات پیدا ہوں۔

تحقیق کا سائنسی ہونا یعنی منظم، منطقی، مشاہداتی، قابلِ توثیق، قابلِ دہرائی، عمومی اور قابلِ قبول ہونا ضروری ہے، جس کی بنیاد پر کاموں کی پیشگوئی کی جا سکے۔ اس کے لیے ادبی و لسانی تحقیق کو ان رسمیات کا پابند ٹھہرانا بھی ضروری ہے۔ تحقیق کی یہ تمام رسمیات دو امور کی پابند ہے:

-1 مسئلہ (Problem)

-2 طریق کار (Procedure)

مسئلہ ہمیشہ ضرورت یا شک سے پیدا ہوتا ہے۔ جب ہمیں کسی سوال کا جواب معلوم نہیں ہوتا تو اس سوال کو ہم مسئلہ کہتے ہیں۔ اس مسئلے کے ممکنہ حل یا تحقیقی سوالوں کے جواب کو فرضیہ (Hypothesis) کہا جاتا ہے۔ صرف وہی جواب فرضیہ ہے، جس پر تحقیق انجام دی جاتی ہے۔ روایتی طور پر یہی فرضیہ پہلے علمی نتیجہ سمجھا جاتا تھا۔ جب کہ یہ ہماری رائے بھی ہو سکتا ہے۔ ہماری آراء خواہ تنقیدی ہوں یا قدر و تحسین سے متعلق ہوں، فرضیے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ انھیں علم کی حیثیت دینے کے لیے جانچنا پرکھنا ضروری ہوتا ہے۔ نیز اس

جانچ پرکھ کے لیے جو طریق کار وضع کیا جاتا ہے اس کی حیثیت بھی جانچی جا سکے۔

ضروری ہے کہ تحقیق کے کسی اقدام کو پوشیدہ نہ رکھا گیا ہو اور اس کے وجود اور نتائج کو تنقیدی نظروں سے دیکھا جا سکے۔ اس سارے عمل کو ہم جدید تحقیق کا نام دیتے ہیں۔ چنانچہ لازم ہے کہ تحقیق صاف شفاف ہو، اعلیٰ مقصد کی حامل ہو، سائنسی طریق کار پر مبنی ہو، منطقی طور پر مدلل ہو، غیر جانبدار ہو، واضح اور جامع ہو اور معیاری ماخذوں پر استوار ہو۔

جدید تحقیق کے آٹھ مرحلے انجام پاتے ہیں۔

ان مرحلوں کے علی الرغم تحقیق کئی طریقوں سے انجام دی جاتی ہے۔ یہ طریقے اپنے تحقیقی ڈیزائن یا حکمتِ عملی یا ارادے کی بنا پر تحقیق کی اقسام قرار پاتے ہیں۔ تاہم ایک بار پھر ہم یہ جان لیں کہ تحقیق کی تمام اقسام اپنی نوعیت، مقاصد اور طریق کار کے حوالے سے ایک مشترک بات کی حامل ہوتی ہیں کہ تحقیق معروضی اور سائنٹیفک طریق کار (Scientific Method) رکھتی ہے نیز یہ کہ اس کا سارا عمل واضح، غیر پوشیدہ اور غیر ذاتی ہوتا ہے۔

ادبی تحقیق کو بھی اپنا طریق کار تکنیک، نجی اور ذاتی یا موضوعی نہیں رکھنا چاہیے اور یہ تمام عمل جدید اصولوں کے مطابق سائنسی ہونا چاہیے۔ اس کے مقاصد، سوال یا مسئلہ، امکانی حل یا فرضیے اور طریق کار متعین ہونے چاہئیں۔ نتائج خواہ کچھ بھی نکلیں، تحقیق کار کو اپنے کسی ایک خاص نتیجے پر اصرار نہیں کرنا چاہیے۔

2- تحقیق: فن، سائنس یا تکنیک

تحقیق فن ہے یا سائنس، اگرچہ آج یہ سوال اتنا اہم نہیں رہا ہے۔ تحقیق کی کئی قسمیں اور تکنیکیں سامنے آ چکی ہیں لیکن ادب میں اس پہلو سے بھی جان لینا ضروری ہے کہ تحقیق کی عملی نوعیت کیا ہے؟

ادبی حوالے سے "تحقیق" (Research) کو ہمیشہ فن (Art) تسلیم کیا گیا اور تحقیق کار (Researcher) کے لیے محقق کی اصطلاح "محقق" مدتوں رائج رہی ہے۔ اس کا ایک سبب یہ تھا کہ تحقیق کے حاصلات (Findings) ہی کو "تحقیق" قرار دیا جاتا رہا اور طریق کار (Procedure) کو تحقیق کا نام دینا غیر ثقہ امر سمجھا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ "تحقیق کار" کو "محقق" کا نام اور "تحقیق" کو "فن" کا درجہ حاصل تھا۔ علمِ تحقیق میں اس روش کو پذیرائی حاصل نہیں۔

ہم علم کی ماہیت پر غور کریں تو ہمیں تحقیق کے فن (Art) ہونے پر معترض ہونے کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔ ادبی دنیا میں تنقید اور تحقیق کے شعبوں کو ان کی نگارشات کے حوالے سے ہمیشہ اسلوبیات کے دائرہ کار میں لانے کی کوشش کی گئی۔ تنقیدی مضامین اور ان کی آڑ میں تحقیقی مقالات کو بھی ادب کی شاخ سمجھا گیا اور چونکہ ادب فن پارے کی حیثیت رکھتا ہے اور علم کی بجائے فن کی ذیل میں آتا ہے، اس لیے علمِ تحقیق کو بھی پہلے قدم کے طور پر فن ہی قرار دیا گیا۔ یوں محقق کی ادبی حیثیت مسلمہ تھی۔

مراحل کے لحاظ سے علم کی بنیاد میں کارفرما دو اُمور سمجھنا ضروری ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ علم ہمیشہ

تشکیک سے شروع ہوتا اور دوم یہ کہ ظن وتخمین پر آ کر ختم ہوتا ہے جبکہ یقینی معلومات اور حقائق کا ادراک انسان کو ایمان ویقین کی منزلوں تک لے جاتے ہیں۔

ظن وتخمین نئے شکوک وشبہات کو جنم دیتے ہیں اور ایمان اور عقائد انسانی ذہن کو احقاقِ حق کی منزل پر لے آتے ہیں: شکوک وشبہات انسان کو پرکھ پرچول اور احقاق ویقین تسلیم ورضا کے لیے مجبور کرتے ہیں۔

''تحقیق'' پرکھ پرچول کا دوسرا نام ہے اور ''مسلمات'' میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہوتی۔ اس لیے تحقیق صرف غیر مسلمہ حقائق پر انجام دی جاتی ہے یعنی جن امور پر شک کیا جا سکتا ہو، صرف انھی پر تحقیق انجام دی جا سکتی ہے۔ ادبی ولسانی تحقیقی کام کرنے والوں کو یہ بات شروع ہی سے پیشِ نظر رکھنی چاہیے۔

ادبی اور لسانی تحقیق میں تنقید اور اصولِ جرح کے استعمال کے سبب گویا رسمیاتِ تحقیق (Formalities of Research) کو اُسلوبی بھی ہونا پڑتا ہے۔ یعنی مجازی اور اصطلاحی زبان کے بعض تقاضے پورے کرتے ہوئے قابلِ اُسلوب انداز یا تحقیقی طریقے اور زبان میں اسے بیان کرنا پڑتا ہے۔ ڈاکٹر گیان چند اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ تحقیق ایک مناسب ''ادبی'' اسلوب میں بیان کی جائے۔ تاہم رسمیاتِ تحقیق کو بیان کرنے کا بھی اپنا ایک علیحدہ منفرد، اُسلوب، لسانی انداز یا قرطاسِ طرز (Style Sheet) ہوتا ہے۔ لازم نہیں کہ یہ ادبی اسلوب میں ہو۔

تحقیق تکنیک بھی ہے، ایک فن بھی، پیشہ بھی اور لگن بھی۔ یہ ایک دلچسپ مشغلہ ہے۔ تحقیق کاری ایک لذتِ مسلسل ہے۔ عجیب بات ہے کہ جو ایک بار اس راہ پر چل نکلا پھر زندگی بھر اسی کا ہو رہا۔ جبکہ اس کے کاموں کی کوئی خاص پذیرائی بھی حاصل نہیں ہوتی۔ کوئی ادارہ محقق کو انعام سے نہیں نوازتا یا پھر اس کے کوئی پرستار بھی نہیں ہوتے۔ اساتذہ کی تو مجبوری ہے کہ تحقیق کریں گے تو ترقی ہوگی، یہ دوسروں کو کیا پڑی ہے کہ تحقیق میں سر کھپائیں۔ اس کے باوجود اُردو کے کئی معروف محقق دوسرے پیشوں اور کاموں سے وابستہ رہے۔

3- تحقیق کی فلسفیانہ بنیاد

فلسفیانہ بنیاد کو سمجھنے کے لیے علم کی ماہیت یا علمیات (Epistemology) کا جائزہ لینا چاہیے۔ یہ جاننے کے لیے کہ حقیقت کیا ہے اور اس پر مبنی وجود کا علم کیا ہے، ہمیں یہ جاننا ہوتا ہے کہ خود علم کیا ہے؟ ہم جس چیز کو علم کہہ رہے ہیں کیا وہ محض معلومات اور اعداد وشمار تو نہیں۔ چنانچہ علمیات کا وجودیات (Ontology) کے ساتھ بہت قریبی رشتہ بنتا ہے۔ ایسٹر بائی سمتھ (Easterby-Smith) اور اس کے ساتھی کہتے ہیں کہ علمیات دنیا کی حقیقت کے بارے میں جاننے کا سب سے موزوں طریقہ ہے۔ علمیات میں یہ جاننے کی کوشش کرتے کہ علم کیا ہے اور اس کے ذرائع کیا ہیں۔ بلائکی کے نزدیک علمیات علم کے طریقوں یا بنیادوں کا نظریہ یا علم ہے جو حقیقت کا ممکنہ علم حاصل کرنے کے مفروضوں پر استوار ہوتا ہے۔ کائیا (Chia) علمیات کو ''کیا اور کیونکر جاننا ممکن ہے'' اور ''معیارات کا مطالعہ کرنا'' نیز ''یہ جاننا کہ آپ کیسے جان سکتے ہیں'' قرار دیتا ہے۔ ہیچ اور کنلف (Hatch & Cunliffe) کے نزدیک ''علم کیونکر پیدا ہوتا ہے اور وہ کون سے کسوٹی ہے جس پر

ہم اچھے علم اور برے علم کو پرکھ سکتے ہیں نیز حقیقت کس طرح ظاہر یا بیان ہو سکتی ہے؟ چنانچہ وجودیات اور علمیات کا باہمی ربط موجود ہے"۔

جدید تحقیقی طریقے علمی فلسفہ یا علمیات کی چوحدی (Paradigm) یا حیطۂ کار میں وضع ہوتے ہیں۔ کوئی علم صرف اس وقت تک قابلِ قبول ہوتا ہے جب تک اس کی بنیاد تحقیقی حقائق پر مبنی نظریے میں گزری ہوتی ہے۔ نئی تحقیق اس نظریے میں تبدیلی لاتی ہے اور یوں علم اپنی عبوری چوحدی پار کرتا رہتا ہے۔

یہ علم فلسفے کی ذیل میں آتا ہے۔ گویا تحقیق سے پہلے تحقیقی فلسفہ جاننا ضروری ہے۔ ہم عام طور پر علم (Knowledge) کو معلومات (Information) کے معنی میں لیتے ہیں اور بعض معلومات رکھنے والے شخص کو عالم قرار دیتے ہیں جو اپنی بات، بیان یا فکر کو حتمی علم یا ادعا (Dogma) کی صورت میں پیش کرتا ہے، جبکہ علم معلومات، حقائق اور مہارتوں کے انسانی تجربے (Experience) کی روشنی میں کسی نظریے یا عملی تفہیم کا نام ہے۔ یہ مضمر (Implicit) یعنی داخلی مہارت اور واضح (Explicit) یعنی ظاہری، نظری ہوتا ہے۔ یہ رسمی، منظم اور عبوری (Tentative) ہوتا ہے۔ علم ہمیشہ وقوفی (Cognitive) طریق کار پر منحصر ہوتا ہے۔ جس میں ادراک، تعلّم، ابلاغ، استدلال اور انسانیت کو مجموعی طور پر تسلیم کرنا شامل ہیں۔

ہمارے ہاں ایک روایت غیر ضروری طور پر چلی آ رہی ہے۔ وہ یہ کہ علم کتابوں، مقالوں، مضمونوں اور رپورٹوں وغیرہ میں ہوتا ہے۔ اس لیے تدریسی عمل میں ان دستاویزات کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ جبکہ ان سب میں علم کا کل پانچ فی صد حصہ محفوظ ہو پاتا ہے۔ گویا دنیا بھر کے کتب خانے کل علم کے صرف پانچ فی صد کے امین ہیں۔ باقی؟

ہم علم کو "تجربے (Experience) یا مطالعے سے حاصل کردہ فہم" قرار دیتے ہیں۔ یہ صرف جانکاری (Know-how) ہے۔ یہ حقائق (Facts)، قواعدِ طریق کار (Procedural Rules) یا انکشافیہ (Heuristic) کا مجموعہ ہو سکتا ہے۔ حقائق کسی موضوع کے بارے میں صداقت کے چند عناصر کا بیان ہوتے ہیں۔ جیسے "سورج مشرق سے نکلتا ہے"۔ قواعدِ طریق کار اصل کے ساتھ نسبت/تعلق کے سلسلوں کو بیان کرتے ہیں جیسے "شاہراہ میں داخل ہونے سے پہلے ٹریفک کا جائزہ لے لیں"۔ انکشافیہ ایک عمومی قاعدہ یا وجدانی بصیرت (Insight) کا قاعدہ ہوتا ہے جو تجربوں کا نچوڑ کہلاتا ہے۔ جیسے "حدِ رفتار سے محض پانچ میل زیادہ کی رفتار پر چالان نہیں ہو سکتا"۔

علم (Knowledge) سے پہلے معلومات (Information) اور کوائف (Data) موجود ہوتے ہیں۔ انھیں سمجھنے کے بعد ہی ہم علم کی تفہیم کر سکتے ہیں۔ کوائف غیر منظم اور غیر مرتب اعداد و شمار اور حقائق کا نام ہے۔ یہ جامد ہوتے ہیں۔ معلومات ان کوائف کو صورت، سمت اور حرکت دینے کا نام ہے تاکہ ان سے معنی برآمد ہوں اور بعد میں ان سے کوئی فیصلہ (Judgement) کیا جا سکے۔ علم معلومات، تجربات، ذہانت کی سمت اور مقدار کا ایک پیچیدہ مجرد مرکب ہے، اسے جاننا کوائف اور معلومات کی نسبت بہت مشکل ہے۔ ٹوانہ کے نزدیک آپ اسے حرکت پذیر معلومات کہہ سکتے ہیں، جو صحیح صورت میں صحیح وقت پر اور صحیح مقام

پر فیصلہ کرنے کے کام آتا ہے۔ سائنٹیفک انداز میں ہم علم کو کسی خاص میدان میں انسانی فہم قرار دے سکتے ہیں جو مطالعے اور تجربات کے نتیجے میں حاصل ہوتا ہے"۔

علم کی اصطلاح کئی معنوں میں استعمال ہوتی ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ "سیکھنے، سوچنے اور کسی شعبے میں موجود مسائل کو سمجھنے" کا نام ہے۔ ڈیون پورٹ (Devenport) اور پروسیک (Prosak) کے نزدیک علم "محیط تجربات (Experiences Framed)، اقدار، سیاقی معلومات اور ماہرانہ وجدانی / اشراقی بصیرت (Insight) کے سیال آمیزے (Fluid Mixture) کا نام ہے جو نئے تجربات اور معلومات کے جائزے اور شمولیت کے لیے ایک لائحہ عمل مہیا کرتا ہے"۔ علم محض معلومات تک محدود نہیں ہوتا اور معلومات محض کوائف کا نام نہیں۔ علم کی وسعت معلومات کی مقدار پر اور معلومات کی حدود کوائف کی وسعت پر ہے۔ علم کی حدود میں ادراک، مہارتیں، تربیت، عقل سلیم اور تجربات سب کچھ شامل ہوتا ہے، جس سے بامعنی نتائج حاصل ہو سکیں۔ علم حقیقت کے ساتھ انسانی تعامل، سماجی فطرت، صداقت کے یقین کے ساتھ سابقہ موجود علم پر مبنی ہوتا ہے۔ علم کی اگلی منزل دانش (Wisdom) ہے۔

علم صداقت کی کھوج لگاتا ہے اور عبوری طور پر حقیقت بیان کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ صداقت کی کھوج اور جانچ تحقیق کے ذریعے ہی سے ممکن ہے اور جب بار بار کی تحقیق کے حاصلات ایک سے ہوں تو انھیں حقائق (facts) قرار دیا جاتا ہے۔ انھی حقائق سے علمی پیش گوئی ممکن ہے۔ مجموعۂ حقائق کی اصلیت کو بیان کرنے کے اس نقطۂ نظر کو نظریہ یا تھیوری کہا جاتا ہے۔ علم کی ماہیت کو سمجھنا، اس کے لیے معلومات کی جمع آوری، بندوبست اور اس کی ترتیب و تنظیم کو ایک اور اصطلاح متعلقاتِ علم یا مابعد علم (Meta Knowledge) سے یاد کیا جاتا ہے۔

تحقیق کو اوّل متعلقاتِ علم ہی سے واسطہ پڑتا ہے۔ حصولِ علم کے طریقے، اصولِ تحقیق، تدریسیات، کورس وغیرہ مابعد یا متعلقاتِ علم قرار پاتے ہیں۔ تحقیقی فلسفہ بھی اسی مابعدِ علم ہی میں شامل ہے۔ چنانچہ تحقیق کے تمام طریقے جاننا اسی کے ذیل میں آتا ہے۔ تحقیقی طریقے علمی فلسفہ یا علمیات کی اسی چوحدی یا حیطۂ کار میں وضع ہوتے ہیں۔ کوئی علم صرف اس وقت تک قابلِ قبول ہوتا ہے جب تک اس کی بنیاد تحقیقی حقائق پر مبنی نظریے میں گڑی ہوتی ہے۔ نئی تحقیق اس نظریے میں تبدیلی لاتی ہے۔ یوں علم اپنی عبوری چوحدی پار کرتا رہتا ہے۔ علم کبھی جامد اور مقید نہیں رہتا۔ یہ عبوری، متحرک اور وسیع تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس کی مسلسل تعمیرِ نو (Reconstruction) ہوتی ہے اور تعمیرِ نو کا یہ فرض تحقیق کے سپرد ہوتا ہے۔ تحقیق اپنے خواص کی بنا پر پہچانی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ خواص کسی حدود (Limits)، حیطۂ کار / چوحدی (Paradigm) / تحقیقی نقطۂ نظر یا نظریہ (Theory) کے اندر اور حد بندی یا تحدید (Delimitation) کے پابند ہوں گے۔ اسی بناء پر تحقیق معروضی (Objective) کہلائے گی۔

جدید تحقیق کے اُصولوں پر ابھی مباحث جاری ہیں۔ اُصولِ ادبی تحقیق گزرگاہ میں ہیں۔ ایسے میں تحقیقی حیطۂ کار یا چوحدی کے حوالے سے تحقیقی فلسفے اور نظریے یا تھیوری پر بات کرنا ہمارے ہاں زبان اور ادب

کے میدان میں بہت ہی قبل از وقت ہے لیکن اہلِ فکر و نظر کے لیے شاید یہ ایک تحریک اور تشویق کا باعث بنے۔ تحقیق سے پہلے تحقیقی فلسفہ جاننا ضروری ہے۔ ہر تحقیق بنیادی طور پر کسی فلسفے اور نظریے یا تھیوری کی روشنی ہی میں انجام دی جاتی ہے۔ ہر تحقیق اسی فلسفے کی چوحدی یا حیطۂ کار کے اندر کام کرتی ہے۔

زبانوں میں اُصولِ تحقیق کا جدید مقصود صرف یہی ہے کہ زبان اور ادب کے میدان کی علمی فتوحات میں ایسا اضافہ کیا جائے جو عالمی سطح پر قابل قبول ہو اور تحقیق اصل اور طبعزاد ہو۔ اس تحقیق کے نتائج کو دہرایا جاسکے اور ان سے تحقیقی حقائق برآمد ہوں جو کسی فلسفے اور نظریے یا تھیوری کی تخلیق میں مدد دے سکیں۔ علمی اضافے کا ایک ہی مطلب ہے کہ تحقیق کسی سوال کا شافی جواب مہیا کر سکے۔ مسئلے کے فہم، نئی تکنیک کی تخلیق اور واضح نتائج ہی کسی تحقیق کو مقام اور اہمیت دلا سکتے ہیں۔ تحقیق اس قابل ہو کہ:

(1) دوسروں کو قائل کر سکے،
(2) تحقیقی مہارت کا اظہار کر سکے،
(3) تحقیق کار کی اہلیت ثابت کر سکے،
(4) تحقیقی منصوبہ بندی پیش کر سکے۔

تحقیقی فلسفے سے قبل حیطۂ کار یا تحقیقی چوحدی کو سمجھنا ہوگا۔ گوبا اور لنکن (Guba & Lincoln) اسے عقائد کا سیٹ اور بنیادی اُصول قرار دیتے ہیں۔ تاہم انکے نزدیک حیطۂ کار یا چوحدی ہی سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ تحقیق کار درون و بیرون کیا ہے۔ انھوں نے اسے تین بنیادی فلسفیانہ سوالات تک محدود کیا ہے

کسی بھی فلسفے کو ہم انھی تین حیطۂ کاروں یا چوحدیوں ہی کے دائرے میں دیکھ سکتے ہیں: وجودیات (Ontology)، علمیات (Epistemology) اور طریقیات (Methodology) پر زبان اور ادب کے میدان میں ابھی ممکنہ تحقیق کے حوالے سے ان پہلوؤں پر غور نہیں کیا گیا۔ تحقیقی حیطۂ کار یا چوحدی کے موضوع پر بات ایک آدھ مقالے سے آگے نہیں بڑھتی۔

لسانی و ادبی تحقیق میں انسانی حوالہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے اس لیے بقول بلائکی آزاد مرضی اس تحقیق میں پیچیدگی پیدا کر دیتی ہے اور یوں کسی تحقیقی فلسفے کی بنیاد درکار رہتی ہے۔ پال فلاورز نے بلائکی، گوویل اور لنکن وغیرہ کے حوالے سے اس پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ اُردو تحقیق میں بھی یہی تینوں فلسفے تحقیقی حیطۂ کاروں یا چوحدیوں کی صورت پیدا کرتے ہیں۔

زبانوں کے تحقیقی کاموں میں کمزوری کے ضمن میں ایک رویّہ ''رواروی'' اور ''چلت'' کاموں کے انداز کا ہے۔ اس کے لیے عام دلیل یہ دی جاتی رہی ہے کہ دوسرے مضامین کے ساتھ مقابلہ کرنے کے لیے زبانوں میں زیادہ سے زیادہ ڈاکٹر پیدا کیے جائیں۔ حالانکہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ اُردو اور پاکستانی زبانوں میں زیادہ سے زیادہ کڑے معیار پر مبنی مقالات وجود میں لائے جائیں۔ اسی سے دوسرے مضامین کے مقابلے میں زبانوں میں تحقیق بہتر ہو سکتی ہے۔ معیار کے حصول کا یہی طریقہ ہے کہ زبانوں کی ادبی تحقیق کو سائنٹیفک اُصولوں پر اُستوار کیا جائے اور ادبی تحقیق میں بھی دنیا کے ساتھ ہم قدم ہوا جائے۔

زبانوں میں تحقیق کے نام پر کئی کام غیر ضروری طور پر بھی انجام دیے گئے ہیں اور کئی اہم کام ادھورے رہ گئے ہیں۔ جہاں تک تحقیقی اثرات کا تعلق ہے، ان میں سے بہت سے کام شاید ہی ایسی کوئی ضرورت پوری کرتے ہوں۔ بیشتر کام ذاتی رسائی یا خواہشوں پر انجام پائے، اُردو اور پاکستانی زبانوں کے مؤرخ کو بھی ان کی کم ہی ضرورت پڑے گی۔ مستقبل میں ایسے کام صرف حقیقی ضرورت پر مبنی انجام دیے جائیں تو تدوین و تحقیق کا فرض صحیح معنوں میں ادا ہوگا۔

اب تک زبانوں میں تحقیق کا مقصود صرف متون کی صحت رہا ہے جو ادبی تحقیق کا منصب ادا نہیں کر پاتا کیونکہ متن محض تحریری پہلو نہیں رکھتا جس کے لیے تحقیق کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔ متن ایک پیچیدہ نفسیاتی اور سماجی یا عمرانی عمل ہے، جس پر معنویات (Semantics) اور ثقافتیات (Culturology) کے حوالے سے تحقیق درکار ہوتی ہے، اس لیے یہ متنی تاریخ کا کام کوئی خاص تحقیقی کارنامہ قرار نہیں پاتا۔ متنی لسانیات البتہ ایک تحقیقی میدان ہے۔

بیسویں صدی کے اواخر میں تحقیق کو محض "علم کی تخلیق بذریعہ تفتیش" سمجھا گیا تھا اور سائنسی نقطۂ نظر کے حوالے سے اسے محض ایک قواعد کار اور تکنیک گردانا گیا تھا۔ یہ امور اثباتیت (Positivism) کے فلسفے کے تحت وضع ہوتے تھے۔

بیسویں صدی کے نصف آخر میں مابعد اثباتیت (Post-positivism) کے فروغ سے دنیا کہیں سے کہیں جا پہنچی۔ ہماری ادبی تحقیق ابھی اثباتیت کی حدود کو نہیں چھوڑ رہی۔ اس لیے شاید مابعد اثباتیت کی بات کرنا کارے دارد ہے۔ ادبی تحقیق کی چوحدی، حیطۂ کار، دائرۂ عمل یا نقطۂ نظر اسی سے تشکیل پاتا ہے۔

علمیات کو جاننے کے لیے ہمیں وجودیات کو سمجھنا پڑتا ہے کہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ بلا کی نے وجودیات کی اساسی تعریف یوں کی ہے:

> "وجود کے مطالعے کا علم، اس کی روشنی میں سماجی علوم، وجود، اس کی ماہیت، اس کے عناصر ترکیبی اور ان عناصر کے باہمی ربط کو جانچتے ہیں"۔

مختصر یہ کہ وجودیات حقیقت کی فطرت کے بارے میں ہمارے نقطۂ نظر کو بیان کرتی ہے اور یہ کہ کیا حقیقت معروضی طور پر موجود ہے یا محض موضوعی طور پر ہمارے ذہنوں میں ہے؟ پیچ اور کنلف اس نقطۂ نظر کو واضح کرنے کے لیے دونوں کو روزمرہ مثال اور ایک سماجی علوم کی مثال کے طور پر لیتے ہیں۔ یعنی جو کچھ حقیقت میں ہو رہا ہے اور جو محض مصنف کے خیال میں ہو رہا ہے۔

اس کی ایک مثال ناول راجا گدھ سے دی جا سکتی ہے کہ جس نفسیاتی کیفیت کے گرد بانو قدسیہ نے سیمی کے کردار کا تانا بانا بُنا ہے، کیا وہ حقیقت میں ایسی ہو سکتی ہے یا محض مصنف کے ذہن کی کارستانی ہے؟ چنانچہ ثقافت اور فریب نظر، تخیل کی اڑان، نیز حقیقت کے بارے میں انفرادی اور اجتماعی فکر اور یہ کہ کیا حقیقت محض نفسیاتی واردات (Experience) کی بنیاد پر سامنے آتی ہے یا ماورائے حیات کوئی چیز ہے؟ ہم سب اپنی تحریروں میں وجودیاتی مفروضوں کا سہارا لیتے ہیں جس کے ذریعے ہم ادب کے ذریعے حقیقت کو بیان

کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور یوں ادب برائے زندگی کی ترجمانی کرنے لگتے ہیں۔ تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے ہمیں ادیبوں کے ان زیر کار مفروضوں کو بھی سمجھنا چاہیے کہ وہ کس علمیاتی اور وجودیاتی فلسفے کا سہارا لے رہے ہیں۔

ادبی تحقیق کار وجودیات کے جس پہلو کو اختیار کرتا ہے لامحالہ اسے علمیات کا بھی اسی سے مربوط مفروضہ زیر کار رکھنا پڑتا ہے۔ ایک علمیات کا ذکر ایرک سن اور کوولینن (Erakson & Kovalainen) کرتے ہیں کہ وہ خارجی طور پر ایک اپنا وجود رکھتی ہے جبکہ موضوعی علمیات میں ہمارے اپنے مشاہدوں، تجربوں اور تشریحوں کے علاوہ ہم کسی حقیقت کو نہیں جان سکتے۔ سانڈر (Sander) اور اس کے ساتھیوں نے اس کی مزید وضاحت کی ہے کہ ایسے میں تحقیق کار کو اشیا سے حاصل شدہ اپنے کوائف کو جو خارجی حقیقت کے طور پر موجود ہوتے ہیں، صرف اعداد و شمار ہی کے انداز میں نہ کہ عبارت آرائی کے طور پر بیان کرنا چاہیے اور نہ ہی کوئی فیصلہ کن بیان دینا چاہیے۔

ادبی تحقیق میں موضوعیت کی اس قدر بھرمار ہوتی ہے کہ حتمی نتائج بیان کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے چنانچہ ہمیں ادبی تحقیق کی چوحدی کا تعین کرنا پڑے گا۔ اسی کو ہم اپنا تحقیقی فلسفہ قرار دیں گے۔ اسی سے ہمارا تحقیقی طریقہ برآمد ہوگا۔

اُصول تحقیق کی بنیاد تحقیق کی چوحدی، نقطۂ نظر یا حیطۂ کار سے حاصل ہوتی ہے۔ Paradigm کا لفظ یونانی زبان سے آیا ہے، جس کا مطلب ہے "ہر ست کے ساتھ ساتھ"۔ گویا یہ کسی شے کلی نمونے کے احاطہ ہوتی ہے۔ اسے کلی انداز فکر یا اصولی نقطہ نظر بھی کہا جاتا ہے۔

چاروں حدود کے ملنے سے کسی چوکھٹے کی جو تصویر بنتی ہے، اسے اس کی چوحدی یا حیطۂ کار کہا جاتا ہے۔ فکری طور پر چوحدی بنیادی اعتقادات پر مبنی ہوتی ہے۔ کائنات کی نوعیت، فرد کا مقام اور ان کے باہمی تعلقات کی امکانی حدود، یہ سب کچھ چوحدی کہلاتے ہیں۔ تحقیق بھی کسی نہ کسی چوحدی یا حیطۂ کار کے اندر ہوتی ہے۔ یہ اس سے باہر نہیں جا سکتی۔ حتیٰ کہ اس کے حقائق اور نظریات بھی۔

ہیننگ (Henning) کے نزدیک حیطۂ کار یا چوحدی (Paradigm) کے نظریے (Theory) پر منحصر ہوتی ہے۔ یعنی ایسا چوکھٹا صرف جس کے اندر ہی وہ نظریہ وجود پا سکتا ہے۔ گویا تحقیقی نظریہ جن حدود میں کارفرما ہوگا، اس کا ذاتی رویوں اور کرداروں پر جو اثر رونما ہوگا، پیشہ ورانہ عمل کی جو صورت پیدا ہوگی اور تحقیق کے عمل کے ساتھ جو انداز وقوع پذیر ہوگا، وہ اس کی تحقیقی حیطۂ کار یا چوحدی یا Research Paradigm کہلائے گا۔

گوبا اور لنکن (Guba & Lincoln) نے تین بنیادی سوالات کو کسی تحقیقی چوحدی یا حیطۂ کار کی اساس قرار دیا ہے:

(ایک) **وجودیاتی (Ontological) سوال:**

یعنی حقیقت کی ہیئت اور فطرت یا نوعیت کیا ہے؟ جسے ہم جاننا چاہتے ہیں۔

(دو) علمیاتی (Epistemological) سوال:
علم کے لیے بنیادی عقیدہ کیا ہے؟ یعنی کیا کچھ معلوم ہو سکتا ہے؟

(تین) طریقیاتی (Methodological) سوال:
تحقیق کار اپنے علمی عقیدے میں کہاں تک جا سکتا یا کس حد تک تحقیق کر سکتا ہے؟
تحقیق کی تین حیطۂ کار یا چوحدیاں ہو سکتی ہیں:

ایک۔ اثباتیت (Positivism)،
دو۔ ترجمانیت (Interpretism)،
تین۔ تنقیدی نظریہ

(ایک) وجودیاتی سوالات

الف۔ اثباتیت (Positivism) کی چوحدی یا حیطۂ کار

تجزیۂ چوحدی (Paradigm Analysis) یا حیطۂ کار کے لیے سوالات:

1- حقیقت کی فطرت/نوعیت
- ایک معروضی، صادق حقیقت وجود رکھتی ہے۔ جو غیر متبدل علت و معلول قوانین کی پابند ہے۔
- حقیقت پہلے سے موجود پائیدار نمونے یا ترتیب پر مشتمل ہے جسے دریافت کیا جا سکتا ہے۔
- حقیقت زمانے یا سیاق و سباق کی پابند نہیں۔
- حقیقت کی تعمیم کی جا سکتی ہے۔
- علم درست اور یقینی ہوتا ہے۔

2- نظریہ/تھیوری کا کردار
نظریات (Theories):
- معیاراتی ہوتے ہیں۔
- ماڈل پیش کرتے ہیں۔
- متغیرات کے درمیان علت کی تشریح کرنے کے قضیے پیش کرتے ہیں۔

3- نظریہ سازی/جانچ
- نظریہ قابل جانچ ہوتا ہے، جس کے بعد رد و قبول ہو سکتا ہے۔
- قابل مشاہدہ مظہر یا رویے سے ثابت ہوتا ہے۔
- اسے کسی زیر قابو سیٹنگ میں جانچا جاتا ہے۔ فرضیے کو حسابی طور پر مدد فراہم کی جاتی ہے یا تجربات کے ذریعے رد کیا جاتا ہے۔

4۔ تحقیق کا کردار

- حقیقتوں کو دریافت کرنا یعنی قدرتی قوانین کی تلاش۔
- مظاہر کو سائنسی انداز میں تشریح / بیان، پیش گوئی اور کنٹرول کرنا۔

5۔ انسانیت کی فطرت / نوعیت

- استدلالی۔
- خارجی عوامل سے صورت پذیر (ایک سی علت ہر ایک پر ایک سے اثرات مرتب کرے گی)۔ مثلاً میکانکی ماڈل، کرداری انداز۔

ب۔ ترجمانیت (Interpretivism) کی چوحدی یا حیطۂ کار

تجزیہ چوحدی (Paradigm Analysis) یا حیطۂ کار کے لیے سوالات:

1۔ حقیقت کی فطرت / نوعیت

- دنیا پیچیدہ اور متحرک ساخت رکھتی ہے جس کی تشریح لوگ اپنے ایک دوسرے سے تعامل اور وسیع تر سماجی نظام میں کرتے اور تجربہ حاصل کرتے ہیں۔
- حقیقت موضوعی ہے لوگ اسے مختلف انداز میں محسوس کرتے ہیں۔ موضوعی حقیقت اہم ہے یعنی لوگ کیا سوچتے، محسوس کرتے اور دیکھتے ہیں۔

2۔ نظریہ / تھیوری کا کردار

نظریات:

- قابل نظر ثانی ہوتے ہیں۔
- تخمینی صداقت ہوتے ہیں۔
- تناظر کی حساسیت رکھتے ہیں۔

3۔ نظریہ سازی / جانچ

- نظریے وضع کیے جاتے ہیں / متنوع حقیقتوں سے تشکیل کیے جاتے ہیں۔ کسی مظہر کو سمجھنے کے لیے تحقیق کار کو مختلف چیزوں کو دیکھنا ہوتا ہے۔
- نظریے کو سماجی ثقافتی تناظر میں صورت دی جاتی ہے۔

4۔ تحقیق کا کردار

- ذہنی، سماجی، ثقافتی مظہر کا مطالعہ کرنا یا یہ سمجھنے کے لیے کہ لوگ کسی خاص انداز میں طرز عمل کیوں اختیار کرتے ہیں؟
- مظاہر کے معنی کا ادراک کرنا۔
- متعدد حقیقتوں کو بیان کرنا۔

- حقیقت نامکمل طور پر قابو میں آسکتی ہے۔
- زبان کا استعمال خاص قسم کی حقیقت بیان کرسکتی ہے۔

5- انسانیت کی فطرت/نوعیت

- سماجی مخلوق جو معنی وضع کرتی اور اپنی دنیاؤں کی مسلسل معقولیت پیدا کرتی ہے۔
- لوگ حقیقت کا داخلی احساس رکھتے ہیں۔

ج۔ تنقیدی نظریہ (Critical Theory) کی چوحدی یا حیطۂ کار

تجزیہ چوحدی (Paradigm Analysis) یا حیطۂ کار کے لیے سوالات:

1- حقیقت کی فطرت/نوعیت

۔ متنازع، زیر اساس ساختوں کی پابند ہے۔ سماجی، سیاسی، ثقافتی، معاشی، نسلی، صنفی وغیرہ۔

2- نظریہ/تصوری کا کردار

نظریات:

- دنیا کی تعمیر و تخریب کے جدلیاتی عمل کے تنقیدی اقدام میں تشکیل پاتے ہیں۔

3- نظریہ سازی/جانچ

- نظریے دنیا کی ساخت ربائی یا تخریب سے اور طاقت کے تعلقات کے تجزیے سے وضع کیے جاتے ہیں۔

4- تحقیق کا کردار

- تنقیدی شعور کو پروان چڑھانا۔
- اداروں کی ساخت اور ترتیب کو کھولنا جس سے عملی نظریات اور سماجی ناہمواریاں جنم لیتی ہیں۔
- طاقت کا توازن اس طرح منتقل کرنا کہ یہ زیادہ مساویانہ طور پر منقسم ہو۔
- سماجی مسائل کو حل کرنا۔
- سیاسی اور تنقیدی شعور کو بڑھانا۔

انسانیت کی فطرت/نوعیت

- لوگ اپنی دنیا کا نقشۂ عمل اور تنقیدی ردعمل کی مدد سے تعمیر کرسکتے ہیں۔

(دو) علمیاتی سوالات

الف۔ اثباتیت (Positivism) کی چوحدی یا حیطۂ کار

تجزیہ چوحدی (Paradigm Analysis) کے لیے سوالات:

1- علم کی فطرت/نوعیت

- علم کو منظم انداز میں بیان کیا جاسکتا ہے۔

- علم توثیق کردہ فرضیوں پر مشتمل ہوتا ہے، جنھیں حقائق یا قوانین کہتے ہیں۔
- امکانیت۔ زیادہ افراد یا گروہوں کے لیے صداقت رکھتا یا کئی صورتوں میں وقوع پذیر ہوتا ہے۔
- علم درست اور یقینی ہوتا ہے۔

2- تحقیقی حاصلات صحیح ہیں اگر:

- قابل مشاہدہ و پیمائش ہوں۔
- دہرائے جانے اور تعمیم کے قابل ہوں۔

3- عقلِ سلیم کا کردار

- نہیں ہے..... صرف استخراجی استدلال (Inductive Reasoning)

ب۔ ترجمانیت (Interpretivism) کی چوحدی یا حیطۂ کار

تجزیہ چوحدی (Paradigm Analysis) یا حیطۂ کار کے لیے سوالات:

1- علم کی فطرت/نوعیت

- علم نہ صرف قابل مشاہدہ مظاہر پر مبنی بلکہ موضوعی عقائد، اقدار، دلائل اور فہم پر منحصر ہوتا ہے۔
- علم ایک ساخت (Structure) رکھتا ہے۔
- علم اس انداز کے متعلق ہوتا ہے، جس میں لوگ اپنی زندگیوں کو معنی پہناتے ہیں۔

2- تحقیقی حاصلات صحیح ہیں اگر:

- تحقیقی کمیونٹی کا ایک عمل ہوں، جس کی اطلاع شرکا دیں اور دوسرے اس کا جائزہ لیں اور تصدیق کریں۔

3- عقلِ سلیم کا کردار

- عقلِ سلیم عام لوگوں کے روزمرہ نظریات کی طاقت ظاہر کرتی ہے۔
- تعاملی اور استخراجی استدلال استعمال ہوتا ہے۔

ج۔ تنقیدی نظریہ (Critical Theory) کی چوحدی یا حیطۂ کار

تجزیہ چوحدی (Paradigm Analysis) کے لیے سوالات:

1- علم کی فطرت/نوعیت

- علم منتشر اور منقسم ہے۔
- علم طاقت کا سرچشمہ ہے۔
- علم زندہ تجربے اور سماجی تعلق سے تشکیل پاتا ہے۔
- واقعات سماجی اور معاشی تناظر میں سمجھے جاسکتے ہیں۔

2- تحقیقی حاصلات صحیح ہیں اگر:

- مخصوص سیاق و سباق میں مسائل حل کر سکے۔
- حل دیگر سیاق و سباق میں بھی قابل اطلاق ہو سکتے ہیں مگر بطور فرضیہ جانچے جائیں۔
- اوہام سے پردہ اٹھا سکیں۔

3- عقل سلیم کا کردار

- غلط عقائد جو طاقت اور معروضی شرائط کو چھپاتے ہیں۔

(تین) طریقیاتی سوالات

الف۔ اثباتیت (Positivism) کی چوحدی یا حیطۂ کار

تجزیہ چوحدی (Paradigm Analysis) یا حیطۂ کار کے لیے سوالات:

1- تحقیق کار کا کردار

- معروضی، موضوع سے آزاد
- تفتیش کنندہ عام طور پر زیر تفتیش کو کنٹرول کرتا ہے۔

2- اقدار کا کردار

- سائنس اقدار سے آزاد ہے۔
- تحقیق میں اقدار کی کوئی جگہ نہیں...... تمام تعصبات کو خارج کر دینا چاہیے۔

3- طریق (Method)

- حسیاتی (Empirical)
- ساختہ اور دہرائے جانے کے قابل مشاہدہ۔
- مقدار کاری اور پیمائش۔
- تجرباتی...... متغیرات کو براہ راست جانچنا اور مشاہدہ کرتا ہے۔

4- نوع مطالعات

- سروے۔
- فرضیے کی توثیق۔
- شماریاتی تجزیہ۔
- مقداری بیانیہ مطالعات۔

ب۔ ترجمانیت (Interpretivism) کی چوحدی یا حیطۂ کار

تجزیہ چوحدی (Paradigm Analysis) یا حیطۂ کار کے لیے سوالات:

1- تحقیق کار کا کردار
- معانی تخلیق کرنے میں شریک۔
- اپنے موضوعی تجربات کو تحقیق میں داخل کر دیتا ہے۔
- کل کی سمجھ پروان چڑھانے کی کوشش کرتا ہے اور یہ کہ ہر حصہ آپس میں کس طرح اور کل کے ساتھ کیوں کر متعلق ہے۔

2- اقدار کا کردار
- اقدار سماجی زندگی کا لازمی حصہ ہیں...... اقدار غلط نہیں البتہ مختلف ہوتی ہیں۔

3- طریق (Method)
- غیر ساختہ مشاہدہ۔
- انٹرویو کا آغاز کرتا ہے۔
- مضمری تجزیہ۔(Discourse Analysis)
- "اندرونی" علم حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

4- نوع مطالعات
- میدانی تحقیق، فطری سیٹنگ کے اندر صورت حال کی اصل معلومات جمع کرنے کے لیے۔

ج۔ تنقیدی نظریہ (Critical Theory) کی چوحدی یا حیطۂ کار

تجزیۂ چوحدی (Paradigm Analysis) یا حیطۂ کار کے لیے سوالات:

1- تحقیق کار کا کردار
- تسہیل کار کا کردار اپناتا ہے...... زیر تحقیق کی شرکت اور شمولیت کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔

2- اقدار کا کردار
- حقائق اقدار سے کبھی الگ نہیں کیے جا سکتے۔
- تحقیق کار کی اقدار تحقیق پر اثر انداز ہوتی ہیں۔

3- طریق (Method)
- شراکتی اقدامی تحقیق۔
- مکالماتی طریقے جو تحقیق کار اور زیر تحقیق کے مابین مکالمے کو تحریک دیں۔

4- نوع مطالعات
- نہیں

4- اثباتیت (Positivism)

اور

مابعد اثباتیت (Post-positivism)

ادبی اور لسانی تحقیق میں اثباتیت اور مابعد اثباتیت کی سفارش کی جائے۔ زینا اولیری نے ان دونوں فلسفوں کی روشنی میں تحقیقی ساکھ کے تجزیے کے اہم عناصر کے پانچ جوابات طے کیے ہیں، جو چوکھٹے میں درج ہیں۔

اثباتیت	مابعد اثباتیت
1- کیا موضوعیت کو سمیٹ لیا گیا ہے؟	
معروضیت: ایسے نتائج جو جذبات، ذاتی تعصبات اور موضوعی عناصر سے پاک ہوں	غیر جانبداری: تعصبات اور جانبداری سے بے نیاز خواہ موضوعیت کو تسلیم کیا گیا ہو لیکن اثرات کا جائزہ شفاف طور پر لیا گیا ہو
2- کیا طریق کار کا تسلسل اور تواتر موجود ہے؟	
وثوق: اعتبار یا معتبری طریق کار کے تسلسل اور متواتر عمل پذیر ہونے پر ہے تاکہ بار بار دہرانے پر ایک سے نتائج آئیں	انحصار پذیری: خواہ نتائج کا معتبر ہونا ممکن نہ ہو لیکن طریق کار منظم ہو، تحشیہ نگاری کے ساتھ ہو اور معروضیت کو محدود کر سکے
3- کیا مسئلے کی روح کشید کر لی گئی ہے؟	
وقعت یا جواز: صداقت پر انحصار ہو۔ نتائج کی صحت جانچی جا سکے اور کیا طریق کار، انداز اور تکنیک اس مسئلے کے لیے موزوں تھے؟	استناد: صداقت کی قدر سے وابستہ ہو خواہ متعدد صداقتیں سامنے آئیں تاکہ قدر کا امتحان ہو سکے
4- کیا ماحصل کا اطلاق اس حوالے سے باہر ہو سکتا ہے؟	
تعمیم: عمومیت یا فارمولا سازی ہو سکے جس کا اس گروہ کے علاوہ عام امور پر بھی اطلاق ہو سکے	انتقال پذیری: ایک نمونے کے نتائج کو دوسرے نمونوں پر منتقل کیا جا سکے جو کسی اور انداز کے ہوں
5- کیا تحقیق کی توثیق ہو سکتی ہے؟	
دہرائی: اگر اس تحقیق کو کسی اور تناظر میں ایسے ہی حالات اور مواد پر آزمایا جائے تو وہی نتائج سامنے آئیں	تنقیح پذیری: تحقیقی تناظر کی اہمیت قبول ہو سکے تاکہ دوسرے بھی دیکھ لیں کہ تحقیق ان نتائج تک کس طرح سے پہنچی یعنی طریق کار کی شفافیت

5- تحقیق کی سائنسی و ادبی بنیاد

تحقیق اپنے طریق کار کے لحاظ سے سائنسی ہے، خواہ یہ سائنس ٹیکنالوجی کے لیے استعمال ہو یا ادب وصحافت کے لیے۔ تحقیق کے خواص میں سائنسی پہلو پر بحث کی گئی ہے۔ یہاں ادبی پہلو پر گفتگو درکار ہے۔ تحقیق کا ادبی پہلو دو طرح سے ہمارے سامنے آتا ہے:

1- ہر تحقیق کے لیے متعلقہ ادبی ذخیرے کا مطالعہ ضروری ہوتا ہے جسے دراصل متعلقہ دستاویزات/سابقہ تحقیقات/مقالات کا مطالعہ کہا جاتا ہے۔

2- تحقیق ادب کے موضوعات پر انجام دی جاتی ہے جو ادبی تخلیقات، دستاویزات، شخصیات اور سماجی رجحانات جیسے پہلوؤں پر انجام دی جا سکتی ہے۔

دونوں پہلوؤں میں تحقیق ادبیات کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔ تحقیق کی بنیادیں اسی قدر وسیع ہوں گی، جس قدر مطالعہ کیا جائے گا۔

ادبی تحقیق کا مقصود اور منتہا بالآخر "عالمانہ انتقاد" (Scholarly Criticism) ہی ٹھہرتا ہے، جسے معاصر جائزہ (Peer Review) ہی قابلِ قبول بنا سکتا ہے۔ معاصر جائزے کے لیے تحقیقی نتائج کی اشاعت ضروری ہے۔

ہم ادبی تحقیق کی منازل کچھ اس طرح سے مقرر کر سکتے ہیں:

1- بنیادی تحقیق
2- تاریخی، دستاویزی تحقیق
3- سائنٹیفک اور معروضی تحقیق
4 - عالمانہ انتقادی تحقیق

بنیادی تحقیق کا مقصود یہ ہے کہ ادب کے بارے میں پہلے سے موجود علم میں اضافہ ہو سکے اور اس کے نظریات کو سمجھا جا سکے۔ خواہ تعریفات، بیانات اور تجربات کی صورت میں، خواہ اعداد و شمار اور تقابلی مطالعے کے انداز میں۔ اگلی تحقیقات کا انحصار اس کے نتائج پر ہوگا۔ جامعات میں عموماً یہی تحقیق انجام دی جاتی ہے۔

فرضیے کو ثابت کرنا تحقیق کار پر لازم نہیں ہوتا۔ اگر حاصلات بار بار اس کے نتائج کی تائید کریں تو انھیں حقائق قرار دے کر نظریے یا تھیوری میں اضافہ سمجھ لیا جاتا ہے، وگرنہ متبادل فرضیہ یہی عمل انجام دیتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ ایک خاص وقت میں درست پیش گوئی ہو سکے۔ وگرنہ نیا فرضیہ پیدا ہوگا۔ خواہ یہ فرضیہ کسی دستاویز کی حقیقت ثابت کرنے کے لیے ہو یا اصل تاریخ معلوم کرنے کے لیے ہو، مصنف کے بارے میں ہو یا ادب پارے کی ساکھ، عمدگی اور صحت کو تلاش کرنے کے لیے ہو۔

تحقیق اپنے ہر انجام پر بھی نامکمل رہتی ہے اور یوں نئی تحقیق کا عمل شروع ہوتا ہے، خواہ بنیادی تحقیق انجام دی جائے یا ثانوی تحقیق، اور خواہ مقداری تحقیق ہو یا معیاری۔ تاہم عام طور پر معیاری تحقیق استعمال ہوتی

ہے۔اس کا بنیادی مقصد مسائل کی بنیادی معلومات جمع کرنا اور ان کا عملی حل پیش کرنا ہوتا ہے۔اس کے لیے معیارات اور اصول مرتب کیے جاتے ہیں تاکہ آئندہ فریضے بہتر طور پر وضع ہو سکیں۔

ایک زمانہ تھا کہ مغرب میں صرف دانشور اور مفکرین ہوتے تھے، جو استخراجی منطق استعمال کرتے ہوئے اپنے فکر وفلسفہ کی روشنی میں تشریحات کرتے تھے۔یہ فکر کبھی درست اور کبھی غلط ثابت ہوتا تھا۔فرانسس بیکن کے دہرے ماڈل (استخراجی، استقرائی،استخراجی) کے تسلیم ہونے کے بعد ہی جدید تحقیقی اصول آزمائے جانے لگے۔طے ہوا کہ علمی دنیا میں صرف مفکرین کے افکار پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔اگر وہ کوئی نظریہ (تھیوری کی صورت) پیش کریں تو نظریہ ثابت شدہ حقائق پر مبنی ہو اور وہ اس صورت حال کی آئندہ زمانے کے لیے پیش گوئی کر سکے۔پھر بھی ہر تھیوری سو فی صد قابل قبول یا قابل اعتماد نہیں ہوتی۔ہر تھیوری یا نظریے میں کہیں نہ کہیں کوئی الجھن یا رکاوٹ نظر آتی ہے۔بس رکاوٹ یا الجھن کے اسی پہلو سے تحقیقی سوال پیدا ہوتا ہے اور یوں جواب حاصل کرنے کے لیے تحقیقی عمل کا آغاز ہوتا ہے۔جب اس تحقیق کے نتائج دوسرے محققین بھی دہرا سکیں تب کہیں جا کر ان حاصلات کو حقائق (Facts) کا مرتبہ ملتا ہے۔تب مفکر کو سائنسدان یا محقق کا نام ملتا ہے اور وہ نظریے میں ترمیم واضافہ کرتا ہے اور یوں علم کا قافلہ آگے بڑھتا ہے۔اس بنا پر تحقیق کا یہ عمل سائنٹیفک کہلاتا ہے۔یہ بات غلط ہے کہ سائنٹیفک تحقیق صرف سائنسی موضوعات کے لیے محدود ہے۔اگرچہ اس کی ابتدا سائنسی یا طبعی علوم ہی سے آئی تھی۔

ادبی تحقیق میں عام طور پر تاریخی دستاویزات اور شواہد کو پرکھا جاتا ہے۔کبھی کبھار سروے اور بیانیہ انداز استعمال ہوتا ہے اور کہیں کہیں کسی خاص معاملے،نظریے،موضوع یا شخصیت کا مطالعہ احوال کیا جاتا ہے۔چنانچہ ماخذ اور آلات تحقیق اہمیت اختیار کر جاتے ہیں۔

ادب کی ماہیت سمجھنے کے بعد اس کے نتائج کو تسلیم کرانا ضروری ہے اور اس کے لیے اس کے کسی ایک پہلو پر اٹھنے والے سوالات کا جواب تلاش کرنے کے لیے جو تحقیق انجام دی جائے گی،اس کا طریق کار اتنا سائنسی اور معروضی ہو کہ وہ ذاتی یا موضوعی رائے معلوم نہ ہو۔اسی میں تمام طریقے اور طریق کار پوشیدہ ہیں۔اب خواہ تحقیق کسی بھی طریقے یا قسم کے مطابق انجام پائے،اس کا کھلا اور مثبت ہونا ضروری ہے۔یہ الگ بحث ہے کہ یہ سائنسی اصول طبعی تحقیق کے حوالے سے ہوں گے یا سماجی تحقیق کا دائرہ مختلف ہوگا۔کیونکہ اُردو میں ابھی تک ادبی تحقیق کی اپنی ماہیت کا سوال بہت کم اٹھایا گیا ہے اور کوئی تحقیقی نظریہ (Theory) تو کجا ادبی نظریہ بھی قائم کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔یعنی اُردو میں تحقیقی سوال اپنی معروضی حدود میں قائم ہی نہیں کیا جاتا۔

بالآخر عالمانہ انتقاد کا مرحلہ آتا ہے اور تحقیق کار خود کو عالم یا سکالر کے طور پر پیش کرتا ہے۔کوئی نئی توجیہ،نیا نظریہ یا نیا پہلو دریافت کر کے سامنے لاتا ہے۔وہ اپنی تحقیق کسی خاص قرطاسِ تحقیق کی وضع میں پیش کرتا ہے۔وہ ایسا کیوں کر سکتا ہے،ان پہلوؤں کا جاننا ادبی تحقیق میں بنیادی حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔

ادبی تحقیق کو جن نئے مسائل،سوالات اور چیلنجوں سے واسطہ پڑ رہا ہے،ان میں سرفہرست تو اس کا

سائنسی اور معروضی ہوتا ہے اور دوم علمِ زبان (Philology) کی طرف اس کی مراجعت اور ثقافتی یلغاروں کا مطالعہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ نیدر لینڈ کے ہارفیم (Harpham) اور نوننگ (Nunning) نے دوسرے مرحلے کے ان پہلوؤں پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ اس کا لب لباب یہ ہے کہ کوئی بھی ادبی تحقیق محض جمالیات کی حدود سے وسیع تر ہو کر سیاسی، سماجی، ثقافتی اور لسانی پہلوؤں کا احاطہ بھی کرتی ہو تو اسے عالمانہ انتقاد میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ اس بحث کا آغاز استشراق (Orientalism) کے مصنف ایڈورڈ سعید نے اپنی کتاب (2004) **Humanism and Democratic Criticism** میں کیا تھا۔ ان تمام مقاصد کے حصول کے لیے اب قدیم علمِ زبان کی طرف مراجعت ہو رہی ہے۔ اس لیے ادبی تحقیق کار کو علمِ زبان میں گہرے درک کی ضرورت ہے، جو تحقیق کے اصول ومبادی کا گہرا فہم اور ادراک حاصل کرنے کے بعد ہی حاصل ہو سکتا ہے۔

6- تحقیقِ عمل

تحقیقِ عمل چونکہ معروضی اور سائنسی ہوتا ہے، اس لیے یہ ایک خاص طریق کار پر عمل پیرا ہوتا ہے۔ اس کا فلسفیانہ پہلو ہم سے اس عمل کو سمجھنے کا تقاضا کرتا ہے۔

زینا اولیری نے حال ہی میں تحقیق کو اس نقطۂ نظر سے پیش کیا ہے کہ تحقیق ایک سوچ کا فکری شغل (Thinking Game) ہونے کے ساتھ ایک کل ذہنی سرگرمی (Whole-brain Activity) ہے۔ اس کے خیال میں تحقیق کار کو بنیادی طور پر تحقیقی تخلیقیت سے کام لینا ہوتا ہے، جس میں تجزیہ اور فیصلہ ایک مسلسل عمل کی صورت میں ہوتا ہے اور ذہن کو کلی طور پر اس میں مصروفِ عمل رکھنا ہوتا ہے۔

ادبی تحقیق کے حوالے سے تحقیق زبان وادب میں موجود مواد کو از سر نو مرتب کرتی، نئی معلومات کی روشنی میں نئے نظریات وضع کرتی اور نئے نتائج سے زبان وادب کی نئی تاریخ مرتب کرتی ہے۔ اس کا بیشتر مواد ماضی اور تاریخ میں ملتا ہے اور حال پر کام نیز تجربہ بہت کم پایا جاتا ہے۔ گویا زبان وادب کی تحقیق تاریخی اور آثاریاتی زیادہ ہوتی ہے اور جائزہ کاری یا بیانیہ اور تجرباتی کم ہوتی ہے۔ اگرچہ سائنسی طریق کار دونوں کے لیے درکار ہوتا ہے۔

(الف) مُنظّم عمل

تحقیق کا کام نہ تو بے ترتیب طور پر انجام دیا جا سکتا ہے اور نہ یہ کسی واضح منصوبہ بندی کے بغیر وجود میں آ سکتا ہے۔ ایک مخصوص وقت میں انجام دی جانے والی تحقیق کی ایک واضح سمت ہوگی اور اس کے مراحل یا اقدامات متعین ہوں گے۔ یعنی تحقیقی عمل انجام دینے کے لیے کوئی منصوبہ بنایا جائے گا۔ اس منصوبے کا کوئی لائحہ عمل یا ڈیزائن ہوگا اور ڈیزائن میں پیشکش کا کوئی خاکہ اور انداز ہوگا۔ تحقیق انجام دینے سے پہلے تحقیق کار کو یہ علم ہوتا ہے کہ یہ عمل منظم (Organized) اور ترتیب وار ہے۔ اسے اسی ترتیب کے ساتھ اپنا کام انجام دینا ہوگا۔

اس منظم کام کو مقررہ مدت میں مطلوبہ امور کے تحت مکمل کرنے کے طریق کار کو ہم تحقیقی ڈیزائن کہتے ہیں۔

تحقیقی ڈیزائن تحقیقی سوالات کے جواب کا نام بھی ہے یعنی یہ سوال کہ اس تحقیق کا مقصد کیا ہے؟ آغاز کہاں سے ہوگا؟ منزل کیا ہے؟ اس کے راستے میں کون کون سے مرحلے ہیں اور ان مرحلوں پر موزوں ذرائع، درست مشاہدات اور قابلِ اعتماد آلات کون کون سے ہیں؟ یعنی اس سارے کام کا جواز کیا ہے؟ وقعت، صحت، وثوق اور امکان کیا ہے؟ اس میں ذاتی رائے کی عدم مداخلت کے امکانات کیا کیا ہیں؟ یہ کتنی مدت میں مکمل ہوگا اور اس پر کتنے اخراجات ہوں گے؟ نیز یہ بھی کہ اس تحقیق کے واقعی انجام پانے کا امکان کس حد تک ہے؟

اُردو اور پاکستانی زبانوں میں ادبی و لسانی تحقیق انجام دینے کے لیے ایسے ہی منظم طریق کار کی ضرورت ہے۔ اگر تحقیقی مقالہ ایسی تنظیم سے عاری ہو تو وہ بادی النظر ہی میں رد کر دینے کے قابل ہوتا ہے، خواہ اس کے نتائج کتنے ہی معتبر اور بہتر ہوں۔ مابعد اثباتیت کا فلسفہ بھی تنظیم پر یقین رکھتا ہے۔ اسی سے تحقیقی ساکھ اور معتبری پیدا ہوتی ہے۔ تاہم اثباتیت جہاں فرضیوں کی تعمیم (Generalization) کی بات کرتی ہے وہاں مابعد اثباتیت امکانات (Possibilities) کا تنقیدی جائزہ بھی لیتی ہے۔

گویا ہر دو صورتوں میں تحقیق ایک منظم طریق کار ہی کا نام ہوگا۔

(ب) معروضی عمل

تحقیق نہایت غیر جانبداری سے انجام دیا جانے والا عمل ہے جس میں ذاتی رائے اور پسند و ناپسند کو دخل حاصل نہیں۔ اسلام میں اسے "عدل" اور تکنیک میں اسے "معروضیت" (Objectivity) کا نام دیا گیا ہے۔

تجرباتی اور آلاتی تحقیق میں معروضیت یا غیر جانبداری بآسانی سمجھ میں آجاتی ہے لیکن دستاویزی تحقیق میں معروضیت کی تلاش اور اطلاق بہت مشکل کام ہوتا ہے۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ ادبی فن پارے کا حسن یا زبان دان اور ادیب کی سماجی حیثیت، رجحانات اور حدود ان نازک سی معنوی تعبیرات (Connotations) میں موجود ہوتے ہیں جنھیں معروضی گرفت میں لانا دشوار ہوتا ہے۔ فنی کیفیات کا تجزیہ کرنا آسان کام نہیں ہوتا۔ محض تنقیدی اصول یا ادبی نظریے برت کر جو اکثر خود بھی معروضی نہیں ہوتے، معروضی نتائج نکالنا مشکل کام ہوتا ہے۔ معروضیت میں کوائف یا معلومات کا درست ہونا صحت کہلاتا ہے۔ کوائف اپنے متن، معیار، عصر، تصورات وغیرہ کے لحاظ سے جائز اور موزوں ہوں تو اسے وقعت کہا جاتا ہے اور کوائف اپنے نتائج کے لحاظ سے بار بار ایک سے ہوں تو اسے وثوق کہا جاتا ہے۔

جدید تحقیق میں معروضیت کا ایک ہی مفہوم ہے کہ اگر کوئی دوسرا شخص یہی تحقیق انجام دے تو اس کے نتائج بھی وہی نکلیں جو پہلے شخص نے برآمد کیے ہیں۔ لسانی اور ادبی تحقیق میں بعض ایسے متبدل یا تبدیل ہونے والے عناصر ایسے متغیرات (Variables) ہوتے ہیں جو تحقیقی نتائج پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ وثوق کی منزل تک پہنچنے کے لیے ان متغیرات پر قابو پانا بہت ضروری ہوتا ہے۔ تاریخی یا دستاویزی تحقیق میں ایک بڑا

متغیرہ "وقت" یا "زمانہ" (Time) ہے جس کی تحدید (Delimitation) عموماً نہیں ہو پاتی۔ یعنی اس متغیرے کے اثرات اور امکانات پر قابو نہیں پایا جا سکتا۔

ایک منظم تحقیق میں مسئلے کی نشاندہی، کوائف کی جمع آوری، تجزیے اور نتائج کی تالیف کا طریق کار پہلے سے طے شدہ اور واضح ہوتا ہے۔ اس کی تنظیم یوں بیان کی جا سکتی ہے:

1- تحقیق کا مرکز کوئی مسئلہ ہوتا ہے۔
2- اس میں کوئی نئی بات سامنے آتی ہے۔
3- اس میں کھلے ذہن سے بات کی جاتی ہے۔
4- اس کا انحصار اس مفروضے پر ہے کہ دنیا کو جانا جا سکتا ہے۔
5- اس میں تصورات کو واضح کیا جاتا ہے۔
6- اس میں علت و معلول یعنی سبب اور نتیجے کا رشتہ یا تعلق تلاش کیا جاتا ہے۔
7- اس میں پیمانے استعمال کیے جاتے ہیں۔
8- اسے محض عبوری نتیجے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

جدید سائنسی تحقیق میں تو معروضیت کے پیمانے مقرر کیے جا چکے ہیں، چنانچہ وہاں، تحقیقی ڈیزائن اور پیشکش کے خاکے طے شدہ ہیں۔ ادبی و لسانی تحقیق میں معروضیت قائم کرنے کے لیے ہر قدم پر "عدل" کی شرط کو ملحوظ رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ خاص طور پر جب پیمائشی رائے مقداری انداز میں دی جا رہی ہو تو نہ صرف یہ کہ ذاتی تعصب، پسند و ناپسند اس میں شامل نہ ہو بلکہ مقداری پیمانے اور سکیل مقرر کر لیے جائیں نیز اپنی ان اصطلاحوں کے مفاہیم متعین کر کے پہلے سے بیان کر دیے جائیں، جن میں کوئی رائے دی جا رہی ہو۔ معروضیت کے بغیر کوئی تحقیق تحقیق نہیں کہلا سکتی۔ جواز کاری یا وقعت، اعتبار، اعتماد، موزونیت، وثوق، صحت، پیمانے یہ سب الفاظ معروضیت کے نکات قرار پاتے ہیں۔ معروضیت نے تحقیق کی دنیا میں کچھ پیمانے بنا رکھے ہیں مثلاً جب تک:

1- کوئی مسئلہ پیدا نہ ہو، تحقیق نہیں ہو سکتی۔
2- اس مسئلے کا حل نظر نہ آ رہا ہو، تحقیق نہیں ہو سکتی۔
3- یہ ممکنہ حل فرضیوں کے طور پر جانچے نہ جائیں، تحقیق نہیں ہو سکتی۔
4- تحقیقی نتائج بار بار کی تحقیق سے ایک جیسے نہ آئیں تحقیق مکمل نہیں ہو سکتی۔
5- یہ نتائج صحت، وقعت اور وثوق کے لحاظ سے معتبر نہ ہوں، تحقیق قبول نہیں ہو سکتی۔

اُصولِ تحقیق کا اپنا بھی ایک تنقیدی پہلو ہے جس سے اس کی اصلاح ہوتی رہتی ہے۔ یہ خود بھی تنقیدی اُصول ظاہر کرتے ہیں کہ تحقیق کار کو کوئی شے گمراہ نہیں کر سکتی اور نہ ہی وہ کوائف اور معلومات کو مسخ کرتا ہے بلکہ اس کے طریقوں اور نتائج کی پڑتال ہر کوئی کر سکتا ہے اور انھیں ہر وقت چیلنج کر سکتا ہے۔ یہ خصوصیت اس کی اسی معروضیت کی بناء پر پیدا ہوتی ہے۔

اُردو اور پاکستانی زبانوں میں موجود ادبی ولسانی مقالات کی ایک بڑی خامی ان کی عدم معروضیت ہے۔ یعنی وثوق، وقعت، موزونیت اور صحت کے حوالے سے کسی مخصوص ڈیزائن کی پیروی نہ کرنا بڑے سے بڑے تحقیقی کاموں کو پایۂ استناد سے گرا دیتا ہے۔

(ج) مُدلّل عمل

تحقیق میں ہر قسم کی معلومات کے کوائف کو یوں ہی شامل کر کے پیش نہیں کر دیا جاتا۔ انھیں منطقی (Logical) دلائل کی روشنی میں پرکھا جاتا ہے جیسا کہ مسلمانوں کی سماجی تاریخ میں موجود تحقیقی کام اسلامی طریقوں : روایت، درایت، جرح وتعدیل وغیرہ کے حوالے سے انجام پاتا رہا ہے یا پھر کسی سند کو صداقت اور عدل کے پیمانوں پر ناپ کر لیا جاتا ہے۔ سند (Authority) پہلا قدم ہے جسے مدلّل (Rational) ہونا چاہیے۔ یاد رہے کہ سند بھی زیرِ انتقاد وتبصرہ ہوتی ہے، اس لیے سند استعمال کرنے سے پہلے ہمیں دیکھ لینا چاہیے کہ:

1- سند خواہ کسی ماہر مضمون کی ہو، اس میں غلطی یا چوک کا امکان موجود ہوتا ہے۔
2- سند محض روایات پر مبنی نہ ہو، روایات غلط بھی ہو سکتی ہیں۔
3- سند صرف اس لیے درست نہیں کہ اسے ہر آدمی جانتا ہے کیونکہ عمومیت بے معنی شے ہے۔
4- سند صرف اس لیے درست نہیں کہ یہ تسلیم شدہ ہے۔ صدیوں کے کئی مسلمات غلط ثابت ہوئے۔
5- کسی کے اعتقاد، مذہب وغیرہ کو بطور سند استعمال نہیں کیا جا سکتا۔
6- ماہر سے ماہر فرد کی رائے بھی غیر مشروط طور پر تسلیم نہیں ہو سکتی۔
7- حوالہ جاتی کتب کی سند بھی حتمی نہیں ہوتی۔
8- بلا استدلال کوئی سند تسلیم نہیں کی جا سکتی۔
9- غیر عقلی بات بطور سند تسلیم نہیں کی جا سکتی۔
10- اپنا خیال اور وجدان بطور سند شامل نہیں کر سکتے۔
11- فہم عامہ یا عقلِ سلیم تحقیقی آلات نہیں ہیں کیونکہ وہ محدود ہوتے ہیں۔
12- محض کسی کا حوالہ دینا سند نہیں ٹھہر سکتا۔

منطقی استدلال دوسرا مرحلہ ہے جس میں اپنے فرضیے کے حق میں موجود شواہد کے علاوہ اس کے مخالف شواہد کو بھی تحقیق میں شامل کیا جاتا ہے۔ اس طرح تحقیق ایک دہرا عمل قرار پاتی ہے جو اپنے موضوع کے خلاف بھی جا سکتی ہے۔

استخراجی طریقہ کسی اہم اور معروف امر سے کسی نئے امر کے بارے میں نتیجہ نکالنا اور استقرائی طریقہ بہت سے عوامل سے نتائج اخذ کرنے کا عمومی اصول ہے۔ تحقیقی بنیادوں میں ان دونوں طریقوں کو دخل حاصل ہے۔

جب ہم فرضیے (Hypotheses) منتخب کرتے ہیں تو استخراج سے کام لیتے ہیں اور جب ان کی صداقت معلوم کرتے ہیں تو استقرائی طریقے پر عمل کرتے ہیں۔ اس کے باوجود کہ ہم زیادہ سے زیادہ شواہد (حق اور مخالفت میں) جمع کرتے ہیں، ہم اپنے تحقیقی نتائج کو حتمی قرار نہیں دیتے بلکہ اپنی حدود کار دوسروں کے سامنے رکھ

دیتے ہیں تاکہ وہ دیکھ سکیں کہ ان حدود کے اندر ہم کس دلیل کے ساتھ کیا بیان کر رہے ہیں۔ چونکہ کوئی استخراج اور استقراء ہمیشہ درست نہیں ہوتا اور ہم تمام مثالوں تک سو فی صد پہنچ کر نتیجہ اخذ نہیں کر سکتے، اس لیے ایک نمونہ جاتی طریقہ استعمال کیا جاتا ہے۔ چونکہ منطق جلد بازی سے عمومیت یعنی عمومی اصول وضع کرنے کی کوشش کرتی ہے، اس لیے تحقیق اس تعمیم (Generalization) کو بھی پرکھتی ہے۔ پھر اپنے نتائج کو بھی محض عبوری (Tentative) قرار دیتی ہے، حتمی نہیں۔ یعنی تحقیق میں دعویٰ (Thesis) تو کیا جاتا ہے، ادعا (Dogma) نہیں۔

تحقیق کے مدلل بیان میں ضروری ہے کہ پیشکش واضح اور منطقی ربط کے ساتھ کی گئی ہو۔ خطابات، صفات، تشبیہ، استعارے اور مجازی زبان استعمال نہ کی جائے۔ بات سیدھے سادے انداز میں بیان ہو۔ مثبت جملے اختیار کیے جائیں۔ یاد رہے کہ دعویٰ اور ادعا میں ایک بنیادی فرق ہے کہ دعویٰ متعدی اور ادعا لازم ہوتا ہے۔ یعنی دعویٰ نتائج کو دوسروں تک منتقل کر کے بھی معروضی طور پر وہی ماحصل دکھاتا ہے جو تحقیق کار چاہتا ہے اور ادعا صرف تحقیق کار کی اپنی ذاتی اور موضوعی رائے یا ذاتی علم کی بنا پر قائم کردہ رائے ہوتا ہے۔ تحقیق کار کو دعوے اور اسناد، حوالے وغیرہ تو پیش کرنے ہوں گے کہ انھیں پرکھا جا سکے لیکن کسی قسم کے حتمی ادعا سے گریز کرنا چاہیے۔

(د) کُلّی عمل

تحقیق ایک جزوی، یک طرفہ یا محض تجزیاتی نہیں بلکہ ایک کُلّی (Holistic) عمل ہے۔ اثباتیت میں دنیا اور اس کی فطرت کو حیاتی بنیادوں پر سمجھنے کی کوشش کی گئی جبکہ مابعد اثباتیت میں دنیا کی کثیر حقیقتی (Multifactual) بنیادوں کو سامنے لایا گیا ہے۔ چنانچہ حیاتی کے بجائے اسے کُلّی اور وجدانی ٹھہرایا گیا۔ اس لیے تحقیق کار جہاں اثباتیت میں معروضی ہوتا ہے، مابعد اثباتیت کے نقطۂ نظر سے موضوعی بھی ہوتا ہے۔ اس کا طریق کار استخراجی فرضیوں سے نکل کر استقرائی دریافتوں تک چلا آتا ہے۔ یوں مقداری تحقیق معیاری تحقیق میں بدلنے لگتی ہے۔ گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ آج کی تحقیق ان ہر دو فلسفوں کے امکانات کو سامنے رکھتی ہوئی کُلّی طریق کار استعمال کرتی ہے۔ یہ روش ادبی تحقیق میں ہمارے زیادہ کام آتی ہے۔ ادبی تحقیق کی چوحدی، دائرۂ عمل یا نقطۂ نظر (Paradigm) اسی سے تشکیل پاتا ہے۔ ادبی دائرۂ کار تو بہت وسیع ہو سکتا ہے مگر تحقیق کا دائرۂ عمل اس کے ڈیزائن پر منحصر ہوتا ہے۔

7- عالمانہ انتقاد

(Scholarly Criticism)

ادبی تحقیق کی سب سے اعلیٰ منزل عالمانہ انتقاد ہے۔ اس اصطلاح کو علم تنقید کے مغالطے میں نہ لیا جائے۔ یہ علمیت (Scholarships) کی تنقیدی بصیرت (Vision) کا دوسرا نام ہے۔ یہ ایسے اصولوں اور اطلاقات کے طریقے استعمال کرنے کا عمل ہے، جس سے محقق کا نظریہ دنیا میں قابلِ قبول ٹھہرے۔ دوسرے اسے تسلیم کریں اور قابلِ تقلید ٹھہرائیں۔ گویا سکالر ایسی معروضی، بے لاگ اور غیر

جانبدارانہ تحقیق انجام دیتا ہے اور اپنی تعقلی بصیرت سے ایسے نتائج اخذ کرتا ہے جو بادی النظر میں بہت مشکل نظر آتے ہیں یا جس طرف دیگر اہلِ علم کی توجہ نہیں گئی ہوتی۔ آرٹ، موسیقی، ادب، مذہب، فلسفہ اور ثقافت کے مطالعے کی منزل یہی عالمانہ انتقاد ہے۔

دورِ جدید میں ایسے سکالر یا عالم کے لیے انگریزی میں گُرو (Guru) کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے، جو اپنی عالمانہ بصیرت کی بنا پر قابلِ قدر ہوتا ہے۔ یہ گُرو مقتدی نہیں پیشوا ہوتے ہیں۔ ادب میں ایسے مؤرخ اور نقاد، نظریہ ساز اور محقق نظر آتے ہیں جو گُرو کا مقام پاتے ہیں۔ اگرچہ ان کا آغاز یونیورسٹیوں اور تحقیقی اداروں میں ملازمت کرنے سے ہوتا ہے لیکن بالآخر وہ "آزاد" حیثیت سے مانے جاتے ہیں، جیسے جان تے ادبی نظریے کے گُرو ہیں۔

عالمانہ انتقاد کی بنیاد "فرضیہ سازی" (Hypothesis Making) سے ہوتی ہے کہ نظریہ سازی کی یہ پہلی سیڑھی ہے۔ دوسرا مرحلہ کوائف کے مآخذ اور جمع آوری کا ہے۔ گُرو بہت احتیاط کے ساتھ مآخذ کا جائزہ لیتا اور تجزیہ کرتا ہے۔ اسے اپنی تکنیک پر ناز ہوتا ہے جو بے حد سائنٹیفک اور معروضی ہوتی ہے اور جس پر کوئی انگلی نہ اٹھا سکے۔ نتائج شائع کرنے سے پہلے وہ خود انھیں تشکیک کی نگاہ سے دیکھتا اور درستی کرتا ہے۔

عالمانہ انتقاد کے نتائج مقالے کی صورت میں اس لیے شائع ہوتے ہیں کہ اس میدان کے دیگر علما / گُروان کا جائزہ لے سکیں۔ چنانچہ یہ مخصوص تحقیقی جرائد ہی میں طبع ہوتے ہیں، عام اخبارات اور رسالوں میں شائع نہیں کیے جاسکتے۔ کیونکہ اس اشاعت کا مقصد شہرت نہیں تحقیق کا اثبات ہوتا ہے۔ قاری نے یہ مقالہ پڑھ کر لطف اٹھانا نہیں ہوتا بلکہ علم میں تحقیق کار کے کیے گئے اضافے کو دیکھنا ہوتا ہے۔

یہ مقصد تبھی حاصل ہوتا ہے جب تحقیق کار یا مقالہ نگار کو اپنے مقالے کے ردِعمل میں معاصر جائزہ (Pear Review) حاصل ہو۔ چنانچہ مقالہ ایک مخصوص علمی ہیئت اور اسلوب میں پیش کیا جاتا ہے جو اس تحقیقی جریدے کی طرف سے متعین ہوتا ہے جس میں مقالہ اشاعت کے لیے قبول کیا جاتا ہے۔ اس موضوع پر تکنیک کے حوالے سے ہیٹ سن نے بہت عمدہ کتاب The Scholar Critic کے نام سے تحریر کی ہے جو قابلِ توجہ ہے۔ اس کے لحاظ سے تحقیق کار کو سکالر کی حیثیت اختیار کرنے کے لیے اپنی تکنیک اور طریقوں میں بے حد احتیاط اور معروضیت کی ضرورت ہوتی ہے جو سائنٹیفک طریقے کو اپنائے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی۔ محض اپنی بات کہہ دینا کافی نہیں ہوتا اور نہ تحقیق کار اور مقالہ نگار پیغمبر کا درجہ رکھتا ہے، جس کی کہی یا لکھی ہوئی بات بلاچون و چرا قابلِ تسلیم ہو۔ انھی معروضی نکات یا تحقیقی اُسلوب کی روشنی ہی میں اس کے عالمانہ انتقاد کو پرکھا جاسکتا ہے۔ معاصر جائزہ ہی ادبی تحقیق کو قابلِ قبول بناسکتا ہے۔ اس کے لیے تحقیقی نتائج کا شائع ہونا اور معاصرانہ آرا موصول ہونا ضروری ہوتا ہے۔

متنی تدوین (Textual Criticism) یا مخطوطہ شناسی کے حوالے سے یہ علم اب متنی علمیت (Textual Scholarship) کہلاتا ہے۔ جس کی بنیاد 1994ء میں ڈیوڈ گریتھم (Greetham) نے رکھی تھی۔ اس کا دائرہ کار متن کے ماخذ، ارتقا، استناد سے لے کر مخطوطہ شناسی نسخہ شناسی،

تجزیاتی وتوضیحی کتابیات سازی، متنی تنقید، عالمانہ تدوین اور تاریخ کتاب تک وسیع ہے۔ اس کا مقصود یا مطمح نظر مصنف، تدوین، نقل نویسی، طباعت اور اشاعت کے شواہد کا حصول ہے تاکہ سند اور مقصدِ تصنیف معلوم ہو سکے۔

متنی علمیت کے ذیلی علوم میں عالمانہ تدوین کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ جس میں متن کی تدوین کے ساتھ اس کا عالمانہ تعارف، تدوین میں استعمال کیے گئے اصولوں اور لائی گئی تبدیلیوں کا جواز بھی بیان کیا گیا ہو۔ متن کے ساتھ متعارف کرایا گیا ہو۔ اس کی قدر و قیمت بیان ہوئی ہو اور ہر بیان پر ناقدانہ نظر دوڑائی گئی ہو یعنی توضیحی اور تشریحی تدوین کی گئی ہو۔ اہم الفاظ اور اصطلاحات کے معنی بھی واضح کیے گئے ہوں۔ اہم معلومات نجی خطوط، ڈائریوں اور یادداشتوں، رجسٹروں وغیرہ سے حاصل کی گئی ہوں اور تمام ممکنہ اغلاط کا محاکمہ کیا گیا ہو۔

عالمانہ انتقاد یا متنی علمیت اس سارے عمل میں تفکر و تفحص کو شامل کرتی ہے، جو ان اصولی کتابوں کے ذریعے فہم میں نہیں آ سکتا۔ یہ ایک سائنس ہے اور آرٹ کے دلدادہ بھی اس سائنسی رویے کے بغیر علمیت کی اعلیٰ سطح تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس لحاظ سے اُردو میں ابھی تک اعلیٰ متنی تنقید کا کوئی شاہکار وجود میں نہیں آ سکا۔ اس پہلو سے بھی اُردو اور پاکستانی زبانوں میں متنی تدوین عالمی سطح تک نہیں پہنچ پائی۔ یہ سائنس متن کی اغلاط اور ان کی تصحیح سے متعلق ہے لیکن یہیں پر تعبیر اور سیاق وسباق کے گہرے ادراک کی منزل آتی ہے۔ استدلال اور عقلِ سلیم اس کے ہتھیار ہیں۔ یہ طبعی علم کی طرح کی سائنس نہیں ہے۔ یہ سطور اور حروف کی سائنس ہے، جس میں معنی کسی سیال کی مانند ہوتے ہیں۔ علمی بصیرت انھی میں غوطہ زن ہو کر معانی تلاش کرتی ہے۔ اسے ہنر کہا جا سکتا ہے۔ کسی مُحرّر کا ہنر۔ یہ ہنر علمیت کی عادت سے وجود میں آتا ہے۔ چنانچہ ادبی تحقیق زندگی بھر کی عادت بن جائے تو عالمانہ شان پیدا ہو سکتی ہے۔ کوئی شخص نقاد یا عالم پیدا نہیں ہوتا۔ یہ سب کچھ اُسے سیکھنے اور مسلسل مشق سے حاصل ہوتا ہے۔ اس لیے ہر شخص ادبی مُحرّر نہیں بن سکتا جبکہ ہر ذہین شخص ایسا بننے کے لیے کوشش کر سکتا ہے۔

دوسرا باب

تحقیق کے مراحل

ہر تحقیق اپنی خاصیتوں کی بنا پر پہچانی جاتی ہے۔ظاہر ہے کہ یہ خاصیتیں کسی حدود (Limits)، حیطۂ کار، چوحدی یا تحقیقی نقطۂ نظر (Paradigm)، نظریہ (Theory) کے اندر اور دوبارہ حد بندی یا تحدید (Delimitation) کی پابند ہوگی۔اسی بناء پر تحقیق معروضی (Objective) کہلائے گی۔

1- حدودِ تحقیق

تحقیق بنیادی طور پر سائنسی (Scientific) اور معروضی ہوتی ہے۔اس کا مطلب یہ نہیں کہ تحقیق صرف سائنس میں ہو سکتی ہے۔اس لحاظ سے تحقیق کی چند اہم خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں:

1- تحقیق بامقصد ہے اور اس کا مقصود کسی مسئلے کو حل کرنا ہے۔

2- تحقیق کی بنیاد مشاہدے اور تجربے پر ہے۔کوئی وقوعہ جو قابلِ مشاہدہ یا پیمائش نہ ہو اس پر تحقیق نہیں ہو سکتی۔

3- تحقیق منطقی ہے۔یہ منطقی دلائل اور تنقید سے پورے طور پر کام لے کر آخری نتائج یا حل پیش کرتی ہے۔

4- تحقیق کا تعلق عام اصولوں، قاعدوں اور نظاموں سے ہے اور انفرادی معاملات کو وہ صرف ان اصولوں اور قاعدوں کی ایک ذیلی شاخ سمجھتی ہے۔

5- تحقیقی نتائج قابلِ تکرار ہوتے ہیں۔اگر ایک شخص نے کوئی مشاہدہ یا تجربہ کر کے کچھ نتائج حاصل کیے ہیں تو دوسرے بھی اسی طریقِ کار کو آزما کر دیکھ سکتے ہیں کہ وہ بھی انھی نتائج پر پہنچتے ہیں یا نہیں۔بالفاظ دیگر یہ ایک معاشرتی سرگرمی ہے، جسے اکثر لوگ انجام دیتے ہیں۔

6- تحقیق ایک خود اصلاحی عملیہ ہے اور غالباً یہ خصوصیت انسان کی دوسری سرگرمیوں سے منفرد ہے۔ یعنی یہ ہر آن اپنی اصلاح اور ترقی میں مصروف رہتی ہے اور نتائج تسلیم کرانے اور اپنے جہل پر اصرار نہیں کرتی۔

تحقیق بنیادی طور پر سائنسی طریقِ کار کی مرہونِ منت ہے۔سائنسی طریقے سے کی گئی تحقیق کا نتیجہ

چند دنوں میں حاصل نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے لیے برسوں کاوشیں کرنا پڑتی ہیں۔

سائنسی طریق کار کی بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں، مثلاً:

کوہن (Cohen) اور نیگل (Neigal) نے سائنسی طریق کار کو منطق کا مسلسل استعمال قرار دیا ہے جو تمام علم الاسباب کا عام خاصہ ہے۔

برٹرینڈ رسل کے مطابق فطرت میں باقاعدگی معلوم کرنے اور اس کی درجہ بندی کرنے کے طریقے کو سائنسی طریق کار کہتے ہیں۔ انسانی زندگی کے اردگرد رونما ہونے وا واقعات ایک قدرتی نظام کے تحت ہیں۔

2- خواص

(الف) وقعت (Validity)

تحقیق ہر لحاظ سے قابلِ جواز یا وقیع ہو۔ سائنسی تحقیق کی زبان میں کہا جا سکتا ہے کہ کسی فرضیے کو جب ماہرین کی رائے یا معاصر جائزے (Peer Review) کے لیے شائع کیا جاتا ہے تو ماہرین اس فرضیے پر اپنے اپنے تجربات مشاہدہ و مطالعہ کرتے ہیں۔ اگر ان تحقیقات کے نتائج ایک جیسے ہوں تو ماہرین کا اتفاق ہو جاتا ہے۔ کسی تحقیق پر ماہرین کے اس اتفاق کو اجماع کا نام دیا جاتا ہے۔ جنھیں حقائق (Facts) یا قوانین (Laws) کہتے ہیں۔ نتائج میں اتفاقِ رائے کی صورت میں تحقیق کی مزید تصدیق ہو جاتی ہے اور نتائج کو درست تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ اس سے نظریہ (Theory) وضع ہوتا ہے یا سابقہ نظریے میں ترمیم و اضافہ ہوتا ہے۔ تاہم یہ ضروری نہیں کہ ہر تحقیق کے نتائج پر ماہرین کا اتفاق ہو۔ یہ نتائج تعمیم (Generalization) کی صورت میں جواز پاتے ہیں۔ اسے اکثریتی جمہوری فیصلہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ بہر صورت تعمیم کا اہم مقصد تحقیق کے نتائج کی وسیع پیمانے پر تصدیق ہے۔ اس تصدیق سے تحقیقی نتائج جائز قرار پاتے ہیں۔ ادبی تحقیق کو بھی با جواز یا وقیع (valid) ہونا چاہیے۔ یعنی اس کے نتائج کہیں بھی آزمائے جا سکیں، ثابت کیے جا سکیں، تلاش کیے جا سکیں اور ان کی بنیاد پر ادبی نظریہ اور نکاتِ نقد و نظر پیش کیے جا سکیں۔ بصورت دیگر تحقیق کار کی تمام تر کاوش موضوعی (Subjective) اور ذاتی ہی قرار پائے گی۔ یوں اس کی تحقیق کا جواز اور اہمیت اپنی حیثیت کھو بیٹھے گی۔ حاصلات، نتائج، استنتاج یا محاکمہ کی وقعت (Validity) سب سے اہم مسئلہ ہے۔ کسی بھی تحقیقی مقالے کے نتائج پر اعتماد اور وثوق ہی اس کی اہمیت کو اجاگر کرنے کا سبب بنتا ہے۔ وقعت کی چار اقسام ہوتی ہیں۔

1- داخلی وقعت (Internal Validity)

2- تشکیلی وقعت (Construct Validity)

3- خارجی وقعت (External Validity)

4- استنتاجی وقعت (Conclustion Validity)

ہمیں ان میں سے آخری وقعت پر غور کرنا ہے:

"استنتاجی وقعت اس درجے کا نام ہے، جس پر ہمارے نتائج ہمارے کوائف کی نسبت سے معقول ٹھہرتے ہیں"۔

دوسرے الفاظ میں ہمارے حاصلات اور نتائج کو ہمارے تحقیقی کوائف ہی سے برآمد ہونا چاہیے۔ ہماری ذاتی خواہش اور شعوری کوشش کو اس میں دخل نہیں ہونا چاہیے۔ کوائف اور نتائج کا یہ تعلق مثبت ہونا چاہیے۔ نتائج کی وقعت جاننے کا آغاز بیانیہ اور شماریاتی تحقیق سے ہوا تھا مگر یہ معیاری اور دستاویزی یا تاریخی تحقیق کے لیے بھی اتنی ہی اہم ہے۔ اگرچہ اس میں نتائج محض اثراتی اور محسوساتی ہوتے ہیں لیکن ان کی معقولیت اور منطقی استدلالیت پر بھی غور کرنا چاہیے کہ کیا واقعی ہمارے کوائف سے وہی نتائج برآمد ہوتے ہیں، جو ہونے چاہئیں تھے۔ چنانچہ علت و معلول (Cause and Effect) کے تعلق کو ہر نتیجہ نکالنے میں ملحوظ رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اسے داخلی وقعت کہتے ہیں، اسی کی روشنی میں یہ آخری وقعت معتبر اور واثق ہوگی۔

(ب) وثوق (Reliability)

ادبی تحقیق کو ہر لحاظ سے معتبر اور واثق ہونا چاہیے۔ کسی فرضیے پر صرف ایک بار تحقیق کے نتائج کو ہم کسی صورت میں آخری اور حتمی قرار نہیں دے سکتے۔ اس کے علاوہ اس کی صحت بھی مشکوک رہتی ہے لیکن جب ایک ہی فرضیے کو مختلف جگہوں پر مختلف لوگ آزماتے ہیں اور نتائج میں یکسانیت پاتے ہیں تو ان نتائج میں وثوق یا اعتمادیت آجاتی ہے۔ ہم یہ دعویٰ مکمل اعتماد سے کر سکتے ہیں کہ فرضیہ بالکل درست ہے اور اس کے نتائج کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ سائنسی تحقیق میں اس معتبری کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ کوئی بھی فرضیہ وثوق حاصل کرنے کے بعد نظریہ بن جاتا ہے، جیسے معاصر ادبی نظریہ۔ اگر نظریہ زمان و مکان کے لحاظ سے درست ثابت ہو جائے تو قانون بن جاتا ہے جیسے کششِ ثقل کا قانون، لیکن ہر نظریہ قانون نہیں بن سکتا۔

ادبی و لسانی تحقیق میں عام طور پر تنقیدی ادعا (Dogma) سے کام لیا جاتا ہے لیکن تحقیق وثوق تک پہنچنے کے لیے بہت محنت اور کارگزاری درکار ہوتی ہے، جس کی طرف ادبی تحقیق کو بھی قدم اٹھانا ہے۔ کوئی بھی ادبی تحقیق صرف اس وقت قابلِ قبول ہوگی جب اسے شائع کر کے معاصر جائزے کے لیے پیش کیا جائے گا اور دیگر اہلِ علم اس کی توثیق کر دیں گے۔ یہی تحقیق کا اعتبار ہے۔ اس منزل تک پہنچنے کے لیے تحقیق کار کو سکالرشپ یا عالمانہ انتقادی بصیرت تک پہنچنا ہوتا ہے۔

(ج) صحت (Accuracy) اور پیمائش (Measurement)

فرضیہ عام طور پر متغیرات کا آپس میں تعلق ظاہر کرتا ہے اور تحقیق میں اسی تعلق کو درست یا غلط ثابت کرنا ہمارا اوّلین مقصد ہوتا ہے۔ متغیرات دو قسم کے ہوتے ہیں جنھیں وصفی متغیرہ اور مقداری متغیرہ کہا جاتا ہے۔ وصفی متغیرہ کسی چیز کی کیفیت یا صفت کو ظاہر کرتا ہے مثلاً خوبصورتی، اچھائی، ذہانت وغیرہ۔ ادبی تنقید اور تحقیق میں یہ متغیرہ عام طور پر موجود ہوتا ہے۔ اس متغیرے کو صحت اور پیمائش کے ساتھ پیش کرنا تحقیق کی اہم

خاصیت ہے۔

مقداری متغیرہ کسی چیز یا واقعے کی مقدار کو ظاہر کرتا ہے، مثلاً طلبہ کے کسی مضمون میں حاصل کردہ نمبر، یونیورسٹی میں مطالعے کے عادی طلبہ کی تعداد، وغیرہ۔ وصفی نوعیت کے متغیرے یا واقعات کی پیمائش میں محققین کو دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ انھیں مروجہ پیمانوں کی مدد سے ناپا تولا جانا اور ان سے کسی نتیجے پر پہنچنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ ماہرین ایسے وصفی نوعیت کے واقعات کو مقداری متغیرات میں تبدیل کر کے نتائج اخذ کرتے ہیں۔ اس قسم کے اعداد و شمار کو شماریاتی مواد کہا جاتا ہے۔ اس مواد پر تحقیق کے طریقے استعمال کیے جاتے ہیں اور نتائج حاصل کیے جاتے ہیں۔ لسانی تحقیق میں شماریات کی مدد بھی درکار ہوتی ہے۔

(د) ساکھ یا عمدگی (Credibility)

اگر تحقیق کو نئے علم کی تخلیق کا ذریعہ کہا جاتا ہے تو اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ اس کی نوعیت کس قدر ساکھ اور عمدگی رکھتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں تحقیق کو اس قابل ہونا چاہیے کہ وہ بعض مسلمات اور عقائد کو رد کر سکے۔ تحقیقی دنیا سے باہر "ساکھ" کا مطلب ہے: "قابلِ یقین، قابلِ قبول، ممکن، حقیقی اور مسلّمہ ہونا"۔ تحقیق کی دنیا میں ساکھ کے اختصاصی مطالب متعین ہوتے ہیں جن کا ابھی ہم ذکر کر چکے ہیں مثلاً عمومیت، وقعت، معتبری، وثوق، صحت، استناد، غیر جانبداری وغیرہ۔ عمدہ تحقیق وہی تحقیق کہلائے گی جو ان معیارات پر پوری اترتی ہو۔ ہم اسے کسی بھی فلسفہ (اثباتیت یا مابعد اثباتیت) کے نقطۂ نظر سے دیکھیں، یہ اپنا اعتبار اور ساکھ ہم پر قائم کرے۔

3- تحقیقی اقدامات

تحقیق میں سائنسی طریق کار استعمال کیے بغیر اسے علم نہیں کہا جا سکتا اور اس کے بغیر کوئی تحقیق پایۂ وثوق و اعتبار تک نہیں پہنچ سکتی۔ موجودہ دور کے علوم، خواہ ان کا تعلق طبعی سائنس سے ہو یا معاشرتی سائنس سے، سب سائنسی طریقہ استعمال کرتے ہیں۔ عمومی سائنس کے برعکس معاشرتی علوم میں تحقیق تجربہ گاہ کی مرہونِ منت نہیں ہوتی بلکہ تحقیق معاشرے کے ان افراد یا دستاویزات پر کی جاتی ہے جن میں زیرِ مطالعہ مسئلہ موجود ہوتا ہے۔

یہی صورت ادبی تحقیق کی ہے کہ سائنسی طریق کار استعمال کیے بغیر اسے قابلِ قبول نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ انسان نے تقریباً سترھویں صدی عیسوی سے حصولِ علم کے ایک نئے طریق کو ترقی دی جس نے موجودہ سائنسی تحریک کو جنم دیا۔ اگرچہ علمی تحقیق کے لیے ابوالبرکات البغدادی نے کتاب المعتبر میں اور تجرباتی طریقوں کے لیے ابن الہیثم نے سائنسی طریق کار متعین کر دیا تھا لیکن اس کے جدید دور کی باقاعدہ بنیاد فرانسس بیکن نے رکھی، جب کہ اس نے محض استخراجی طریقے سے نتائج نکالنے پر تنقید کی۔ اس نئے طریق کار سے مسلّمہ مقدمات کی بنیاد پر نتائج نکالے جاتے ہیں۔ بیکن نے کہا کہ مشاہدے میں آئے ہوئے حقائق بنیاد پر عام نتائج نکالے جائیں۔ نیوٹن، گلیلیو اور ان کے بعد میں آنے والے لوگوں نے استخراجی اور

استقرائی طریقِ کار کو اکٹھا کر دیا تاکہ زیادہ قابلِ اعتبار و وثوق علم حاصل کرنے کے لیے زیادہ قابلِ عمل طریقہ وضع کیا جاسکے۔ عقل اور مشاہدے کی ترکیب سے سائنسی طریقِ تحقیق نے جنم لیا۔

سائنسی طریقِ کار میں جس انداز میں تحقیق کی جاتی ہے۔ اس کے پانچ بڑے حصے ہیں:

1- قابلِ تحقیق مسئلے کی نشاندہی۔
2- مسئلے سے متعلق ضروری حقائق کی جمع آوری۔
3- مسئلے کے حل کے لیے ایک یا زیادہ آزمائشی ممکنہ حل یا فرضیے کا انتخاب۔
4- متبادل حل کی پڑتال تاکہ معلوم کیا جاسکے کہ کونسا حل تمام حقائق کے مطابق ہے۔
5- ممکنہ حد تک مسئلے کے حل کا آخری انتخاب۔

سائنسی طریقِ کار پر عمل درآمد کرنے کے لیے تحقیق کار ادبی تحقیق میں بھی مندرجہ ذیل اقدامات کرتا ہے:

1- مسئلے / موضوع کا انتخاب (Identification of a Problem)

تحقیق میں موضوع دراصل وہ بنیادی تحقیقی سوال یا مسئلہ ہوتا ہے، جس کا جواب تلاش کر کے اسے جانچا جاتا ہے۔ چنانچہ اس سوال یا مسئلے کو غیر سوالیہ انداز میں بطور موضوع درج کیا جاتا ہے۔ تحقیقی سوال، مسئلے اور موضوع کے انتخاب پر بہت کچھ لکھا گیا ہے، مگر اس سارے عمل میں جس چیز سے گریز کرنا ہے وہ یہی ہے کہ تحقیق میں ہم کسی کتاب کی تصنیف کا موضوع تلاش نہیں کر رہے ہوتے بلکہ ہماری تلاش کا انحصار کسی نظریے/تصوری (Theory) کی تفہیم میں حائل دشواریوں یا ان پر کی گئی سابقہ تحقیقات پر ہوتا ہے۔ تحقیق کے لیے موضوع ہمیشہ انھی سے حاصل ہوگا۔ موضوع دراصل زیرِ مطالعہ وہ بنیادی سوال ہے، جو کسی درپیش مشکل کے لیے تجویز کیا گیا ہوتا ہے۔ ہر تحقیقی سوال کا کوئی زیرِ تحقیق جواب بھی ہوگا۔ اسے فرضیہ کہتے ہیں۔ یہی سوال جواب مل کر تحقیقی موضوع ٹھہرتے ہیں۔ اس لیے موضوع کو غیر سوالیہ انداز میں ظاہر کرتے ہیں۔

کسی بھی موضوع میں تحقیقی مقاصد واضح ہونے چاہئیں یعنی:

1- وہ مسئلے یا تحقیقی سوال سے متعلق ہونے چاہئیں۔
2- تحقیقی توقعات کو واضح کر رہے ہوں۔
3- مسئلے کے حل پیش کرنا چاہتے ہوں۔
4- مخصوص، قابلِ پیمائش، قابلِ حصول، متعلق اور وقت میں محدود ہوں۔

ادبی تحقیق کے لیے موضوع تلاش کرنا بہت مشکل کام ہے۔ اس وقت دنیا میں ایک سوال بہت ابھر کر سامنے آرہا ہے کہ کیا ادبی تحقیق کے لیے کام کے موضوعات یا مسئلے ختم ہو گئے ہیں؟ ادب کے تحقیق کار یا تو نقل در نقل چل رہے ہیں یا پھر کیا ان کے پاس کوئی تحقیقی موضوع یا مسئلہ سرے سے موجود ہی نہیں؟ اس سوال کے پیدا ہونے کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہر اگلی تحقیق سابقہ تحقیق میں پیدا ہونے والے سوالات سے جنم لیتی ہے لیکن یہاں ادبی تحقیق کا ہر موضوع دوسرے سے منفرد، جدا اور مختلف ہوتا ہے، اس لیے دراصل وہ کوئی

موضوع ہی نہیں ہوتا۔ہارٹ مین اور تونگ نے اس کے بارے میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔اُردو میں تو اور بھی بڑا مسئلہ درپیش ہوتا ہے کہ یہاں تنقیدی نظریات تو بڑے شدومد کے ساتھ پیش کیے جاتے ہیں لیکن کوئی ادبی نظریہ تحقیق کی بنیاد نہیں بنتا۔دنیا بھر میں ادبی تحقیق نے جہاں علمِ زبان کا سہارا لیا ہے وہیں موضوع کی تلاش میں ''ثقافت'' کو مرکز ٹھہرایا ہے جو سماجی مطالعے کا ایک بڑا اہم پہلو ہے۔تمام تحقیقی فریضے اسی کے گرد وضع ہوں اور تمام نتائج اسی کا حوالہ دیں تو ادبی تحقیق کا ''موضوع'' ابھر سکتا ہے۔اُردو تحقیق کو بھی اپنے تحقیقی موضوعات کا دائرہ کار متعین کرنا ہے۔اُردو تحقیق کی منزل اور راستہ اب یہی ہے۔اگر اُردو تحقیق کو عالمی سطح پر کوئی مقام پانا ہے تو اسے ایسی ہی راہوں پر چلنا ہوگا اور ان فضولیات سے جان چھڑانا ہوگی جن کے طومار تحقیق کے نام پر بلند کیے گئے ہیں اور جو محض سابقہ کتابوں میں موجود امور کی نئی پیشکش سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔

ادبی تحقیق محض تاثراتی حوالوں سے بھی کہیں زیادہ اب لسانی پہلو کی طرف منتقل ہو رہی ہے اور وہ بھی بقول ایڈورڈ سعید الفاظ اور بیان کو علمِ زبان (Philology) کے حوالے سے پہلے بطور تخلیق کار یا مصنف دیکھنا ہے، جن کے نزدیک لکھنا فیصلے کرنے کا کام ہوتا ہے۔یہ فیصلے ہی جمالیاتی تخلیق کرتے ہیں اور تصوراتی دنیا وجود میں لاتے ہیں۔گویا وہ اثباتیت کے فلسفے کی تائید کرتا ہے اور تحقیق کو اسی فلسفے کے تحت لاتا ہے۔یعنی الفاظ کا نہیں بلکہ مصنف کا مطالعہ کیا جائے گا اور مصنف کی شخصیت کا نہیں بلکہ اس کے لسانی ادراک کا جائزہ لیا جائے گا۔اس کی تعلیم و تعلم اور نفسیاتی رسائیوں اور نارسائیوں کا تجزیہ کیا جائے گا۔

پال ڈی مین نے بھی **Return to Philology** (1986) میں یہی کہا تھا کہ متن کا مطالعہ کرنا ہے جسے انسانی تجربے یا تاریخ کی روشنی میں دیکھنا چاہیے۔ڈی مین نے جمالیاتی اقدار اور لسانیاتی ساخت کے مابین تعلق ڈھونڈنے کے لیے کہا تھا۔اس کے لیے ادبی تحقیق سے کام لیا جا سکتا ہے۔بشرطیکہ ادبی تحقیق جمالیاتی متغیرات کا تقابل کرنا سیکھ لے۔

یہی وجہ ہے کہ دنیا بھر میں ادبی تحقیق کاروں کو اب ایسے تکنیکی، خشک اور سخت موضوعات کی طرف بلایا جا رہا ہے۔روایتی عملیت اور ساختیات و مابعد ساختیات، نسوانیت، مارکسیت وغیرہ کے ادبی نظریات بھی اب ختم ہو رہے ہیں۔خاص طور پر 1980ء کے بعد سے علمِ زبان ہی دوبارہ تحقیق کا موضوع بن رہا ہے۔

فی الوقت ایم اے/ایم فل کی سطح پر مختلف اشاریہ جاتی اور کتابیاتی مواد، ذخیرۂ الفاظ اور لفظی فہرستیں یعنی کارپس (Corpus) تیار کرانے کے تحقیقی منصوبے بنائے جا سکتے ہیں۔یہ منصوبے برقیاتی اور کاغذی دونوں صورتوں میں ڈگری کے لیے پیش کیے جا سکیں اور ان کا مقصد مستقبل کے تحقیق کار کے لیے بنیادی مواد برقیاتی صورت میں مہیا کرنا ہو۔یہ مواد کچھ یوں ہو سکتا ہے:

1- ہر موضوع پر کتابوں، مضامین اور مقالات کی فہرستیں (اردو، عربی، فارسی اور پاکستانی زبانوں میں)۔

2- ہر موضوع پر اقوال، مصرعے اور اشعار کا الگ الگ ذخیرہ۔

3- شخصیات، مقالات اور اداروں کے بارے میں کوائف۔

-4 مختلف نوعیتوں کی لفظیات کے ذخیرے (عہدوار، موضوع وار، علاقہ وار، صنف وار۔
-5 رسالوں/اخباروں کے اشاریے مع اقتباسات۔
-6 مختلف نوعیتوں کی لفظیات کے ذخیرے (عہدوار، موضوع وار، علاقہ وار، صنف وار۔
-7 تحقیقی مقالات کے کوائف (ادارے، جامعہ، موضوع، تحقیق کار اور نگران وغیرہ کے حوالے سے)۔
-8 لسانیات، ثقافت اور عمرانیات کے حوالے سے ادبی تحقیقات کے نتائج اور حاصلات۔
-9 مختلف ثقافتوں کے بارے میں اہم معلومات (مثلاً لکھنؤ کا پس منظر، دہلی میں مغل سلاطین کا دور، لاہور کے قدیم رنگ، سندھ کی قدیم تہذیب، پنجابی وغیرہ)۔
-10 گوگل اردو اور وکی پیڈیا اردو جیسے تلاش انجنوں اور کو ائفوں/ویب سائٹوں پر اردو کے مضامین میں اضافہ۔
-11 نئے تلاش انجن (Search Engine) اور ویب سائٹوں کی تیاری۔ (اردو کے حوالے سے)
-12 اُردو اور دیگر زبانوں کے کمپیوٹری قواعد کی تیاری اور تقابلی جدولیں، تذکیر و تانیث کی صورتیں اور امکانات، افعال اور مصادر کا تقابل، واحد جمع کے انداز، املے کے مقامات، سابقے اور لاحقے، جملوں کی ساخت، معروف (Active) اور مجہول (Passive) جملوں کا دوسری زبانوں سے موازنہ، سادہ جملے اور مرکب جملے کی تقطیع، جملوں کی تبدیلی کے اصول، صوت و حرف کا تغیر، اصطلاح سازی کے امکانات اور اصول وغیرہ، یعنی کمپیوٹری لسانیات۔
-13 اہم ادبی/کلاسیکی ادبی متون کی برقیاتی تشکیل (اشاریوں، حوالوں، حواشی کے ہمارہ) قابل تحقیق کوائف کی تشکیل کے ساتھ۔
-14 آن لائن برقیاتی کتب خانوں/ای لائبریری کا قیام۔
-15 تحقیقی طرزوں (Research styles) کے لیے بنیادی دستاویزات سازی۔

ان حوالوں سے اور جدید ٹکنالوجی، کمپیوٹر اور اطلاعیات کا استعمال سامنے آتا ہے تو تحقیق کے کئی اور بھی موضوعات ابھر آتے ہیں جیسے:

-1 قصہ خوانی کا بیانیہ تجزیہ
-2 وڈیو گیم
-3 معنوی تعامل کے سلسلے
-4 ٹکنالوجی اور ثقافت کے تعلق اور نسبتیں
-5 استعاروں میں پوشیدہ انسانی شعور جسے ٹکنالوجی وضع کرسکتی ہے
-6 معنوی یا بے معنی علامات کا نظام
-7 معنی پہلے، علامت بعد میں

8- معنی منظم طریقوں کے پابند ہیں
9- معنی کی سطحیں: وضعی، رسمی، غیر رسمی، اصطلاحی وغیرہ
10- تجنیس (حروف کی سطح پر، معنی کی سطح پر)
11- تحریری زبان کے ساختیاتی فیچر اور بول چال کی ترتیب میں موجود ساخت (صوتیاتی سطح پر) الفاظ سے معنی اور معنی سے الفاظ، تراکیب اور جملوں تک کا سفر)۔

ادبی تحقیق کے موضوعات دو دائروں ''علم زبان'' اور ''ثقافت'' میں گھومتے ہیں۔

اُردو میں بھی مستقبل کے تحقیق کار کو علم زبان اور علم ثقافت سے آگاہ ہونا ہوگا اور اپنے تحقیقی موضوع کو انھی حوالوں سے محدود کرنا ہوگا۔ چنانچہ لسانی اور ثقافتی مطالعے بھی نفسیات کی طرح ادبی تحقیق کے اعلیٰ سطحی کورسوں کا حصہ ہونا چاہئیں یا طالب علم کو سماجیات/عمرانیات کا بھرپور علم ہونا چاہیے۔ اُردو کے اعلیٰ سطحی نصاب میں علمِ زبان اور عمرانیات کو بھی اب علمِ تحقیق کے ساتھ ساتھ شامل رکھنا چاہیے۔

تحقیق کے لیے کسی موزوں موضوع کی تلاش سب سے مشکل مرحلہ ہے، بلکہ یوں سمجھیں کہ نصف کام اس وقت ختم ہو جاتا ہے، جب کوئی تحقیقی موضوع واقعی ہاتھ لگ جاتا ہے، لیکن عام طور پر موضوع کے انتخاب کی تکنیک استعمال نہ کرنے کے بناء پر موضوع کی تلاش مشکل ہو جاتی ہے۔ یہی اس تحقیقی مرحلے کی سب سے بڑی مشکل ہوتی ہے۔ اس مرحلے پر تحقیق کار کو پورے غور و فکر سے اپنا کام انجام دینا چاہیے۔ موضوع یا مسئلہ تلاش کرتے وقت چند بنیادی امور پیشِ نظر رہنے چاہئیں۔ مشی گن سٹیٹ یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر جوزف لیوائن نے Learnaan.irate کی ویب سائٹ پر اس مرحلے کے سات رہنما نکات تجویز کیے ہیں:

1- ہر قسم کی سوچ کو شاملِ حال رکھیں۔
2- اپنے خیالات ہمیشہ تحریر کرتے رہیں۔
3- دوسروں کی توقعات کو خود پر طاری نہ کریں۔
4- کوئی بہت بڑا کارنامہ انجام دینے کا نہ سوچیں۔
5- مدتِ تکمیل کا تعین حقیقی بنیادوں پر کریں۔
6- زیادہ مشکل مرحلہ مقالے کی تحریر کا ہے، اسے زیادہ وقت اور توجہ دیں۔
7- پہلے ایک چھوٹی سی تحقیق (پائلٹ) انجام دے کر ہی اپنی تجویز تیار کریں۔

موضوع یا مسئلے کا صحیح انتخاب اس کے حل کی پہلی شرط ہے۔ مسئلہ منتخب کرتے وقت اور اس کے بعد حل تلاش کرنے تک یہ بہت ضروری ہے کہ اس کے بارے میں صحیح قسم کی معلومات موجود ہوں اور اس کی نظریاتی منطق موجود ہو۔ عملی طور پر تحقیق کار اس امر کی تصدیق کرے گا کہ:

1- موضوع یا مسئلے کے بارے میں سابقہ علم (Prior Knowledge) کتنا ہے؟
2- زیرِ غور موضوع یا مسئلے پر اس سے پیشتر کتنا اور کیا کیا کام کیا گیا ہے؟
3- کیا موجودہ موضوع یا مسئلے کی نوعیت دوامی ہے عارضی؟

4- دوسرے لوگوں نے اس موضوع یا مسئلے کے بارے میں کن خیالات کا اظہار کیا ہے، اوراس موضوع یا مسئلے کے بارے میں ان کا ردعمل کیا رہا ہے؟

5- کیا دوسرے لوگوں نے اس موضوع یا مسئلے پر تحقیق کی اوراس کا حل دریافت کیا ہے، اگر کیا ہے تو نتائج کیا نکلے ہیں؟

ان نتائج کی روشنی میں یا ان لوگوں کی تجاویز کو سامنے رکھتے ہوئے آیا اس موضوع یا مسئلے پر مزید تحقیق کی گنجائش موجود ہے؟"

4- انتخابی اُصول

(الف) ذاتی دلچسپی (Personal Interest)

کوئی بھی تحقیقی موضوع یا مسئلہ اس وقت بہتر اور موثر سمجھا جاتا ہے جب تحقیق کار کو اس سے ذاتی لگاؤ اور دلچسپی ہو۔ فرد ذاتی دلچسپی کے بغیر کسی مشکل کام کے لیے ہرگز راغب نہیں ہو سکتا۔ اگر اس کو کسی مسئلے یا عنوان سے خاص اور ذاتی لگاؤ ہے تو وہ اس کی تحقیق میں موجود دشواریوں اور دقتوں کو بھی برداشت کرے گا اور سخت محنت ومشقت سے اپنی ذاتی دلچسپی کی تسکین کرے گا۔ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ بعض تحقیق کار ایسے موضوع یا مسئلے کو سامنے لاتے ہیں جو ان کی ذاتی اپج اور دلچسپی سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کئی کئی سال لگا دیتے ہیں اور اس کے باوجود ان کی تحقیق مکمل نہیں ہو پاتی۔ اس راہ میں ان کی ذاتی دلچسپی کی عدم موجودگی حائل ہوتی ہے۔ بعض تحقیقی عنوانات تحقیق کاروں کے لیے جذباتی اور دلی عقیدت کا باعث ہوتے ہیں اور وہ ان پر تحقیق کرنے میں زیادہ سرگرمی دکھاتے ہیں۔ ذاتی دلچسپی اور لگاؤ کئی طرح سے ظاہر کیے جا سکتے ہیں۔ اس کے لیے چند سوالات تحقیق کار خود سے خود کرے تو جو جوابات ظاہر ہوں گے، ان سے دلچسپی اور عدم دلچسپی کا اظہار ہو جائے گا، مثلاً:

1- کیا میرے اندر تحقیقی موضوع یا مسئلے کو حل کرنے کا جذبہ اور جستجو موجود ہے؟

2- کیا میرا ذہنی علمی رجحان اس موضوع یا مسئلے کی طرف ہے؟

3- کیا یہ موضوع یا مسئلہ میرے کسی ذاتی تقاضے کو پورا کرتا ہے، بالفاظ دیگر اس سے مجھے کوئی مالی فائدہ ہوگا یا کسی اعزاز کی امید ہوگی یا ڈگری ملے گی۔

4- کیا یہ مسئلہ میری اس قدر دلچسپی کا ہے کہ دشواریوں اور مصائب کے باوجود اس پر قابو پالیا جائے گا؟

(ب) معاشرتی وادبی ضروریات (Needs)

تحقیقی موضوع یا مسئلہ ایسا ہو جو معاشرے کے لیے قدر و قیمت کا حامل ہو اور نہ صرف قیمتی معلومات فراہم کرنے کے لیے ہو بلکہ اس سے لوگوں کو کچھ فائدہ پہنچے اور ان کے شک وشبہات دور ہو جائیں۔ خواہ وہ شکوک مؤرخ ادب کے ہوں یا نقاد کے۔ یہ کسی علمی ادارے کی بنیادی ضرورتیں پوری کرتا ہو۔ اس بات کے لیے مندرجہ ذیل سوالات کیے جائیں تو مسئلے کی قدر و قیمت کا اندازہ ہو جائے گا:

1- کیا اس مسئلہ کے نتائج موجودہ معلومات میں اضافہ کرسکیں گے یا اس کی معلومات سطحی ہوں گی؟
2- کیا اس مسئلے کے تحت واقعی تحقیق کرنے کی ضرورت ہے؟ اگر تحقیق نہیں ہوتی تو کیا متعلقہ موضوع یا مسئلہ ادھورا اور غیر واضح رہے گا؟
3- اس تحقیق سے معاشرے اور ادبیات کے کن افراد اور اداروں کو فائدہ حاصل ہوگا؟ اور اس کی عملی حیثیت کیا ہوگی؟

ان سوالات سے موضوع یا مسئلے کی اہمیت اور قدر وقیمت کا اندازہ بخوبی ہو جائے گا۔ اگر کسی موضوع یا عنوان پر پہلے ہی تحقیق ہو چکی ہے تو اس کو پھر زیر بحث نہ لایا جائے اور اس کی نقل نہ کی جائے۔ تاہم طالب علم اور تحقیق کار کو چاہیے کہ جو تحقیق پہلے ہو چکی ہے اس کا مطالعہ کرے اور جو پہلو تشنہ رہ گئے ہوں، ان کو واضح کرے اور ان میں قیمتی معلومات کا اضافہ کرنے کے لیے نیا مسئلہ سامنے لائے۔

(ج) موضوع یا مسئلہ حسبِ استعداد اور حسبِ حال ہو

موضوع یا مسئلہ تحقیق کار کے حسب استعداد اور حسب حال ہونا چاہیے۔ تحقیق کے لیے ایسا موضوع یا مسئلہ منتخب کیا جائے جو تحقیق کار کی لیاقت اور صلاحیت سے ایک معین مدت اور مناسب محنت اور سرمایہ کے تحت تکمیل پا جائے۔ موضوع یا مسئلہ ایسا نہ ہو کہ تین سال کے بجائے سات آٹھ سال لگ جائیں اور تحقیق پھر بھی پوری نہ ہو سکے۔ موضوع یا مسئلہ بڑا اور پھیلا ہوا ہو تو اس کے کسی ایک جزو پر کام کیا جائے۔ اسی طرح موضوع یا مسئلہ تحقیق کار کی مالی حالت سے ہم آہنگ ہو۔ غریب تحقیق کار کسی موضوع یا مسئلے کی تحقیق کے لیے اعلیٰ کتابوں اور دور دراز کے ملکوں کا سفر برداشت نہیں کرسکتا۔ حوالوں کی تلاش کے لیے بھارت یا برٹش میوزیم نہیں جاسکتا۔ بعض اوقات محض مالی مجبوریاں تحقیق میں حائل ہو جاتی ہیں اور تحقیق کئی سال کے کام کے باوجود ادھوری رہ جاتی ہے۔ اس کے علاوہ موضوع یا مسئلہ ایسا ہونا چاہیے جس میں تحقیق کار اپنی استعداد کے مطابق محنت ومشقت کرے۔ ایسا نہ ہو کہ تحقیق میں جو دشواریاں اور رکاوٹیں آ رہی ہوں، ان کی وجہ سے وہ ہمت ہار بیٹھے اور جسمانی وذہنی لحاظ سے پریشان ہو جائے۔

اس کے لیے مندرجہ ذیل سوالات سے واقفیت مفید ہو سکتی ہے:

1- کیا مجھے اس موضوع یا مسئلے کے حل کے لیے میرے اندر تحقیقی صلاحیتیں موجود ہیں؟ کیا میں وسیع تر معلومات اور کوائف کو جمع کرسکتا ہوں؟
2- کیا موضوع یا عنوان کے تحقیقی مصارف میرے لیے قابل برداشت ہیں؟
3- کیا اس موضوع یا مسئلے کے تحت تحقیق میں دوسرے افراد یا ادارے میری مدد کریں گے اور اگر کریں گے تو کہاں تک؟

(د) موضوع یا مسئلے کے لیے حصولِ کوائف کا امکان

کوئی موضوع یا مسئلہ منتخب کرتے ہوئے اس بات پر غور وخوض کیا جائے کہ متعلقہ موضوع یا عنوان یا

مسئلے کے لیے معلومات یا کوائف کہاں سے حاصل ہوں گے اور انھیں کس طرح سے جمع کیا جائے گا۔ تحقیق کار کو حالات کا تجزیہ کرنا پڑتا ہے، متعدد مضمونوں، مقالوں، کتابوں اور حوالہ جات کو دیکھنا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ بعض پہلوؤں کی وضاحت کے لیے لوگوں سے انٹرویو لینا ہوتا ہے، سوالنامہ تیار کرنا ہوتا ہے اور ان کے جوابات سے کوائف حاصل کرنا ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں لسانی دشواری، رنگ اور نسل کا امتیاز، معاشرتی اقدار، تعصب، فرقہ پرستی اور علاقائی جانب داری جیسے مسائل بھی درپیش ہوتے ہیں اور ان اسباب کی وجہ سے تحقیق ادھوری رہ سکتی ہے۔ اس بات کے لیے تحقیق کار مندرجہ ذیل سوالات خود سے کرے:

1- کیا متعلقہ موضوع یا مسئلے کے تحت کوائف آسانی سے حاصل کیے جاسکتے ہیں؟
2- کوائف کے لیے جو طریق کار اختیار کیا جائے گا کیا وہ معتبر ہوگا اور اس میں کوئی دشواری تو نہیں ہوگی؟
3- کوائف حاصل کرنے کے دوران میں پیش آنے والی دشواریاں کس طرح سے دور کی جاسکتی ہیں اور وہ کوائف تحقیق میں کہاں تک معاون ثابت ہوں گے؟

موضوع یا مسئلے کے ماخذ (Sources of Research Problem)

کسی موضوع یا مسئلے کی تلاش کس طرح سے کی جاتی ہے؟ کن ماخذوں سے تحقیقی موضوع یا مسئلے کے لیے استفادہ کیا جاسکتا ہے؟ یہ ایسے سوالات ہیں جو تحقیق کے میدان میں قدم رکھنے والے کے ذہن میں اکثر پیدا ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل نکات ممد ومعاون ثابت ہوں گے:

(الف) سابقہ تحقیقی مطالعے کا تکرار

موضوع یا مسئلے کے انتخاب کے سلسلے میں ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ پہلے سے کی گئی تحقیق یا مطالعے کو دہرایا جاسکتا ہے، خاص طور پر وہ تحقیقی مطالعہ جس کے نتائج مشکوک نظر آتے ہوں۔ یعنی تشکک (Scepticism) بنیادی منطقی طریقہ ہے۔

(ب) کسی تحقیقی مقالے کا آخری باب

موضوع یا مسئلے کی تلاش سابقہ تحقیقی مقالوں کے آخری باب سے کی جاسکتی ہے۔ جہاں نتائج اور سفارشات درج ہوتی ہیں۔ تحقیق کار اس میں اپنی تجاویز درج کرتا ہے کہ اس سلسلے میں اور کس طرح کی تحقیق ہونی چاہیے۔ تحقیق کے دوران میں تحقیق کار کو بہت سے سوالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تحقیق کے آخر میں اس کے ذہن میں بہت سے خیالات اور تصورات جمع ہوجاتے ہیں۔ وہ دوسرے لوگوں کے فائدے کے لیے ان کو ریکارڈ کرتا ہے۔ تحقیقی مسئلہ تلاش کرنے والے ان تجاویز کا مطالعہ کرکے استفادہ کرسکتے ہیں۔ ان سفارشات سے نئے مسائل تلاش کیے جاسکتے ہیں۔

(ج) موجود معلومات کا جائزہ

موضوع یا مسئلے کی تلاش کا ماخذ پہلے سے موجود معلومات بھی ہوسکتی ہیں۔ ان کے تجزیے اور

مطالعے سے نہ صرف اچھا فرضیہ بن سکتا ہے جو شاید دوسری صورت میں ممکن نہ ہو بلکہ ان معلومات کی موجودگی سے تحقیق کار کا بہت سا وقت بچ جائے گا اور رقم بھی۔ کیوں کہ اس کو تحقیق کے لیے از سر نو مواد جمع نہ کرنا پڑے گا۔ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ تحقیق کار بہت سی معلومات یا کسی خاص موضوع پر جمع کی ہوئی غیر معمولی معلومات یا غیر مطبوعہ مواد کا مطالعہ کرتا ہے، یہاں تک کہ وہ روزمرہ کے مطبوعہ مواد کو بھی استعمال کرسکتا ہے۔ دریافتی تحقیق (Exploratory Research) اسی سے جنم لیتی ہے۔

(د) کسی موجود مفروضے (Assumption) کی جانچ پرکھ

موضوع یا مسئلے کی تلاش اس طرح بھی کی جاسکتی ہے کہ موجودہ معمولات میں سے کسی مفروضے کا انتخاب کر کے اس کی جانچ پرکھ کی جائے۔ مثلاً یہ مفروضہ کہ "غالب انیسویں صدی کا سب سے بڑا شاعر ہے" مسلمہ امر (Axiom) بھی ہوسکتا ہے مفروضہ (Assumption) بھی اور مشکوک بھی۔ لہٰذا اس سلسلے میں ایک نیا تحقیقی مطالعہ درکار ہوگا، اگر بادی النظر میں اس کے شواہد مل رہے ہوں نیز انیسویں صدی کے شعرا کا تقابل کسی معیار پر کرنا ہوگا۔

معیار سازی بھی ایک تحقیقی موضوع بن سکتی ہے۔

(ر) زیر غور شعبے کے ادب کا مطالعہ

کوئی موضوع یا مسئلہ سامنے لانے کا ایک اور طریقہ یہ ہے کہ زیر غور شعبے کے تمام ادب کا مطالعہ کیا جائے اور جو کچھ پڑھا ہے، اس پر غور و فکر کیا جائے۔ محقق اپنے ذہن میں لائے گئے تمام خیالات اور مشاہدات پر غور کرتا ہے اور مختلف زاویوں سے ان کو دیکھتا ہے۔ اگر وہ لسانیات کے میدان میں کام کر رہا ہے اور اس کا تعلق زیر غور مظہر (Phenomna) کے ساتھ براہ راست ہے تو وہ معقول حدود کے اندر رہ کر کسی عامل یا عنصر کو بدل کر چند غیر رسمی تجربات اور مشاہدات کرسکتا ہے اور پھر ان کے نتائج کو دیکھ سکتا ہے۔ اس کو ان لوگوں سے بات چیت کرنی چاہیے جو اس شعبے کے متعلق جانتے ہوں اور معلوم کرے کہ کیا انھوں نے کبھی کوئی ایسی بات دیکھی ہے جو اس نے کبھی نہیں دیکھی۔

فان ڈیلن (Van Dalen) نے اسی بات کو دوسرے انداز سے بیان کیا ہے۔ اگر تحقیق کار خود کو تحقیقی ماحول میں قائم رکھے، تو اسے موضوع یا مسائل معلوم کرنے اور ان کو حل کرنے کے مواقع ملتے ہیں۔ ایسی ملاقاتیں جن میں ذہنی اور عقلی لحاظ سے تبادلۂ خیال کیا جاتا ہے، مذاکرے اور پیشہ ورانہ اجلاس جن میں مقالات پڑھے جاتے ہیں اور ان پر نقد و جرح کی جاتی ہے، تحریک دلانے والے پروفیسروں، محققوں اور دانشوروں سے ملاقات، متعلقہ پیشے، زبان یا ادب میں موجود معروف شخصیات کے خطبات اور ساتھی تحقیق کاروں سے بات چیت بھی ایسے خیالات کو جنم دیتی ہے جو قابل تحقیق ہوتے ہیں۔

(س) تنقیدی زاویۂ نگاہ / تشکیک

علم شک سے پیدا ہوتا ہے۔ یقین سے ایمان نصیب ہوتا ہے جو علم کا آخری مرحلہ ہے۔ مسائل کی

دریافت اور ان کا حل صرف وہی لوگ کرتے ہیں جو بے چین اور متلاشی ہوتے ہیں۔ اپنی علمی دنیا میں نتائج کو حتمی قرار دینے پر قناعت اختیار کرنے والے ذہن میں نہ تو مسائل ابھرتے ہیں اور نہ ہی وہ ان کے حل کیلیے کوشاں ہوتا ہے بلکہ وہ روایتی اسناد کے تحت کام کرتا ہے اور اشیاء کی موجودہ صورت حال سے مطمئن ہوتا ہے۔ جبکہ علم کوئی جامد شے نہیں بلکہ محض عبوری (Tentative) ہوتا ہے۔ تحقیق کار کبھی بھی یکسانیت اور جمود کی حالت میں آرام محسوس نہیں کرسکتا۔ اسے مشکلات کا سامنا ضرور کرنا چاہیے اور موجودہ نظریات اور معمولات کو چیلنج کرنا چاہیے۔ وہ جو بھی اطلاع، عام اصول، مفروضے اور طریق کار پائے، ان کے بارے میں تنقیدی نقطہ نظر یا تشکیک پیدا کرے۔ ان پر سوال کرے، ان کی معقولیت کو چیلنج کرے، نقائص اور تضادات تلاش کرے، صحت مند تشکیکی زاویہ نظر اپنائے۔ یہ سوالات پوچھتا ہے، کہ کیا یہ درست ہے؟ کیا تحقیق کار نے صحیح طریقے سے نتائج کی توجیہہ کی؟ کیا اس مظہر کی بہتر وضاحت ممکن ہے؟ فرانسس بیکن کے اس مشورے پر عمل کرے کہ" مخالفت کرنے کے لیے نہ پڑھیں اور نہ ہی غلطیاں ثابت کرنے کے لیے اور نہ ہی اندھی تقلید کے لیے مطالعہ کریں، بلکہ جانچنے اور غور کرنے کے لیے پڑھیں"۔

1-پانچ سوالات کا طریقہ

ایک اور طریق کار کینتھ برک (Kenneth Burke) نے اپنی کتاب میں درج کیا ہے:

ہم اپنے تحقیقی موضوع کو انسانی اعمال وافعال کی روشنی میں رکھتے ہوئے مندرجہ ذیل سوالات کرسکتے ہیں۔

برک کے یہ پانچوں سوالات معروف چھ سوالات کون؟ کیا؟ کہاں؟ کب؟ کیوں؟ اور کیسے؟ کے قریب قریب ہیں۔ تحقیق کے ہر مرحلے پر اپنے خیالات کو ان سوالوں کی روشنی میں جانچنا ضروری ہے۔ موضوع سے لے کر مقالہ نگاری تک کا ہر مرحلہ ان پر مبنی ہے۔

2-بیس سوالات کا طریقہ

سوال کسی شے کے حصول کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ سقراط، ارسطو اور افلاطون اپنے طلبہ کو سوال کی افادیت سکھاتے رہے۔ کیوں کہ سوال ہی علم کی تشکیل کرتا ہے۔ اس طریق کار کو جیکولین برک نے (Jacqueline Berke) نے اپنی کتاب میں واضح کیا ہے۔

ان میں سے چند سوالات ادبی تحقیق کار کے کام آسکتے ہیں اور وہ ان کی روشنی میں مسئلے یا موضوع کی تشکیل کرسکتا ہے۔ اس سلسلے میں کوئی قاعدہ کلیہ تو نہیں بنایا جاسکتا لیکن ان کی بنیادوں پر موضوع سامنے لایا جاسکتا ہے۔

سوالات	جوابات
1- الف کو کس طرح سے بیان کیا جاسکتا ہے؟	وضاحت (Description)
2- الف کس طرح وقوع پذیر ہوا؟	بیان (Narration)
3- الف کیسا شخص ہے؟	کردار نگاری

4- الف کے بارے میں میری یادداشت کیا ہے؟	ذاتی تجربات/ واردات
5- الف کے بارے میں میرا ردعمل کیا ہے؟	" "
6- الف کے بارے میں حقائق کیا ہیں؟	تعبیر و تشریح
7- الف کی تلخیص کیوں کر ممکن ہے؟	تلخیص
8- الف کا مفہوم/ مطلب کیا ہے؟	تعریف
9- الف کا حقیقی وظیفہ کیا ہے؟	فعلی تجزیہ
10- الف کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں؟	تجزیہ
11- الف کیونکر بنا یا انجام پایا؟	تجزیہ طریق کار
12- الف کیسے بنایا یا انجام دیا جاسکتا ہے؟	" "
13- الف کی وجوہات/ اسباب کیا ہیں؟	تجزیہ اسباب
14- الف کے امکانات/ نتائج کیا ہیں؟	" "
15- الف کی اقسام کیا ہیں؟	درجہ بندی
16- الف کا ب سے کس طرح سے موازنہ کیا جاسکتا ہے؟	تقابل
17- الف کی موجودہ حیثیت/ مقام کیا ہے؟	وضاحت (Description)
18- الف کی تشریح کیونکر کی جاسکتی ہے؟	تشریح
19- الف کی قدر کیا ہے؟	جائزہ
20- الف کے حق اور مخالفت میں کیا کچھ کیا جاسکتا ہے؟	استدلال

تحقیقی مسئلے کی جانچ پرکھ

تحقیق کے لیے مسئلہ یا موضوع لیتے وقت ضروری ہوتا ہے کہ معلوم کرلیا جائے کہ کیا یہ اس معیار پر پورا اترتا ہے جو تحقیق کے سلسلے میں قائم کیا گیا ہے۔ ہل وے (Hillway) نے کہا ہے کہ تحقیق کار کو مسئلے کے بارے میں چند سوالات اٹھانے چاہئیں تاکہ اسے معلوم ہوجائے کہ واقعی اس مسئلے پر تحقیق کرنا ضروری ہے۔

ان سوالات کو اجمالی طور پر یوں بیان کیا جاسکتا ہے:

1- کیا یہ مسئلہ دلچسپ ہے؟ یعنی کیا ذاتی اور سماجی ضرورتوں پر مبنی ہے؟
2- کیا یہ نیا مسئلہ ہے؟ کیا اس سے پہلے ایسا مسئلہ پیدا نہیں ہوئی؟
3- کیا یہ متعلقہ علم میں اضافہ کرے گا؟
4- کیا یہ ممکن اور قابل عمل ہے؟ یعنی کیا اس کے جوابات موجود ہیں یا ان کے ہونے کا امکان ہے؟
5- کہیں کسی اور تحقیق کار کا اس پر دعویٰ تو نہیں؟ کیا سابقہ تحقیقات میں اس کا وجود نہیں

ہے؟

کسی موضوع پر مسئلے کو معیار کے اعتبار سے جانچنے کے لیے فان ڈیلن (Van Dalen) نے بھی سوالات کی ایک فہرست دی ہے۔ ان کو دو اقسام میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس نے پہلی فہرست کو ذاتی ملاحظات کا نام دیا ہے اور دوسری فہرست کو سماجی ملاحظات سے تعبیر کیا ہے:

(الف) ذاتی ملاحظات

فان ڈیلن کا کہنا ہے کہ غور وفکر کیے بغیر کسی موضوع یا مسئلے پر تحقیق شروع کر دینا عقل مندی نہیں۔ ممکن ہے تحقیق کار کے پاس اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے قابلیت تعاون اور سہولتیں نہ ہوں۔ ایسی غلطی سے بچنے کے لیے ذہین تحقیق کار چند سوالات کرتا ہے۔

1- کیا یہ موضوع یا مسئلہ میرے حصول مقاصد سے اور دوسروں کی توقعات سے بھی ہم آہنگ ہے؟ یعنی ڈگری کے حصول، ترقی وغیرہ کرنے کی راہ سے ہم آہنگی رکھتا ہے۔ اگر کوئی طالب علم ہے تو اس کا مقصد حصول سند ہوگا اور اگر استاد ہے تو ترقی کا حصول مقصد ہوگا؟

2- کیا میں درحقیقت اس میں دلچسپی رکھتا ہوں اور اس میں اپنے کسی بھی قسم کے تعصب سے دور ہوں؟ اس کی وضاحت مل وے نے یوں دی ہے کہ اگر کسی موضوع یا مسئلے میں تحقیق کرنے والا دلچسپی نہیں رکھتا تو اس پر کام کرنا بہت مشکل ثابت ہوگا۔ تحقیقی تجسس پیدا ہوتا ہے تو یہ قابل قدر اور قابل تحقیق موضوع یا مسئلے کی جانب رہنمائی کرتا ہے۔ کسی نوجوان تحقیق کار کے لیے بہتر ہوتا ہے کہ وہ اپنی دلچسپیوں کے شعبے میں تحقیق کرے؟

3- کیا میں اس موضوع یا مسئلے کا تحقیقی مطالعہ کرنے کے لیے ضروری مہارت، قابلیت اور علم رکھتا ہوں یا حاصل کر سکتا ہوں؟

4- کیا تحقیق کرنے کے لیے میری رسائی ان آلات، کتب خانوں، رسائل اور لوگوں تک ہو سکتی ہے جو اس کے لیے ضروری ہیں؟

5- تحقیق کو مکمل کرنے کے لیے کیا میرے پاس وقت، رقم، صحت اور دوسری ذمہ داریوں سے فرصت میسر ہے؟

6- کیا میں کافی معلومات حاصل کر سکتا ہوں؟

7- جس شعبے، ادارے یا رسالے کو مجھے رپورٹ پیش کرنی ہے، کیا یہ موضوع یا مسئلہ ان کی مقرر کردہ وسعت، اہمیت اور موضوعی ضروریات پر پورا اترتا ہے؟

8- کیا اس موضوع یا مطالعے میں مجھے انتظامیہ کی حمایت، رہنمائی اور تعاون حاصل ہو سکتا ہے؟

(ب) معاشرتی ملاحظات

تحقیق کار صرف اپنے ذاتی مقاصد کی تسکین یا حصول کے لیے اس میدان میں قدم نہیں رکھتا بلکہ وہ پوری انسانیت کے فائدے کے لیے علمی دنیا کو ترقی بھی دیتا ہے، لہٰذا مسئلے کے انتخاب کے وقت درج ذیل قسم

کے سوالات پر بھی غور کرنا چاہیے:

1- کیا اس موضوع یا مسئلے کا حل اس شعبے میں علم کو اس طرح آگے بڑھائے گا کہ وہ لوگ جو اس تحقیق میں شامل ہوئے ہیں، ان کے انسانی حقوق پر زد نہ پڑے گی؟

2- کیا اس مطالعے کے نتائج عملی یا نظری قدر و قیمت کے حامل ہوں گے؟

3- نتائج کے اطلاق کی وسعت کا دائرہ کار کیا ہوگا؟ با اعتبار افراد کا دائرہ وسعت، صلاحیت، اطلاق کی مدت اور دائرہ اثر کے مختلف شعبے۔

(اگر ہم ان تینوں سوالوں پر غور کریں تو ہمیں ہل وے (Hillway) کے الفاظ میں صرف ایک سوال نظر آتا ہے یعنی یہ مطالعہ علم کی دنیا میں کیا اضافہ کرے گا؟ اس بنا پر ضروری ہو جاتا ہے کہ زیر غور مسئلے پر تنقیدی نظر ڈالی جائے کہ اس کی ممکنہ اہمیت کیا ہے؟ یہ کس حد تک علم کی دنیا میں قابل قدر خدمت سرانجام دے گا؟ کوئی شخص یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ اس تحقیق کے کیا نتائج ظاہر ہوں گے؟ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ اہم دریافت محض اتفاق سے ہوئی لیکن با قاعدہ تحقیق میں دشواریوں، مسئلوں اور فرضیوں کے پیشگی تعین سے اہمیت کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔)

4- کیا یہ تحقیق اس کام کا تکرار ہے جس کام کو کسی اور نے پہلے کیا ہے۔ کیا اس نے کوئی پہلو چھوڑ دیا، غلط کیا یا وہ اس کو بحسن و خوبی کر رہا ہے؟

5- اس عنوان پر کس حد تک کام ہوا ہے اور کیا اس کی موجودہ حدود کو وسعت دینے کی ضرورت ہے؟

6- کیا موضوع یا مسئلے کی ایسی حد بندی کر لی گئی ہے کہ اس کو قابل عمل کہا جائے۔ پھر اس صورت میں بھی یہ اتنا اہم رہتا ہے کہ تحقیق کے قابل ہو؟

7- کیا تحقیق کے نتائج مشکوک نوعیت کے ہوں گے؟ کیوں کہ اس کے حل میں جو آلات اور طرزیں دستیاب ہیں وہ نہ تو عمدہ ہیں اور نہ ہی کافی حد تک قابلِ اعتماد؟

8- کیا یہ مطالعہ دوسرے تحقیقی مطالعات کی جانب رہنمائی کرے گا؟

تحقیقی مسئلے کی تعریف یا موضوع کا تعین (Definition of the Problem)

تحقیقی کام کے آغاز میں جو بات بے حد ضروری ہے وہ یہ ہے کہ تحقیقی موضوع یا مسئلے کی مناسب الفاظ میں تعریف کر دی جائے۔ مسئلے کی موزونیت بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی تعریف اور حدود کا تعین بھی کر دینا چاہیے۔ تحقیق کار کو چاہیے کہ وہ آسان الفاظ میں اپنے عنوان یعنی موضوع یا مسئلے کا مطلب بھی بتا دے کیوں کہ جس موضوع یا مسئلے پر مطالعے کا آغاز ہوتا ہے وہ اپنے عنوان کے لحاظ سے سادہ ترین ہونا چاہیے مگر آسان زبان کا مطلب یہ نہیں کہ تکنیکی اور بالخصوص سائنسی ذخیرہ الفاظ کو مسخ کر کے ہر حالت میں آسان بنایا جائے۔ جیسا کہ نظر آتا ہے کہ تحقیق ایک مشکل عمل ہے، اس طرح مسئلے کی تعریف بھی ایک کٹھن مرحلہ ہوتا ہے۔ جہاں کوئی غور طلب اور حل طلب صورت حال نظر آئے ہم اسے موضوع یا مسئلہ کہہ سکتے

ہیں۔ مگر ہر حل طلب صورت حال کو تحقیقی مسئلہ نہیں کہا جا سکتا، کیوں کہ خاص کر عمرانی علوم اور ادبیات کے مختلف عوامل آپس میں کچھ اس طرح سے گڈمڈ ہوتے ہیں کہ ان کو واضح طور پر بیان کر کے اور ان کا تجزیہ کیے بغیر ہم تحقیق کا مسئلہ وضع نہیں کر سکتے۔

کسی موضوع یا مسئلے کی تعریف کرنا تحقیق کار کو ایک ایسی سمت کا پتا دیتا ہے۔ جس کے بعد وہ ایسے تمام عوامل سے بچ سکتا ہے جو اس کی تحقیق کی راہ میں رکاوٹ بن سکیں یا اسے اس کے راستے سے ہٹا سکیں۔ دوسرے الفاظ میں مسئلے کی تعریف سے واضح طور پر انھی عوامل کا ذکر مقصود ہوتا ہے۔ تحقیق کے جو عنوان ہوں اور جن پر دوسرے عوامل کا اثر بہت کم ہو۔

موضوع یا مسئلے کی تعریف کرنے سے موضوع یا مسئلے کی وسعت، خصوصیت اور وضاحت سامنے آجاتی ہے اور تحقیق کی حدود قائم کر دی جاتی ہے۔ ایک مرتبہ جب موضوع یا مسئلے کی تعریف کر دی جائے تو تحقیق کار کے ذہن کے بیشتر سوالات مسئلے کے مناسب حل پر روشنی ڈالتے چلے جاتے ہیں اور اس میں بے راہ روی کا احتمال نہیں رہتا۔ لہٰذا مسئلے کی اچھی طرح تعریف کرنا مسئلے کے حل میں آسانیاں پیدا کر دیتا ہے۔

موضوع نگاری یا مسئلے کا بیان (Statement of the Problem) اور تحقیقی سوال

موضوع یا مسئلے کے بیان کا تعلق چند جچے تلے الفاظ میں اس طرح پیش کرنے سے ہوتا ہے۔ جس سے علمی طور پر تحقیق کار کا مقصد اور دائرۂ عمل واضح ہو جائے اور قاری اس بات کا بخوبی اندازہ لگا سکے کہ زیرِ نظر تحقیقی مقالے کا اصل عنوان یا موضوع کیا ہے؟ اور اس کے حل میں کس قسم کا مواد شاملِ تحقیق ہوگا نیز مسئلے کے بیان میں مختصراً تمام پیچیدہ پہلوؤں پر روشنی پڑنی چاہیے۔ جس سے تحقیقی سوالات واضح ہو جائیں۔ موضوع یا مسئلے کے ایک رسمی بیان میں تحقیق کار زیرِ نظر مطالعے کا پس نظر اور اس کے بنیادی نظریہ اور مفروضات (Assumptions) بھی بیان کرے گا۔ اسی بیان میں ان لوگوں، اشیاء، ساز و سامان، ماحول، عناصر اور وجوہات تک کا ذکر بھی آجائے گا جن کا تعلق مطالعے سے ہوتا ہے مگر چوں کہ یہ محدود الفاظ میں بیان ہوتا ہے، اس لیے الفاظ کا بہتر انتخاب بہت ضروری ہوتا ہے تاکہ ابہام نہ آنے پائے۔ چنانچہ ضروری ہے کہ:

1- تحقیقی موضوع یا مسئلے سے دو یا دو سے زیادہ متغیروں کا تعلق ظاہر ہو۔ اس معیار کے مطابق مسئلے کے بیان کا انداز کچھ اس طرح ہوگا: کیا الف کا ب سے کوئی تعلق ہے؟ الف سے ب، ج کس قسم کا تعلق رکھتے ہیں؟ الف اور ب کے درمیان ج اور د کے تابع کیا ربط ہے؟

2- موضوع یا مسئلے کو واضح اور غیر مبہم الفاظ میں سوال کی صورت میں بیان کرنا چاہیے۔ مسئلہ "یہ ہے......" یا "اس مقالے کا مقصد یہ ہے......" کی بجائے سوال پوچھا جائے۔ سوال کی خوبی یہ ہے کہ مسئلہ براہ راست سامنے آجاتا ہے۔ ضروری نہیں کہ مقالے کا موضوع وہی ہو جو مقالے کے موضوع یا مسئلے کا ہے۔

3- تیسرا معیار پورا کرنا عام طور پر مشکل ہوتا ہے۔ یہ معیار تقاضا کرتا ہے کہ موضوع یا مسئلہ اور بیان مسئلہ اس انداز میں ہو کہ اس کی تجرباتی پڑتال ہو سکے۔ اگر موضوع یا مسئلے سے پڑتالی امکان

ظاہر نہ ہو تو موضوع یا مسئلے میں بیان کردہ تعلق سائنسی نوعیت کا نہیں ہوگا۔

تحقیقی خاکے میں سب سے مختصر مگر سب سے اہم فصل (Section) یہی ہوتی ہے۔ بعد میں جو کچھ بھی بیان ہوتا ہے اس کے سوتے یہیں سے پھوٹتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی یہ شعبے اور تحقیق کار کے مابین ایک سنجیدہ معاہدے کی شکل بھی ہے۔ بعض اداروں میں تو اس کی باقاعدہ معاہدوں جیسی خصوصیات بیان کی جاتی ہیں۔ بہر حال ہر اچھی یونیورسٹی یا پیشہ ورانہ ادارے میں بیانِ مسئلہ کی اچھی طرح چھان پھٹک ہوتی ہے اور ایک دفعہ جب قبول ہو جائے تو شعبے کی منظوری کے بغیر اسے تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ قبولیت کے بعد بیانِ مسئلہ ہی تحقیق کار کا تحقیقی مسئلہ ہوتا ہے اور پروگرام کی تکمیل تک تحقیق کار کا اوڑھنا بچھونا یہی ہوتا ہے۔ وہ اسی کی حدود میں رہ کر کام کرتا ہے۔

بعض اوقات موضوع یا مسئلے کے تصور کا صاف نثری بیان یا جملہ تحقیق کے اغراض و مقاصد سمجھنے میں مددگار ہوتا ہے۔ بعض نگران صاحبان تقاضا کرتے ہیں کہ مسئلہ اور بیان مسئلہ کے درمیان ایک پیراگراف میں تحقیق کا مدعا (Purpose) بیان کیا جائے۔ یہ اچھا خیال ہے، بشرطیکہ تحقیق کار کے لیے قابل عمل ہو۔ مدعا کا پیراگراف مختصر ہو اور تحقیق کی وجہ بیان کرے اور یہ بھی کہ اس سے کس مقصد کی تکمیل ہوگی اور اس کے حاصلات اور نتائج کیا ہوں گے۔ تاہم مدعا یا مقاصد بیان کرنا اتنا لازم نہیں جتنا خود مسئلے کا بیان کرنا۔

مدعا کے بعد ایک یا دو جملے مسئلے کے بیان کے لیے وقف ہوں۔ اس مقصد کے لیے الفاظ کا چناؤ نہایت محتاط ہو۔ معیار سے متعلق غیر ضروری مبالغہ سے کام نہ لیا جائے۔ منطقی طور پر مسئلے کے بیان کے بعد ہی مدعا کا بیان آنا چاہیے۔ اسے بیان یا سوال کی صورت میں ہونا چاہیے۔ اس بات کا انحصار تحقیق کار، نگران اور موضوع کی نوعیت پر ہے۔ اس بیان سے تحقیق کو اس کا رخ ملتا ہے۔ تحقیق کی جامع حدود متعین ہوتی ہیں اور تحقیق کا طریق کار طے ہوتا ہے۔ بیان مسئلہ واضح، جامع اور غیر مبہم ہونا چاہیے۔ تحریر اعلیٰ تکنیکی معیار پر پوری اترتی ہو۔ یہ کہنا آسان ہے مگر اس پر عمل نہایت مشکل کام ہے۔ یہاں ایک مثال کے ذریعے سے ہم اس کو واضح کرنا چاہیں گے۔

"اردو ہماری روز مرہ ضرورتوں کے لیے ناکافی ہے۔ کیا یہ مفروضہ واقعی درست ہے؟ معاشرے میں اس کی کھوج لگاتا ہے"۔ (یعنی اسے فرضیہ بنا کر تحقیق کرتا ہے)

ڈاکٹر گیان چند مسئلے سے اجتناب کرتے ہوئے صرف موضوع کی بات کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک انتخاب موضوع کے تین پہلوؤں پر غور کیا جاتا ہے:

1- موضوع کیسا ہو؟ 2- موضوع کیسا نہ ہو؟ 3- موضوع کیوں کر تلاش کیا جائے؟

اس پر ہم تفصیلی بحث کر چکے ہیں۔ پہلے دو نکات کی وضاحت کے لیے مزید نکات درج ذیل ہیں:

ادبی تحقیق موضوع یا مسئلہ کیا ہو؟

1- ادبی تحقیقی موضوع یا مسئلہ ایسا ہو جس پر تحقیق کی جا سکے۔ مثلاً تنقیدی موضوعات پر کتاب تو لکھی

جا سکتی ہے تحقیق نہیں ہو سکتی جیسے ''جوش کی مناظر فطرت کی شاعری'' یا ''نظیر اکبر آبادی کے کلام کی سماجی معنویت'' لیکن وہ تحقیق نہیں ہوگی۔ ہمارے اکثر ادبی تحقیقی مقالات اسی نوعیت کے ہوتے ہیں۔

-2 ادبی تحقیقی عنوان یا موضوع طے کرتے وقت خود سے سوال کریں کہ ادبی مؤرخ کن میدانوں اور کن موضوعات پر تحقیقات کرانا چاہتا ہے۔ انھی میں سے کوئی لیں یعنی ادبی مؤرخ کیا چاہتا ہے؟

-3 ادبی تحقیقی موضوع ایسا ہو کہ اشاعت کے بعد قارئین کی اس میں دلچسپی ہو، کچھ ندرت محسوس ہو۔ عام قارئین کو نہیں، کم از کم خصوصی قارئین کو ہو۔

-4 کم از کم سندی تحقیق یا ڈگری کے تقاضوں کے لیے ایسا مسئلہ یا موضوع لینا چاہیے جس پر کافی مواد مل سکے۔ یہ نہ ہو کہ پوری مدت تحقیق غیر موجود مواد کی تلاش ہی میں گزر جائے۔ غیر سندی تحقیق کے لیے تو یہ ممکن ہے کہ مواد کم ملتا ہے تو ایک چھوٹا سا، غیر ضخیم رسالہ یا پانچ سات صفحوں کا ایک مضمون لکھ کر بس کر لی جائے۔ ورنہ تحقیق کا آغاز کرنے سے پہلے اس کے بارے میں پورا علم حاصل ہو چکا ہو۔

-5 بین العلومی (Inter-disciplinary) موضوعات شاندار تو سمجھے جاتے ہیں جو ایسے موضوعات ہیں جن میں ادب کے علاوہ کسی اور مضمون، علم یا فن کی معلومات بھی درکار ہوں لیکن ایسے موضوع پر کام کرنے کے لیے ضروری ہے کہ تحقیق کار کو دوسرے علوم و فنون سے بھی واقفیت ہو۔ جیسے اُردو اطلاعیات کے لیے کمپیوٹر سائنس کا علم۔

ادبی تحقیقی موضوع یا مسئلے کی تلاش یا انتخاب موضوع کی تصویر تبھی مکمل ہوگی جب دوسرا رخ بھی دیکھا جائے کہ موضوع کیسا نہیں ہونا چاہیے۔ ذیل کے امور بعض محولہ بالا نکات کی ضد ہو سکتے ہیں۔

-1 ادبی تحقیقی مسئلہ یا موضوع خالص تنقیدی نہ ہو۔ بدقسمتی سے یونیورسٹیوں میں تحقیق کی تعریف یہ کی جاتی ہے:

"Discovery of new facts or new interpretation of old facts"

مگر کس طرح؟ کس طریق کار کے تحت؟ بقول ڈاکٹر گیان چند ''اس میں ''پرانے حقائق کی نئی تشریح'' کے پردے میں تحقیق کے حصار میں خالص تنقیدی موضوعات کا دڑبا کھل جاتا ہے''۔ ہماری جامعات میں اکثر ایسا ہی کام ہوتا رہا ہے اور ایسے موضوعات پر پی ایچ ڈی، بلکہ ڈی لٹ بھی مل سکتی ہے لیکن اگر اُردو تحقیق کی تحقیقی تاریخ لکھی گئی تو اس میں ان موضوعات کو جگہ نہ دی جائے گی۔ اکثر بڑے بڑے محققین مثلاً قاضی عبدالودود، رشید احمد خان، ڈاکٹر اکبر حیدری وغیرہ نے بھی انتہائی معمولی معلومات یا شخصیات پر تحقیقی وقت ضائع کیا ہے۔ ہماری اکثر جامعات میں بھی ایسا ہو رہا ہے۔ اُردو میں اصل بڑی تحقیق تو ابھی وجود میں نہیں آئی جو مسائل کا حل ان کی جانچ کے بعد پیش کرے۔ رشید حسن خاں لکھتے ہیں:

''اس زمانے میں یہ رجحان فروغ پا رہا ہے کہ تحقیقی مقالوں کے لیے ایسے موضوعات منتخب کیے جاتے ہیں جو اصلاً تنقید کے دائرے میں آتے ہیں۔ یہ تحقیق اور تنقید دونوں کی حق تلفی ہے۔...... تحقیق بنیادی حقائق کا تعین کرے گی...... اخذِ نتائج میں جہاں سے تعبیرات کی کارفرمائی شروع ہوگی اور ان پر مبنی اظہارِ رائے کا پھیلاؤ شروع ہوگا، وہاں تحقیق کی کارفرمائی ختم ہو جائے گی۔''

-2 دوسری ضروری بات یہ ہے کہ اس موضوع یا مسئلے پر پہلے ہی کام نہ ہو چکا بلکہ ہو بھی نہ رہا ہو۔ صرف امکانی توسیع یا بہتری کے لیے کسی موضوع کی تکرار ہو سکتی ہے۔ اس کے مختلف پہلوؤں پر پیچھے غور کیا جا چکا ہے۔

-3 ادبی تحقیق موضوع یا مسئلہ زیادہ وسیع نہ ہو۔ پارسنس نے لکھا ہے کہ بہت بڑا مسئلہ یا موضوع لینا بڑی غلطی ہے۔ کسی دوسرے نے کہا ہے کہ ایسا موضوع نہ لیں جسے مکمل کرنے سے پہلے آپ ریٹائر ہو جائیں۔ اس پر بھی ہم بات کر چکے ہیں۔

اس منزل کی مزید دو شقیں ہیں:

(i) ادبی تحقیقی مسئلہ یا موضوع زیادہ عمومی یا وسیع نہ ہو مثلاً دکنی شاعری، اُردو نثر کا ارتقاء، پاکستانی لوک ادب، آزادی کے بعد کا ادب۔ اس قسم کے موضوعات نہ صرف وسیع ہوتے ہیں بلکہ عمومی بھی ہیں۔ ان پر گہری تحقیق نہیں کی جا سکتی، پھیلا ہوا عمومی جائزہ ہی لیا جا سکتا ہے یا کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ یاد رہے کہ کتاب اور تحقیقی مقالہ دو مختلف چیزیں ہیں۔

(ii) کسی بڑے مصنف کی پوری زندگی اور جملہ تصانیف کو لے لینا بھی عمومی جائزہ بن کر رہ جائے گا۔ مثلاً میر، غالب، اقبال، جوش اور فیض کو پورے کا پورا موضوع بنا لیا جائے تو بہت سرسری کام ہوگا۔ البتہ ان کے بارے میں کوئی مسئلہ تحقیق طلب ہو تو صرف اسی حد تک موضوع بنایا جائے۔

ہم تحقیق کار کو جامع Jack of all trades and master of none نہیں عمیق بنانا چاہتے ہیں۔ تحقیق جتنی گہری ہوگی، موضوع اتنا ہی محدود، تنگ اور عمیق ہوگا۔

-4 ادبی و لسانی تحقیقی مسئلہ یا موضوع بالکل ہی محدود نہ ہو یعنی ایسا بھی نہ ہو جس پر مواد ہی نہ مل سکے مثلاً یہ موضوعات ملاحظہ ہوں:

اُردو میں علمی تراکیب، شخصی مرثیے، ادب پر ہندو پاک کی جنگوں کے اثرات۔ یہ سب موضوعات اتنے محدود ہیں کہ ان پر قابلِ قدر مقالہ نہیں لکھا جا سکتا کیونکہ یہ کوئی مسئلہ پیدا نہیں کرتے اور ان کے قابلِ تحقیق فریضے وجود میں نہیں آتے۔

-5 راتھ نے ایک دلچسپ نکتہ پیش کیا ہے کہ اگر آپ کے مقالے کا پورا مواد کسی ایک کتاب میں مل جاتا ہے تو آپ نے اچھا موضوع منتخب نہیں کیا۔

-6 جن شخصیتوں یا موضوعات پر بے خوفی سے نہ لکھا جا سکے، ان پر تحقیقی کام نہ کرنا ہی بہتر ہے

جیسے زندہ لوگوں پر لکھنے میں یہی ایک قباحت ہے۔ ایسے مقالے محض ایک کتاب کی تالیف ٹھہرتے ہیں۔ قاضی عبدالودود لکھتے ہیں:

''بعض موضوعات ایسے ہیں کہ ان پر آزادی سے کچھ لکھنا ضرر رساں ہوسکتا ہے۔ اگر اس کے لیے آمادہ ہیں تو ایسے موضوع پر قلم اٹھانا مناسب ہے۔ کسی کے لیے یہ نہایت نازیبا بات ہے کہ اسے خوفِ راست گفتاری سے باز رکھے۔''

7- کہیں زیادہ غیر اخلاقی، نازیبا اور غلط بات ہے کہ کسی زندہ شخص پر کسی مصلحت یا مفاد کی خاطر تحقیق کی جائے۔ رشید حسن خاں لکھتے ہیں:

''اب تک یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ جن زندہ لوگوں کو موضوعِ تحقیق بنایا گیا، اس انتخاب میں دنیا داری کی کسی مصلحت کو ضرور دخل تھا۔ بظاہر حالات ایسے ہی ہیں اور خیال یہ ہے کہ آئندہ بھی ایسا ہی ہوگا۔''

8- زیادہ حالیہ ادبی مسائل اور تنقیدی موضوعات سے احتراز مناسب ہے کہ اس کا مواد رسالوں ہی میں مل سکتا ہے، دیگر ماخذوں میں نہیں۔ اگر فردیات، ہائیکو، ثلاثی، مختصر افسانے، مغرب میں اُردو ادب کے مسائل وغیرہ پر لکھنے تو دقت پیش آئے گی۔ اتنے جدید موضوعات کو اعلیٰ تحقیق خاص طور پر پی ایچ ڈی کے لیے نہیں لینا چاہیے۔ اگرچہ علمی امور کے لیے تحقیقی رسالے ہی جدید ترین ماخذ ہوتے ہیں لیکن ہماری زبانوں میں ایسے علمی رسالے بہت کم ہیں اور ان میں نئی تحقیقات اور ان کے نتائج بھی شاذ ہی شائع ہوتے ہیں۔ تاہم انھیں پہلا بنیادی ماخذ ٹھہرانا چاہیے۔

9- زیادہ تکنیکی موضوع بھی آخر کار تحقیق کار کی علمی الجھن کا باعث بن سکتا ہے جیسے کمپیوٹر، ٹائپ کاری وغیرہ کی زبان لیکن ایسے مسئلے دورِ حاضر کی بعض ضروریات سے وابستہ ہوتے ہیں۔

10- اپنے والد یا بزرگ، افسر یا استاد پر تحقیقی کتاب لکھی جائے تو امکان کم ہے کہ غیر جانب داری سے معروضی جائزہ لیا جاسکے گا۔ ایسی کئی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔

11- اگر کوئی ایسا مسئلہ تحقیق طلب ہو جس میں کسی دوسری زبان کی معلومات بھی درکار ہیں تو تاوقتیکہ اس زبان سے کما حقہ، واقفیت نہ ہو اسے نہیں لینا چاہیے مثلاً یہ موضوعات دیکھیں۔ ''اردو اور پاکستانی زبانوں میں اسم مصدر کا موازنہ''، ''اردو اور سندھی کے مشترک اعلام''۔

12- کم از کم سندی مقالوں کے لیے ایسے موضوعات یا مسائل نہیں لینے چاہئیں جن کی تسوید میں فحاشی، عریانی یا جنس زدگی سے نہ بچا سکے۔

13- سندی یا غیر سندی تحقیق کے لیے ایسا مسئلہ یا موضوع پسند نہیں کرنا چاہیے جسے تکمیل کے بعد شائع کریں تو ہماری دریافت بالکل غیر اہم رہے۔ اب کوئی کسی تیسرے درجے کے ادیب پر کام کرے تو اس پر کون توجہ کرے گا۔ اسی طرح کسی غیر اہم متن کو مرتب کر دیا جائے تو بھی اس سے ادبیات میں اضافہ نہ ہوگا۔

14- ایک عام تاثر یہ ہے کہ ایسے موضوعات تحقیق کے لیے اچھے نہیں ہوتے جن میں کام تذکرے کے انداز کا ہو مثلاً کسی فرقے یا علاقے کے افراد کی ادبی یا لسانی خدمات کا جائزہ۔اس قسم کے موضوعات میں زیادہ سے زیادہ نام دینے کی کوشش ہوتی ہے جس کی وجہ سے غیراہم اور تیسرے اور چوتھے درجے کے ادیبوں کو بھی شامل تسوید کرلیا جاتا ہے۔

زبان اور ادب میں عام طور پر مورخ اور نقاد کی ضرورتیں سامنے آتی ہیں۔مورخ کسی ادب پارے کے تاریخی مقام کا تعین کرنے کے لیے کچھ سوالات کے جواب چاہتا ہے اور نقاد کو کسی ادب پارے کے محاسن کو جانچنے کے لیے کچھ معلومات، حقائق اور نتائج درکار ہوتے ہیں۔دونوں تحقیق کار سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ ان کے سوالوں کے جواب تلاش کر کے دے۔تحقیق میں ایسے تحقیقی سوال کو مسئلہ (Problem) کہا جاتا ہے۔تحقیقی سوال ممکنہ دلچسپی کے میدان میں موجود دشواریوں سے حاصل ہوتا ہے۔اس کے لیے سابقہ تحقیقات کا مطالعہ مفید ہوتا ہے۔دیکھا یہ جاتا ہے کہ مسئلے یا سوال کی تحقیقی اور نظریاتی قدر کیا ہے؟ عملی طور پر اس کی ضرورت کس حد تک ہے اور اس پر کس حد تک کام ہو چکا ہے؟ کیا یہ سوال سابقہ جوابات کی نفی کرتا ہے، یا کچھ اضافہ چاہتا ہے؟ کیا اس سوال پر تحقیق ہو سکتی ہے؟ اس خاص مسئلے کے اہم حل کون کون سے ملے ہیں؟ کیا ان پر تحقیق ہوئی ہے؟ چنانچہ تحقیقی مقالوں اور رپورٹوں کا مطالعہ کیا جاتا اور سابقہ تحقیقات میں ان کا خلاصہ دیکھا جاتا ہے۔ان میں مسئلے کے بیان کا مقصد اور اہمیت معلوم کی جاتی ہے۔ان کے فرضیے دیکھے جاتے ہیں اور دیکھا جاتا ہے کہ کیا سوال اور یہ جوابات واضح اور متعلقہ ہیں؟ تحقیقی ڈیزائن، طریق کار، نمونہ بندی، حاصلات، سفارشات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

2- فرضیوں کی تشکیل (Formulation of Hypothesis)

ہر سوال کے کچھ ممکنہ جوابات ہوتے ہیں جو سابقہ مورخوں، نقادوں، ادیبوں، محققوں، مفکروں اور استادوں نے تلاش کر رکھے ہوتے ہیں یا کسی نظریے/تصوری کی روشنی میں ابھر کر سامنے آتے ہیں۔تحقیق کار انھی میں سے کسی ایک یا زیادہ جوابات کو تحقیقی اصولوں پر جانچتا ہے۔اس منتخب جواب کو فرضیہ (Hypothesis) یا بردعویٰ کہا جاتا ہے۔گویا تحقیق میں ہم نئی تلاش نہیں کرتے بلکہ پہلے سے معلوم جوابات یا تلاش کو پرکھتے اور حکم لگاتے ہیں۔یہ کام سابقہ ادبیات/تحقیقات کو کھنگالنے سے ہوتا ہے۔فرضیے کو جانچنے سے پہلے ہم تحقیق کے لیے کوئی بنیاد استوار کرتے ہیں یعنی کچھ حقائق تسلیم کر کے چلتے ہیں جنھیں پرکھا نہیں جاتا اور اس کی بنیاد پر تحقیق آگے بڑھائی جاتی ہے۔

تحقیق تبھی انجام دی جا سکتی ہے، اگر وہ مسلمہ حقائق (Facts) موجود ہوں۔تحقیق کی بنیاد انھی پر رکھی جاتی ہے۔انھیں مفروضہ (Assumption) کہتے ہیں یعنی اگر ہم یہ جاننا چاہیں کہ کیا اُردو ادب میں غیرملکی ادب کی اصناف کا خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے؟ اور ہمارا جواب یہ ہو کہ ڈراما، افسانہ، جدید نظم وغیرہ کا اضافہ غیرملکی ادب ہی کے زیر اثر ہوا ہے تو ہمارا مفروضہ یہ ہوگا کہ اُردو کے ادیب غیرملکی زبانوں کے ادب کا وسیع تر مطالعہ کرتے اور ان سے اخذ واستفادہ کرتے رہتے ہیں۔یاد رہے کہ ہم مفروضے کو مسلمہ سمجھ کر آگے بڑھتے ہیں اور

اسے نہیں جانچتے بلکہ اپنی جانچ کی بنیاد اس پر رکھتے ہیں۔ مفروضے عام طور پر سابقہ تحقیقات کے مسلمہ نتائج ہوتے ہیں۔

فرضیہ دو یا زیادہ متغیروں کے درمیان تعلق کو بیان کرتا ہے۔ فرضیہ نظریے، استخراجی منطق، مشاہدے اور استقرائی منطق کے میل جول سے وضع کیا جاتا ہے۔ فرضیہ قابل پیمائش اور قابل جانچ ہوتا ہے۔

فرضیوں پر بحث سے پہلے متغیرہ (Variable) کا تصور سمجھ لینا ضروری ہے۔ ہر تصور ذہنی ادراک کا نام ہے اور متغیرہ ہر تصور کی وہ خاصیت ہے جو مختلف قدروں میں مختلف ہوتی چلی جاتی ہے۔ متغیرے تین طرح کے ہوتے ہیں:

1- آزاد یا غیر منحصر متغیرہ (Independent Variable) جو دوسرے متغیروں کو متاثر کرتا ہے۔ یہ کسی اور نتیجے کا سبب ہوتا ہے۔ کسی اور سطح پر پایا جاتا ہے لیکن اس کا سبب کچھ اور ہو سکتا ہے۔

2- منحصر متغیرہ (Dependent Variable) جو آزاد متغیرے کے تبدیل ہونے پر تبدیل ہوتا ہے۔

3- مخلوط متغیرہ (Compounding Variable) جو کبھی آزاد اور کبھی منحصر متغیرہ ہوتا ہے۔ دونوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ تحقیق میں ان متغیروں کو کنٹرول کیا جاتا ہے۔

ہر تحقیق طلب فرضیہ (Hypothesis) ایک برعکس صفر فرضیہ (Null Hypothesis) لازمی طور پر رکھتا ہے۔ صفر فرضیے سے مراد یہ ہے کہ ایسا فرضیہ جو آپ کے تحقیق طلب فرضیے کی نفی کرتا ہے۔ یعنی اگر آپ کا تحقیقی جواب یا تحقیق طلب فرضیہ یہ ہو کہ اُردو میں ڈراما، افسانہ اور جدید نظم غیر ملکی ادب ہی کے زیر اثر پیدا ہوا ہے تو اس کا برعکس صفر فرضیہ یہ ہوگا کہ اُردو میں ڈراما، افسانہ اور جدید نظم غیر ملکی ادب کے زیر اثر پیدا نہیں ہوا بلکہ ان اثرات کے آنے سے پہلے موجود تھا۔ جب تک آپ صفر فرضیے کو غلط ثابت نہیں کریں گے، آپ اپنے فرضیے پر کام کرنے کا حق نہیں رکھتے۔

فرضیہ مسئلے یا تحقیقی سوال کا امکانی حل یا جواب ہوتا ہے۔ عموماً فرضیوں کی تشکیل مسئلے کے انتخاب پر ہوتی ہے کیونکہ مسئلے کے حل اور مکمل وضاحت کے سلسلے میں مختلف فرضیے وجود میں لائے جاتے ہیں جو در حقیقت دو مختلف متغیرات کا آپس میں تعلق ظاہر کرتے ہیں اور اسی تعلق کے بارے میں مواد اکٹھا کر کے اسے درست یا غلط ثابت کرنا تحقیق کا مرکزی موضوع ہے۔ فرضیوں کی مدد سے کسی نظریے کو غلط یا درست ثابت کیا جا سکتا ہے یا اس میں ترمیم کی جا سکتی ہے۔ فرضیہ ہمیشہ قابل پیمائش اور قابل جانچ ہوتا ہے۔ برعکس یا صفر فرضیہ (Null Hypothesis) پہلے مسترد کرنا ہوتا ہے، پھر یہ فرضیہ جانچا جا سکتا ہے۔ تب بھی دیکھا جاتا ہے کہ کوئی متبادل فرضیہ تو نہیں بن رہا۔

اس سارے کام کے لیے سابقہ تحقیقاتی ادبیات کا جائزہ لینا ضروری ہوتا ہے۔ تمام فرضیے، مفروضے اور صفر فرضیے اسی سے برآمد ہوتے ہیں۔ چنانچہ تحقیق کا کام یا تحقیقی سوال کا جواب متعلقہ ادبیات کے مطالعے سے شروع ہوتا ہے۔ اس مطالعے سے جو نتائج برآمد ہوتے ہیں، انھی سے فرضیے اور ان کے متعلقات وجود میں آتے ہیں۔

اپنا جواب تلاش کرنے یا فرضیوں کو صحیح یا غلط ثابت کرنے کے لیے لازم ہے کہ آپ کو تحقیق کے دائرہ کار یا اس کی تمام تر وسعتوں (Universe) اور سمتوں (Dimensions) کا علم ہو۔ اسے حدودِ تحقیق (Limitations) کہا جاتا ہے۔ ان سمتوں کی کاٹ چھانٹ (Cropping) ضروری ہے تاکہ آپ نمونے کی اعلیٰ تحقیق انجام دیں۔ یعنی ان حدود کو کم سے کم کرنے کی کوشش کریں جن کے اندر تحقیق انجام دی جائے گی۔ اسے تحدید یا حد بندی (Delimitation) کا نام دیا جاتا ہے۔ تحدیدی احاطہ جتنا تھوڑا ہوگا، تحقیقی نتائج اتنے زیادہ وقیع ہوں گے۔ بس حدودِ تحقیق کے ایک جزو پر کام کرلیا جائے۔ باقی اجزا پر کام کرنے کی سفارش دوسروں کے لیے کی جائے۔ کسی تحقیقی موضوع پر پورا کام ہونا لازم نہیں، اس کے جزو کا اختصاص ضروری ہے۔ تحقیقی وقعت (Validity) اور وثوق (Reliability) اسی سے پیدا ہوں گے۔

3- آزمائشِ فرضیات (Testing of Hyphotheses)

اپنا جواب تلاش کرنے یا فرضیوں کو صحیح یا غلط ثابت کرنے کے لیے لازم ہے کہ آپ کو تحقیق کے دائرہ کار یا اس کی تمام تر تحقیقی عمل میں تشکیل شدہ فرضیوں کو جانچا یا پرکھا جاتا ہے کہ آیا وہ درست ہیں یا غلط۔ اس پرکھ کو تجربے کا نام دیا جاتا ہے۔ چنانچہ تحقیقی حکمتِ عملی تیار کی جاتی ہے۔ اس کے لیے مندرجہ ذیل اقدامات کیے جاتے ہیں:

الف۔ حسی تجربہ یا واردات (Empirical Experience)

وہ علم جو حواسِ خمسہ کو استعمال کر کے حاصل کیا جائے "حسی تجربہ یا واردات" کہلاتا ہے۔ یعنی ایسا طریق کار جس میں مشاہدہ ایک سے زائد حواس سے علم حاصل کرتا ہے اور اس کے آلات یا ذرائع استعمال کرتا ہے۔ بصارت، سماعت، لمس، ذائقہ، خوشبو جیسی وارداتیں انسانی علم کا بنیادی یا حیاتی تجربہ کہلاتی ہیں۔ ان میں سے بصارت اور سماعت بنیادی حواس ہیں جن کے ساتھ تعقل (Intellect) کی آمیزش سے نتائج حاصل کیے جاتے ہیں۔

ب۔ مشاہدہ (Observation)

مشاہدہ حسی وتعقلی تجربے کا ایک حصہ ہے یعنی ایسا مطالعہ جو آنکھ کے ذریعے عقلی بنیادوں پر کیا جائے مشاہدہ کہلاتا ہے۔ مشاہدہ تجربات کا پہلا دروازہ ہے جس میں سے تمام تحقیق کار گزرتے ہیں۔ یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ سائنس مشاہدے سے شروع ہوتی ہے اور مشاہدے پر ختم ہوتی ہے۔ مشاہدے کی کئی قسمیں ہیں مثلاً منضبط مشاہدہ اور غیر منضبط مشاہدہ وغیرہ۔ بہرحال تمام تحقیق کار ان میں سے کسی ایک یا دونوں قسمیں مشترکہ طور پر استعمال میں لا کر کسی خاص شعبے میں تحقیق کرتے ہیں۔

4- ماحصل / لب لباب (Conclusion)

تجربات کے بعد سائنسی طریقِ تحقیق میں اہم ترین موڑ نتیجہ اخذ کرنا ہوتا ہے۔ اگر فرضیے کی تصدیق ہو جائے تو یہ سائنٹفک حقیقت (Fact) بن جاتا ہے۔ سائنسی حقیقت آگے چل کر کوئی نیا نظریہ قائم کرنے یا پہلے سے

موجود کسی نظریے میں ترمیم کا باعث بنتی ہے۔ فرضیہ عام طور پر متغیرات پر مشتمل ہوتا ہے، جن میں سے ایک آزاد یا خود مختار اور دوسرا تابع ہوتا ہے یعنی ایک علت یا "سبب" اور دوسرا اس کے معلول، اثر یا نتیجے سے تعلق کو ظاہر کرتا ہے۔ پس "اسی سبب اور اثر کے تعلق" (Cause and Effect Relationship) کی اہمیت سے ہم ماحصل اور لب لباب کے طور پر یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اگر تعلق اہم ہے تو فرضیہ اہم ہے، ورنہ اس کی اہمیت مشکوک ہوگی۔

5- منطق کا استعمال

فلسفے میں عام طور پر منطق کے دو طریقے استعمال ہوتے ہیں لیکن سائنسی طریق میں ان پر انحصار جلد بازی کا طریق سمجھا جاتا ہے، کیونکہ منطق کلی اور حتمی فیصلہ کرنے کی کوشش کرتی ہے، جبکہ تعمیم (Generalization) کا جدید اصول سو فی صد نتائج کے امکان کو تسلیم نہیں کرتا۔

منطق کے دو بنیادی طریقے ہیں:

(الف) استقراء (Induction)

استقراء میں ہمارا استدلال خصوصی سے عمومی کی طرف ہوتا ہے یعنی ہم کسی خاص واقعہ سے جمع شدہ کوائف یا معلومات کے پیش نظر جو نتائج اخذ کرتے ہیں، ان کا اطلاق عام واقعات پر ہوتا ہے۔ کسی فرضیے پر کئی سوالات بنائے جاتے ہیں اور کائنات میں کئی افراد پر مشاہدہ کیا جاتا ہے، پھر تمام معلومات یا کوائف کو جمع کر کے نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے۔ اس طرح سے حاصل شدہ نتیجے کا اطلاق عام واقعات پر بھی ممکن ہوگا۔

(ب) استخراج (Deduction)

یہ ایسا منطقی طریق استدلال ہے، جس میں مطالعے کا رُخ عمومی سے خصوصی کی طرف ہوتا ہے۔ یہ اصول سائنسی طریق کار میں خاص اہمیت کا حامل ہے۔ فرضیوں کی تشکیل انھی بنیادوں پر کی جاتی ہے۔ فرضیے عام طور پر پہلے سے موجود استخراجی نظریے سے بنائے جاتے ہیں۔ اگر فرضیے تحقیق سے درست ثابت ہوں تو نظریے کو تقویت پہنچتی ہے، بصورت دیگر یہ نظریے میں ترمیم یا تردید کا باعث بنتے ہیں۔

سائنسی تحقیق میں استخراج اور استقراء کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اگر نظریے سے بذریعہ استخراج فرضیے بنائے جائیں تو فرضیوں پر منضبط مشاہدے کے بعد بذریعہ استقراء کوائف حاصل کیے جاتے ہیں جو پھر نظریات کی تصدیق و تردید میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ تمام کوائف سے بذریعہ استخراج خصوصی نتائج حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ ادبیات کی جدید تحقیق میں اس طریق استدلال کو بہت کم اہمیت ملی ہے۔

6- تعمیم یا عمومیت کاری (Generalization)

کسی فرضیے کے بارے میں تحقیق کاروں کی رائے کو تعمیم یا عمومیت کہا جاتا ہے۔ سائنسی تحقیق کی سیڑھی میں نتیجے سے اگلا قدم تعمیم یا عمومیت کاری ہے۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے، تجربے سے کسی فرضیے کا درست یا غلط ثابت کرنا مقصود ہوتا ہے۔ نتائج کسی فرضیے کی تصدیق یا تردید کرتے ہیں۔ یہاں یہ بات

بہت اہمیت کی حامل ہے کہ نتائج کو ہرگز ہرگز دوسرے تحقیق کاروں اور ماہروں سے چھپا کر نہیں رکھا جاتا بلکہ اس کی مزید تصدیق یا تردید کے لیے اسے شائع کر کے منظرِ عام پر لایا جاتا ہے۔ ماہرین اپنے اپنے تجربات کی روشنی میں اس پر سیر حاصل بحث کرتے ہیں اور آخر میں ایک معاصر جائزہ یا رائے پیش کرتے ہیں۔ اگر کسی فرضیے کے نتائج کو تمام محققین متفقہ طور پر درست مان لیں تو فرضیہ درست تصور کر لیا جاتا ہے، بصورتِ دیگر اس کی تردید ہو جاتی ہے۔ تعمیم کے دو اہم مقاصد وقعت اور وثوق ہیں۔ تنقید ایسی عمومیت کاری یا تعمیم میں جلد بازی سے کام لیتی ہے۔ تحقیق کو تعمیم کے لیے کوائف اور شواہد کی صحت پر اعتبار کرنے کے لیے وقت درکار ہوتا ہے کیونکہ تعمیم کسی ایک فرد کی ذاتی رائے نہیں بلکہ عمومی اجتماعی ماحصل کہلاتی ہے۔

5- مراحل

تمام تر تحقیقی اقسام میں عموماً مندرجہ ذیل مراحل سائنسی طریق کے ساتھ مشترک حیثیت رکھتے ہیں۔ ہم ان کا ذکر آٹھ مرحلوں کے طور پر کر چکے ہیں۔ یہ مراحل کسی تحقیقی طریقے کے لیے عمومی مشترک حیثیت رکھتے ہیں۔

1- تحقیق کا پہلا مرحلہ اس کی ضرورت اور مسئلے کی نشاندہی ہے۔ ضرورت کے بغیر مسئلہ اور مسئلے کے بغیر تحقیق بے معنی ہے۔

2- تحقیق کا دوسرا مرحلہ سابقہ تحقیقات کا نچوڑ حاصل کرنا ہے۔ اس مرحلے پر تمام استخراجی آراء اور تحقیقی مطالعے شریک کیے جاتے ہیں۔

3- تیسرا مرحلہ تحقیقی ڈیزائن کی تیاری یعنی لائحہ عمل اور تحقیقی قسم اور طریق کار کا انتخاب ہے۔

4- چوتھا مرحلہ تحقیقی سوالات یا فرضیے تشکیل دینا ہے جو عام طور پر سابقہ تحقیقات کے مطالعے کے بعد آسان ہو جاتے ہیں۔ فرضیات کو مسئلے کا ممکنہ حل بھی کہا جاتا ہے۔ قابلِ تحقیق فرضیوں کو سامنے لایا جاتا ہے اور ان پر کام کیا جاتا ہے۔ اس مقصد کے لیے مسلمات یا مفروضے طے کرنا ہوتے ہیں۔

5- پانچویں مرحلے پر فرضیوں کی تصدیق یا تکذیب کے لیے کوائف اور مواد جمع کیا جاتا ہے۔

6- چھٹے مرحلہ پر مطلوبہ ترتیب سے پڑتال اور تجزیہ کیا جاتا ہے۔

7- کوائف سے نتائج برآمد کیے جاتے ہیں جسے ساتواں مرحلہ بھی کہتے ہیں۔

8- آخر میں نتائج اور سفارشات کو رپورٹ کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔ حسبِ اسلوب مقالہ لکھنا اس کی آٹھویں اور آخری منزل ہے۔

6- مشترک تحقیقی ارادہ یا ڈیزائن

تحقیق کی تمام تر اقسام اور طریق کار ایک ایسے ارادے کی مرہونِ منت ہوتی ہیں جسے ہم تکنیک میں ڈیزائن کا نام دیتے اور اس سے معروضیت وضع کرتے ہیں۔ تحقیقی ڈیزائن کا ذکر بہت آتا ہے لیکن اس کی

نوعیت سمجھ میں نہیں آتی۔ یہ دراصل تحقیقی سوالات کے جوابات حاصل کرنے کا وہ طریق کار ہے جس میں دیگر عوامل اور متغیرات قابو میں رکھے جاسکیں اور تحقیق کو جواز اور وثوق دیا جاسکے۔ اس سے کام کرنے کا ارادہ تحقیقی انداز سے ظاہر ہوتا ہے۔ تحقیقی ڈیزائن پر جس قدر محنت کر لی جائے، تحقیقی کام اتنا ہی آسان ہو جاتا ہے۔ یعنی کوائف اور اعداد و شمار کے حصول میں جتنی احتیاط برت لی جائے اتنا ہی اس تحقیق کو معروضی بنایا جاسکے گا۔

زمانہ قدیم میں تحقیق کا ڈیزائن صرف قیاس (Abduction) پر منحصر ہوتا تھا۔ یعنی امکانی تشریح کرنا جو بظاہر عقل کو معقول معلوم ہو۔ فرقہ وارانہ مباحث اسی احتمالی قیاس پر مبنی ہوتے ہیں۔ پھر استخراج (Deduction) کا عہد آیا۔ کسی ایک واقعے کو دلیل بنا کر نتائج نکالنا یا فریضے قائم کرنا۔ بعد ازاں زیادہ سے زیادہ کوائف سے استقرا (Induction) اور اب سائنسی طریق تحقیق جو انفرادی سے زیادہ اجتماعی اور ذاتی سے زیادہ سماجی قبولیت پر منحصر ہوتا ہے اور جب تک معاصر جائزہ (peer review) اسے قبول نہ کرلے، تسلیم نہیں ہوتا۔

تحقیقی ڈیزائن کی تین بنیادی خصوصیات ہیں: معروضی، مدلل اور واضح ہونا، یعنی:

1- اس میں ذاتی رائے اور تعصب کو دخل حاصل نہ ہو۔ (معروضیت)

2- اس میں منطقی اصول علت و معلول کی خلاف ورزی نہ ہو۔ (استدلال)

3- تحقیق کا کوئی مرحلہ پوشیدہ نہ ہو۔ (وضاحت)

7- تحقیق کار کے اوصاف

تحقیق کار کو معروضی تحقیق انجام دینے کے لیے اپنے اندر چند اوصاف پیدا کرنا ضروری ہوتے ہیں۔ ان کے بغیر ذاتی رجحانات اور تعصبات، تساہل اور غفلت تحقیق پر اثر انداز ہو جاتے ہیں اور یوں تحقیق موضوعی ٹھہرتی ہے۔

بنیادی شرائط

تحقیق کار کے لیے صداقت کے حصول پر ایمان رکھنا اور عدل کے غیر جانبدارانہ معروضی طریق کو اپنانا ضروری ہوتا ہے۔ اثباتیت کے نقطۂ نظر سے اسے یقین ہونا چاہیے کہ دنیا اور اس کی ہر چیز مندرجہ ذیل اصولوں پر پوری اترتی ہے:

1- دنیا کی ہر چیز کو سمجھا جاسکتا ہے (Knowable)۔

2- اسے دہرایا اور تبدیل کیا جاسکتا ہے (Controlable, Changable)۔

3- نتائج کی بنا پر انھی حالات میں اس عمل کی پیش گوئی کی جاسکتی ہے (Predictable)۔

محض اسی یقین کی بدولت ایک تحقیق کار سچ یا صداقت تلاش کرنے کی کوشش کرسکتا ہے۔ صداقت یا سچ اس سے غیر جانبدارانہ اور غیر متعصبانہ طریق کار اور رویے کا طلب گار ہوتا ہے۔ مطلق سچ یا صداقت ایسی عریاں حقیقت بھی نہیں کہ فوراً سامنے آجائے۔ سائنس ہو یا شعر و ادب صداقت کو بھی نسبت، مجاز، تشبیہ اور استعارے کی

مدد سے بیان کیا جاتا ہے۔ اصولِ تحقیق میں اسے (Previous/PriorKnowledge/Experience) ''سابقہ تجربہ'' کہا جاتا ہے۔ یعنی صداقت کی تلاش ایک ایسا عمل ہے جو سابقہ تجربات پر مبنی قدم بہ قدم آگے بڑھتا ہے۔ یوں نسبت، مشبہ بہ یا مستعار لہٗ کے حوالے سے تصورات کا تقابل وجود میں آتا ہے۔ مجازی الفاظ یعنی تشبیہ اور استعارہ ہی علم کا فہم عطا کرتے ہیں۔

انسان کے سابقہ تجربات اس کے مشاہدات پر مبنی نئے تصورات پیدا کرتے ہیں۔ یہ تصورات علم کی بنیادی اکائیاں قرار پاتے ہیں۔ ہر تصور کو ہم کسی نہ کسی اصطلاح سے یاد کرتے ہیں۔ تصور عام طور پر مشاہدات اور تجربات کی مجموعی شکل ہوتا ہے، جیسے طالب علم کے ذہن میں ''کتاب'' کا ایک تصور اس کے تجربات اور مشاہدات کی روشنی میں پیدا ہوتا ہے اور وہ کتاب اور غیر کتاب میں آسانی سے امتیاز کر لیتا ہے۔ یہ تصورات جب تحقیق میں حاصل کردہ حقائق سے ملتے، ٹکراتے یا متصادم ہوتے ہیں تو ان میں شکست و ریخت واقع ہوتی ہے۔ بعض تصورات جامد اور بعض متغیر ہوتے ہیں۔ عام طور پر تصورات تغیر پذیر ہوتے ہیں۔ بہت کم جامد یا مستقل ہوتے ہیں۔ اسی لیے انھیں متغیرات کہا جاتا ہے۔ تحقیق انھی متغیرات کو قابو میں رکھ کر ان تصورات کے ساتھ تقابلی مطالعہ کرنے کا نام ہے۔ مثلاً اگر ہم یہ مطالعہ کر رہے ہوں کہ غالب بڑا شاعر ہے یا اقبال؟ تو ہم اپنے تصورات کے متغیرات پر غور کریں گے کہ:

1- ہم یہ مطالعہ کس دور میں کر رہے ہیں؟
2- اس دور میں ''بڑے'' کا تصور کیا ہے؟
3- بڑائی کا معروضی پیمانہ کیا ہے؟
4- مختلف ادوار میں بڑائی کے معروضی پیمانے کیا تھے؟
5- کون کون سے دوسرے تصورات/متغیرات ''بڑائی'' اس تصور کے پر اثر انداز ہوتے ہیں؟

ثانوی شرائط

تحقیق کار کو اپنے کام کے لیے بے حد محنت درکار ہوتی ہے اور محنت کا یہ کام انتہائی صبر اور لگن کے ساتھ انجام دینا پڑتا ہے۔ تحقیق کاری ایک طرزِ زندگی ہے جس میں باقاعدگی، ذاتی دلچسپی اور سچی لگن سے کام لیا جاتا ہے۔ حقائق کی تلاش، چھان پھٹک، نتائج کا حصول یہ سب صبر آزما کام ہیں۔

ہر حاصل ہو جانے والے مواد کو آسانی سے تسلیم کر لینا محنت اور صبر کی شرط کے خلاف ہے۔ تحقیق کار کو احتیاط اور تنقید سے کام لیتے ہوئے مزید تلاش کا عمل جاری رکھنا ہوتا ہے۔ اس کے لیے وہ تجسس اور حقیقت کو کام میں لائے، بے صبری نہ کرے، جلدی نہ گھبرائے اور دیر تک تلاش اور جستجو میں محو رہ سکے۔ تحقیق ایک بہت آہستہ رو عمل ہے۔ اس میں فوری نتائج کی توقع نہیں رکھی جا سکتی۔ محنت میں صبر و تحمل بھی ایک شرط ہے۔ ایسا تحقیق کار جو تمام تر بہتر ڈیزائن اور طریق کار کے باوجود اپنی تحقیق کو انجام تک نہ پہنچا سکے اور اسے ترک کر دے، وہ ایسے محقق سے افضل ہے جو جلد بازی سے چند نتائج حاصل کر کے رپورٹ پیش کر دے کہ جو بعد میں انتہائی غلط اور برے ثابت ہوں۔ تحقیق ابتدا ہی سے صبر و ضبط کی آزمائش شروع کر دیتی ہے۔ کوائف کی فراہمی کے دوران میں بعض اوقات حوصلہ شکن

حالات سے سابقہ پڑتا ہے۔ فاصلے، وقت، اخراجات، عدم دستیابی اور کئی طرح کے مسائل سامنے آتے ہیں۔ پھر کوائف کی چھان پھٹک، موازنے، تجزیے اور استخراج میں برداشت کی ایک طویل آزمایش ہوتی ہے۔ بعض اوقات طویل تحقیق کے بعد بھی کچھ ہاتھ نہیں آتا یا پھر نتائج محنت کے مقابلے میں تھوڑے ہوتے ہیں۔ یوں سچی لگن کے بغیر ضبط و تحمل سے کام لینا بھی مشکل ہو جاتا ہے اور یہ محض اضافی مشقت سی محسوس ہونے لگتی ہے۔

ثلاثی شرائط

تحقیق کے میدان میں اس سے متعلقہ تکنیکی تعلیم و تربیت بہت ضروری ہے۔ جدید تحقیق اس کے بغیر انجام نہیں پا سکتی۔ تحقیقی مہارت کے حصول کے لیے تحقیق کار کو ان بنیادی علوم و فنون اور تکنیکوں میں تعلیم و تربیت درکار ہوتی ہے، جن سے تحقیق کا میلان وجود میں آتا ہے۔ ان میں سے چند حسب ذیل ہیں:

1- تحقیق کار کو اپنے نفسِ مضمون پر عبور حاصل ہو اور وہ اس مضمون میں مہارت رکھتا ہو۔

2- وہ اصولِ تحقیق سے کما حقہٗ واقف ہو۔ خاص طور پر سائنسی طریق کار کو جانتا ہو۔

3- اسے دستاویزات اور کتب خانے سے مواد کے حصول کا خاصا تجربہ ہو۔

4- اس کا مطالعہ وسیع تر ہو۔ کیونکہ تحقیق کا موضوع، مسئلہ، فرضیہ، مفروضے، حدود، تحدید وغیرہ اسی وسعتِ مطالعہ سے برآمد ہوتے ہیں۔

5- اسے نتائج حاصل کرنے کے لیے استدلال، تفکر اور بیان یعنی اُصولِ تحریر سے پوری آگہی حاصل ہو۔

6- تحقیق میں نفسیات، عمرانیات/سماجیات اور شماریات جیسے علوم سے آگاہی درکار ہوتی ہے۔

7- اسے تحقیق میں بنیادی اخلاقی امور کی تربیت دی گئی ہو یعنی معلومات کے ماخذ کو صیغۂ راز میں رکھنا، کاپی رائٹ کا احترام کرنا، ردِ عمل ہمیشہ مثبت ہونا، دوسروں کی عزتِ نفس کا خیال رکھنا اور تحقیقی متن میں اپنی ذات کے لیے "میں"، "میرے" کے الفاظ استعمال نہ کرنا، وعدہ خلاف نہ ہونا، اپنی کوتاہیوں کا ذکر نہ چھپانا وغیرہ۔

تحقیق کار یا محقق کو آخری صفات یعنی اخلاقی امور پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ عام طور پر دوسروں کی تحقیقات سے استفادہ کرتے ہوئے ان کا حوالہ نہ دینا یا ان کے دیے گئے مطالعاتی حوالوں کو اپنے مطالعے کے حوالے بنا کر پیش کرنا انتہائی غیر اخلاقی ہی نہیں غیر تحقیقی حرکت بھی ہے۔ یہ بیان کہ تحقیق کار کسی ماخذ تک نہیں پہنچ سکا اور کسی مواد یا حدود وقت کو ملحوظ نہیں رکھ سکا، اس کی تحقیقی وقعت میں اضافہ کر دیتا ہے کیونکہ اس سے قاری کو اس کی حدود کار کا علم ہو جاتا ہے اور تحقیق پر صحیح اعتبار قائم ہو سکتا ہے۔

پہلی اور اساسی شرط یعنی متعلقہ زبان و ادب پر تحقیق کار کی مکمل مہارت کا مفصل ذکر بھی کر دینا ضروری ہے۔ تحقیق کار جس زبان یا لسانی اور ادبی شعبے میں ماہر ہو اسے تحقیق کا کام صرف اسی میں انجام دینا چاہیے۔ اس کا زندگی بھر کا مطالعہ، رجحان اور نقطۂ نظر ہی اس کے تحقیقی میدان کو متعین کرتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اگر وہ زبانوں کے تقابلی مطالعے کا کام انجام دینا چاہتا ہو تو اسے دوسری زبانوں پر بھی (ایک حد تک) مہارت حاصل ہونی چاہیے۔

8-ادبی تحقیق میں سائنسی اُصول

یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ ادبی تحقیق میں سائنسی طریق کا استعمال کس طرح سے شروع ہوا لیکن اتنا معلوم ہے کہ سماجی علوم کی تحقیق میں زبان اور ثقافت کے ادب کے ساتھ باہمی اثرات کی پیمائش کا سوال پیدا ہوا تو جدید ادبی تحقیق کے اصول سامنے آنے لگے۔ سماجی علوم میں سائنسی طریق تحقیق جہاں تک زیر استعمال آ سکتا تھا، ادبی ولسانی تحقیق میں بھی در آیا۔ بنیاد معروضیت اور پیمائش ہی پر رہی۔ گویا تھارن ڈائیک اور کوہن کے نقطۂ نظر ہی نے فروغ پایا۔ ادبی تحقیق کی بنیاد ادبی نظریے کی چوحدی (Paradigm) میں استوار ہونے لگی اور یوں جانز ہوپکنز یونیورسٹی کی کتب اور جان لے (John Lye) کے نقطۂ نظر کی بات قابلِ قبول ٹھہری۔

ایڈورڈ سعید کے نزدیک ادبی تحقیق کا مستقبل علمِ زبان (Philology) اور ثقافت کے مطالعے میں پوشیدہ ہے۔

سائنسی طریق پر اعتراضات بھی ہوئے ہیں، جس کا آغاز تو کوہن (1961ء) ہی سے منسوب ہے لیکن اس کے بعد بھی کئی افراد اس میدان میں سامنے آئے اور انھوں نے اس پر بھرپور تنقید کی۔ مائیکل پیلانگی (Michael Palangi) نے 1958ء میں اپنی کتاب **Personal Knowledge** میں کہا تھا کہ اگر پہلے سے کوئی طریقہ ذہن میں رکھ کر کام کیا جائے گا تو نتیجہ اسی چوحدی، حیطہ یا دائرہ کار میں ظاہر ہو گا۔ 1975ء میں پال فیرابینڈ (Feyerabend) نے اپنی کتاب **Against Method** میں یہ نقطۂ نظر اپنایا کہ سائنس صرف سائنسی طریق پر پروان نہیں چڑھی۔ وہ سائنسی سماجیات کا قائل تھا۔

مابعد جدیدیت کے دور نے سائنسی طریق کو بھی نہیں بخشا۔ 1992ء میں باؤر نے سائنسی طریق کو محض ایک دیومالائی کہانی قرار دیا۔ اکیسویں صدی میں بھی کئی کتابیں اس طریق پر تنقید کر رہی ہیں لیکن ابھی تک کوئی تبدیلی تجویز نہیں ہو سکی۔ ساؤدرن کیلیفورنیا یونیورسٹی کے ولیم میک کوماس (McComas) نے 1996ء میں سائنسی طریق کے دس غلط تصورات (Myths) کی طرف توجہ دلائی۔ 2000ء میں میری ہالویز (Halwes) نے ایک ویب سائٹ پر **The Myth of Magical Scientific Method** کے نام سے اس طریق پر خاطر خواہ اعتراضات کیے لیکن وہ بھی کوئی متبادل طریق وضع نہیں کر سکے۔ گویا کوہن کے بعد ابھی تک سائنسی طریق تحقیق میں کوئی تبدیلی تجویز نہیں کی جا سکی۔ اس لیے ادبی تحقیق میں سائنسی طریق استعمال کرتے ہوئے ہم صرف تحقیقی اقدامات ہی کو ملحوظ رکھیں گے۔

اقسامِ تحقیق

تیسرا باب

تحقیق کی اقسام

ادب تحقیق کا موضوع بن سکتا ہے۔ ادب کی نوعیت، موضوع، طریق، ڈیزائن، مقاصد، واسطے اور حتمی منزل کے لحاظ سے اس کی کئی قسمیں قرار دی جا سکتی ہیں۔ لسانی ہو یا ادبی تحقیق کا ڈیزائن تیار کرتے ہوئے ان پہلوؤں کو ملحوظ رکھنا ضروری ہوتا ہے۔

1۔ نوعیت/موضوع/طریق کار کی اقسام

ہمارے ہاں تحقیق کی دو اقسام عام ہیں۔ ایک سندی تحقیق اور دوسری عمومی، نجی یا اصولی تحقیق۔ یہاں ہمارا مقصود زیادہ تر سندی تحقیق ہے۔ تحقیق کی اقسام کو اسی حوالے سے سمجھا جانا چاہیے:

(الف) نوعیت کے لحاظ سے اقسام تحقیق

نوعیت کے اعتبار سے جدید تحقیق کی دو واضح اقسام ہیں:

1- کمیتی تحقیق یا مقداری تحقیق (Quantitative Research)
2- کیفیتی تحقیق یا معیاری تحقیق (Qualitative Research)

پہلی قسم میں ایسے حقائق جمع کیے جاتے ہیں جنھیں ہم ناپ، تول، گن سکیں۔ جیسے کسی شخصیت کے کوائف، کسی زبان کے اعداد و شمار، کسی فن پارے میں استعمال ہونے والے کسی مخصوص لفظ کی کل تعداد، لفظیات، اصطلاحات یا دیگر مطالعہ جاتی کوائف وغیرہ۔ دوسری قسم میں عام طور پر نظری، فلسفیانہ انتقادی، تاریخی، دستاویزی امور زیر بحث لائے جاتے ہیں جنھیں نقد و نظر کے اصولوں پر پرکھا جاتا ہے۔ عام طور پر تعلیم اور نفسیات کے میدانوں میں یہ تحقیقات انجام دی جاتی ہیں۔ ادب میں بھی مطالعۂ احوال اور کسی سماجی پہلو سے بیانیہ مساحت میں یہ انداز اختیار کیے جا سکتے ہیں۔

(ب) موضوع کے لحاظ سے اقسام تحقیق

موضوع کے لحاظ سے جدید تحقیق کی پانچ اقسام بنتی ہیں:

1- محض علمی یا سندی تحقیق (Academic Research)

ادبی و علمی دنیا، تدریسی اداروں یا اکادمیوں میں ایسے موضوعات پر تحقیق کرنا جن سے طلبہ اور اساتذہ اپنے نظری مطالعے کے حوالے سے علمی وسعت پیدا کر سکیں۔ جامعات میں طلبہ اور اساتذہ کی تحقیق اس نوعیت سے تعلق رکھتی ہے۔ اسے ہم سندی تحقیق یا تفویضِ کار کا نام بھی دیتے ہیں۔ عموماً اس کی حیثیت وقتی اور کام جزوی یا مخصوص ہوتا ہے۔ غیر عملی، اضافی اور بنیادی تحقیق کو بھی محض علمی، Academic Work یا ''کارِ فضول'' کہا جاتا ہے۔ یعنی ایسا کام انجام دینا جو علم برائے علم میں تو کام آئے لیکن اس کی کوئی اطلاقی ضرورت نہ ہو۔ اسے رپورٹ/تفویض یا مشق بھی قرار دیتے ہیں اور بنیادی تحقیق بھی کہتے ہیں۔ یہ بے حد محدود ہوتی ہے اس سے صرف چھوٹے پیمانے کی تحقیق انجام دی جا سکتی ہے جس کی قبولیت محض کسی ڈگری کے حصول تک ہو سکتی ہے۔

2- سائنسی تحقیق (Scientific Research)

عملی میدان میں ایسے تحقیقی منصوبے جو عموماً اداروں کی طرف سے سائنسی ضروریات یا موضوعات کے لیے انجام دیے جاتے ہیں، اسی ذیل میں آتے ہیں۔ اس میں مشاہدات اور تجربات استعمال کیے جاتے ہیں۔ لسانی تحقیق میں اس سے کسی قدر کام لیا جاتا ہے۔ یہ عموماً مشاہداتی اور تجرباتی طریقے استعمال کرتی ہے۔ ادبی مشاہدات کو بھی تجربی تحقیق کا حصہ بنایا جا سکتا ہے، لیکن یہاں ہماری مراد طبعی علوم کی سائنسی تحقیق سے ہے۔ سائنسی طریقِ کار یہاں مراد نہیں۔ البتہ مشاہدے اور تجربے کے طریقے استعمال کیے جاتے ہیں۔ سائنسی تحقیق بھی جب تک معاصر جائزے سے نہ گزرے، قابلِ قبول نہیں ہوتی۔

3- سماجی تحقیق (Social Research)

انسانیت کے مجموعی تقاضوں، معاشرے کے عمومی رجحانات، رویوں اور تقاضوں پر تحقیق۔ یہ بھی عموماً اداروں ہی میں انجام دی جاتی ہے یا پھر معاشرے کی فلاح و بہبود کے مقصد کے لیے بعض ایجنسیاں اور افراد بھی یہ تحقیق انجام دیتے ہیں۔ نفسیاتی اور عمرانی یا سماجی تحقیق ادب اور زبان کے کئی پہلوؤں پر بھی انجام دی جا سکتی ہے۔ خاص طور پر شخصیت کا جائزہ، مطالعۂ احوال یا کوئی زبان بولنے والوں یا مطالعہ کے رجحانات وغیرہ۔ اسے سماجی لسانیات اور نفسی لسانیات کی تحقیق میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ ادب کے سماجی اثرات اور ادب کے بارے میں سماجی رویے، ثقافتی تجزیے اور ادبی نظریے کی بحث اس حوالے سے کی جا سکتی ہے۔

4- فنیاتی تحقیق (Technological Research)

جدید ترقیاتی، انجینئری یا فنیاتی میدانوں میں صنعت و حرفت کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ٹکنالوجی اور انجینئرنگ کے بعض پہلوؤں پر یہ تحقیق انجام دی جاتی ہے اور ایسے ذرائع معلوم کیے جاتے ہیں جو صنعت و حرفت کی حالت اور پیداوار کا جائزہ لے سکیں۔ عام طور پر یہ بھی ادارہ جاتی تحقیق ہوتی ہے۔ اس میں

بھی اکثر اوقات تجربی طریقے استعمال کیے جاتے ہیں۔

5- تعلیمی تحقیق (Educational Research)

تعلیمی موضوعات، میدانوں یا نظام، اس کے تقاضوں اور ضروریات کے حوالے سے بڑے بڑے تحقیقی منصوبے جو انفرادی اور اجتماعی یا ادارہ جاتی سطح پر انجام دیے جاتے ہیں، تعلیمی تحقیق کہلاتے ہیں۔ زبان وادب کے حوالے سے اس کی تدریس، نصاب اور تعلیمی نظام میں اس کے حصے، زبان کے طلبہ کی مشکلات اور تدریسی طریقوں کو اس کا موضوع بنایا جا سکتا ہے۔ گویا زبان وادب کے حوالے سے بھی تعلیمی تحقیق انجام دی جاتی ہے۔ جیسے نظم کی تدریس، افسانے کا مطالعاتی پہلو وغیرہ۔

6- لسانی وادبی تحقیق (Lingual and Literary Research)

اگرچہ زبان وادب کے موضوع پر بہت سا تحقیقی کام انجام دیا جاتا ہے جیسے مسودات کی تدوین، مخطوطہ شناسی، انتقادی جائزے وغیرہ لیکن ابھی اسے تحقیق کی قسم ماننے میں ماہرینِ اصولِ تحقیق کو تامل ہوتا ہے۔ شاید کبھی اس کے تحقیقی طریقوں میں اصلاح کے بعد اسے بھی ایک قسم تسلیم کر لیا جائے گا مگر یہ تبھی ہو سکے گا جب ادب اور زبان کے شعبے تحقیقی ڈسپلن کے اصولوں اور تکنیکوں کو عام کریں گے اور معروضی بنیادوں پر نتائج اخذ کریں گے، خواہ تدوینِ متن ہی میں ایسا کیا جائے۔ اس میں محض قیاس کے گھوڑے دوڑانے سے بڑھ کر اب نقد ونظر کو بھی تحقیق اور آزمائش کی چھلنی سے گزارنا اور معاصر جائزے کا ہونا ضروری قرار دیا گیا ہے۔ انفرادی سے زیادہ اب یہ ادارہ جاتی ہے۔

(ج) طریقِ کار کے لحاظ سے اقسامِ تحقیق

طریق (Method) کے اعتبار سے جدید تحقیق کی تین واضح اقسام بیان کی جاتی ہیں:

1- دریافتی / تاریخی یا دستاویزی تحقیق (Documentary Research
Historical or Exploratory)

2- بیانیہ یا مساحتی تحقیق (Descriptive or Survey Research)

3- تجرباتی یا کنٹرول تحقیق (Experimental or Controlled Research)

پہلی قسم کی تحقیق کو لائبریری تحقیق بھی کہتے ہیں جو عموماً تحریری مواد یا دستاویزات کو چھان پھٹک کر دریافت کر کے انجام دی جاتی ہے۔ اس کا تعلق ماضی کے شواہد سے ہوتا ہے۔ یہ تحقیق ہمیں صرف کوئی رائے قائم کرنے میں مدد دیتی ہے یا کسی پہلے سے موجود رائے کو بدلنے کا موقع فراہم کرتی ہے۔ ادبی اور لسانی تحقیقی موضوعات عموماً اسی سے متعلق ہوتے ہیں اور ان میں زیادہ تر یہی تحقیقی قسم استعمال کی جاتی ہے۔ اس تحقیق سے ادبی مؤرخ فائدہ اٹھاتا ہے۔ گویا یہ زمانہ ماضی کی تحقیق ہے۔ اسے طنزیہ طور پر گورکنی بھی کہتے ہیں۔ لیکن کوئی بھی فرضیہ قائم کرنے کے لیے ایسی تحقیق بنیادی دریافتی حیثیت رکھتی ہے۔ کسی بڑے منصوبے یا

پراجیکٹ کا یہ پہلا مرحلہ ہوسکتا ہے جو سروے کے بعد متعلقہ ادبیات کے جائزے کے لیے انجام دیا جائے۔

دوسری قسم کی تحقیق زمانہ حال میں انجام دی جاتی ہے اور عموماً آراء پر سروے یا مساحت کے نتائج مہیا کرتی ہے۔ حالیہ زبان اور ادب کے رجحانات اس سے معلوم کیے جاسکتے ہیں اور آئندہ کی تحقیق کے لیے فرضیے قائم کیے جاسکتے ہیں۔ زبان وادب کے ترقیاتی ادارے اس سے مستفید ہوتے ہیں۔ یہ قسم کوئی فیصلہ نہیں کرتی بلکہ رائے فراہم کرتی ہے۔ سروے نمائندہ نمونوں سے فراہم کیے جاتے ہیں اور نتائج کا اطلاق کل پر کیا جاتا ہے۔

تیسری قسم کی تحقیق متغیرات (Variables) کو قابو میں لاکر تجربات کے ذریعے نتائج اور کلیات تک پہنچنے کی کوشش کا نام ہے۔ افراد یا اشیا کے دو گروہ بنا کر ایک پر روایتی اور دوسرے پر مطلوبہ طریقوں سے تجربات کر کے ان دونوں کے نتائج کا تقابلی مطالعہ کیا جاتا ہے۔ ادبی ولسانی رجحانات، نفسیاتی اور تعلیمی امور اور سائنسی وتکنیکی کاموں میں سائنسی تجزیے کے لیے اس قسم کی خالص تحقیق سے کام لیا جاتا ہے۔

2- ڈیزائن/ مقاصد/ واسطے کی اقسام

(الف) تحقیقی ڈیزائن کے لحاظ سے اقسامِ تحقیق

تحقیقی ڈیزائن یا ارادے کے اعتبار سے جدید تحقیق کی چودہ اقسام بنتی ہیں جن میں کمیتی، کیفیتی، تاریخی، بیانیہ یا تجرباتی تحقیق سے ماورا اپنے مقاصد اور طریق کار کو ملحوظ رکھا جاتا ہے، انھیں ادارہ جاتی تحقیق کے منصوبوں میں ملحوظ رکھا جاتا ہے:

1- تجزیاتی تحقیق (Analytical Research)

اس ڈیزائن میں اعداد وشماریا کوائف کے گروپ جمع کیے جاتے ہیں اور یوں ان اصولوں کو ممتاز کیا جاتا ہے جو اقدام (Action) کے رہنما ہوتے ہیں۔ زبان کے مختلف سانچوں اور نمونوں کو اس طریقے سے پرکھا جاسکتا ہے۔ اس میں تخصص اور مہارت درکار ہوتی ہے۔ شماریاتی جائزے اور تجزیے بھی اس کا حصہ ہوتے ہیں۔ مطالعے اور کتابوں کی مارکیٹ یا بازارکاری اور دیگر رجحانات کے لیے اس قسم کی تحقیق استعمال ہوتی ہے۔

2- تقابلی تحقیق (Comparative Research)

احوال کی دو یا دو سے زیادہ صورتوں کا باہمی مطالعہ کر کے ان کے مابین مشابہات، اختلافات اور اثرات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ زبان وادب کے حالیہ رجحانات اور سماجی لسانیات کا مطالعہ اس کے ذریعے بہتر طور پر کیا جاسکتا ہے۔ کئی لسانی وادبی شعبوں میں اس طریقے پر مطالعۂ احوال وشخصیت کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

3- ہم ربطی پیش گو (Correlational Predicative)

اس تحقیقی طریق کار کے تحت باہم متعلق مظاہر میں باہمی تعلق کی مستقل عددی مقداروں کے مابین

تعلق تلاش کر کے اس کی تشریح کی جاتی ہے اور اس کی بنیاد پر اس بات کا کھوج لگایا جاتا اور پیش گوئی کی جاتی ہے کہ ایک عامل میں تبدیلی دوسرے میں کس قدر تبدیلی کی عکاسی کرتی ہے اور پھر ان حاصلات کی تشریح و تعبیر کی جاتی ہے۔ سماجی لسانیات میں یہ ڈیزائن پسندیدہ ہے۔ مستقبل کے لسانی امکانات کا جائزہ اس طریقے سے لیا جا سکتا ہے۔ یہ تجرباتی تحقیق کے طریق کار کے استعمال کا نام بھی ہے۔

4-ڈیزائن اور مظاہری (Design & Demonstration)

اس تحقیق قسم میں اسباب پر قابو پانے کے منصوبے، رہنمائی اور مشاورت کے پروگرام، ساز و سامان کی تیاری اور پیشہ ورانہ امور کے پروگرام وغیرہ تیار کیے جاتے ہیں۔ سماجی منصوبوں میں اس قسم کا ڈیزائن استعمال ہوتا ہے۔ سماجی لسانیات اور مطالعاتی ادبی رجحانات وغیرہ پر تحقیق اس طریقے کی مرہونِ منت ہے۔ یہاں لفظ ڈیزائن کو عمومی معنوں میں لیا جائے تو مفہوم سمجھ میں آتا ہے۔

5-ترقیاتی تحقیق (Developmental Research)

اس نوعیت کی تحقیق میں ایک یا ایک سے زیادہ قابلِ مشاہدہ عوامل میں اضافے، نمو یا کمی کو کسی خاص دورانیے میں معلوم کر کے چارٹ تیار کیا جاتا ہے۔ لسانی، ادبی، سماجی، نفسیاتی ہر قسم کے موضوعات کا مطالعہ اس طریقے پر ممکن ہے۔ عام طور پر سماجی منصوبوں میں اس تحقیق سے مدد لی جاتی ہے۔ اس کے لیے عام طور پر گینٹ (GANTT) چارٹ وضع کیا جاتا ہے۔ پائی اور بار گراف کے چارٹ بھی تیار کیے جا سکتے ہیں۔

6-خالص تجرباتی تحقیق (Experimental Research)

تجرباتی تحقیق کے ذریعے ایک گروہ میں ایک یا ایک سے زیادہ متغیرات کو قابو میں رکھا جاتا ہے اور دوسرے گروہ میں عمومی حالات کا مشاہدہ کیا جاتا ہے اور ہر دو گروہوں پر کسی عامل کے اثرات کے فرق کا تقابلی مطالعہ کیا جاتا ہے۔ سماجی تحقیق کا یہ اصول سائنسی تحقیق کا مرکزی طریقہ ہے۔ لسانی اور ادبی مسائل کا تجرباتی مطالعہ اس طریقے سے ممکن ہے۔ اس میں دونوں گروہوں کا ہر لحاظ سے ایک جیسا ہونا ضروری ہوتا ہے۔

7-تاریخی یا دستاویزاتی تحقیق (Historical or Documentary Research)

اس طریق تحقیق کے تحت ماضی کی تعبیرِ نو کے لیے افراد، ادبیات یا سرگرمیوں اور واقعات کا مطالعہ اس طور سے کیا جاتا ہے کہ ان کی اثر پذیری کی غیر جانبدارانہ تشریح کی جا سکے اور مستقبل میں ایسے امور کی اٹھان یا تعمیرِ نو میں مدد لی جا سکے۔ ادبیات میں عام طور پر اس کا مقصد تاریخ ادب میں کسی ادب پارے یا ادیب کی وقعت اور حیثیت کا اندازہ لگانا ہوتا ہے نیز زبان اور لسانیات میں حال اور مستقبل کے امکانات کی پیش گوئی کرنے کے لیے ماضی کے رجحانات اور مطالعات سے کلیات اخذ کرنا ہوتا ہے۔ ادبی و لسانی ضروریات کے لیے اس کا مفصل جائزہ اور طریق کار آگے چل کر پیش کیا گیا ہے۔ مواد کی فراہمی، تجزیہ اور تشریح اس میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ داخلی اور خارجی شواہد پر انحصار کیا جاتا ہے۔ گویا روایت اور درایت جرح و تعدیل،

ہر اصول سے کام لیا جاتا ہے۔

8- آراء کا تعین (Opinion Polling)

تحقیق کی اس قسم کے تحت مخصوص گروہوں کے طرز عمل، عقائد، نیتوں اور ارادوں کا تعین، ان کی رپورٹ اور تشریح کے لیے سروے اور دوسرے آلات استعمال میں لائے جاتے ہیں۔ مطالعے کے رجحانات، زبان میں تبدیلی کے انداز وغیرہ کا مطالعہ اس طریقے سے ممکن ہے۔

9- حیثیتی تحقیق (Status Research)

ایک یا ایک سے زیادہ مظاہر کے منتخب نمونوں (Samples) کو علیحدہ کر کے معائنہ کرنا تاکہ پوری تحقیق کے خصائص معلوم ہو سکیں۔ زمانہ حال کے بارے میں تحقیق اس طریقے سے ممکن ہے۔ زبان اور ادب ہر دو میں اسے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ادارہ مطالعۂ پاکستان، قائداعظم یونیورسٹی اور مقتدرہ کے مطالعات اسی نوعیت کے ہیں۔ دو اہم میدانوں: ایک لسانی بندوبست (Language Management) اور دوسرے ترقی و تنظیم (Development and Organization) کے لیے یہ ڈیزائن استعمال میں لایا جاتا ہے۔ لسانی پالیسی کا تعین اس سے ہو سکتا ہے۔ ادبی نظریے کی جانچ پڑتال اس کے ذریعے کی جا سکتی ہے۔

10- نظری تحقیق (Theoretical Research)

اس تحقیق میں کوائف یا مظاہر کے با کفایت اور متعینہ تشریحی اصول وضع یا تجویز کیے جاتے ہیں جو نظریہ قائم کرنے میں مدد دے سکیں۔ ادبی یا لسانی نظریہ قائم کرنے کے لیے اس قسم کی تحقیق کو استعمال میں لایا جا سکتا ہے، تاہم اس کے لیے تحقیقی ڈیزائن وضع کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ کسی بھی نظریے یا اصول کو جانچنے کے لیے بھی اس تحقیق کو استعمال میں لایا جا سکتا ہے۔ تنقیدی رائے بھی اس کے ذریعے جانچی جا سکتی ہے۔

11- رواجی تجزیہ (Trend Analysis)

اس قسم میں زبان، مطالعہ یا سماجی کردار کے حوالے سے رویوں کے بدلتے ہوئے رجحانات اور رواجوں کا مطالعہ اس طرح سے کیا جاتا ہے کہ ان کے رخ کی شناخت ہو سکے اور پیش گوئی ممکن ہو۔

12- مطالعۂ احوال (Case Study)

ایسی تحقیق میں کسی فرد، ادارے یا گروہ کے نفسیاتی، سماجی یا ماحولیاتی و ادارہ جاتی کوائف کا تقابل اس کی نمو، ترقی، حالات اور نتائج سے کیا جاتا ہے تاکہ داخلی اور خارجی اثرات کا پتا چل سکے۔ احوال و آثار اور شخصی مطالعے کے دستاویزی طریقے کی بہ نسبت اس طریقے سے خاص طور پر زندہ اشخاص/ ادیبوں/ ماہرین کے مطالعے میں اس سے خاص مدد ملتی ہے۔ جدید جامعات میں ادیبوں/ شاعروں کا مطالعہ ایسے ہی طریقوں سے کرایا جانے لگا ہے۔ بعض نفسیاتی الجھنوں اور سماجی مسئلوں کا جائزہ اس قسم کے ذریعے لیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے اپنی کتاب میں ادیبوں کے ایسے مطالعے کی چند مثالیں درج کی ہیں۔

13-نیم تجرباتی (Quasi Experimental)

جہاں کسی عامل یا متغیرہ (Variable) پر پوری طرح قابو نہ پایا جا سکے جیسے فروخت کے رجحانات، مطالعہ کے رجحانات یا زبان بولنے والوں پر کسی تبدیلی کے عامل کا جائزہ وغیرہ وہاں تقابل یا تنگ بندی کے لیے نیم تجرباتی طریق کار استعمال کیا جاتا ہے۔اس قسم کی تحقیق ایک مسلسل عمل ہوتی ہے اور وقفے وقفے سے انجام دی جاتی ہے۔عام طور پر ادارے ایسا طریقِ تحقیق استعمال کرتے ہیں۔اسے بار بار سروے کا نام بھی دیا جاتا ہے۔

14-جائزہ کاری (Evaluation)

اس قسم کی تحقیق میں کسی منصوبے یا تحقیق کے کسی خاص ڈگر پر زد بہ تکمیل ہونے اور مخصوص نتائج برآمد ہونے کی توقع کی جاتی ہے۔اس تحقیق میں یہ جائزہ لیا جاتا ہے کہ کیا متوقع نتائج برآمد ہو سکیں گے اور اگر ہو سکیں گے تو کس حد تک؟ طریق کا جائزہ ہیئتی (Formative) اور نتائج کا جائزہ اجتماعی (Summative) کہلاتا ہے۔

(ب) مقاصد کے لحاظ سے اقسامِ تحقیق

1- اساسی تحقیق (Basic Research)

خالص یا عمومی نوعیت کے موضوعات پر کسی مسئلے یا شے کے بارے میں بنیادی معلومات اخذ کرنا اس طریقِ تحقیق کا مقصد ہوتا ہے۔لسانی، ادبی، سماجی موضوعات وغیرہ کی اکثر تحقیقات اسی طریقے پر انجام دی جاتی ہیں۔عمومی اصول وضع کرنا، تعبیر نو کرنا یا نئے نظریے وضع کرنا اس کا بڑا مقصد ہوتا ہے۔اس میں عموماً محرکات کو جاننا اور صداقت کو پرکھنا شامل ہوتا ہے۔اس لیے اسے نظری یا فلسفیانہ تحقیق بھی کہا جاتا ہے۔کسی بڑے تحقیقی منصوبے میں یہ اطلاقی تحقیق سے پہلے کا مرحلہ قرار پاتی ہے۔اسے پائلٹ سٹڈی بھی قرار دیا جاتا ہے۔

2-اطلاقی تحقیق (Applied Research)

اس طریقے میں کسی مسئلے یا شے کے حصول کے طریقے کی افادیت معلوم کی جاتی ہے۔خاص طور پر فروخت، تجارت، سماجی صورت حال یا سائنس و ٹکنالوجی کی ضروریات کے حوالے سے اس میں تحقیق انجام دی جاتی ہے۔اسے عملی یا اطلاقی تحقیق بھی کہا جاتا ہے۔جدید ترقیات میں اطلاقی تحقیق کا بہت چرچا ہے۔اس میں تجرباتی طریق کار بھی استعمال میں لایا جا سکتا ہے۔ادب کا اطلاقی و سماجی پہلو بھی یہاں زیرِ غور آ سکتا ہے۔

3-اقدامی تحقیق (Action Research)

یہ تحقیق عام طور پر متعلقہ میدان کے لوگ انجام دیتے ہیں۔خاص طور پر اساتذہ، اتالیق اور

تربیت کار کے لیے یہ طریقہ استعمال میں لایا جاتا ہے۔ تحقیق کار اس اقدام میں شامل ہوتا ہے جو وقوع پذیر ہو رہا ہوتا ہے۔ اس کے نتائج فوری طور پر قابل اطلاق ہوتے ہیں۔ محدود موضوع، فوری نتائج، غیر نظری، کم خرچ اور بہتر کارکردگی کی تلاش کے لیے یہ قسم استعمال ہوتی ہے۔ اس میں مسئلے کے حل اور تدارک کے اقدامات تجویز کیے جاتے ہیں۔ ادبی و لسانی حوالے سے بھی اس میں محدود اور مقامی مسئلے زیر تحقیق لائے جاتے ہیں اور ان کے فوری حل اور اطلاق کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس قسم کی تحقیق سے نظریے یا اصول وضع نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ عام طور پر اسے تحقیق تسلیم ہی نہیں کیا جاتا۔ اس قسم میں مندرجہ ذیل چار خصوصیات ہوتی ہیں:

1- کسی عمل میں خاص صورت پر مسئلہ اس کا ہدف ہوتا ہے۔
2- اس میں اجتماعی شرکت درکار ہوتی ہے۔ یعنی تحقیق کار خود ایک عامل بھی ہوتا ہے۔
3- یہ تبدیلی کا بڑا عامل ہوتی ہے۔
4- اس کا حل ہر جگہ کے لیے عمومیت یا فیصلہ کن حیثیت نہیں رکھتا۔

3- سائنسی و ادبی تحقیق کا موازنہ

یہاں سائنسی تحقیق سے ہماری مراد اس سائنٹیفک طریق کار سے ہے جو کسی بھی میدان میں، خواہ وہ ادب ہو، تحقیق کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ ادب کے کسی مسئلے پر تحقیقی سوالات اٹھتے ہوں تو ان کے کسی موزوں ترین جواب یا حل کو جانچنے کے لیے اس طریق کار کو استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ کوائف کی جمع آوری، تجزیے اور فرضیے کی توثیق و تردید کا نام ہے۔ عام سائنس میں مشاہدات اور تجربات بھی اس کا حصہ ہوتے ہیں۔ اس میں ذاتی رائے یا موضوعی اطلاقات یا عمومی منطق اور دلائل سے گریز کیا جاتا ہے اور دوسروں کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ بھی ایسا تجزیہ کریں تو یہی نتائج برآمد ہوں گے۔ مسلمانوں میں جابر بن حیان، ابن الہیثم اور ابوالبرکات البغدادی ایسے سکالر تھے جو سائنسی تحقیق کے بانیوں میں شمار ہوتے ہیں۔ البیرونی، ابن سینا اور ابن رشد اس طریقے کو استعمال کرتے رہے۔ فرانسس بیکن سے بہت پہلے یہ طریق وجود میں آ چکا تھا۔ ڈیکارٹ اور تھارن ڈائیک اسے آگے بڑھانے والوں میں سے تھے۔ ادب میں اس کا اطلاق کرنے والوں کا ذکر آگے آتا ہے۔

☜ ادب اور سائنس کو عام طور پر دو متضاد میدان سمجھا جاتا ہے۔ ادب کو داخلی اور موضوعی اور سائنس کو خارجی اور معروضی قرار دیا جاتا ہے؟ جب کہ دونوں تلاشِ حقیقت میں سرگرداں ہیں اور اپنے ماحصل کو سابقہ تجربہ کی روشنی میں واضح کرتے ہیں۔ سائنسی اور ادبی تحقیق میں موازنہ کرتے ہوئے بھی یہ خیال ملحوظ رہے کہ خواہ تحقیقی اصولوں کو ہم کتنا ہی معروضی بنالیں۔ بہر کیف ادبی تحقیق خارجی نہیں داخلی ہوتی ہے۔ ہم اس کو کتنے ہی معروضی پیمانوں سے ناپنے کی کوشش کریں بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر۔ ادبی تحقیق میں تحقیق کار خود اس کا حصہ بن کر اپنی رائے دیتا ہے چونکہ شواہد اور کوائف تک مکمل رسائی ممکن نہیں ہوتی، اس لیے ادبی تحقیق

میں درست مواد کا حصول ممکن نہیں ہوتا یا پھر گروہی تعصبات کی شمولیت کا خدشہ ہوتا ہے۔ چونکہ تاریخی تحقیق کے حوالے سے حالات وواقعات دہرائے نہیں جاسکتے ،اس لیے تجربہ گاہ کی طرح کی تجرباتی تحقیق ممکن نہیں ہوتی اور چونکہ اس میں متغیرات زیادہ ہوتے ہیں جو اپنے کوائف اور فکری اثرات رکھتے ہیں، اس لیے ادبی تحقیق میں اشیاء کی ماہیت کا معروضی تعین نہیں ہو پاتا جو سائنسی تحقیق میں ضروری ہے۔ اس میں نتائج اخذ کرنے کے لیے قیاس احتمالی، استخراج، استقرا وغیرہ سے کہیں آگے بڑھ کر عالمانہ بصیرت درکار ہوتی ہے۔ تاہم ادبی تحقیق یا سائنسی تحقیق ہو دونوں کے نتائج کی قبولیت محض عالمانہ اتھارٹی (شخصیت) پر نہیں، بلکہ معاصر جائزے پر ہوتا ہے۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ادبی تحقیق پورے طور پر تو سائنسی تحقیق نہیں مگر اس میں سائنسی اصول تحقیق کا استعمال اسے زیادہ سے زیادہ معروضی اور معتبر بنا سکتا ہے، خواہ بات دستاویزات یا متن کی تدوین کی ہو رہی ہو، طریق تحقیق سائنسی اور معروضی ہونا چاہیے۔ تاکہ معاصر جائزے میں یہ تحقیق قابلِ قبول ہو سکے۔

جہاں تک سائنسی، سماجی اور ادبی میدانوں میں تحقیق کے ایک سے اصول استعمال کرنے کا تعلق ہے اس بارے میں اختلاف رائے موجود رہا ہے۔ تھارن ڈائیک (1918ء) کا خیال تھا کہ سائنسی طریق تحقیق فطری علوم میں تو موزوں ہے کہ اس میں مادی عناصر کے باہمی تعلق اور عوامل وعناصر کا مقداری تجزیہ ممکن ہے مگر سماجی علوم میں انسانی رویوں، ذہانت، جذبات اور جذباتی ردعمل کی مقداری پیمائش ممکن نہیں۔ تاہم پیاژے اور سکنر نے اس بات کو غلط ثابت کر دیا اور نفسیات پر مقداری تجزیہ ممکن ثابت کیا۔ ادبی تحقیق میں ابھی ایسے بڑے نابغہ تحقیق یا تحقیقی گروہ کی جگہ خالی ہے جو خوشی، غم، محبت، نفرت کے احساس، جذبہ اور تاثر کی مقداری پیمائش ممکن بنا سکے کہ جس میں مقداری تحقیق کے ساتھ معیاری تجزیہ بھی ضروری ہوتا ہے۔ اس طرح ہم زینا اولیری کے تحقیق کے کلی ہونے کے نظریے کے قریب پہنچ جاتے ہیں جس کا ذکر پہلے ہوا ہے۔ اس مقداری پیمائش کو کسی معروف پیمانے پر بھی رکھ کر دیکھا جا سکتا ہے جیسا کہ پانچ یا سات کا پیمانہ سروے میں آراء کے لیے استعمال ہوتا ہے یا پھر بعض شماریاتی قاعدے جن کا ذکر آگے چل کر کیا گیا ہے، اس تحقیق میں استعمال ہوتے ہیں۔

چوتھا باب

دستاویزی ادبی تحقیق

ادبی اصناف کا ایک حصہ تحقیق بھی ہے۔ تحقیق کی اپنی بھی کئی اقسام اور اصناف ہیں۔ ادبی تحقیق کو تحقیقی اصناف کا ایک حصہ سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس پر تنقیدی نظر دوڑائی جائے کہ کیا سائنسی تحقیق، تعلیمی تحقیق اور سماجی تحقیق کی طرح یہ بھی ایک صنفِ تحقیق ہے؟ عام طور پر ادبی (Literary) و لسانی (Philological) تحقیق کو بہت زیادہ دقت نظری، عمیق بصیرت اور سنجیدہ غور وفکر کے بعد ورطہ تحریر میں لایا جانے والا ایسا تنقیدی میدان سمجھا جاتا ہے جس میں قیاس اور غور وفکر کے گھوڑے بھی دوڑائے جائیں۔

ادبی تحقیق کی سابقہ روایت ایسے ہی مرتبہ (Compiled) دستاویزی مجموعوں کی پیشکش کا نام رہی ہے اور اسے خالص تحقیق کی جدید اقسام کی صورت میں پیش کرنے کی سعی نہیں کی گئی۔ متنی تنقید کو ادبی تحقیق سمجھا گیا۔ زبان پر تحقیق کو بھی ادبی تحقیق میں شامل سمجھا گیا اور اگر انداز بدلا بھی تو چند طریقوں تک محدود رہا۔ ڈاکٹر گیان چند جیسے مصنفین بھی تحقیق کا فن جیسی کتابوں میں بنیادی طور پر سابقہ روایت ہی کی طرز پر مقالے مرتب (Compile) کرنے کو تحریک دیتے رہے اور اسی کو "تحقیق" کہتے رہے۔ یہ دستاویزی کام تاریخی تحقیق کے زمرے میں آتا ہے مگر اس میں بھی تاریخی تحقیق کے سائنسی اصولوں اور تکنیکوں کی عملی صورت بہت کم سامنے لائی گئی۔ ادبی تحقیق باقاعدہ اور معروضی تکنیکوں سے وجود میں آنی چاہیے۔ یہی وہ تیسرا تحقیقی دبستان ہے جو ابھی پروان چڑھنے کے مراحل میں ہے۔

ذیل میں اسی سائنسی و معروضی حوالے سے جدید تحقیق کی مختلف اقسام پر بحث کی گئی ہے۔ ادب، زبان اور لسانیاتی مطالعوں میں عام طور پر دو تین بڑی اقسامِ تحقیق پر زیادہ زور دیا جاتا ہے، یعنی مذکورہ سابقہ مختلف اقسام کی قریبی گروہ بندی کر لی جاتی ہے۔ پہلی قسم دستاویزاتی یا تاریخی تحقیق کی ہے اور دوسری قسم تجزیاتی یا تقابلی تحقیق کی ہے۔ تیسری مطالعۂ احوال کہلاتی ہے۔ تجرباتی تحقیق البتہ ابھی تک شجرِ ممنوعہ ہی سمجھی جاتی ہے۔ علیٰ ہٰذا القیاس۔

دستاویز کسی بھی بصری علامات پر مبنی شے کا نام ہے جو ہمیں اطلاعات یا معلومات مہیا کرتی ہے اور اسے انسانی ریکارڈ کہا جا سکے۔ روایتی طور پر وہ حروف اور علامات پر مشتمل ہوتی ہے۔ ادبی و لسانی تحقیق کی

روایت عام طور پر اسی قسم سے تعلق رکھتی ہے۔ اگر چہ اس قسم کی تحقیق کو ماضی کھنگالنے یا گورکنی کا نام بھی دیا جاتا ہے لیکن عام طور پر ادبی، صحافتی اور لسانی تحقیق اسی ڈیزائن میں انجام دی جاتی ہے۔ اس میں زیادہ تر کام دستاویزات، مطبوعات، آثارات وغیرہ کی مدد سے کتب خانوں میں یا تحقیق کی میز ہی پر بیٹھ کر انجام دیا جاتا ہے اور کوائف وشواہد جمع کر کے کوئی نئی دستاویز یا مقالہ مرتب کر لیا جاتا ہے۔

جدید دستاویزی یا تاریخی تحقیق ماضی کے کوائف کو سائنسی بنیادوں پر پرکھنے کا نام ہے۔ یونیسکو کے ماڈل UNISIST میں دستاویز کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ حصولِ اطلاعات کی ایسی اکائی جو پیراگراف، جزو، باب یا دیب صفحہ یا مضمون یا کتاب کی صورت میں ہو سکتی ہے جبکہ عام طور پر دستاویز کے معانی ایسے تحریر کیے ہیں جو کسی شہادت کے طور پر پیش کی جا سکے یعنی جس میں بنیادی اطلاع یا معلومات موجود ہوں۔

دستاویزی تحقیق میں اصل بنیاد دستاویز یا حوالے کے معتبر ہونے کی ہے۔ یہ اس فرضیے پر ٹکتی ہے کہ کوئی بھی متن یا دستاویز شک سے بالاتر نہیں۔ حوالے، ماخذ یا مصادر دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک کو بنیادی یا حقیقی اور دوسری کو ثانوی یا روایتی مصادر کہا جاتا ہے۔ بنیادی ماخذ میں ابتدائی اور پہلی شہادت موجود ہوتی ہے لیکن جس کا ماخذ یا حوالہ کسی اور نے دیا ہو وہ ثانوی ماخذ کہلاتا ہے۔ بنیادی ماخذ میں ذاتی دستاویزات، کاغذات، ذاتی اور سرکاری ریکارڈ، آثار، خودنوشت، ڈائریاں اور یادداشتیں وغیرہ شامل ہوتی ہیں۔ ان کے اقتباسات وغیرہ پر مشتمل کسی اور کی تیار کردہ دستاویز، کتابیں، رسالے، مضامین جب بطور حوالہ یا سند استعمال کیے جاتے ہیں تو انھیں ثانوی ماخذ کہتے ہیں۔ دستاویز کی ایک اور بھی قسم ہوتی ہے، جو ان دونوں ماخذوں کو پہلے ہی استعمال میں لا چکی ہوتی ہے۔ اسے ثلاثی ماخذ کہتے ہیں۔

دستاویزی مواد تک پہنچنے کے لیے ذاتی کوائف، معلومات اور صاحبانِ علم وفضل سے انفرادی استفسارات، انٹرویو وغیرہ کے علاوہ رسائل وجرائد کے اشاریے، مخطوطات کی فہرستیں، کتابوں اور کتب خانوں کی فہرستیں پہلا ماخذ ہوتی ہیں۔

ماخذ اور مصادر تک رسائی کے بعد ان سے مطلوبہ مواد کا حصول، ان پر داخلی اور خارجی تنقید اور ان کی جانچ پرکھ کا مرحلہ آتا ہے کہ کیا یہ دستاویز اصل ہے؟ کیا سیاہی، کاغذ، طرزِ تحریر، عبارت قابلِ اعتماد ہے؟ کیا یہ حوالہ قابلِ قبول ہے؟ کیا یہ معتبر ہے؟ کیا اس کی سند پر کوئی بات کی جا سکتی ہے؟ اس کا تاریخ ومقامِ تصنیف کیا ہے؟ کیا اس کے اندر متعلقہ امور پر مناسب باتیں موجود ہیں؟ کیا اس کی زمانی اور مکانی شہادتیں اسے معتبر ثابت کرتی ہیں؟ یہ سارے کام بہت محنت طلب اور صبر آزما ہوتے ہیں۔ ان امور کی تفصیلات کو متنی تنقید کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ خاص طور پر ہاتھ کی تحریروں، مخطوطات، مسودوں وغیرہ کو پڑھنے کے لیے خصوصی تجربہ اور تربیت درکار ہوتی ہے۔ جس میں کاغذ سازی کے علم اور آگاہی سے لے کر رسم الخط اور دستاویزی تحریروں کے علم تک بہت کچھ شامل ہوتا ہے۔ ایک ایک لفظ پڑھنے پر بہت عرصہ اور محنت لگتی ہے۔ زبان وبیان کی نزاکتوں کا صحیح ادراک کرنا پڑتا ہے۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے فان ڈیلن کے نکات میں ترمیم واضافے کے بعد مزید چند امور بھی بیان

کیے ہیں جن میں سے یہ بات اہم ہے کہ کیا کسی نے جان بوجھ کر یا غلطی سے کوئی تبدیلی تو نہیں کی، کہیں کوئی الحاقی عبارت شامل تو نہیں ہو گئی؟ اگر نقل ہے تو کیا نقل کرنے والے نے اپنے بارے میں کوئی معلومات درج کی ہیں؟ کیا کوئی تاریخ بھی دی گئی ہے؟ دستاویز کا کتنا حصہ ذاتی مشاہدے پر مبنی ہے اور دیگر ماخذوں کی سند کا کیا اعتبار ہے؟ نیز ہیئت کے اعتبار سے کیا یہ دستاویز مصنف کی دوسری تحریروں کے مطابق ہے یا نہیں؟ دراصل متنی تنقید کے یہ اصول بائبل پر تحقیق کے لیے وضع کیے گئے تھے۔

1-مبادیات

دستاویزی تحقیق کا سب سے اہم مسئلہ یہی ہے کہ کس عنوان پر تحقیق کی جائے؟ عموماً افراد کے احوال و آثار یعنی سوانح، کتابوں کے متون کی دریافت، اداروں کی تاریخ، اصناف کا جائزہ، زبان وادب کی تاریخ وغیرہ کو موضوع بنایا جاتا ہے۔

دستاویزی تحقیق ایک تھکا دینے والا کام ہے۔ اس میں صبر و برداشت اور مستقل محنت درکار ہوتی ہے۔ عام طور پر ایسی تحقیق کی قبولیت کی شرح بھی بہت کم ہوتی ہے۔ شاید نصف صدی کے بعد ہی کسی کو اس موضوع پر کی گئی تحقیق کی ضرورت پڑے۔ اس لیے یہ فوری طور پر قابل قبول بھی نہیں ہوتی۔ یعنی معاصر جائزہ بہت کم سامنے آتا ہے۔ دستاویزی تحقیق میں ذاتی رائے یا موضوعی اطلاقات یا عمومی منطق اور دلائل سے گریز کیا جانا چاہیے۔ عموماً تحقیق کار اپنے نتائج کے بت تراش کر خود ہی خوش ہو لیتا ہے۔ چنانچہ دستاویزی تحقیق کی ضرورت اور اہمیت کا پہلے سے جائزہ لے لینا ضروری ہوتا ہے تاکہ وہ کسی فوری وقت کا ازالہ کرنے کے باعث جلد قبول ہو سکے۔ محض کارِ فضول انجام نہ دیا جائے۔

دستاویزی تحقیق جس قدر پیچیدہ، طویل، وسیع اور دقت نظری کی حامل ہو اسی قدر وقیع اور باجواز سمجھی جاتی رہی ہے لیکن اس کے فرضیے اور نتائج جس قدر واضح اور قطعی ہوں گے۔ یہ اسی قدر معتبر یا واثق کہلائے گی اور یہ کام معروضی یا سائنسی اندازِ نظر کے بغیر ممکن نہیں۔

اگر دستاویزی تحقیق صرف دوسروں کے کام کو از سر نو ترتیب اور تدوین کے ساتھ پیش کرنا ہے تو تحقیق کے ڈسپلن میں اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ تحقیق کا مقصد تو علم میں اضافہ کرنا یعنی علمی دنیا میں موجود حالیہ معلومات میں تبدیلی کرنا اور نیا علم پیدا کرنا ہے۔ ضروری ہے کہ تحقیق یہ کام انجام دے۔ چنانچہ اس کے لیے لازم ہے کہ اس کا تحقیقی ڈیزائن خوب سوچ سمجھ کر بنایا جائے۔ ماخذ اور مصادر تک زیادہ تر وہی سے پہنچا جائے اور نتائج پورے استدلال اور مہارت کے ساتھ بیان ہوں۔

دستاویزی تحقیق میں جو بات عموماً نظر سے اوجھل رہ جاتی ہے وہی بنیادی حیثیت رکھتی ہے یعنی اس سے پہلے انجام دی گئی تحقیق اور اس کے نتائج، جن کی روشنی میں مزید تحقیق درکار ہے، معلوم کر لیے جائیں۔ چنانچہ تحقیقی کام شروع کرنے سے پہلے اس موضوع پر سابقہ تحقیقی کاموں سے واقفیت کا ذکر کر دیا جائے بلکہ ان کا خلاصہ لکھ لینا ضروری ہوتا ہے اور اسی کی روشنی میں تحقیق کو آگے بڑھایا جاتا ہے۔

نوعیت

تاریخی تحقیق نوعیت اور فطرت کے لحاظ سے موجود کی از سرِ نو تعبیر کا نام ہے۔ گویا ایک ادبی علمیت کا اظہار کیا جاتا ہے۔ یہ ہمیں ہمارے ورثے سے آگاہ کرتی ہے اور متعدد نوعیتوں اور مرتبے کا تعین کرتی ہے۔ ادبی و تنقیدی معرکے اسی نوعیت کے کاموں سے مملو ہوتے ہیں۔ تحقیق کار دراصل ادبی تاریخ لکھنے کی بنیادی تگ و دو کرتے ہیں اور اس سلسلے میں انھیں مختلف نوعیتوں اور مرتبوں کا تعین کرنا ہوتا ہے۔ ایس ایم شاہد نے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے کہ قدیم یونانیوں کے مطابق تاریخ کے معنی ماضی کے واقعات کو از سرِ نو ترتیب دینے کے لیے تفتیش کی منصوبہ بندی تھے۔ بقول ڈاکٹر عبدالرشید آزاد ان معنوں کی روشنی میں اب بھی تاریخی تحقیق کی ایک تعریف یوں کی جا سکتی ہے:

''ماضی میں کیا ہوا ہے؟ اسے دریافت کرنے کی عالمانہ کوشش''۔

ایک طویل عرصہ تک مؤرخین کے لیے تحقیق کا مقصد صرف اس تعریف تک محدود تھا۔ یہ مؤرخین اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ درج ذیل اصولوں کو اپنا کر ماضی کو صحیح طور پر از سرِ نو ترتیب دیا جا سکتا ہے:

1- قابلِ اعتماد مآخذوں پر انحصار کرنا۔
2- ایک وسیع خارجی تنقیدی نظام کے ذریعے سے شواہد کی موزونیت ثابت کرنا۔
3- ممکنہ حد تک معروضیت اختیار کرنا۔

آج اکیسویں صدی میں بھی ان قابلِ غور باتوں میں سے کچھ باتیں موزوں ہیں۔ چند جدید مؤرخ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ مکمل معروضیت نہ صرف ممکن ہے بلکہ ضروری بھی ہے لیکن انھوں نے کبھی ماضی کو از سرِ نو اسی انداز میں اجاگر کرنے کی امید ظاہر نہیں کی، جس انداز میں وہ وقوع پذیر ہوا تھا۔ مؤرخین کی زیادہ تر توجہ واقعات کو ذخیرہ کرنے کی بجائے ان کی تشریح اور ان کے معنی متعین کرنے کی طرف رہی ہے۔ بہت سے مؤرخ یہ محسوس کرتے ہیں کہ حقائق پر ضرورت سے زیادہ توجہ حقیقت میں اچھی تاریخ نویسی میں رکاوٹ کا باعث ٹھہرتی ہے۔ اسلام کے ابتدائی دور میں حدیث اور سیرت کی تدوین و تحقیق اسی عروج و زوال سے گزری۔ ہماری موجودہ ادبی تحقیق بھی ایسے ہی مد و جزر کا شکار ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ ہر مؤرخ لازماً ڈھکے چھپے یا کھلے عام کسی نہ کسی نظریاتی (Theoretical) اساس یا چوحدی (Paradigm) کے تحت کام کرتا ہے اور یہ نظریاتی اساس اس کے حاصل کردہ کوائف (Data) کی تشریح پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ایک ادبی مؤرخ بھی یہی کچھ کرتا ہے۔ اس لیے ایک ادبی نظریہ ہونا بہت ضروری ہے، جس کے تحت کام انجام دیا جائے۔ یہی بات اس کی ادبی علمیت یا سکالرشپ ظاہر کرتی ہے۔ کچھ تاریخ دان تاریخ کو فطرت کا مقصد یا منصوبے کا اظہار سمجھتے ہیں جس کے تحت انسان اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ جاتا ہے۔ باقی تاریخ دان تہذیب کو ایک ایسا نامیہ (Organism) سمجھتے ہیں جس کی نشو و نما، کامیابیاں اور زندگی کا تعین کرنے والے عوامل پیدائش کے ساتھ ہی معرضِ وجود میں آ جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ فلسفۂ

انسانیت بھی ہے جس کے مطابق انسان اپنی اور دنیا کی قسمت بنانے میں ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تاریخی حقائق کو معنی دینے کے لیے مؤرخ کسی نہ کسی ایک یا ایک سے زیادہ نظریاتی نقطہ ہائے نظر کے پس منظر میں اپنے کوائف کی تشریح کرتا ہے۔ یہی صورت ادبی تاریخ کی ہے۔ یہاں بھی محقق ادبی نظریات کی حدود کار میں رہ کر کام کرتے ہیں۔ یاد رہے کہ اُردو ادب میں ابھی ادبی نظریے کا جائزہ لے کر اسے واضح اور مرتب کرنے کا کام شروع نہیں ہوا۔ عام طور پر تنقیدی نظریات کو ادبی نظریات سمجھ لیا جاتا ہے۔ جبکہ درحقیقت ایسا نہیں۔ ادبی نظریہ سے ہماری مراد ادب کے استاد کا ادب کی ماہیت کے بارے میں ایک ورسی نقطہ نظر ہے۔ تاریخی تحقیق میں تنقیدی کی بجائے ادبی نظریے کی ضرورت ہوتی ہے۔

تاریخی تحقیق کے طریقے سے ایسے حقائق کو جمع کرنا، منتخب کرنا، ان کا جائزہ لینا اور تصدیق کرنا یا پھر ان کی درجہ بندی کرنا ہوتا ہے جن کا تعلق گزرے ہوئے زمانے، گزشتہ حالات اور گم گشتہ واقعات سے بھی ہوتا ہے۔ مقصد وہی مجرد تنقیدی جستجو اور سچائی کی تلاش ہے۔ گذشتہ حالات وواقعات کے بارے میں صحیح صحیح معلومات حاصل کر لینے کا دوسرا بڑا مقصد حال اور مستقبل کے حالات اور واقعات کے بارے میں اندازہ لگانا ہوتا ہے۔

مختصر یہ کہ تاریخی نوعیت اور اس کے مقاصد کی روشنی میں اس کی تعریف یوں ہو سکتی ہے: تاریخی تحقیق شواہد اور کوائف (Data) جمع کرنے اور ان کی معروضی جانچ پڑتال کرنے کا ایک باقاعدہ طریقہ ہے۔ ان معلومات کا تعلق ماضی کے وقوع پذیر واقعات سے ہوتا ہے اور اس کا مقصد ان واقعات کی وجوہ، اثرات یا رواجوں (Trends) کے متعلق فرضیوں کی پڑتال ہوتا ہے تاکہ موجودہ واقعات کی تشریح کی جاسکے اور آئندہ وقوع پذیر ہونے والے واقعات کے متعلق پیش گوئی کی جاسکے۔ ادبی دنیا میں ماضی کے کسی ادب پارے، موضوع، ادبی تحریک، صنفِ ادب یا ادیب کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنے میں مدد دینا بھی اس کا ایک اہم مقصد ہوتا ہے۔

خواص

تاریخ، ترقی کی راہ میں انسانی سفر کو قلم بند کرنے کا عظیم مقصد بھی مہیا کرتی ہے۔ تاریخ کا علم ماضی کی تعمیر نو بھی کہلاتا ہے۔ اس تعمیر نو کی بنیاد اس استنباط (Inference) پر ہے جو دستاویزات سے کیا جاتا ہے۔ یہاں اصطلاح ''دستاویز'' روزمرہ معنوں کے بجائے وسیع معنوں میں استعمال کی جاتی ہے۔ کوئی انسان طبعی حالت میں جو تاثر چھوڑتا ہے وہ ''دستاویز'' کہلاتی ہے۔ یہ تاثر خواہ کاغذ پر روشنائی سے دیا جائے، پتھر پر سنگتراش کی چھینی سے ہو، کینوس پر مصور کے برش سے نقش کیا جائے یا نرم مٹی پر کمھار کا ہاتھ دے یا آڈیو وڈیو ریکارڈ بن جائے۔ تاریخ کے مشاہدے کا مرکز کوئی فرد بھی ہو سکتا ہے، گروہ، خیال، تحریک یا ادارہ بھی ہو سکتا ہے، مگر تاریخی مشاہدے میں آنے والی ایسی کسی بھی چیز کو سب سے علیحدہ کر کے زیرِ غور نہیں لایا جاتا بلکہ یہ تمام عناصر آپس میں ہمیشہ لازم وملزوم رہتے ہیں۔ یونیسکو کی تعریفات ہم بیان کر چکے ہیں۔

جدید مؤرخین انسان کے ماضی کے تجربات کو دوبارہ اس طرح تخلیق کرنے کی کوشش کرتے ہیں جن سے ماضی کے اصل حالات و واقعات ٹھیک طور پر سامنے آ جاتے ہیں۔ وہ حقائق و واقعات کو مخصوص معیاروں کی روشنی میں پرکھتے ہیں۔ ان کا معائنہ، انتخاب، تصدیق اور ان کی جماعت بندی سائنسی اصولوں کے تحت کرتے ہیں اور ان کی توجیہہ اور توضیح میں تنقیدی معیاروں کو کام میں لاتے ہیں۔ مختصر یہ کہ جدید تاریخی تحقیق سچائی کی تنقید پر مبنی تلاش کا نام ہے۔

تاریخی قاعدے کو نہ صرف ماضی کے حقائق کا مفہوم اور ان کے وثوق کا تعین کرنے کے لیے استعمال میں لایا جاتا ہے بلکہ اس سے ان حقائق کے اس زمانے پر مجموعی اثرات کا پتا بھی چلتا ہے۔ اس لیے تاریخی تحقیق کا بنیادی مقصد موجودہ صورت حال کے پس منظر کے متعلق معلومات اور کوائف مہیا کرنا ہے۔

ادبی و لسانی تاریخ سے واقفیت ہماری مروّجہ اقدار اور رویوں کے ارتقاء کے متعلق حالات کو سمجھنے کے قابل بناتی ہے اور ماضی کی ان حکمت عملیوں اور مروجہ طریقوں کی نشان دہی کرتی ہے جو غیر مؤثر اور ناقابل عمل ثابت ہوئے ہیں۔ لہٰذا تاریخی تحقیق وسائل کو کام میں لا کر تاریخی مسائل و مشکلات کو سائنسی طریقہ کار سے جانچنے کا نام ہے۔ یہ طریق تحقیق دیگر طریقوں کی بہ نسبت معیار، احتیاط، ترتیب و سلیقہ اور درست مفہوم کا زیادہ متقاضی ہے۔

تاریخی تحقیق بے حد مشکل تفتیشی طریقوں میں سے ایک ہے۔ ویسے تو ہر انسان ایک مؤرخ ہے کیونکہ اسے یاد ہوتا ہے کہ ماضی میں کیا واقعات پیش آئے مگر اس قسم کی تاریخ تحقیق کی کسوٹی پر پوری نہیں اترتی۔ انسانی یادداشتیں ذاتی، موضوعی اور متعصبانہ نوعیت رکھتی ہیں۔ ''اسماء الرجال'' کے علم میں اسی مفروضے کی بنا پر جرح و تعدیل کے پیمانے وضع ہوئے تھے۔ اگر تاریخی تحقیق کو سائنس کی حیثیت سے لیا جائے تو اسے معیارات کی ویسی ہی فضیلت پر پورا اترنا چاہیے جیسا کہ دوسری تحقیقی اقسام میں ہوتا ہے۔ تاریخی تحقیق سائنسی طریق کار کے عین مطابق تو نہیں لیکن صحت، علمی ریاضت اور اصول تحقیق کے اطلاق کے معاملے میں سائنسی تحقیق کی خصوصیات کا احاطہ کرتی ہے۔

تین زاویہ ہائے نظر

دستاویزی یا تاریخی تحقیق کی ماہیت کے بارے میں تین قسم کے نقطہ ہائے نظر پائے جاتے ہیں:

1- **تاریخی انداز** (Approach)۔ یہ ایسی تحقیق کا حوالہ ہے جو نئے زیر تشکیل تصورات کی تائید اور حمایت میں تاریخی حقائق کو منظم کرتی ہے۔

2- **تاریخی موضوعات**۔ ان میں معروف شخصیات یعنی ادیبوں، شاعروں، نقادوں، محققوں کی سوانح عمریاں، مقالات اور نظریات کے خاکے، افکار اور رجحانات وغیرہ شامل ہیں۔

3- **تاریخی تکنیک**۔ اس سے مراد ہر وہ تحقیق ہے جو تاریخی ریکارڈ کی بنیاد پر کی جاتی ہے۔

مقاصد

1- تاریخی تحقیق کا سب سے اہم مقصد ماضی اور حال کا درست ترین منظر دکھانا ہے۔ حالیہ مشکلات کو ماضی کی بنیاد ہی پر سمجھا جاسکتا ہے۔
2- اس سے ہمیشہ ثقافت کا عظیم تر ادراک حاصل ہوتا ہے۔
3- اس قسم کی تحقیق کا سب سے عام محرک ماضی کے درست احوال تک رسائی ہے۔
4- یہ مطالعہ ماضی کے معمولات کے اثرات کے بارے میں اہم معلومات مہیا کرتا ہے جن کی روشنی میں مستقبل کا ایسا لائحہ عمل تجویز کیا جاسکتا ہے جو ماضی کے ان تجربات کی تشخیص پر مبنی ہو۔
5- یہ ماضی کی غلطیوں سے بچنے میں مدد دیتی ہے۔
6- جامع اور حقیقت پسندانہ سوچ کا انحصار یقیناً ان بنیادی سر چشموں کے کلی علم (Body of Knowledge) پر ہونا چاہیے کہ جو موجودہ صورت حال پر بھی اثر انداز ہیں۔ ان کا سراغ تحقیق سے ملتا ہے۔
7- کسی پیچیدہ صورت حال کے معنی خیز عوامل کو پہچاننے اور تسلیم کرنے کے عمل کو سلسلہ وار تحقیقی اقدامات آسان بنا دیتے ہیں۔
8- اس قسم کی تحقیق تبدیلی کی حرکیات (Dynamics) کو سمجھنا سکھاتی ہے۔
9- یہ رواں مسائل کی گہری جڑوں والے اسباب کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔
10- یہ تاریخی شہادت کو متعین کرنے، اسے جانچنے اور اس کا تجزیہ کرنے کی صلاحیت کو فروغ دیتی ہے۔ اس شہادت کی حدود کار (Limitations) کو سمجھنے کے قابل بناتی ہے۔
11- یہ تعصبات، بدگمانیوں، غلط فہمیوں، اوہام اور تصنع کو مٹانے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔
12- یہ کسی بھی اصلاح کے لیے ضروری بنیاد فراہم کرتی ہے۔
13- اس سے موجودہ متعدد مسائل کو ان کی اصل، جڑ اور نشو و نما کی روشنی میں ہمدردانہ طور پر جانچا جاسکتا ہے۔
14- یہ ہمیں وژن اور بصیرت مہیا کرتی ہے کہ معاشرتی اداروں کے وظائف اور کردار میں وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلی کیونکر آئی ہے۔
15- یہ پیشہ ورانہ تربیت و تعلم کا اہم عنصر مہیا کرتی ہے۔
16- یہ کسی مطالعے میں مقابل نہیں معاون (Ally Rather than Competitor) ہوتی ہے۔
17- دستاویزی تحقیق آئندہ کی تحقیق کے لیے فرضیے وضع کر کے بنیاد مہیا کرتی ہے۔

تاریخ تین اہم سوالوں کے جوابات دینے کی خواہش مند ہوتی ہے۔

(الف) ارتقاء: اس خاص عمل، صنف یا تحریک کا ارتقا کیا رہا؟
(ب) مماثلت کا سوال :اس خاص عمل، صنف یا تحریک کا تقابل کس کس کے ساتھ ہے؟
(ج) قدر و قیمت: اس خاص عمل، صنف یا تحریک کی قدر و قیمت اور مقام و مرتبہ کیا ہے؟

تاریخی تحقیق گویا ان تین سوالوں میں سے کسی ایک یا سب کا جواب تلاش کرتی ہے یعنی اس موضوع کا ارتقاء کیسے ہوا؟ مختلف اصناف میں تقابل کیا ہے؟ اور کسی خاص صنف کی قدر و قیمت کیا ہے؟ ادبی موضوعات میں بھی ہمیں یہی جوابات درکار ہوتے ہیں۔

مدعا، فوائد، اہمیت (Purpose /Advantages /Importance)

تاریخی تحقیق کا بنیادی مقصد موجودہ صورت حال کے پس منظر کے متعلق معلومات مہیا کرنا ہے۔ موجودہ صورت حال کو سمجھنے کے لیے ہمیں اس کا تاریخی پس منظر معلوم ہونا ضروری ہے۔ تاریخی تحقیق کی مدد سے ہم صرف مسائل کے حل کے متعلق فرضیے ہی طے نہیں کرتے بلکہ اس کے ساتھ ہی انسان کی فطرت کو بہتر طور پر سمجھنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ ہمیں انسانی اقدار کا شعور حاصل ہوتا ہے اور اپنی روایات اور ثقافت کو بھی ہم بہتر طور پر سمجھنے لگتے ہیں۔ اس کے علاوہ اصلاح معاشرہ کے لیے عمرانی علوم یا ادب و لسانیات کے کردار کی بھی نشاندہی ہو جاتی ہے۔

دور حاضر کے معاشرتی مسائل کے پس منظر کے ادراک سے حقائق اور اقدار کی بہتر تصویر ہمارے سامنے آنی چاہیے کیونکہ اہم معاشرتی فیصلے ان حقائق اور اقدار کی بنیاد پر کیے جاتے ہیں۔

انسانی زندگی کا ماضی کے واقعات سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ وہ ان سے بہت کچھ سیکھ سکتا ہے۔ ماضی کو سامنے رکھ کر وہ مسائل کا حل تلاش کر سکتا ہے اور مستقبل کے لیے راہ متعین کی جا سکتی ہے۔ اس لحاظ سے ہمیں دیکھنا چاہیے کہ اس طریق تحقیق کی اہمیت کیا ہے۔ ماہرین عمرانیات ہل اور کربر (Hill and Kerber) کہتے ہیں:

-1 عصری مسائل کا حل ماضی میں تلاش کیا جاتا ہے۔
-2 یہ حال و مستقبل کے رجحانات پر روشنی ڈالتا ہے۔
-3 تمام تہذیبوں میں باہمی اثر انداز ہونے والے عوامل ہوتے ہیں، تاریخی تحقیق سے ہمیں ان کی اہمیت اور اثرات کا علم ہوتا ہے۔
-4 اس طریقے سے ہم اس قابل ہوتے ہیں کہ عصر حاضر میں ماضی کے بارے میں جو فرضیات، نظریات اور عام اصول پائے جاتے ہیں، ان کے بارے میں موجود معلومات کی دوبارہ جانچ پرکھ کر سکیں۔

ان دونوں مصنفین کے نزدیک تاریخ میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ ماضی کو سامنے رکھ کر مستقبل کے متعلق پیش گوئی کی جاتی ہے اور زمانہ حال ماضی کی وضاحت کرتا ہے۔ اس طرح اس میں دوگونہ خوبی پائی جاتی

ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ طریقہ ہر قسم کی عالمانہ تحقیق کے لیے بہت مفید ہے۔

حدودِ کار (Limitations)

1- دستاویزی یا تاریخی تحقیق کے دوران میں تحقیق کار نہ تو متغیرات کو کنٹرول کرسکتا ہے اور نہ ہی اپنی مرضی کے تابع (Manipulate) کرسکتا ہے۔ محقق ماضی کے واقعات پر اثر انداز بھی نہیں ہو سکتا۔ جو ہو چکا ہے وہ ہو چکا ہے۔ تاہم وہ سائنسی معروضیت کے ساتھ جاننے کی کوشش کرسکتا ہے کہ حقیقت میں ماضی میں کیا ہوا۔

2- مسئلے کی نشاندہی اور اس کی تشریح عام طور پر ایک مشکل مرحلہ ہے۔ اس میں صرف تاریخی اہمیت کے حامل مسئلے کا انتخاب ہی شامل نہیں بلکہ مطلوبہ معلومات کا دستیاب ہونا بھی شامل ہے۔ بہت سے تاریخی مسئلے اس لیے ترک کرنے پڑتے ہیں کیونکہ ان کے متعلق معلومات تک رسائی نہیں ہو سکتی۔

3- تاریخی نوعیت کی معلومات حاصل کرنا بھی ایک مشکل کام ہے۔ آثارِ قدیمہ اور تاریخی اہمیت کے حامل نوادرات کی تلاش کے لیے قدیم آثارات کی کھدائی اور خاص طور پر معلومات کے حصول کے لیے دستاویزات، مسودات، خطوط، ڈائریوں اور اجلاسوں کی رپورٹوں پر گھنٹوں وقت صرف کرنا پڑتا ہے۔ یہ سب اس مشکل کام کا حصہ ہے۔

4- معلومات کی موزونیت اور صحت کو ثابت کرنے کے عمل کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ مآخذ کا مستند (Authentic) ہونا اور دوسرا حصہ اندراجات کی موزونیت ثابت کرنا ہے۔ تاریخی تحقیق میں یہ عمل خاصا دقیق اور وقت طلب ہے۔

5- معلومات کی تشریح کرتے ہوئے اس قرضیے یا نظریے کو سامنے رکھنا چاہیے جس کے ساتھ معلومات زیادہ سے زیادہ مطابقت رکھتی ہوں۔ الگ تھلگ حقائق بے معنی ہوتے ہیں۔ صرف تاریخی حقائق کی فہرست تیار کرنا تحقیق نہیں ہے جیسا کہ ہمارے اکثر ادبی و لسانی مقالوں کا وتیرہ ہے۔ معلومات کو ایک دوسرے کے حوالے سے سمجھنا چاہیے۔ ان کو تعمیمات (Generalizations) اور نتائج کی صورت میں ترتیب دینا چاہیے تاکہ ان کی مجموعی اہمیت پیشِ نظر رہے۔ تاریخ سے متعلق سائنس کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے یہ تسلیم کرنا ضروری ہے کہ تاریخی شواہد سے حقیقت اخذ کرنا ایک دشوار عمل ہے جس میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ وہ کوائف (Data) جن پر تاریخی تحقیق کا انحصار ہوتا ہے، ناکافی ہوتے ہیں۔ جب تحقیق کی جاتی ہے تو اس وقت عام طور پر مآخذ مکمل کھوج کے لیے دستیاب نہیں ہوتے۔ لہٰذا بہت سی معلومات از سرِ نو ترتیب دینا ہوتی ہیں۔ اس عمل میں اعتباریت یا وثوق کا فقدان ہوتا ہے۔

6- اس کے علاوہ حالاتِ حاضرہ کے پس منظر کے متعلق پوری آگاہی نہ ہونا نیز تعصبات بھی تاریخی تحقیق میں مشکل کا باعث بنتے ہیں۔ مثلاً ترقی پسند تحریک کے متعلق معلومات کے انبار کی جانچ کے دوران میں مکمل معروضیت کا مظاہرہ کرنا، خاص طور پر ایسے واقعات کے متعلق جن کے ساتھ

لوگ جذباتی لگاؤ رکھتے ہوں، نہایت ہی مشکل ہے۔

7- تاریخی کوائف (Data) جمع کرنے کے لیے بہت زیادہ محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ پہلے کوئی دستاویز یا نوادر، باقیات (Relics) حاصل کرنا اور پھر ان کی چھان بین کرنا دقیق کام ہے۔ پھر یوں بھی ہوتا ہے کہ ساری چھان بین کے بعد پتا چلتا ہے کہ حاصل کردہ دستاویز ہی غیر موزوں ہے۔ یہ تمام عمل نہایت نازک اور غیر یقینی ہوتا ہے۔ ایسا بھی ممکن ہے کہ تاریخ دان مہینوں کسی ماخذ یعنی شہادت کی تلاش میں صرف کر دے اور پھر بھی کامیاب نہ ہو۔ اس کے نتیجے میں یا تو وہ مطالعہ ہی ترک کر دے گا یا نامکمل شواہد کی وجہ سے غلط نتائج پر پہنچے گا۔

8- نازک معاملات کے متعلق دستاویزات مصلحتاً جان بوجھ کر منظر عام پر لانے سے روک لی جاتی ہیں یا تلف کر دی جاتی ہیں تا کہ ممکنہ مواخذہ (Incrimination) نہ ہو سکے۔ یہ بات بعید از قیاس نہیں ہے کہ بعض ایسے شواہد جو دور حاضر کی عالمانہ آراء کے ساتھ مطابقت نہ رکھتے ہوں، ان کو دبا دیا جاتا ہے یا ان کو دستاویزات سے خارج (Expunge) کر دیا جاتا ہے۔ اس سے بلاشبہ یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ دستاویزات کا ذخیرہ تعصبات سے بھرپور حقیقت کی عکاسی کرتا ہے۔ اس لیے دستاویزات کو پوری پرکھ پرچول کے بعد ہی استعمال میں لایا جا سکتا ہے۔

2- ذیلی اقسام

تاریخی تحقیق کی مختلف انواع ہیں۔ ماہر تحقیق ٹائرس ہل وے (Tyrus Hillway) نے اس کی چھ قسمیں گنوائی ہیں:

سوانح حیات یا احوال و آثار

اس میں کسی شعبہ علم کی کسی معروف شخصیت، ادیب، شاعر یا نقاد و محقق کی زندگی، کردار اور کارناموں کے بارے میں بڑے بڑے اور اہم حقائق کو جمع کیا جاتا ہے اور ان کو صداقت و دیانت کے ساتھ پیش کر دیا جاتا ہے۔ ادبیات میں کسی ادیب یا شاعر کی سوانح اور آثار کو تحقیق کا موضوع بنا کر اس کی حیات اور خدمات پر تحقیق کی جاتی ہے۔ لسانیات میں کسی زبان دان یا محقق کا مطالعہ احوال انجام دیا جاتا ہے۔ محض کسی شخصیت کا تعارف مقصود نہیں ہوتا بلکہ اس کا شخصی تجزیہ اور تخلیق کاری کے عناصر دریافت کیے جاتے ہیں۔

اداروں اور تنظیموں کی تاریخ

جامعات، کتب خانے اور دوسرے ادبی و تعلیمی ادارے اسی میں آ جاتے ہیں۔ پاکستان میں موجود جامعات اور کتب خانوں پر کچھ تحقیقی کام پہلے ہو چکا ہے۔ پنجاب یونیورسٹی کی پہلے پچاس سال کی تاریخ بروس (Bruce) نے لکھی جس کو یونیورسٹی نے 1933ء میں شائع کیا۔ 1982ء میں یونیورسٹی کی صد سالہ تقریبات کے سلسلے میں یونیورسٹی کی تاریخ کو مکمل کیا گیا۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے 1962ء میں اورینٹل کالج کی

تاریخ لکھی۔ اس میں اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں کالج کی خدمات کو بیان کیا گیا ہے اور کالج کے اساتذہ کی ادبی علمی اور تحقیقی خدمات کا ذکر کیا گیا ہے۔ اسی طرح گورنمنٹ کالج، لاہور کی تاریخ (1824-1914ء) گیرٹ (Garret) نے لکھی تھی۔ اکتوبر 1981ء میں گورنمنٹ اسلامیہ کالج سول لائنز، لاہور کا مجلہ "فاران" شائع ہوا ہے۔ اس میں محمد صدیق نے اسلامیہ کالج کی تاریخ پر ایک مبسوط مقالہ لکھا ہے۔ اس کا نام ہے "اسلامیہ کالج لاہور۔ برصغیر میں مسلم نشاۃ ثانیہ کا عظیم تعلیمی ادارہ"۔ ڈاکٹر محمد ایوب صابر نے اُردو کے ادبی اداروں کی مجموعی تاریخ لکھی۔ اسی طرح دہلی کالج، حلقہ ارباب ذوق، فورٹ ولیم کالج، جامعہ عثمانیہ، انجمن ترقی اُردو، مدرسہ فرنگی محل وغیرہ کی تاریخیں لکھی گئیں۔ ہمارے ملک میں ابھی اس میدان میں تحقیقی کام کرنے کی کافی ضرورت ہے۔ بڑے بڑے ادبی اداروں کی غیر جانبدارانہ اور محققانہ تاریخیں لکھی جانی چاہئیں۔ لیکن ضروری ہے کہ یہ کام وہ ادارہ تفویض نہ کرے جس کی یہ تاریخ لکھی جا رہی ہو بلکہ غیر جانبدارانہ طور پر کوئی دوسرا شعبہ، جامعہ یا ادارہ یہ فرض ادا کرے اور اس میں عالمانہ بصیرت یا انتقاد کا بھی مظاہرہ کیا گیا ہو۔ جیسا کہ مقتدرہ قومی زبان کی تعلیمی خدمات پر ادارہ تعلیم و تحقیق پنجاب یونیورسٹی میں اور دفتری اُردو میں مقتدرہ قومی زبان کی خدمات پر شعبہ اُردو علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی میں ایم فل اور صرف دفتری اُردو پر نمل (NUML) میں پی ایچ ڈی کی سطح کے مقالات لکھے گئے۔ ان میں کمی یہ ہے کہ کسی سے ان کا تقابل نہیں کیا گیا۔

ذرائع اور اثرات کی تاریخ

اس قسم کی تاریخ میں یہ جاننے کی کوشش کی جاتی ہے کہ کسی فرد یا جماعت کے خیالات، صنف یا موضوع کے تصورات تحریروں اور خاص کارناموں پر ایسے عوامل مثلاً تعلیم، احباب، مطالعہ، روزمرہ زندگی کے واقعات اور بالعموم ماحول کس طرح اثر انداز ہوئے۔ عام طور پر اس طرح کی تحقیق کرنے کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اس فرد کے تحریری یا زبانی بیانات یا اس کے طرزِ عمل میں اس اثر کی واضح شہادت معلوم کی جاتی ہے۔ ادبیات میں یوں ہوتا ہے کہ لکھنے والا کسی دوسرے مصنف سے کوئی پلاٹ، کردار یا قافیہ مستعار لیتا ہے یا اس کے خیالات، طرزِ بیان، اسلوب وغیرہ کے اثرات سے متاثر ہوتا ہے۔ اس میں تجزیے درکار ہوتے ہیں۔

ترتیب و تدوینِ متن

تحقیق میں متنی تدوین یا تنقید بہت اہمیت رکھتی ہے۔ کسی مصنف کی کتاب کو ترتیب دینا، کسی کتاب کے پرانے ایڈیشن کو حواشی کے ساتھ نئی شکل دینا، کسی اہم مخطوطے کو مرتب کر کے عام استفادے کے لیے شائع کرنا۔ ایسے ہی علمی تحقیقی کام اس میں شامل ہوتے ہیں۔ تحقیق کار اپنے کام کو اس طرح سے انجام دیتا ہے کہ پہلے وہ اصل متن تلاش کرتا ہے، کتابوں کے مختلف پرانے ایڈیشن اور ایک ہی مخطوطے کے متعدد نسخے اپنے اندر متن کے اختلافات رکھتے ہیں۔ ان مختلف مطبوعہ اور غیر مطبوعہ نسخوں میں سے بہتر نسخے کو اصل متن کی بنیاد قرار دیا جاتا ہے۔ پھر ان سب کا تقابلی مطالعہ کیا جاتا ہے۔ بعض اوقات مصنف اپنے کام پر نظرِ ثانی کرتا ہے۔ مرتب کو چاہیے کہ متن میں کی گئی مصنف کی تبدیلیوں کو بھی پیشِ نظر رکھے۔ متن میں موجود ظاہری اور امکانی اغلاط اور غلط مطبوعہ الفاظ کو

درست کر دینا چاہیے۔ مصنف کے الفاظ و معانی کو معلوم کیا جائے اور اگر اس کی تلمیحات واشارات غیر مانوس اور مبہم ہوں تو ان کی توضیح کر دی جائے۔ بعض حالات میں تدوین متن کے ساتھ ترجمہ اور تشریح بھی کرنا پڑتی ہے۔ اس کے لیے تبحر علمیت یا سکالرشپ درکار ہوتی ہے۔

پاکستان کی جامعات میں تدوین و ترتیب متن کے سلسلے میں کافی کام ہوا ہے۔ اس میں ایم۔اے سے لے کر پی۔ایچ۔ڈی تک کا کام شامل ہے۔ ادبی اور لسانی تحقیق اس قسم کے کاموں سے بھری پڑی ہے۔ کئی اداروں مثلاً انجمن ترقی اُردو کراچی، مجلس ترقی ادب لاہور، خدا بخش لائبریری پٹنہ وغیرہ نے کئی ادبی متون مرتب کرا کے شائع کیے ہیں۔ نجی سطح پر کئی محققوں نے متون مرتب کر کے شائع کیے ہیں، جن کی فہرست بہت طویل ہے۔ اب یہ اداروں کے کرنے کا کام ہے اور کمپیوٹر پر ایسے سافٹ ویر آ گئے ہیں جو مخطوطہ شناسی کا فریضہ انجام دے سکتے ہیں۔ اس لیے اب تحقیق پر انفرادی کاوشوں کو معاصر جائزے میں زیادہ اہمیت نہیں مل سکتی۔ البتہ سندی یا بنیادی تحقیق کے لیے یہ ایک اچھا موضوع ہے۔

تحریکات، نظریات یا اصناف کی تاریخ

اس میں عموماً بڑے بڑے فلسفیانہ اور فکری نظریات کی تاریخ پر تحقیق کی جاتی ہے، یعنی معلوم کیا جاتا ہے کہ کسی تحریک یا نظریے یا صنف کا سب سے پہلے ظہور کب ہوا اور یہ کن ارتقائی منازل سے گزر کر اپنی اصل صورت میں آیا۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی خاص دور میں عام لوگوں کے خیال اور طرز عمل میں تبدیلیوں کو معلوم کیا جاتا ہے۔ اس میں تحریکوں کا جائزہ بھی لیا جاتا ہے۔ ادبی نظریات کو اصناف کے حوالے سے بھی دیکھا جاتا ہے۔ اُردو ڈرامے، افسانے، داستان وغیرہ کے علاوہ حلقۂ ارباب ذوق اور ادبی تحریکیں کے موضوعات پر بھی اُردو اور سرائیکی میں مقالے لکھے گئے۔

کتابیات/ کتاب نامہ

کسی بھی شعبۂ علم میں کتابیات کی تدوین تاریخی تحقیق کے طریقے سے کی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کتابیات کے بغیر ذخیرۂ علم خاموش ہے۔ اس سے کتابیات کی اہمیت وافادیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس کے ذریعے سے تحقیق کرنے والوں کا بہت سا قیمتی وقت بچ جاتا ہے۔ محقق کو کسی موضوع کے بارے میں ایک ہی مقام پر کتب اور دیگر معلوماتی ذرائع کے اندراجات مل جاتے ہیں۔ اس طرح وہ خود اس محنت و مشقت سے بچ جاتا ہے جو اس کو ان کی تلاش میں کرنا پڑتی ہے۔ پاکستان میں کئی شخصیات اور موضوعات پر ماخذوں کی کتابیاتیں (Bibliographies) شائع ہو چکی ہیں۔ بلا شک کتابیات تلاش و ترتیب کا عمدہ کام ہے لیکن تحقیق کے ڈسپلن میں محض فہرستِ کتب مرتب کرنے کی بجائے مشرح اور وضاحتی کتابیات مرتب کرنے کو اہمیت دی جاتی ہے۔ ابن ندیم کی کتاب الفہرست اس کے لیے اولین اور بنیادی نمونے کی حیثیت رکھتی ہے۔ چنانچہ محض عمومی کتاب نامہ مرتب کر دینا تحقیق نہیں کہلا سکتا۔ ایک علمی بصیرت، عالمانہ انتقاد یا سکالرشپ بہر حال جھلکنی چاہیے کہ یہی تحقیق کا مقصود ہے۔

3-دستاویزی تحقیق کی حدود

ادب کے مطالعے میں محض دستاویزی تحقیق کیوں کی جائے؟ صرف دوسروں کی آراء کیوں نقل کی جائیں؟ تحقیقی مقالہ ہی کیوں لکھا جائے؟ ایک اور دستاویز کیوں شائع کی جائے؟ وہ سب کچھ کیوں بتایا جائے جو پہلے سے ہمارے علم یا کسی گوشے میں موجود ہے۔ ان سب سوالات کا جواب ایک ہے اور وہ ہے: ''علم میں اضافہ''۔ ادبی مطالعے میں کئی سوالات ہمارے سامنے ہوتے ہیں۔ مثلاً کیا داستان معاشرے کی عکاس ہوتی ہے؟ کیا شاعری محض ذہنی اختراع کا نام ہے؟ کیا اُردو میں افسانہ واقعی لکھا گیا یا محض اخذ و ترجمے سے کام لیا گیا؟ ایسے سوالوں کا جواب تحقیق کے ذریعے سے فراہم کیا جاتا ہے اور پھر کم سے کم حوالوں اور اقتباسات کے ساتھ دوسرے اہلِ علم تک پہنچایا جاتا ہے۔ تاکہ وہ مان سکیں کہ واقعی ادب کے کسی پہلو پر موجود علم میں کوئی اضافہ درکار تھا اور وہ ہوا ہے۔ محض تحقیق کار کی محنت کی داد نہیں دی جا سکتی۔ سندی تحقیق میں تو ایسا ممکن ہے کہ صرف محنت کی بنا پر مقالے کو تسلیم کر لیا جائے اور ڈگری دے دی جائے لیکن عملی میدان کے محققین کے لیے یہ بڑا کٹھن مرحلہ ہوتا ہے۔ اگر نتائج تسلیم نہ ہوں تو تحقیق بیکار قرار پاتی ہے۔

اثباتیت اور مابعد اثباتیت کے اثرات نے دستاویزی تحقیق کی اہمیت کو کم کر رکھا ہے۔ اسی لیے اس پر مبنی ادبی تحقیق کم اہمیت رکھتی ہے۔ دستاویزی یا تاریخی تحقیق واضح کوائف کی حامل نہ ہونے کے باعث ثقہ محققین سے خود کو منوا نہیں پاتی۔ اس لیے دستاویزی تحقیق کار کو زیادہ عمق اور ژرف نگاہی سے کام لینا ہوتا ہے۔ ادبی تحقیق صرف معاصرانہ مسائل اور سوالات مثلاً جنس، صنف، نسلیت، قومیت وغیرہ کے پیشِ نظر انجام دی جائے تو کوئی وقعت پا سکتی ہے۔ دستاویزی ادبی تحقیق متن کے گرد گھومتی ہے اور متن مغالطہ انگیز ہوتا ہے، جو اپنے تخلیق کار کے پیغام کو من و عن پہنچانے سے قاصر ہوتا ہے، اس لیے اس کی کئی صورتیں اور تشکیلیں وجود میں آتی ہیں۔ ادبی تحقیق انھی اختلافات میں سے حتمی صداقت یا توجیہ تلاش کرنے کا نام ہے۔

پانچواں باب

تجزیاتی، تقابلی یا بیانیہ تحقیق

حالیہ واقعات اور معاملات کا جائزہ لینے کے لیے تحقیق کی یہ اقسام استعمال ہوتی ہیں۔ بیانیہ (Descriptive) یا تجزیاتی (Analytical) اور تقابلی (Comparative) مطالعے مجموعی طور پر ایک ہی گروہ قرار دیے جاتے ہیں۔ اس تحقیق میں جہاں تحقیقی ڈیزائن کو اولیت واہمیت حاصل ہے، وہیں تحقیقی آلات (Tools) کا درست اور موزوں ہونا بھی ضروری ہے۔ مثلاً سروے قسم کے جائزے میں ایک اہم تحقیقی آلہ ''سوالنامہ'' ہوتا ہے۔ یہ سوالنامہ اس طرح سے تیار کیا جاتا ہے کہ آپ جو کچھ چاہتے ہیں، اس سے کون سے مقاصد حاصل ہوں گے؟ یعنی آپ کیا چاہتے ہیں اور کیوں؟ کیا آپ کا یہ آلہ مطلوبہ مقاصد پورے کر سکتا ہے؟ دستاویزی تحقیق میں اشاریے، کتابیات اور بنیادی وثانوی مصادر یا ماخذ آلات تحقیق تھے تو تجزیاتی، تقابلی یا بیانیہ تحقیق میں اعداد وشمار، کوائف، انٹرویو کے سوالات، اعداد وشمار کے پیمانے، سوالنامے، پرتالی اشاریے، شماریات وغیرہ ایسے آلات ہوتے ہیں جو کسی تحقیق کو اعتبار اور وثوق عطا کرتے ہیں۔ تحقیقی ڈیزائن انھی اجزاء پر مبنی ہوتا ہے۔ گویا ادبی تحقیق کے لیے یہ قسم استعمال کرنے والے طالب علم اور نگران کو شماریات سے آگاہ ہونا چاہیے۔

تقابلی یا بیانیہ تحقیق سے ہم حالیہ معلومات، کوائف، رجحانات، رویوں اور طریق کار سے آگاہ ہوتے ہیں۔ ہم ان کے باہمی تقابل ہی سے نسبت تناسب، شرح اور انحیار وغیرہ کے متعلق جان سکتے ہیں۔

بیانیہ یا تقابلی وتجزیاتی تحقیق میں کمیتی تجزیے ضروری ہوتے ہیں۔ چنانچہ پیمانوں اور شماریات کے استعمال، خاص طور پر ادبی اور لسانی موضوعات کے لیے ان کی خصوصی تربیت درکار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان میدانوں میں تقابلی اور بیانیہ تحقیق کی بہ نسبت دستاویزی اور تاریخی تحقیق زیادہ انجام دی جاتی ہے۔

اس تحقیقی قسم میں اصل کام انجام دینے سے پہلے نمونہ جاتی یا پائلٹ سٹڈی درکار ہوتی ہے جس میں فرضی اعداد وشمار (Simulations) کو جمع کر کے مطلوبہ پیمانوں پر پرکھنے کی مشق کی جاتی ہے تا کہ جب اصل تحقیق شروع ہو تو کوائف کی پیمائش درست طریق پر کی جا سکے۔

چونکہ اس طرح کی تحقیق کی حدود بہت وسیع ہوتی ہیں اس لیے اس میں پوری تحقیقی آبادی کی نمونہ بندی (Sampling) کر لی جاتی ہے۔ اتنی حدود کار متعین کر لی جاتی ہیں جن پر آسانی سے کام ہو سکے مثلاً

اُردو زبان کی بول چال کے موجودہ رجحانات پر مطالعہ کرتے ہوئے اگر اس کی تحدید (Delimitation) پاکستان تک بلکہ اسلام آباد تک کر لی جائے اور نمونہ بندی اسلام آباد میں چند مخصوص طبقوں اور پیشوں اور ہر جنس سے متعلق دس دس افراد تک محدود رکھی جائے تو انٹرویو، سروے، سوالنامے وغیرہ کے جوابات حاصل کرنے میں آسانی ہو گی اور ایک نمائندہ تحقیقی نتیجہ ہاتھ لگ سکے گا۔

1- سروے یا مساحت

بیانیہ تحقیق کا ایک اہم آلہ سروے یا مساحت ہے۔ یہ صحافتی اور ادبی ہر دو قسم کی تحقیق میں استعمال ہو سکتا ہے۔ تحقیق میں سروے یا مساحتی طریق تحقیق کی اہمیت کا اندازہ اس طرح لگایا جا سکتا ہے کہ بہت سے ماہرین تمام بیانیہ طریق ہائے تحقیق کو دو زمروں میں تقسیم کرتے ہیں یعنی:

(1) مساحتی طریقہ (Survey Method)

(2) غیر مساحتی طریقے (Non-survey Methods)

گویا تفریق کا بنیادی تصور مساحتی یا غیر مساحتی ہے اور دونوں اقسام کی تحقیق میں تحقیق کار کو خود میدان میں جانا پڑتا ہے۔ جس کی بنا پر اسے میدانی طریقہ بھی کہا جاتا ہے۔ اس طریقے میں کوائف جمع کرنے کے مندرجہ ذیل ضمنی قاعدے استعمال کیے جاتے ہیں:

1- سروے/مساحت بذریعہ سوال نامہ۔

2- سروے/مساحت بذریعہ روبرو انٹرویو۔

3- سروے/مساحت بذریعہ ٹیلی فونی انٹرویو۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے اسے غیر ادبی تحقیق قرار دیا ہے لیکن عادات، مطالعات، ادارہ جات، طباعت واشاعت وغیرہ کے لیے سروے تحقیق کی کئی مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ دراصل سروے یا مساحت ایک وسیع المعانی اصطلاح ہے جس کی تمام تفصیلات کو کسی ایک جملے میں سمونا آسان نہیں تاہم اگر چند کیفیات کو سامنے رکھا جائے تو کسی قدر آسانی فراہم ہو سکتی ہے۔ مثال کے طور پر یہ چند کیفیات دیکھیں:

1- سروے یا مساحت میں بہت سے لوگوں سے رابطہ قائم کیا جاتا ہے۔

2- جن لوگوں سے رابطہ قائم کیا جاتا ہے ان کا انتخاب یا نمونہ بندی مسلمہ طریقوں کے مطابق کی جاتی ہے۔

3- سوالات پوچھ کر کئی طرح کی معلومات جمع کی جاتی ہیں اور یہ معلومات مقررہ وقت کے اندر حاصل کی جاتی ہیں۔

اب اگر ان تمام کیفیات کو سمیٹ کر سروے یا مساحت کی تعریف متعین کرنے کی کوشش کریں تو وہ کچھ یوں بنتی ہے:

> ”سروے یا مساحت سائنسی طریقے سے منتخب نمونے میں شامل افراد سے کم وقت کے اندر سوالات پوچھ کر معلومات جمع کرنے کے ایک طریق تحقیق کا نام ہے“۔

سروے یا مساحت کوائف یا معلومات جمع کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ یہ معلومات معاشرے کے ہر فرد سے حاصل کرنا دشوار ہے لہٰذا کچھ افراد سے رابطہ قائم کیا جاتا ہے اور ان کا انتخاب سائنسی طریقے سے کیا جاتا ہے۔ پھر یہ معلومات سوالات کے توسط سے حاصل کی جاتی ہیں۔ یہ سوالات بھی سائنسی طریق کار پر بنائے جاتے ہیں اور آخری بات یہ کہ چونکہ لوگوں کی رائے بدلتی رہتی ہے لہٰذا سوالات پوچھنے اور معلومات جمع کرنے کا کام کم سے کم وقت کے اندر پورا کیا جاتا ہے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو مساحت کے نتائج از کار رفتہ اور ہو جائیں گے۔ خواتین کی عادات مطالعہ کے حوالے سے ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے مولانا صلاح الدین احمد کے سروے پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

تعریف کی مدد سے مساحتی تحقیق کی نوعیت کو سمجھنے کے لیے ایک اور زاویے سے بھی مدد لی جاسکتی ہے۔ ڈاکٹر نثار احمد زبیری نے کتاب تحقیق کے طریقے میں اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ جس کے مطابق:

> ’’سماجی علوم معاشرے میں موجود عمرانی حقائق کا مطالعہ کرتے ہیں۔ گویا وہ یہ جاننے کی جستجو کرتے ہیں کہ سماجی نوعیت کے کون کون سے متغیرات موجود ہیں، ان کی تقسیم معاشرے کے مختلف طبقات وغیرہ میں کیسی ہے اور ان کے درمیان کس نوع کا تعلق ہے۔
>
> مثال کے طور پر اگر سیاسیات سے متعلق کسی سروے کے ضمن میں معاشی، عمرانی مرتبے، ایک متغیرہ اور دوسرے متغیرہ کے تعلق کا جائزہ لینا مقصود ہو تو سروے کرنے والا دیکھے گا کہ معاشی عمرانی مرتبے کے متغیرہ کی کون کون سی شکلیں کسی علاقے میں موجود ہیں۔ مثال کے طور پر کراچی میں لیاری کے علاقے میں کم آمدنی اور درمیانی آمدنی والے کثیر تعداد میں موجود ہو سکتے ہیں۔ اس کے بعد دوسرے متغیرہ کے سلسلے میں تحقیق کرنے والا یہ دیکھے گا کہ لیاری میں کس کس طرح کا انداز رائے دہی موجود ہے۔ مثال کے طور پر کچھ لوگ مذہبی جماعتوں کے ووٹر ہو سکتے ہیں اور کچھ لوگ غیر مذہبی جماعتوں کے۔ اس طرح متعلقہ علاقے میں متغیرات کی موجودگی زیر غور آئے گی۔ اس کے بعد تحقیق کرنے والا یہ دیکھے گا کہ ان متغیرات کی تقسیم، یعنی یہ کہ مختلف متغیرات علاقے میں کس انداز سے تقسیم ہیں؟ مثلاً یہ کہ لیاری کے جو علاقے زیادہ تعلیم یافتہ لوگوں کے علاقے سے متصل ہیں ان میں اور ان سے دور واقع علاقوں میں متغیرات کس صورت میں موجود ہیں، اس کے بعد تحقیق کرنے والا متغیرات کے درمیان تعلق کی نوعیت کو پیش نظر رکھے گا، یعنی اس کی توجہ اس امر پر ہوگی کہ (مثال کے طور پر) تین ہزار روپے سے کم آمدنی کا متغیرہ غیر مذہبی سیاسی جماعتوں کے حق میں انداز رائے دہی کا کس حد تک ذمے دار ہے؟‘‘

ادب ولسانیات کی دنیا میں یہ مثال متخالف لہجوں کے متغیروں کے حوالے سے سامنے لائی جاسکتی

وہاں کئی نازک مرحلے اور مشکلات درپیش ہوتی ہیں جن پر سروے کیا جاسکتا ہے۔ کسی ادب پارے کی مقبولیت کے بارے میں تحقیقی رائے سروے کے بعد ہی قائم کی جاسکتی ہے۔

اب اگر ان کیفیات کے پیش نظر سروے کی تعریف متعین کرنے کی سعی کی جائے تو کہا جائے گا کہ:

> ''سروے یا ساحت وہ طریقہ تحقیق ہے جو بڑے اور چھوٹے نمونوں میں سماجی متغیرات کی موجودگی، ان کی تقسیم، ان کے بین عمل کا سوالات کے ذریعے سے معلومات جمع کر کے مطالعہ کرتا ہے''۔

ان دو تعریفوں کی روشنی میں سمجھا جاسکتا ہے کہ اس طریق تحقیق میں پوری تحقیقی آبادی کی نمونہ بندی کے ذریعے سے منتخب افراد سے رابطہ قائم کیا جاتا ہے اور ان سے کم وقت کے اندر سوالات کے ذریعے سے زیر تحقیق موضوع سے متعلق معلومات جمع کی جاتی ہیں۔ اس طرح سروے یا ساحت کے تین مرحلے سامنے آئے ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

1- نمونہ بندی (یعنی پورے حلقۂ تحقیق یا زیر مطالعہ آبادی کے نمائندہ نمونوں کا مطالعہ)

2- سوالات سازی (سروے کے لیے اپنے مطلوبہ جوابات کے لیے انٹرویو کے سوالات مرتب کرنا)

3- رابطے کا طریقہ (تحریری سوالنامے پُر کرانا یا انٹرویو کرنا)

ان مراحل میں سے ہر ایک واضح تکنیک کا حامل ہے۔ جسے سمجھ کر تینوں مراحل کو باقاعدگی کے ساتھ طے کرنا ہی عمدہ سروے کرنے کی ضمانت ہے۔

2- کوائفی تجزیات وشماریات

کوائف، مواد، اعداد و شمار، سروے، انٹرویو وغیرہ کے تجزیے اور ان کا شماریاتی جائزہ ایک الگ اور جداگانہ نوعیت کا حامل ہے، جس کی زیادہ تر ضرورت ادبی مطالعے، رجحانات، لفظ شماری، تعدد استعمال اور لسانیاتی تجزیوں میں ہوتی ہے۔ چونکہ بیانیہ اور تجزیاتی مطالعے عام طور پر دو متغیرات کے باہمی تقابل کی بنیاد پر کیے جاتے ہیں، اس لیے اس تقابل کو بعض ضروری شماریاتی (Statistical) تجزیوں کے بعد نتائج کی صورت میں سامنے لایا جاتا ہے۔

استاد محترم ڈاکٹر عبدالرشید آزاد کے نزدیک تجزیہ بذات خود ایک طریق تحقیق ہے۔ اس کا وضاحتی تحقیق کے ساتھ چولی دامن کا ساتھ ہے۔ یہ سائنسی طرز فکر کا ایک پہلو ہے کہ تجزیہ کس طرح سے کرنا چاہیے۔ اس کا دارومدار مسئلے کی نوعیت پر ہے اور یوں تحقیقی ڈیزائن یہاں پر آن شامل ہوتا ہے۔ ڈاکٹر عبدالرشید آزاد نے اس کی دو بڑی قسمیں (1) فنی تجزیہ (2) تجزیہ کاری ہیں۔ یہاں تجزیہ کار میں ایسے کوائف کا تجزیہ درکار ہے جو اعداد و شمار کی صورت میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔

تحقیقی آبادی اور نمونہ بندی

بیانیہ تحقیق میں سوالنامے، انٹرویو آزمائش اور ایسے دیگر تحقیقی آلات کے استعمال کے لیے ہمیں پورے

مواد، افراد، اداروں یا اشیاء تک پہنچنا ہوتا ہے چوں کہ ایسا کرنا محدود وقت میں ممکن نہیں ہوتا، اس لیے ہم اس زیر تحقیق پوری آبادی (Population) کے کچھ نمائندہ نمونے حاصل کر کے ان پر تحقیق کرتے ہیں اور تصور کرتے ہیں کہ باقی آبادی کے حوالے سے بھی ہمارے نتائج درست ہی ہوں گے۔

س تحقیق کل کو کائنات (Universe) بھی کہتے ہیں۔ کائنات اور آبادی کے تصورات میں صرف اتنا فرق ہے کہ کائنات "کل عناصر" اور آبادی "موجود عناصر" کو کہتے ہیں جیسے سارے پاکستانی ایک کائنات ٹھہرتے ہیں اور صرف پاکستان میں موجود پاکستانی افراد آبادی کہلائیں گے۔ ہمارا مفروضہ (Assumption) یہ ہوتا ہے کہ نمونہ بندی اس طرح سے کر لی گئی ہے کہ یہ پوری آبادی کی نمائندہ ہے اور ہمارے نتائج کم و بیش پوری آبادی پر لاگو ہوں گے۔

ڈاکٹر احسان اللہ خان، ڈاکٹر عبدالرشید آزاد، ایس ایم شاہد، ڈاکٹر فاروق جوش اور ڈاکٹر نثار احمد زبیری نے نمونہ بندی پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ ان کے نزدیک رائے شماری میں وقت اور سرمایے میں بچت کی خاطر نمونہ بندی (Sampling) کر لی جاتی ہے۔ ڈاکٹر نثار احمد زبیری نے نمونہ بندی کی تعریف کچھ یوں کی ہے:

> "نمونہ بندی کسی چھوٹی یا بڑی آبادی میں سے منتخب کیے ہوئے افراد کے جزو (Segment) کو کہتے ہیں جو ہر ممکن طور پر اور ہر حقیرہ کے لحاظ سے ایک حد تک اپنے کل کی نمائندگی کرتا ہو۔"

ایس ایم شاہد اس میں صرف یہ اضافہ کرتے ہیں کہ یہ (نمونہ بندی) کسی اصول پر کی جاتی ہے۔ فاروق جوش نمائندگی میں احتیاط پر زور دیتے ہیں۔ ان اصولوں کا ذکر ان کی اقسام کے تحت کیا گیا ہے۔

گویا نمونہ اس کل تحقیق آبادی (Whole Population) کی (جس میں سے اسے منتخب کیا گیا ہے) ایک حد تک (Approximately) نمائندگی کرتا ہے اور یہ نمائندگی کل کی تقریباً تمام کیفیات اور نوعیتوں پر محیط ہوتی ہے۔ یہاں تمام کیفیات اور نوعیتوں سے مراد یہ ہے کہ متعلقہ آبادی میں مردوں اور عورتوں کا جو تناسب ہو، عمروں کا تناسب، شہری دیہی کا تناسب، خواندہ و ناخواندہ افراد کا تناسب، سماجی مرتبے کے تناسبات، پیشوں سے متعلق افراد کا تناسب، نمونے میں کم و بیش ان کی نمائندگی ایسی ہی ہونی چاہیے جیسی کہ کل آبادی (Universe) میں موجود ہے۔

نمونہ بندی کا پہلا مرحلہ ایک غیر جانبدارانہ فہرست نمونہ بندی (Sampling Frame) تیار کرنا ہے۔ اس سے مراد ان افراد کی فہرست سے ہے جن میں سے نمونہ منتخب کیا جاتا ہے۔ یہ فہرست ہر طرح کے تعصبات اور رجحانات سے بلند تر ہو کر تیار کی جانی چاہیے اور اس امر کا خصوصی اہتمام کیا جانا چاہیے کہ فہرست میں کوئی نام دوبارہ نہ آنے پائے۔ یہ فہرست جس قدر درست اور صحیح ہوگی اسی قدر نمونہ بھی درست، نمائندہ اور قابل اعتماد ہوگا۔ ہر قسم کی نمونہ بندی میں فہرست سازی کے اصول مختلف ہوتے ہیں۔

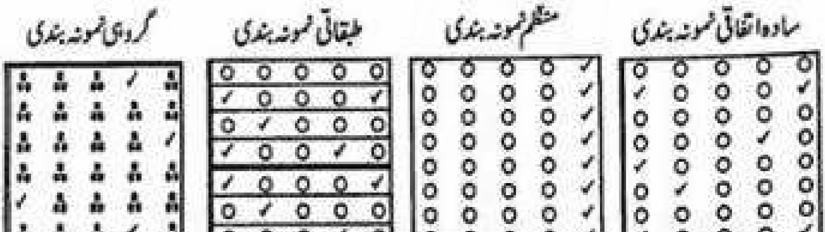
نمونہ بندی میں خطا (Error) بھی ہوتی ہے، جن میں تعصبات اور اتفاقات دو اہم عناصر ہیں۔ ان کی گروہ بندی کر لی جاتی ہے۔ بقول ڈاکٹر عبدالرشید آزاد جب بھی نمونہ سازی ہوگی ان کا امکان موجود ہوگا۔ انھوں نے ان خطاؤں کا ایک چوکھٹا پیش کیا ہے۔

	اتفاقیہ	مستقل
نمونہ بندی	الف	ب
پیمائش	ج	د

اس کا مطلب ہے کہ اتفاقیہ خطا ہو یا مستقل خطا، ان کا انحصار نمونہ بندی اور پیمائش کے طریقوں پر ہوگا۔ نمونہ بندی دو طریقوں سے کی جاتی ہے۔ ایک زمرے کو معلوم اور برابر امکان کی امکانی نمونہ بندی (Probability Sampling) کہتے ہیں۔ اس میں فہرست میں شامل ہر فرد کے لیے نمونے میں آنے کا امکان برابر ہوتا ہے اور یہ امکان تحقیق کار کو معلوم ہوتا ہے جب کہ دوسرے زمرے کو نیم امکانی نمونہ بندی (Non-Probability Sampling) کہتے ہیں۔ اس میں کسی فرد کے منتخب ہونے کے امکان کی بابت محقق کو کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ ذیل میں ان کی کچھ تفصیل بیان کی جاتی ہے۔

(الف) امکانی نمونہ بندی (Probability Sampling)

امکانی نمونہ بندی کی تفصیل یوں ہے کہ اگر سو افراد میں سے ایک فرد بطور نمونہ لیا جائے تو ہر فرد کا نمونے میں آنے کا امکان سو میں سے ایک (1/100) ہوگا۔ معلوم امکان کی نمونہ بندی کی سب سے اہم خصوصیت یہی ہے کہ اس میں شامل فہرست ہر فرد کے لیے نمونے میں آنے کا امکان معلوم بھی ہوتا ہے اور سب کے لیے قطعی برابر بھی۔ اس طرح کی نمونہ بندی چار طرح کی ہوتی ہے:



1- سادہ اتفاقی نمونہ بندی (Simple Random Sampling)

نمونہ بندی کی یہ قسم سب سے جانی پہچانی اور آسان ہے۔ اس میں ہر فرد کے لیے نمونے میں منتخب

ہونے کا امکان برابر ہوتا ہے۔ اس طرز کی نمونہ بندی کے مطابق صوبہ سرحد کا ساٹھ سالہ پٹھان اور سندھ کے گاؤں کا پندرہ سالہ نوجوان (اگر وہ ہماری فہرست میں شامل ہوں تو) ہمارے نمونے میں منتخب ہو سکتے ہیں اور وہ اس کا بالکل برابر کا امکان رکھتے ہیں۔

اتفاقی نمونہ بندی کی لازمی ضرورت یہ ہے کہ اس کی فہرست کو بغیر کسی قسم کی جانب داری کے تیار کیا گیا ہو۔ اس کے بعد تحقیق کار اس فہرست میں سے نمونہ بندی کے لیے مطلوبہ افراد کے نام بغیر کسی رغبت یا نفرت کے کر سکتا ہے۔ بعض ماہرین کا کہنا ہے کہ اگر آبادی بہت بڑی نہ ہو تو دس فی صد افراد نمونے میں ضرور منتخب کیے جانے چاہئیں۔ یعنی اگر آپ کسی زبان کے کُل سو ادیبوں پر کام کر رہے ہوں تو دس کو ضرور شامل کریں۔

فہرست میں سے نام حاصل کرنے کا ایک طریقہ قرعہ اندازی کا ہے کہ ہر فرد کو ایک نمبر دے دیا جائے۔ مثال کے طور پر فہرست نمبر شمار کے ساتھ تیار کی جائے اور پھر ان نمبروں کی پرچیوں میں سے مطلوبہ تعداد کی پرچیاں اسی طرح اٹھائی جائیں جیسے قرعہ نکالا جاتا ہے۔

دوسرا طریقہ اتفاقی اعداد کی جدولوں (Random Digit Tables) کی مدد سے اختیار کیا جا سکتا ہے۔ تحقیق کار یا تو خود اپنی جدولیں تیار کر لیتا ہے یا تحقیق کی کسی کتاب کے آخر میں درج ہندسوں سے مدد لیتا ہے۔ ان جدولوں میں ہندسے بغیر کسی ترتیب کے درج ہوتے ہیں۔ تحقیق کار طے کرتا ہے کہ یا تو انھیں افقی (Horizontally) طور پر دیکھے گا یا پھر عمودی (Vertically) طور پر اور جہاں سے چاہے گا شروع کرے گا۔ مثال کے طور پر اگر نمبر اس طرح درج ہوں۔

پہلا کالم	دوسرا کالم	تیسرا کالم
54410	92792	23956
23120	31002	03982
67821	56789	56612
42421	44201	35242

تحقیق کار تیسرے کالم کی پہلی قطار پر عمومی نظر ڈالتے ہوئے نمبر 3.5.2 اپنے نمونے میں شامل کرے گا۔ پھر وہ دو دو ہندسوں کو ملا کر پڑھنا شروع کرے گا اور تیسرے کالم میں نمبر 23 اور 03 (تین کو چھوڑتے ہیں۔ کیوں کہ وہ پہلے آ چکا ہے) نمبر 56 اور 35 کو نمونے میں شامل کرے گا۔ اس طرح پھر تین تین ہندسوں کو دیکھتے ہوئے وہ نمبر (352,566,039,239) کو نمونے میں شامل کرے گا۔ اگر وہ دوسرے کالم سے شمار کرے گا تو ایک ایک ہندسے کی صورت میں (4,5,3,9) نمونے میں آ جائیں گے۔ اس کے بعد دو دو ہندسوں کی صورت میں (44,56,31,92) اور تین ہندسوں کی صورت میں (442,567,310,927) اس طرح تحقیق کار یکے بعد دیگرے کالم اور الگ الگ ایک قطار کو دیکھتے ہوئے نمبروں کی مدد سے نمونہ بندی کے

لیے مقررہ تعداد پوری کرے گا۔ ان نمبروں کی مدد سے نمونہ بندی میں کسی قسم کی جانب داری یا برابر امکان کی خصوصیت میں کمی نہیں آنے پائے گی۔

2- منظم نمونہ بندی (Systematic Sampling)

فہرست تیار کرنے کے بعد اگر اس میں سے بغیر کسی ترتیب کے نام یا نمبر منتخب کرنے کی بجائے تحقیق کرنے والا پہلے سے یہ طے کردے اور اس کا اظہار کردے کہ وہ فہرست میں سے ہر تیسرا یا پھر پانچواں یا ستر ھواں نام نمونے میں منتخب کرے گا تو اس طرح کی نمونہ بندی کو ترتیبی نمونہ بندی کہتے ہیں۔ اس طرح کی نمونہ بندی کے لیے احتیاط کا تقاضا ایک تو یہ ہے کہ بنیادی فہرست ہر طرح کے تعصبات اور جانبداری کو یکسر خیر باد کہہ کر تیار کی گئی ہو اور دوسرے یہ کہ ناموں کو منتخب کرنے کا سلسلہ ایک سے شروع نہ کیا جائے۔ کیوں کہ اس طرح نمبر ایک پر درج نام نمونے میں ضرور شامل ہوگا اور یہ ایک طرح کی گارنٹی ہو جائے گی جب کہ معلوم امکان کی نمونہ بندی کے طریقوں کی اولین شرط ہی یہ ہے کہ کسی کے لیے کوئی گارنٹی نہ ہو۔ ان سب کے لیے برابر امکان ہو۔ شمار کرنے کا آغاز اس طرح ہوسکتا ہے کہ اگر بارھواں نمبر شمار کرنا ہے تو ایک سے بارہ تک نمبر پرچیوں پر لکھ کر قرعہ کی طرح ایک نمبر اٹھا لیا جائے اور جو نمبر نکل آئے وہاں سے شمار شروع کیا جائے۔ ترتیبی نمونہ بندی کے درست ہونے کا انحصار بنیادی فہرست کے درست ہونے پر ہے۔ یہ نمونہ بندی وہاں کرنی چاہیے جہاں تمام نام ایک سی خصوصیات رکھتے ہوں۔

3- طبقاتی نمونہ بندی (Stratified Sampling)

اس طریقے کی نمونہ بندی کا طریقہ یہ ہے کہ متعلقہ تحقیق آبادی (Population) کے تمام طبقات کی الگ الگ فہرست بنائی جائے اور پھر ہر ایک طبقے میں سے اتفاقی نمونہ بندی کر لی جائے۔ ہر پیشے سے تعلق رکھنے والوں کے ناموں کی الگ الگ فہرست تیار کر لی جائے اور پھر اس میں سے الگ الگ اتفاقی نمونہ بندی کر لی جائے۔ پیشوں کے علاوہ آمدنی اور تعلیمی عمر، تجربے وغیرہ کے لحاظ سے بھی طبقات مقرر کیے جاسکتے ہیں اور ان کی الگ الگ فہرست بنائی جاسکتی ہے۔ کس طرح کے طبقات کی فہرست بنانے کی ضرورت ہوگی اس کا انحصار تحقیق کے مسئلے، موضوع اور مقصد پر ہوتا ہے۔

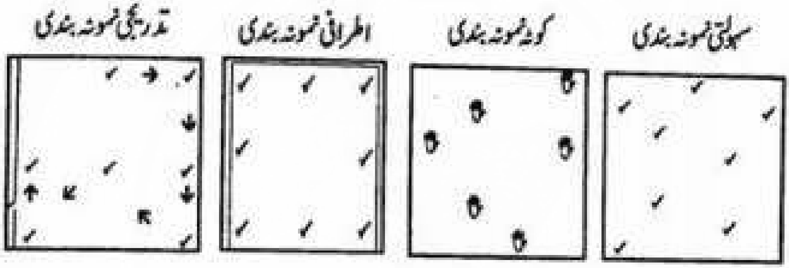
4- گروہی نمونہ بندی (Cluster Sampling)

اس نمونہ بندی میں افراد کے گروپ نمونہ بندی کے لیے بنیادی اکائی ہوتے ہیں۔ اس کے بعد دوسری سطح (Stage) پر منتخب مکانات میں رہنے والوں میں سے اتفاقی نمونہ بندی کی جائے گی۔ اسی طرح سکونتی طلبہ پر تحقیق کی جا رہی ہو تو زبانوں کے تقابلی مطالعے میں کسی ہوسٹل میں پہلے مرحلے پر چند کمرے اور دوسرے مرحلے میں ان کمروں میں رہنے والوں میں سے ایک فرد نمونے میں منتخب کیا جائے گا۔ یہ کام چونکہ مختلف مرحلوں میں مکمل ہوتا ہے۔ اس طرح کی نمونہ بندی کو کثیر المرحلہ گروہی نمونہ بندی (Multi Stage

Cluster Sampling) بھی کہتے ہیں۔

(ب) نیم امکانی نمونہ بندی (Non-Probability Sampling)

چھوٹے پیمانے پر کیے جانے والے مطالعوں یا تجرباتی بنیادوں پر کیے جانے والے مطالعوں کے لیے عموماً اس طرح کی نمونہ بندی کی جاتی ہے۔ اس میں معلوم نہیں ہوتا کہ در حقیقت کتنے افراد میں سے کتنے لوگ منتخب کیے جا رہے ہیں۔ چنانچہ نمونے میں منتخب ہونے کے امکانات کی برابری کا کچھ علم نہیں ہوتا۔ نا معلوم امکان کی نمونہ بندی چار طرح کی ہوتی ہے۔



1- سہولتی نمونہ بندی (Convenience Sampling)

اس طرح کی نمونہ بندی میں در حقیقت کوئی ترتیب نہیں ہوتی۔ تحقیق کار اپنی سہولت کے مطابق جو بھی مل جائے اسی سے سوال نامہ بھروالیتا ہے یا انٹرویو کر لیتا ہے۔ گویا جو نقصان نمونہ بندی کو صحیح طور پر نہ کرنے سے ہوتا ہے اسے وقت بچا کر پورا کرنے کی سعی کہتے ہیں۔

2- کوٹہ نمونہ بندی (Quota Sampling)

یہ طریقہ نیم امکانی نمونہ بندی والے خاندان میں طبقاتی نمونہ بندی سے ملتا جلتا ہے۔ کوٹہ نمونہ بندی میں پہلے یہ طے کیا جاتا ہے کہ کون سا طبقہ مطالعے کے لیے موزوں رہے گا، پھر اس طبقے میں سے تحقیق کرنے والا اپنی معلومات کی بنیاد پر کوٹہ مقرر کر دیتا ہے۔ اس طرح سے کی جانے والی نمونہ بندی کو جس میں تحقیق کار خود سے کوٹہ مقرر کرتا ہے اور کوٹے میں شامل ہونے والے افراد، ادیبوں، محققوں، شاعروں کا انتخاب اپنی صوابدید کے مطابق کرتا ہے، کوٹہ نمونہ بندی کہتے ہیں۔

3- اطرافی نمونہ بندی (Dimensional Sampling)

اس طرح کی نمونہ بندی کے لیے تحقیق کرنے والا کسی سوال کے مختلف جوابات رکھنے والوں کی نمونہ بندی کرتا ہے۔ مثال کے طور پر تاریخی ناولوں کے سوال پر ممکنہ جواب یہ ہو سکتے ہیں کہ:

1- مجھے تاریخی ناول انتہائی ناپسند ہے۔
2- مجھے تاریخی ناول ایک حد تک ناپسند ہے، ایک حد تک پسند ہے۔

3- مجھے تاریخی ناول انتہائی پسند ہے۔

ان تین امکانی جوابات کے پیش نظر اگر تحقیق کرنے والا تینوں طرح کے افراد منتخب کر کے مطالعے کے بارے میں ان سے گفتگو کرے تو اس کی نمونہ بندی نامعلوم امکان کی اطرافی نمونہ بندی کہلائے گی۔

4- تدریجی نمونہ بندی (Snowball Sampling)

اس طرح کی نمونہ بندی کے لیے تحقیق کار مطالعے کے لیے موزوں چند افراد کو تلاش کرتا ہے اور پھر ان سے انھی جیسے مزید افراد کے نام پتے معلوم کر کے تحقیق کو آگے بڑھاتا ہے یہاں تک کہ نمونہ بندی کے لیے افراد کی مقررہ تعداد پوری ہو جاتی ہے۔ جس طرح برف کی گیند پہاڑ کی چوٹی سے نیچے آتے آتے بتدریج بڑی ہوتی جاتی ہے اسی طرح اس قسم کی نمونہ بندی میں نمونہ بتدریج بڑا ہوتا جاتا ہے۔

عام طور پر تحقیق کا موضوع اور مقصد یہ طے کرتا ہے کہ کس طرح کی نمونہ بندی مناسب ہوگی۔ مثال کے طور پر اگر نتائج کو منتخب نمونے سے باہر قابلِ اطلاق نہ بنانا ہو یعنی ان کی تعمیم نہ کرنی ہو تو نیم امکانی نمونہ بندی موزوں ہو سکتی ہے۔ اگر نتائج کی بڑے پیمانے پر تعمیم کرنا ہو تو پھر امکانی نمونہ بندی موزوں ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ سوال نامے کی آزمائش ماقبل (Pretesting) کے لیے نیم امکانی نمونہ بندی کا طریقہ استعمال کر کے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ سوال نامے کے سوالات وغیرہ کا مفہوم واضح طور پر سمجھ میں آتا ہے یا نہیں۔ دونوں طرح کی نمونہ بندی کا اپنا اپنا استعمال ہے جسے واضح طور پر سمجھ کر استعمال کیا جانا چاہیے۔ ادبی و لسانی تحقیق کے لیے موزوں نمونہ بندی امکانی اور تدریجی نمونہ بندیاں موزوں نظر آتی ہیں تاہم باقی اقسام بھی زیرِ استعمال لائی جا سکتی ہیں۔

3- کوائف کا شماریاتی تجزیہ

تحقیق کے حوالے سے کوائف کے تجزیے کے لیے شماریات ہی کو بنیاد بنایا جاتا ہے۔ اس کے لیے شماریات کے تین پہلو اہم ہیں:

1- پیشہ ورانہ رسائل میں اشاعت کے لیے شماریاتی تجزیہ۔

2- تحقیقی مقالوں کے لیے شماریاتی تجزیات۔

3- سادہ اور بنیادی شماریات کا تحقیقی فہم۔

سوال ناموں، انٹرویو اور دیگر آلات تحقیق سے نمونہ بندی کے مطابق حاصل کردہ کوائف / جوابات کا تجزیہ سیدھی سادی یا عمومی پیش کش کا نام نہیں جیسا کہ اکثر اخبارات و جرائد مختلف آراء کے حوالے سے کرتے ہیں بلکہ ان جوابات کو شماریاتی طریقے سے پیش کر کے نتائج نکالنا تحقیق کی سائنسی بنیادوں میں سے ایک ہے۔ ایس ایم شاہد اور ڈاکٹر نثار احمد زبیری نے ایسے طریقے بیان کیے ہیں جو تعلیم اور عمرانیات کے میدان میں استعمال ہوتے ہیں۔ ادبیات اور لسانیات کے ایسے تحقیقی جائزوں کے لیے حسبِ ذیل چند معلومات مفید ہو سکتی ہیں۔

شماریات(Statistics)، ریاضی کی ایک ایسی شاخ ہے جس کے ذریعے سے تجربات وشواہد سے حاصل شدہ کوائف کی تشریح اور توضیح کی جاتی ہے۔

شماریات کے فوائد مندرجہ ذیل ہیں:

1- اس کی وجہ سے نتائج کو تمام تر قطعیت کے ساتھ بیان کیا جاسکتا ہے۔

2- یہ ہمیں بالکل واضح اور غیر مبہم طریقہ کار اختیار کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

3- یہ نتائج کو نہایت اختصار سے پیش کرنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔

4- یہ واضح سفارشات مرتب کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

5- اس کی بنا پر پیش گوئی بھی کی جاسکتی ہے اور

6- اس کی مدد سے نتیجہ پیدا کرنے والے اتفاقی عناصر(Casual factors) کی نشان دہی ہوسکتی ہے۔

ادبی ولسانی تحقیق کے لیے یہاں اس علم کے محض چند بنیادی تصورات اور طریقے پیش کیے جائیں گے۔

کوائف واعداد وشمار کے شماریاتی تجزیے کے لیے ان کی گروہ بندی کی جاتی ہے۔ یہ کئی طرح کی ہوتی ہے۔ کوائف کی عام گروہ بندی کے لیے چھانٹی کی جاتی ہے۔ یہ عمل دستی طور پر کاغذ پر انجام دیا جاتا ہے۔ ہر قسم کے ہر زمرے کے لیے علیحدہ جگہ رکھی جاتی ہے۔ ہر امکانی جواب کی علیحدہ تنظیم کی جاتی ہے۔ ان کوائف سے جدولیں بنائی جاتی ہیں تاکہ اہم تفاصیل اور ان کا باہمی ربط واضح ہو جائے۔ بعض اعداد وشمار کو گراف کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔ ان میں خطی اور مدوّر گراف زیادہ معروف ہیں۔ کوائف کے تجزیے کے چند طریقے حسب ذیل ہیں:

تعددی تقسیم (Frequency Distribution)

کسی تحقیقی کام یا مشاہدے کے نتیجے میں(مثال کے طور پر تحقیقی مقاصد کے لیے کوئی سوال نامہ بھروانے کے بعد) ہمیں کوائف منتشر حالت میں ملتے ہیں مثلاً اگر ہم ٹی وی کے ادبی پروگراموں کی مقبولیت کے بارے میں کوئی سوال نامہ پُر کرائیں، تو ہر پروگرام کے بارے میں سکور ہمیں بکھری ہوئی حالت میں ملیں گے۔ کچھ کی نظر میں ڈرامے بہت پسندیدہ ہوں گے۔ کچھ کی نظر میں مباحثوں کے پروگرام اور کچھ کی نظر میں درآمد شدہ غیر ملکی پروگرام۔ ہمارے پروگراموں کے بارے میں ان کی رائے کو عددی شکل میں رکھنے پر ہمارے لیے مشکل ہوگا کہ ہم ایک نظر میں(At a glance) یہ معلوم کرسکیں کہ اوسط کے لحاظ سے کون سا پروگرام زیادہ مقبول ہے۔ اس طرح کی مشکلات کے حل کے لیے شماریات کا ایک اہم طریقہ یہ ہے کہ ان منتشر کوائف کی درجہ بندی کی جائے اور انھیں ایک ایسی شکل میں رکھا جائے کہ ایک نظر میں ہر گروہ کا اندازہ

ہو سکے۔ پھر اس درجہ بندی کی مدد سے مرکزی رجحان (Central Tendency) کو ظاہر کرنے والے پیمانے مرتب کیے جاتے ہیں جن میں سے تین کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے:

1- M اوسط حسابیہ (Mean)

2- Mdn وسطانیہ (Median)

3- Md تکراریہ (Mode)

کسی بھی زیر تحقیق گروہ کی اوسط کارکردگی معلوم کرنے کا سب سے زیادہ قابل اعتماد طریقہ یہ ہے کہ اس کی کارکردگی کا اوسط حسابیہ معلوم کرلیا جائے۔ اوسط حسابیہ کسی گروہ کی مجموعی کارکردگی کو ظاہر کرتا ہے۔ اسی طرح وسطانیہ ایک ایسے نقطے (Point) کو کہتے ہیں جو کسی گروہ کے نصف حصے کے رجحان کی وضاحت کرتا ہے۔ چنانچہ وسطانیہ کے پیش نظر آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس گروہ میں نصف افراد اس نقطے سے اوپر اور نصف اس سے نیچے ہیں۔ اس کے بعد تکراریہ بھی ایک نقطہ ہے جس پر کسی گروہ کے زیادہ تر افراد کا سکور نظر آتا ہے۔ تکراریہ اس سکور کو ظاہر کرتا ہے جو متعلقہ گروہ میں زیادہ افراد نے حاصل کیا ہو جس کی تکرار ہو رہی ہو۔

تعددی تقسیم ایک ایسی جدول ہے جس میں مختلف کالم ہوتے ہیں۔ اس کی تیاری سے منتشر کوائف بامعنی شکل اختیار کرتے ہیں۔ 1958ء میں ڈاکٹر محمد افضل، 1982ء میں ڈاکٹر ممتاز منگلوری، 1999ء میں مقتدرہ اور نادرا نے مشترکہ طور پر اور 2015ء میں یو ایس ایڈ کے پاکستان ریڈنگ پراجیکٹ نے اُردو حروف تہجی کی تعددی تقسیم کی جدولیں تیار کی تھیں۔ ان کی مدد سے راقم کو اُردو قاعدہ اور اُردو کلیدی تختہ تیار کرنے میں مدد ملی۔ اس کے لیے کتابیں اُردو تدریسیات، اُردو: طریق تدریس، علم تدریس اُردو یا طریق و تدریسیات اُردو ملاحظہ کی جا سکتی ہیں۔

ڈاکٹر نثار احمد زبیری نے مختلف اقدامات کی تفصیل کچھ یوں دی ہے:

1- سب سے پہلے گروہ میں سب سے زیادہ اور سب سے کم سکور کی نشان دہی کی جاتی ہے۔ زیادہ میں سے کم کو گھٹا کر اور اس میں ایک جمع کر کے تعدادات کی حدِ اطلاق معلوم کی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر کسی گروہ میں سب سے زیادہ سکور 68 اور کم سے کم سکور 32 ہے تو حد اطلاق (Range) = 68 - 32 = 36 + 1 =37 ہو گی۔

2- حدِ اطلاق معلوم کرنے کے بعد ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت ہمیں کتنے زُمروں کی ضرورت ہو گی۔ زُمرہ ایک دراز کی طرح ہے جس کی ایک نچلی حد، حدِ اصغر (Lower Limit) اور ایک بالائی حد، حدِ اکبر (Upper Limit) ہوتی ہے۔ یہ زُمرے قائم کرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہر تعدد کو کسی ایک دراز میں رکھا جا سکے گا، مثلاً اگر دو تعدادات 68 اور 32 ہوں تو یہ دونوں دو مختلف قسم کی اشیاء کی طرح ہیں جنھیں ایک دراز

میں تھوڑا سا بے ترتیبی ہوگی۔ اب اگر دو زمرے 60-70 اور 30-40 ہوں تو مندرجہ بالا تعدّدات کو اس طرح لکھا جا سکے گا:

زمرے	تعدّدات
70-60	1
60-50	-
50-40	-
40-30	1

اس طرح ہم کہہ سکیں گے کہ 60-70 والے زمرے میں ایک تعدد اور 30-40 والے زمرے میں ایک تعدد ہے۔

عموماً جب حدِ اطلاق (Range) زیادہ ہو تو زمرے بڑے رکھے جاتے ہیں۔ حدِ اطلاق نکالنے کا فائدہ یہی ہے کہ اس کی روشنی میں زمروں کی تعداد اور ان کی حدود اصغر و اکبر کا تعین کیا جائے۔ ماہرین شماریات کی روایت کے مطابق اگر حدِ اطلاق کم ہے تو حدِ اصغر اور حدِ اکبر میں فرق صرف ایک یا دو ہو سکتا ہے (مثلاً 20-21)۔ اگر حدِ اطلاق درمیانی ہے تو یہ فرق تین ہو سکتا ہے (مثلاً 20-22) اگر حدِ اطلاق بڑی ہے تو یہ فرق پانچ یا دس ہو سکتا ہے (مثلاً 20-24 یا 20-29)۔ واضح رہے کہ 20 سے 24 تک فرق پانچ کا یعنی 24, 23,22,21,20 کا ہو جاتا ہے۔

ماہرین کا کہنا ہے کہ زمروں کی کل تعداد بہت زیادہ یا بہت ہی کم نہیں ہونی چاہیے۔ عموماً سات یا دس سے لے کر بیس تک زمرے کافی تصور کیے جاتے ہیں۔ اگر سب سے چھوٹے زمرے کی حدِ اصغر و قفے کے دونوں اعداد (20-24) کے درمیان فرق (5) سے پوری تقسیم ہو جائے تو اسے قابلِ ترجیح سمجھا جاتا ہے، مثلاً اس مثال میں 5,20 سے پورا تقسیم ہوتا ہے۔

تعدّدی تقسیم کی جدول کے پہلے کالم میں زمرے درج کیے جاتے ہیں۔

-2 تعدّدی تقسیم کے دوسرے کالم میں تعدّد کو نشاناتِ تعدّد (Tallies) سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ کسی زمرے میں جتنے تعدّدات آتے ہیں اتنی Tallies لگا دی جاتی ہیں مثلاً فرض کریں کہ 38,58,35,24,51,56,44,29,28,32 بکھری ہوئی تعدّدات ہیں، انھیں مندرجہ ذیل زمروں میں رکھنے کا طریقہ یہ ہوگا کہ ایک زمرے کے سامنے حسبِ صورتِ حال Tallies لگا دی جائیں (Tally ایک ترچھے نشان کو کہتے ہیں)۔ یہ کام اس طرح ہوگا:

زمرے	نشانات	تعدد(f)
50-59	///	3
40-49	/	1

30-39	///	3
20-29	///	3

3- تیسرے کالم میں نشانات تعدد (Tallies) کو گن کر عدد کی صورت میں لکھ دیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر دیکھیں مندرجہ بالا جدول میں تیسرا کالم۔

4- چوتھے کالم میں ہر درجاتی وقفے کی قطعی حدِ اصغر اور قطعی حدِ اکبر(Exact Lower and Exact Upper Limits) لکھی جاتی ہیں۔ایسا کرنے کا سبب یہ ہے کہ زمروں کی حدود کے متراکب ہونے (overlapping) کے اثرات کو محدود کر دیا جائے۔ مثال کے طور پر کوئی دو زمرے اگر 14-15 اور 15-16 ہوں تو 15 کے بارے میں یہ طے کرنا مشکل ہو جائے گا کہ اسے پہلے زمرے میں رکھا جائے یا دوسرے میں۔ اس مشکل کو دور کرنے کے لیے قطعی حدود کا تعین کیا جاتا ہے۔ جس کا طریقہ یہ ہے کہ ہر زمرے کی حدِ اصغر میں سے 0.5 نفی کر دیا جائے اور حدِ اکبر میں 0.5 جوڑ دیا جائے۔ چنانچہ مندرجہ بالا دونوں زمرے اس طرح ہو جائیں گے۔

1.14.5-15.5

2.13.5-14.5

اس کا مطلب یہ ہوگا کہ 14.5 تک کے تمام سکور زمرہ 2 میں اور اس سے زائد کا سکور(مثلاً 14.6) زمرہ 1 میں رکھا جائے گا۔ اس تبدیلی کے بعد 15 کے سکور کے بارے میں کوئی شبہ نہیں رہے گا کہ وہ زمرہ 1 ہی میں آئے گا۔

5- تعددی تقسیم کے پانچویں خانے میں زمروں کے درمیانی نکات (Mid-Points X) درج کیے جاتے ہیں۔ جنھیں ہر درجاتی وقفے کی حدِ اصغر اور حدِ اکبر کو جمع اور دو سے تقسیم کر کے حاصل کیا جاتا ہے۔ چنانچہ مندرجہ ذیل درجاتی وقفوں کے درمیانی نکات اس طرح ہوں گے:

زمرے	درمیانی نکات
44-40	42
39-35	37
34-30	32

کچھ دوسرے زمروں کے درمیانی نکات اس طرح ہوں گے:

11-10	10.5
12-10	11
14-10	12
19-10	14.5
20-10	15

تعددی تقسیم کی جدول کے مختلف کالموں کے ذکر کے بعد ہم ایک مثال لیتے ہیں۔ فرض کریں یہ کہا جائے کہ مندرجہ ذیل کوائف کی درجہ بندی کریں:

37,34,18,18,17,15,36,39

40,20,22,24,30,19,32,34,24

حدِ اطلاق نکالنے کے لیے دیکھیں کہ سب سے بڑا سکور 40 اور سب سے کم 15 ہے لہٰذا حدِ اطلاق ہوئی۔ 26 = 1 + 25 = 15-40 اس حد اطلاق کے پیش نظر ایسے زمرے مناسب ہو سکتے ہیں جن کی دونوں حدود کے درمیان فرق 3 کا ہو۔ چنانچہ زمرے اور دوسرے کالم مندرجہ ذیل ہوں گے:

جدول الف

زمرے	نشانات	تعدد	قطعی حدود	درمیانی نکات	تعداد اور درمیانی نکات کی ضرب
		(f)		X	f x X
44-42	-	صفر	44.5-41.5	43	-
41-39	//	2	41.5-38.5	40	80
38-36	//	2	38.5-35.5	37	74
35-33	//	2	35.5-32.5	34	68
32-30	//	2	32.5-29.5	31	62
29-27	-	صفر	29.5-26.5	28	-
26-24	//	2	26.5-23.5	25	50
23-21	/	1	23.5-20.5	22	22
18-20	///	4	20.5-17.5	19	76
17-15	//	2	17.5-14.5	16	32
N =	17			$\sum$ fX = 464	

(یہاں $\sum$ سے مراد ہے مجموعہ یا میزان)

تعددی تقسیم کی تیاری کے بعد اس کی مدد سے مرکزی رجحان کے پیمانے مندرجہ ذیل طریقوں سے نکالے جا سکتے ہیں۔

مرکزی رجحان کے پیمانے

تعددی تقسیم تیار ہو جانے کے بعد اوسط حسابیہ، وسطانیہ اور تکراریہ نکالنا آسان ہو جاتا ہے۔ ان تینوں پیمانوں کی تعریف اوپر آ چکی ہے لہٰذا یہاں ہم صرف فارمولے اور ان کے مطابق اوپر درج شدہ جدول سے اوسط حسابیہ، وسطانیہ اور تکراریہ نکالنے کو ترجیح دیں گے۔

-1 اوسط حسابیہ

(الف) اگر کوائف کی درجہ بندی نہ کی جائے تو فارمولا ہے:

$$M = \frac{\Sigma X}{N}$$

یہاں Σ سے مراد تعداد کے تمام میزان سے اور N سے مراد لوگوں کی تعداد سے ہے۔ اوپر درج کیے جانے والے غیر مرتب کوائف کا اوسط حسابیہ یہ ہوگا:

$$M = \frac{459}{17} = 27$$

(ب) تعددی تقسیم کے بعد یعنی کوائف کی درجہ بندی کے بعد اوسط حسابیہ کے لیے فارمولا اور حساب ہوگا:

$$M = \frac{\Sigma fX}{N} = \frac{464}{17} = 27.29$$

(یہاں یونانی زبان کے حرف سگما سے مراد ہے مجموعہ، fX سے مراد تعدد (f) اور درمیانی نکات (X) کو ضرب لگا کر آنے والے اعداد کا مجموعہ)

یہاں غیر مرتب کوائف سے اوسط حسابیہ 27 اور مرتب کوائف (کوائف) سے 27.29 آتا ہے۔ دونوں صورتوں میں آنے والے اوسط حسابیہ میں معمولی فرق ایک امکانی امر ہے۔ اس پر تردد کی ضرورت نہیں۔

-2 اب اگر اوپر کی تعددی تقسیم کی مدد ہی سے وسطانیہ نکالنا مقصود ہو تو اس کے لیے فارمولے ہیں:

$$(1)\ Mdn = u - \left(\frac{\frac{N}{2} - Fa}{fp}\right) i$$

$$(2)\ Mdn = 1 + \left(\frac{\frac{N}{2} - Fb}{fp}\right) i$$

یہاں

u سے مراد وسطانیہ والے زمرے کی قطعی حدِ اکبر ہے

l سے مراد وسطانیہ والے زمرے کی قطعی حدِ اصغر ہے

N سے مراد ان لوگوں کی تعداد جن کا سکور زیرِ ترتیب ہے

N/2 سے مراد N کے نصف سے ہے

Fa سے مراد ان تعدد (f) کی جمع سے ہے جو وسطانیہ والے زمرے سے بڑے زمروں میں واقع ہیں۔

Fb سے مراد ان تعدد (f) کی جمع سے ہے جو وسطانیہ والے زمرے سے چھوٹے زمروں میں واقع ہیں۔

fp سے مراد ہے وہ تعدّد (f) جو وسطانیہ والے زمرے میں ہے۔

اور i سے مراد ہے زمروں کی دونوں حدود کے درمیان فرق سے

وسطانیہ نکالنے کا طریقہ یہ ہے کہ سب سے پہلے N/2 معلوم کیا جائے یعنی جتنے افراد کا سکور زیرِ ترتیب ہے ان کی تعداد کو دو سے تقسیم کر دیا جائے۔ اوپر دی جانے والی جدول میں چوں کہ N 17 ہے لہٰذا N/2 =8.5 ہوگا۔ اب تعدد (f) کو نیچے سے جوڑتے ہوئے دیکھا جائے کہ نصف N یعنی 8.5 کس زمرے میں پورا ہوتا ہے۔ یہی وہ زمرہ ہوگا جس میں وسطانیہ واقع ہے بہتر ہوگا اس کے اوپر اور نیچے (اسے علیحدہ کرنے کے لیے) نشان لگا دیا جائے۔

یہاں دی جانے والی جدول میں 8.5 اس زمرے میں واقع ہے جو 26-24 کی حدود رکھتا ہے۔ جدول میں اس زمرے کے اوپر اور نیچے نشان لگا دیا گیا ہے۔ اب آپ چاہے تعدّد (f) کو اوپر سے جوڑ کر دیکھیں چاہے نیچے سے، بہتر صورت 8.5 کا عدد اسی زمرے میں پورا ہوتا ہے۔ اب پہلے فارمولے کے مطابق وسطانیہ یوں نکالا جائے گا:

$$Mdn = 26.5 - \left(\frac{8.5 - 8}{2}\right) 3$$

$$= 26.5 - \frac{.5}{2} \times 3$$

$$= 26.5 - \frac{1.5}{2} = 26.5 - .75$$

$$= 25.75$$

اس کے بعد، دوسرے فارمولے سے وسطانیہ یوں نکالا جائے گا:

$$Mdn = 23.5 - \frac{8.5 - 7}{2} \times 3$$

$$= 23.5 + \frac{1.5}{2} \times 3 = 23.5 + 2.25$$

$$= 25.75$$

دونوں فارمولوں سے وسطانیہ ایک ہی آئے گا۔

-3 اوسط حسابیہ اور وسطانیہ کے بعد.....اب ہم تکراریہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ تکراریہ کسی پیمانہ پیمائش(Scale of Measurement) پر وہ نقطہ ہے جس کے اطراف میں سب سے زیادہ تعدد (fs) پایا جاتا ہے۔

اسے نکالنے کا فارمولا ہے:

$$Mo = 3xMdn-2m$$

اگر ہمیں مندرجہ بالا تقسیم تعدد کی مدد سے تکراریہ نکالنا ہو تو وہ اس طرح نکالا جائے گا:

$$\begin{aligned} Mo &= 3 \times 25.75 - 2 \times 27.29 \\ &= 77.25 - 54.58 \\ &= 22.67 \end{aligned}$$

تقابل

مرکزی رجحان کے تینوں پیمانوں میں اوسط حسابیہ سب سے زیادہ قابلِ اعتماد، وسطانیہ اس سے کم اور تکراریہ سب سے کم قابلِ اعتماد ہے۔ ان تینوں کی بابت ماہرین شماریات کا کہنا ہے کہ اوسط حسابیہ اس وقت نکالیں جب:

-1 نتائج پر اعتماد حاصل کرنے اور ان کی صداقت جانچنے کی ضرورت سب سے زیادہ ہو۔ اس اعتماد کا سبب یہ ہے کہ کسی ایک ہی آبادی میں کی جانے والی مختلف نمونہ بندی کے بعد نتائج کے اوسط حسابیہ میں بہت کم فرق واقع ہوتا ہے اور نتائج کی تعداد یا نوعیت سے اوسط حسابیہ فوراً متاثر ہو کر فرق ظاہر کرتا ہے۔

-2 وسطانیہ اس وقت نکالیں جب

اوسط حسابیہ نکالنے کا وقت نہ ہو، تعدد (fs) تمام درجاتی وقفوں میں کم و بیش یکساں تقسیم نہ ہو بلکہ کسی ایک طرف زیادہ اور دوسری طرف کم یعنی (Skewed) ہو یا نتائج مکمل طور پر دستیاب نہ ہوں۔

-3 تکراریہ اس وقت نکالیں جب جلد از جلد مرکزی رجحان کا اندازہ کرنا ہو اور اس کے محض سرسری اندازے سے کام چل سکتا ہو۔

معیاری انحراف SD(Standard Deviation)

کوائف میں جوابی انتشار بھی شماریات کا ایک اہم تصور ہے۔ جس کی مدد سے یہ معلوم کیا جاتا ہے کہ حاصل شدہ کوائف کا اوسط حقیقتاً کس حد تک بہتر نمائندگی کرتا ہے۔ کوائف کے انتشار کی پیمائش معیاری انحراف سے کی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر دیکھیں کہ اگر سندھی کے مضمون میں تین طلبہ کے حاصل شدہ نمبر 25,75

اور 20 ہوں تو ان کا اوسط 40 ہوگا لیکن یہ اوسط اس گروہ کی تینوں تعدد کی صحیح طور پر نمائندگی نہیں کرتا۔ جب یہ کہا جائے کہ گروہ میں سند ھی کا اوسط سکور 40 ہے اس سے 20 اور 25 نمبر حاصل کرنے والے طلبہ کے ساتھ ایک قسم کی طرف داری (Favour) ہوگی جب کہ 75 نمبر حاصل کرنے والے کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔

اب اگر تین طلبہ کے کسی دوسرے گروہ میں حاصل شدہ نمبر 38,39 اور 43 ہوں تو اس گروہ کا اوسط بھی 40 ہوگا لیکن اس کا اوسط، گروہ کی کہیں بہتر نمائندگی کرے گا۔ بالفاظ دیگر ہم کہہ سکتے ہیں کہ جس گروہ میں انتشار زیادہ ہے (یعنی 20 تا 75) اس میں اوسط گمراہ کن ہوسکتا ہے۔ ایسی صورت میں ہمیں یہ دیکھنے کے لیے کہ اوسط اپنے گروہ کی کس نوع کی نمائندگی کرتا ہے، کسی اور پیمانے کی ضرورت ہے۔ سادہ ترین الفاظ میں انتشار کے مختلف پیمانوں کا یہی کام ہے۔

انتشار کے یوں تو کئی پیمانے مستعمل ہیں، لیکن ان میں سب سے زیادہ استعمال معیاری انحراف کا کیا جاتا ہے۔ جس کا فارمولا ہے:

$$S.D = \sqrt{\frac{14}{3}}$$

یہاں D سے مراد ہے اوسط سے انحراف

N سے مراد ہے تعداد (کتنے افراد کا سکور ہے)

آیئے اب مندرجہ بالا مثالوں کا معیار انحراف نکال کر دیکھیں۔

گروپ (1)

	تعدد	اوسط سے انحراف D	D^2	
1.	20	-20	400	
2.	25	-15	225	$S.D = \sqrt{\frac{1850}{3}}$
3.	75	35	1225	
	میزان =120		$\sum D^2$=1850	=24.83
	اوسط = 40			

گروپ (2)

تعدد	اوسط سے انحراف D	D^2

1.	38	-2	4	
2.	38	-1	1	
3.	43	3	9	
	میزان = 120		$\sum D^2 = 14$	=2.16
	اوسط = 40			

ایک گروہ کا معیاری انحراف 24.83 اور دوسرے کا صرف 2.16 ہے۔ جس گروہ میں انتشار زیادہ ہے اس کا معیاری انحراف بڑا ہے۔ چنانچہ یہ کہا جائے گا کہ جس گروہ کا معیاری انحراف بڑا ہے اس میں اوسط اپنے گروہ کی موثر نمائندگی نہیں کرتا اور مرکزی رجحان کو مناسب طور پر ظاہر نہیں کرتا۔ اس کے برعکس جب معیاری انحراف چھوٹا ہے تو اوسط اپنے گروہ کے مرکزی رجحان کو بہتر طور پر ظاہر کرتا ہے۔

تعددی تقسیم کی مدد سے یا بالفاظ دیگر گروہی کوائف سے معیاری انحراف نکالنے کا فارمولا مندرجہ ذیل ہے:

$$S.D = \sqrt{\frac{\sum fx^2}{N} - M^2}$$

یہاں f تعدد، x درمیانی نکات، N گروہ میں شامل افراد کی تعداد (یعنی کتنے افراد کا سکور ہے) اور M اوسط حسابیہ کو ظاہر کرتا ہے۔ مثال:

زمرے	f	درمیانی نکات x	fx	fx^2	
30-32	2	31	62	1922	$\{2x(31)^2\}$
27-29	1	28	28	784	
24-26	3	25	75	1875	
21-23	4	22	88	1936	
18-20	1	19	19	361	
15-17	2	16	32	512	
12-14	3	13	39	507	
		N=16	fx = 243	fx2 = 7897	

$$= \frac{\sum fx}{N}$$

$$\text{(M)} = \frac{343}{16} = 21.44$$

اوسط حسابیہ

$$= \sqrt{\frac{7897}{16} - (21.44)}$$

$$\text{معیاری انحراف} = \sqrt{493.56 - 459.67}$$

$$= \sqrt{33.89}$$

$$= 5.82$$

ہم ربطی (Correlation)

شماریات کی مدد سے دو متغیرات کے درمیان تعلق اور اس تعلق باہمی کی قوت و نوعیت معلوم کرنا بھی تحقیق عمرانی کی ایک اہم ضرورت ہے۔ شماریات کی اصطلاح میں اس تعلق باہمی کو ارتباط یا ہم ربطی کہتے ہیں، جو مثبت ایک (+1) سے منفی ایک (-1) کے درمیان ہو سکتا ہے۔ جب دو متغیرات کی قوت ایک ساتھ گھٹتی بڑھتی ہے تو ہم ربطی یا ارتباط مثبت ہوتا ہے اور جب یہ صورت ہو کہ ایک متغیرہ کی قوت بڑھنے پر دوسرے کی قوت کم ہوتی ہو تو ہم ربطی منفی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر عمر اور اخبار پڑھنے کے وقت کے درمیان ہم ربطی +.75 ہو تو کہا جائے گا کہ عمر اور اخبار پڑھنے کے وقت کے درمیان مثبت اور طاقت ور ہم ربطی ہے۔ یعنی یہ دونوں ساتھ ہی ساتھ کم یا زیادہ ہوں گے۔ اس کے برعکس اگر خاندان کی آمدنی اور ٹی وی دیکھنے کے وقت کے درمیان ہم ربطی -.75 ہو تو کہا جائے گا کہ آمدنی بڑھنے پر ٹی وی دیکھنے کا وقت کم ہو جاتا ہے۔

ہم ربطی معلوم کرنے کے بھی متعدد طریقے ہیں جن میں سے دو کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے:

1- حاصل ولمحہ ہم ربطی (Product-Moment Correlation)

عام طور پر ہم ربطی معلوم کرنے کے لیے یہ طریقہ سب سے زیادہ استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کا فارمولا ہے:

$$r = \frac{\sum dx\ dy}{N \sigma x\ \sigma y}$$

جہاں x اور y دو متغیرات ہیں جن سے متعلق سکورز کے درمیان ہم ربطی معلوم کرنا ہے۔ dx سے مراد x متغیرہ سے متعلق ہر سکور کا اس کے اوسط سے فرق ہے۔ اسی طرح dy سے مراد y متغیرہ سے متعلق ہر سکور کا اس کے اوسط سے فرق ہے۔ σx سے مراد x متغیرہ کی تعدد کا معیاری انحراف اور σy سے مراد y متغیرہ کے تعدد کا معیاری انحراف ہے۔ N سے مراد ان افراد کی تعداد ہے جن کے نمبروں میں ہم ربطی معلوم کرنا ہے۔

مثال: فرض کریں کہ ہمیں پانچ طالب علموں کے اُردو اور سندھی میں حاصل شدہ نمبروں میں ہم ربطی معلوم کرنا ہے اور ان کے نمبر مندرجہ ذیل ہیں:

نام	اُردو	dy	سندھی	dy	dxdy
	(x)		(y)		
احمد	20	-11	30	-7	77
مجتبیٰ	25	-6	40	3	-18
راشد	30	-1	35	-2	2
سلیم	32	1	38	1	1
محمود	48	17	42	5	85
میزان	= 155		185		+165-18=147
اوسط	= 31		37		
اوسط انحراف	= 9.46		4.20		

$$r = \frac{\sum(dx)\,(dy)}{N\,\sigma_x\ \sigma_y}$$

$$= \frac{147}{5 \times 9.46 \times 4.20}$$

$$= \frac{147}{198.66}$$

$$= +.73$$

یعنی اس گروہ میں دونوں متغیرات کے اندر طاقت ور مثبت ہم ربطی ہے۔ جس طالب علم نے اردو میں اچھے نمبر لیے ہیں اکثر اسی نے سندھی میں بھی اچھے نمبر حاصل کیے ہیں۔

2-درجہ/ترتیب ہم ربطی (Rank Order Correlation)

ہم ربطی معلوم کرنے کا یہ طریقہ نسبتاً آسان اور سادہ ہے۔ اس کا فارمولا ہے:

$$r = \frac{\Sigma dx\ dy}{N \sigma x\ \sigma y}$$

جہاں D, x اور y متغیرات سے متعلق سکورز کے درمیان Ranks میں فرق کو ظاہر کرتا ہے اور N سے مراد افراد کی تعداد ہے۔

مندرجہ بالا مثال کے مطابق اس طریقے سے ہم ربطی معلوم کرنے کے لیے مندرجہ ذیل جدول کی ضرورت ہوگی:

نام	ریاضی (x)	انگریزی (y)	رینک x	رینک y	رینک میں فرق D	D2
احمد	20	30	5	5	0	0
مجتبیٰ	25	40	4	2	+2	4
راشد	30	35	3	4	-1	1
سلیم	32	38	2	3	-1	1
محمود	48	42	1	1	0	0

$D^2=6$

$$r = 1 - \frac{6 \times 6}{-5\ (25\ \ -1)}$$

$$= 1 - \frac{36}{5 \times 24}$$

$$= 1 - \frac{36}{120} = 1 - .30$$

$$= +.70$$

(نوٹ: مندرجہ بالا دونوں طرح ہم ربطی نکالنے پر نتیجہ کچھ مختلف ہوتا ہے۔ تاہم حاصل لحہ ہم ربطی کو زیادہ قابل اعتماد تسلیم کیا جاتا ہے)۔

کائی سکوئر (χ^2) (Chi Square) فارمولا

دو متغیرات کے مابین آزادی کی شرح کا مطالعہ کائی سکوئر فارمولے سے کیا جا سکتا ہے۔ تحقیق کار ان معنوں میں بھی ایک قابلِ ذکر فرد ہوتا ہے کہ وہ جو اندازہ لگاتا ہے وہ بے سروپا یا بغیر کسی جواز اور دلیل کے نہیں ہوتا۔ تحقیق کی ابتدا عام طور پر کسی اندازے سے ہوتی ہے۔ یہ اندازہ کہ کسی علاقے میں تعلیم سے مقامی زبان بولنے میں کمی واقع ہو گی۔ ایسے اندازے کے بعد جو تحقیق کی جاتی ہے اور جو نتائج حاصل ہوتے ہیں ان کے بارے میں یہ دیکھنا ضروری ہے کہ ان پر کس حد تک اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ کہیں نتائج محض اتفاقاً تو حاصل نہیں ہو گئے یا روز مروں میں جو فرق سامنے نظر آ رہا ہے کیا وہ حقیقت میں اتنا واضح ہے جتنا کہ سمجھا جا رہا ہے۔ اس اعتماد کا حصول شماریات میں کئی طریقوں سے ممکن ہے اور اس کا ایک مقبول طریقہ کائی سکوئر ہے۔ کائی سکوئر کی بنیاد اس امر پر ہے کہ جو نتائج تحقیق سے حاصل ہوئے ہیں وہ کسی معقول اندازے سے کس درجہ مختلف ہیں اور کیا یہ نتائج قابلِ اعتماد ہیں۔ کائی سکوئر اندازے کی بنیاد پر تحقیق سے برآمد حقیقی نتائج کو پرکھنے کا ٹیسٹ ہے۔ اس کا فارمولا ہے:

$$(\chi^2) = \Sigma \frac{(O - E)^2}{E}$$

یہاں x^2 کائی سکوئر کا نشان ہے۔

سائر جدول کے ہر خانے کے اعداد کو فارمولے کے مطابق مختصر کرنے کے بعد سب خانوں کا حاصل جمع کرنے کا نشان ہے۔

O تحقیق سے حاصل شدہ تعدد (f) یعنی ظاہر تعدد (Observed Frequency)

E تعدد کا اندازہ ہے یعنی تخمینی تعدد (Estimated Frequency)۔

اب فرض کریں عمر اور ادبی مطالعے کے درمیان تعلق کی نوعیت معلوم کرنے کے لیے دو سو (200) بالغ اور نابالغ افراد کا ایک سروے کیا جائے اور ایک سو بیس (120) بالغ افراد میں سے چالیس (40) عدم مطالعہ سے دوچار پائے جائیں جب کہ ایک سو دس (110) مطالعہ رکھنے والوں میں سے تیس (30) نابالغ پائے جائیں تو کائی سکوائر سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ نتائج محض اتفاقی تو نہیں اور در حقیقت قابلِ اعتماد ہیں یا نہیں۔ طریق کار کے مطابق سائر جدول یوں بنے گی:

(حقیقی تعدد)

		عدم مطالعہ		
مرتبہ بہ لحاظ عمر	بالغ	80 (a)	40 (b)	120 (c)
مرتبہ بہ لحاظ عمر	نابالغ	30 (d)	50 (e)	80 (f)
مرتبہ بہ لحاظ عمر	میزان	110 (g)	90 (h)	200 (i)

(مربعوں میں وہ اعداد ہیں جو فرضی مثال میں دیے گئے ہیں بقیہ خانے افقی اور عمودی خانوں کا میزان پورا کر کے پُر کیے جاتے ہیں)۔

کائی سکوئر استعمال کرنے کے لیے تعدد کا اندازہ (یا تخمینہ) ایک فارمولے کے مطابق لگایا جاتا ہے۔ اگر مندرجہ بالا نو (9) خانوں کو انگریزی کے ایک ایک حرف سے تعبیر کیا جائے تو سہولت ہو جاتی ہے۔ ہر خانے کی تخمینی تعدد حاصل کرنے کے لیے اس خانے سے متعلق عمودی میزان کو اس کے افقی میزان سے ضرب کر کے کُل میزان سے تقسیم کر دیا جاتا ہے یعنی خانہ (a) کی تخمینی تعدد معلوم کرنے کے لیے

$$a = \frac{g \times c}{i}$$

$$a = \frac{110 \times 120}{200}$$

$$a = 66$$

اس طرح (e) خانے کا تخمینی تعدد ہوگا:

$$a = \frac{90 \times 80}{200}$$

$$= 36$$

اب یا تو اس طرح ہر خانے کی تخمینی تعدد معلوم کر لیا جائے یا اس امر کا خیال رکھتے ہوئے کہ کوئی بھی افقی یا عمودی میزان تبدیل نہیں ہو سکتا صرف ایک خانے کا تخمینی تعدد معلوم کرنے کے بعد باقی خانوں کو بآسانی پُر کیا جا سکتا ہے۔ بہرحال، مکمل جدول اس طرح حاصل ہوگی:

(تخمینی تعدد)

		مطالعہ	عدم مطالعہ	میزان
مرتبہ	بالغ افراد	66	54	120
بہ لحاظ عمر	نابالغ افراد	44	36	80
	میزان	110	90	200

دونوں طرح کے تعدد کی جدول بننے کے بعد اب کائی سکوئر کے فارمولے کے مطابق ہر خانے کے اعداد کو مختصر کرنا ہے جو اس طرح ہوگا:

$$(\chi^2) = \frac{(O-E)^2}{E}$$

$$a = \frac{(80-66)^2}{66} = \frac{(14)^2}{66} = \frac{196}{66} = 2.96$$

$$b = \frac{(40-54)^2}{66} = \frac{(-14)^2}{66} = \frac{196}{66} = 2.96$$

$$d = \frac{(30-44)^2}{66} = \frac{(-14)^2}{66} = \frac{196}{66} = 2.96$$

$$e = \frac{(50-36)^2}{66} = \frac{(14)^2}{66} = \frac{196}{66} = 2.96$$

$$\Sigma = 11.84$$

کائی سکوئر کی اس قیمت کو ایک مقررہ جدول میں دیکھ کر یہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ یہ قیمت قابل اعتماد ہے یا نہیں۔ یہ جدول شماریات کی ہر کتاب کے آخر میں لگی ہوتی ہے۔ اس جدول کے استعمال کے لیے ایک مزید عدد اور ایک فیصلہ درکار ہے۔

کائی سکوئر کی قیمت درجہ ہائے آزادی (Degrees of Freedom = DF) کے اعتبار سے گھٹتی بڑھتی ہے۔ درجہ ہائے آزادی سے مراد یہ ہے کہ اوپر مذکور ہمارے چار خانوں یعنی a b d اور e میں کتنے خانوں کی تعدد آزادی کے ساتھ تبدیل ہو سکتی ہیں۔ سیدھی سی بات ہے کہ جب b اور a خانوں کا میزان 120 ہے تو ان میں سے صرف ایک خانے کی تعدد تبدیل ہونے کے لیے آزاد ہے۔ جیسے ہی یہ طے ہوتا ہے کہ a خانے کی تعدد 80 ہے تو میزان کی روشنی میں یہ آپ سے آپ طے ہو جاتا ہے کہ b خانے کی تعدد 40 ہوگی۔ گویا یہ تعدد تبدیل ہونے کے لیے آزاد نہیں ہے۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا۔ یہ امر کہ a b d اور e میں سے کتنے خانوں کے تعددات تبدیل ہو سکتے ہیں کائی سکوئر کی قیمت کو متاثر کرتا ہے۔ چنانچہ درجۂ آزادی کو معلوم

کرنا ضروری ہوگا۔ اس کا فارمولا ہے:

$$D.F=(row-1)\ (column-1)$$

اب یہاں دو قطاریں اور دو کالم ہیں لہٰذا

$$D.f = (2-1)\ (2-1)$$

$$= 1 \times 1$$

$$= 1$$

گویا یہ طے ہوا کہ اس مثال کے لیے کائی سکوئر کی قیمت ایک درجۂ آزادی پر دیکھی جانی چاہیے۔
یہ عدد معلوم کیے جانے کے علاوہ جو فیصلہ درکار ہے وہ یہ ہے کہ تحقیق کار اپنے کام میں کسی کمی یا غلطی کی کتنے فی صد گنجایش چھوڑنے کے لیے تیار ہے۔ اگر وہ غلطی کی صرف ایک فی صد گنجایش قبول کرنے پر تیار ہے تو اس کی سطح اعتماد اونچی ہوگی اور اسے اس طرح دیکھا جائے گا:

$$\text{Level of Confidence} = \frac{5}{100} = .01$$

اس کے برعکس اگر وہ غلطی کی پانچ فی صد گنجایش کو قابل قبول سمجھتا ہے تو اس صورت میں

$$\text{Level of Confidence} = \frac{5}{100} = .01$$

ہوگا۔ عام طور پر تحقیقی کاموں کے لیے .05 سطح اعتماد کو کافی اور قابل قبول سمجھا جاتا ہے۔ تاہم اگر کسی تحقیق کے نتائج .01 سطح اعتماد پر پورے اترتے ہوں تو اسے زیادہ وقیع سمجھا جاتا ہے۔

اب ہماری مثال میں کائی سکوائر کی حاصل شدہ قیمت 11.84 ہے، جسے ہمیں کائی سکوائر مقررہ جدول میں ایک درجۂ آزادی اور .05 سطح اعتماد پر دیکھنا ہے۔ جدول میں یہ قیمت 3.84 ہے۔ چونکہ تحقیق سے حاصل شدہ قیمت کائی سکوائر کی درکار قیمت سے زیادہ ہے، لہٰذا نتائج قابل اعتماد ہیں۔ اگر تحقیق یہ دیکھنے کے لیے کی گئی ہے کہ بلوغت اور عدم مطالعہ کے درمیان تعلق ہے یا نہیں اور اگر اس میں مندرجہ ذیل تحقیقی و صفرا مل فرضیے پیش نظر رکھے گئے ہیں۔

HI تحقیقی فرضیہ

بلوغت اور عدم مطالعہ کے درمیان تعلق ہے۔

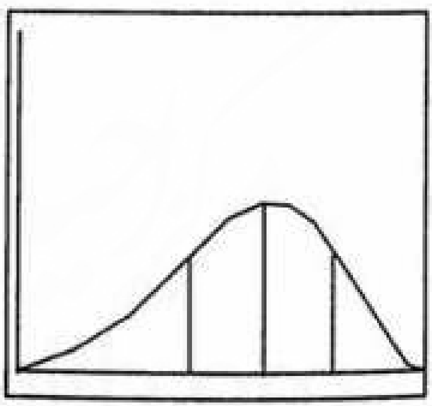
H0 صفرا مل فرضیہ۔

بلوغت اور عدم مطالعہ کے درمیان تعلق نہیں ہوسکتا۔

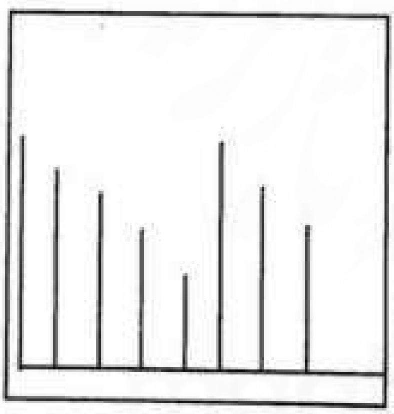
اس صورت میں جب کہ کائی سکوئر حاصل شدہ قیمت (11.84) جدول میں درج قیمت (3.84) سے زائد ہے، تحقیقی فرضیے کو قبول اور صفرائل فرضیے کو مسترد کردیا جائے گا۔ اگر جدول میں درج قیمت حاصل شدہ قیمت سے زائد ہوتی ہو تو صفرائل فرضیے کو قبول کرلیا جاتا۔

کوائف کے شماریاتی عموی تجزیے کے علاوہ ان کا استخراجی تجزیہ بھی کیا جاتا ہے۔ بعض اوقات کوائف سادہ طور پر کوئی نتائج پیش نہیں کرتے بلکہ دو متغیرات کے درمیان مشاہدے سے معلوم کیے گئے روابط سے چند نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ اتفاقی نمونے کا شمارآبادی کا ایک معروضی تخمینہ ہوتا ہے اور اس نمونے کا اوسط حسابیہ نارمل ہوگا، چنانچہ ان سے ایک عبوری نتیجہ برآمد کیا جاسکتا ہے۔ ان شماریاتی طریقوں پر مہارت حاصل کرنے کے لیے ابتدائی جماعتوں کی شماریات پر درسی کتب کا مطالعہ مفید رہے گا۔ اس کے علاوہ تعلیمی اور عمرانی تحقیق کے مقالات کا جائزہ لے کر بھی لسانی وصحافتی نوعیت کی تحقیقات کے لیے اصول منضبط کیے جاسکتے ہیں۔

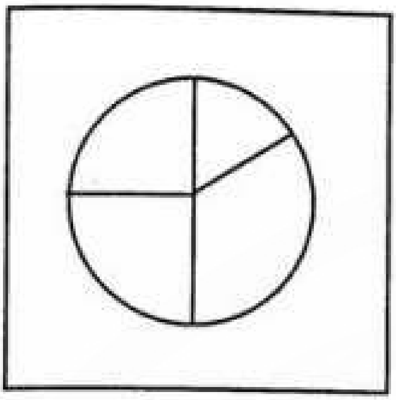
ادبی تحقیق میں شماریاتی طریق کار کے استعمال میں گرافی پیشکش ایک خوبصورت انداز کا نام ہے۔ اس سے جہاں اعداد و شمار میں نمو اور ان کا تقابل ایک ہی نظر میں سامنے آجاتے ہیں وہیں ان کے تعلق سے ماضی اور مستقبل کی تصویر بھی ابھرآتی ہے۔ بیانیہ اور تجرباتی طریق تحقیق میں خاص طور پر گراف کے ذریعے ہمیں ادبی ولسانی امور کو بہت آسانی سے منطقی اور سائنسی انداز میں پیش کرنے کا سلیقہ آجاتا ہے اور ہماری معروضی رائے یا حاصلات موضوعی قرار پانے سے بچ جاتے ہیں۔



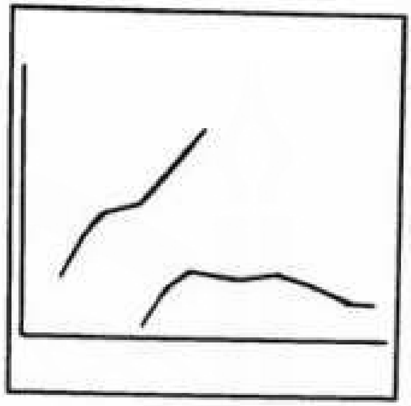
معیاری انحراف



بار گراف



پائی گراف



خطی گراف

4- نمونہ کاری کی مقدار (Sampling Size)

کسی جائزے، سروے یا تجربے میں لیے گئے نمونوں کی کم سے کم تعداد کیا ہونی چاہیے، اس کے لیے کئی طریقے وجود میں آئے ہیں۔ عام سائنسی تحقیق میں کئی فارمولے دیے گئے ہیں، لیکن سماجی، لسانی اور ادبی تحقیق میں عام طور پر 5 یا 10 یا ابہام کا قانون (Rule of Thumb) استعمال میں لایا جاتا ہے۔ یہ ایک سادہ سا قانون ہے۔ اسے سمجھنے کے لیے ایک سادہ سا فارمولا سمجھ لینا چاہیے، جس میں:

n= نمونے کا مطلوبہ سائز: انٹرویو/ سروے کیے جانے والے تمام افراد/ الفاظ/ کتابیں/ نقشے یا اشیاء کی تعداد

p= ہاں میں جواب دینے والے افراد کی فی صد تعداد/ معلوم ہونے والے الفاظ/ کتابوں/ اشیاء کی تعداد

q= ہاں میں جواب نہ دینے والے افراد کی فی صد اعداد/ معلوم نہ ہونے والے الفاظ/ کتابوں/ اشیاء کی تعداد

SE= معیاری خطا 05±

$n= pxq/SE^2$

اگر 25٪ ہاں ہے اور 75٪ ہاں نہیں اور معیاری خطا 3 ہو تو حسب فارمولا n کی تعداد 208 ہوگی۔

n=25x75/3x3=208

اس فارمولے سے قطع نظر ایک سادہ اندازہ یوں ہو سکتا ہے:

کم سے کم 200 اور زیادہ سے زیادہ 2000

لیکن اگر آپ کا پہلے سے کوئی تجربہ نہیں تو یہ تعداد نصف ہو سکتی ہے۔

یعنی 100 سے 200 کے درمیان۔

لیکن اگر آبادی/ کل تعداد بہت زیادہ ہو تو نمونے کا سائز 5٪ ہونا چاہیے اور بہت تھوڑی ہو تو 10٪۔

ایک ماہر اصولِ تحقیق روسکو (Roscoe) نے 1975ء میں نمونوں کی کم سے کم تعداد کے لیے ابہام کا قانون (Rule of Thumb) دیا تاکہ تحقیق پر اعتماد کی سطح برقرار رہے۔

1- 10 سے کم کل تعداد (نمونے) پر تحقیق مناسب نہیں۔ 10 افراد/کتابوں/لغات/الفاظ پر تحقیق درست نہیں۔ صرف تجرباتی تحقیق 10 سے۔

2- 20 کے درمیان کل تعداد (آبادی) کو زیرِ تحقیق لایا جاسکتا ہے۔

3- 30 سے زیادہ کل تعداد (نمونے) ہی کی سفارش کی جائے۔

4- اگر ذیلی زمرے موجود ہوں تو ہر زمرے میں کم سے کم یہی تعداد ہو۔

5- متعدد ذیلی زمروں کی تحقیق میں زمروں کی تعداد سے 10 گنا نمونے لیے جائیں۔

6- زیادہ سے زیادہ فی زمرہ تعداد 500 ہونی چاہیے۔ کیونکہ 500 کی تعداد کو معیاری خطا معیاری انحراف کے 10٪ سے زیادہ ظاہر نہیں کرے گا۔ شاید ہی کل آبادی کے 10٪ سے زیادہ نمونے لینے کی ضرورت پڑے۔ یعنی اگر کل آبادی 1400 ہو تو نمونہ 140 ہوگا۔

7- روسکو کے نزدیک 5 اور 10 کے قانون میں 10٪ کا قانون بہتر ہے اور ہر زمرے میں کم سے کم 30 کی تعداد ہونا ضروری ہے۔

یوں سمجھ لیں کہ اگر آپ 200 ادیبوں پر سروے کر رہے ہوں اور ان کی مرد/خاتون تقسیم ہو تو 10٪ کے لحاظ سے دو زمروں میں سوسو کا 10٪ =20 کا نمونہ بنے گا۔ لیکن ہمیں کم سے کم تعداد 30 چاہیے لیکن یہاں 15٪ کا نمونہ درکار ہوگا۔ اگر 300 ادیبوں پر کام ہو رہا ہو تو پھر 10٪ کے لحاظ سے 30 کا نمونہ سامنے آئے گا۔

اگر کسی لغت پر کام کر رہے ہوں اور اس کے کل اندراجات 9000 ہوں تو 10٪ کے لحاظ سے 900 پر کام کرنا ہوگا جو اتفاقی انتخاب سے لیے جائیں گے، لیکن اگر اس کے اندر اسم، فعل، صفت کے تین زمرے ہوں تو ہر ایک کا 10٪ لینا ہوگا۔ 30 کے کم از کم نمونے کے حوالے سے تین زمروں میں تعداد 90 بنتی ہے، جسے کم سے کم 200 ہونا چاہیے جبکہ یہاں تعداد 900 ہے، جو درست ہے۔ اگر اسم، فعل، صفت کے اندر بھی چھ چھ ذیلی زمرے مختلف پیشوں سے تعلق رکھتے ہوں تو مزید 10٪ کے لحاظ سے 18 ذیلی زمروں سے ہر ایک کا 10٪ منتخب کرنا ہوگا۔ یوں ہر زمرے میں کم سے کم 30 کی تعداد پوری رکھنے کے لیے 18 ذیلی زمروں میں 540 کے نمونوں کو پیشِ نظر رکھنا ہوگا، جبکہ یہاں تعداد 900 ہے۔ جو مناسب ہے۔ اگر ذیلی زمروں کی تعداد زیادہ ہو مثلاً 50 تو ہر زمرے میں کم از کم 30 کو ملحوظ رکھیں تو نمونوں کی کل تعداد 1500 ہوگی۔ جیسا کہ ڈاکٹر اظہر چودھری نے پنجابی لیکسیکو گرافی کے ڈاکٹریٹ کے مقالے میں کیا ہے۔

ڈیوڈ گارسن (Garson) نے اپنی کتاب میں بہت سے حوالے دیے ہیں۔ بعض کے نزدیک نمونے کی کل تعداد اہم ہے اور بعض کے نزدیک ہر متغیرہ کے لحاظ سے تعداد۔ گورسچ (Gorsuch) اور کلائن (Kline) نمونے کی کل تعداد کم سے کم سو (100) چاہتے ہیں، اگر متغیرات کی تعداد 20 سے کم ہو (یعنی 5٪ کے قانون تک)۔ ہیچر (Hatcher) کے نزدیک ہر متغیرے کے کم از کم 5 نمونے ہونے چاہئیں (5 کا

قانون)۔

ہچسن (Hutcheson) اور سوفرونیو (Sofroniou) کے نزدیک کل تعداد کم سے کم 150 اور زیادہ سے زیادہ 300 ہونی چاہیے۔ گلفرڈ (Guilford) کے خیال میں تعداد 200 ہونی چاہیے۔ کیٹل (Cattell) کے نزدیک کم سے کم تعداد 250 ہونی چاہیے۔ ہچسن کی دوسری بات کی تاکید کرتے ہوئے نورو (Noru) نے کم سے کم کل تعداد 300 مقرر کی ہے۔ لالے (Lawley) اور میکسویل (Maxwell) کے خیال میں نمونوں کی کل تعداد متغیرات کی کل تعداد سے 1 عدد زیادہ ہوتا کہ کائی سکوئر فارمولے پر عمل ہو سکے۔ کومرے (Comrey) اور لی (Lee) نے کہا ہے کہ کل تعداد 100 کمزور، 200 کی مناسب، 300 کی عمدہ، 500 کی بہتر اور 1000 کی تعداد بہترین ہے۔

جبکہ متغیروں کے لحاظ سے ہیر (Hair)، اینڈرسن (Anderson)، ٹیتھم (Tatham) اور بلیک (Black) 20 گنا تعداد کو مناسب سمجھتے ہیں۔ 10 کے قانون کے تحت ڈیوڈ گارسن، ایوریٹ (Everitt)، نونالے (Nunnally) کی رائے سب سے اہم ہے۔ 5 کے قانون کے تحت برائنٹ (Bryant) اور یارنولڈ (Yarnold) بھی ہر متغیرے کی کم سے کم تعداد 5 ہی قرار دیتے ہیں۔ کئی لوگوں نے اور بھی کئی شرحیں بتائی ہیں جو 5 سے کم تھیں۔ مگر عام طور پر ابہام کا قانون ہی موزوں ترین سمجھا جاتا ہے تاہم 5 اور 10 کے قانون کی ممانعت بھی نہیں۔

تحقیق کے گرو کو شماریاتی پہلو سے بھی مہارت پیدا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ بنیادی طور پر جدید مغربی اصطلاح کے طور پر گرو کہتے ہی ایسے شخص کو ہیں جو ایسے تمام کوائف، اعداد و شمار، فارمولوں اور تکنیکوں پر عبور رکھتا ہو۔ وہ حسابی یا شماریاتی مسائل کا حل تلاش کر سکے۔ وہ صاحب بصیرت ہو اور ایسے امور میں اسی سے رجوع کیا جا سکے۔

چھٹا باب

مطالعۂ احوال

تحقیق کا ایک طریقہ مطالعۂ احوال (Case Study) ہے۔ کسی ایک معاملے (Case) کا مطالعہ کرنا، اس کے ہر پہلو اور اس کی وجوہات پر تحقیق کرنا، مطالعۂ احوال کہلاتا ہے۔ اس کا زیادہ تر استعمال نفسیات میں ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ ادبیات میں تو زیادہ استعمال نہیں ہوتا، پھر بھی انفرادی مطالعے کی اکادکا مثالیں نفسیاتی تجزیے کے حوالے سے مل جاتی ہیں۔ عموماً ایک ادیب پر مقالہ لکھا جاتا ہے جو تاریخی تحقیق کا تقاضا کرتا ہے۔ ادبی تحقیق میں مطالعۂ احوال کے طریق تحقیق سے کسی ادبی شخصیت کا داخلی اور باطنی مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ اس طریقے کی اہمیت یہ ہے کہ اس کے ذریعے فرد کے تخلیقی کارناموں کے پیچھے کام کرنے والے نفسیاتی محرکات کا سراغ لگایا جا سکتا ہے۔ کسی ادیب کے یہاں پیدا ہونے والے خصوصی رجحانات کے اسباب معلوم کر سکتے ہیں۔ مطالعہ احوال ایک نفسیاتی تجزیے کا طریقہ ہے۔ ہمارے اکثر محققوں اور نقادوں نے کلاسیکی شعراء میں سے غالب اور جدید شعراء میں میراجی کے علاوہ کسی اور شاعر کو اس کام کے لیے منتخب کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ میراجی کا مطالعہ احوال بھی صرف اسی لیے ہو سکا ہے کہ اس کی شخصیت میں اسرار تھے۔ یہ اسرار معلوم کرنے کا نام ہی مطالعہ احوال ہے۔ البتہ یہ اسرار کسی ادبی نظریے کی روشنی میں معلوم کیے جاتے ہیں۔ اس لیے پہلے ادبی نظریہ (Literary Theory) قائم کرنا ضروری ہے۔

1۔ مطالعۂ احوال کا دستاویزی طریقہ

ڈاکٹر تبسم کاشمیری لکھتے ہیں کہ فرد کے مطالعہ احوال میں یہ ضروری ہے کہ تحقیق کرنے والا شخص نفسیات پر پورا عبور رکھتا ہو۔ اسے تحلیلِ نفسی کا علم ہو اور وہ ماہرانہ انداز میں تجزیہ کر سکتا ہو۔ اس لیے ادب کے طالب علم کو نفسیات سے آگاہ ہونا ضروری ہے۔

مطالعہ احوال میں تحقیق کے لیے کئی ذرائع سے مواد فراہم کیا جاتا ہے۔ اگر فرد خود زندہ ہو تو اس کا ذاتی انٹرویو اس سلسلے میں سب سے زیادہ اہم اور مفید ذریعہ ثابت ہو سکتا ہے۔ ایک ماہر تحقیق کار فرد سے جملہ ضروری کوائف حاصل کر سکتا ہے جن سے رپورٹ تیار کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔ اس اہم اور مفید ذریعے کے علاوہ کئی اور ذرائع بھی ہیں جن کا ہم جائزہ لیتے ہیں۔ مثلاً ذاتی دستاویزات جن میں آپ بیتی، خطوط، ڈائریاں

اور یادداشتیں شامل ہیں۔ تخلیقی شخصیات میں ان کی تخلیقات ذاتی دستاویزات میں شامل ہیں اور مطالعہ احوال میں ان سے بڑی مدد ملتی ہے۔ دستاویزی تحقیق میں ہم پہلے ہی واضح کر چکے ہیں کہ خطوط، ڈائریاں اور یادداشتیں کیا اہمیت رکھتی ہیں لیکن جب ہم کسی فرد کا مطالعہ احوال پیش کرتے ہیں تو ان دستاویزات کی اہمیت دو چند ہو جاتی ہے۔ ان سے شخصیت کے بہت سے چھپے ہوئے پہلو سامنے آتے ہیں۔ یہ دستاویزات چونکہ ذاتی ہوتی ہیں، اس لیے ان سے شخصیت کے ذاتی حالات، روزمرہ زندگی کے حادثات، پسند ناپسند، نفسیاتی الجھنیں، واقعات کے بارے میں ردعمل، تہذیبی وثقافتی اور سیاسی حالات کے شخصیت پر اثرات، ردوقبول کے مراحل یا مجبوری اختیار کی جانے والی مفاہمتیں اور ان سے شخصیت میں جنم لینے والا تناؤ، نظریات کا مسئلہ اور اس نوعیت کی دیگر بے شمار باتیں ہمیں ان سے معلوم ہو جاتی ہیں۔ چونکہ یہ دستاویزات اولین ماخذ کی حیثیت رکھتی ہیں اس لیے ان کو اعتماد سے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ کسی ادبی شخصیت کا تخلیقی سرمایہ مطالعہ احوال میں سب سے زیادہ مفید سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی شاعر زیرِ بحث ہے تو اس کی شاعری کے مختلف ادوار ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں جن سے شاعر کی ذہنی کیفیات کا حال معلوم ہوتا ہے اور ان ماخذوں سے محقق تجزیہ کر کے شخصیت کی تصویر تیار کرتا ہے۔

اُردو ادب میں مصحفی، میراجی، آزاد، سعادت حسن منٹو وغیرہ کے مطالعۂ احوال کے تجزیے کیے گئے ہیں۔ پہلا کیس مصحفی کا ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری لکھتے ہیں:

> "مصحفی آخری مغل دور کے شاعر ہیں۔ یہ زبردست انتشار اور افراتفری کا دور ہے۔ جس میں ہر شے تباہ و برباد ہو رہی ہے۔ مصحفی نے اپنے سامنے دلی جیسے تاریخی شہر کا نقشہ بگڑتے ہوئے دیکھا۔ عظیم عمارتیں برباد ہو رہی تھیں۔ محلے اجڑ رہے تھے۔ انسانی خون بکھر رہا تھا۔ حملہ آوروں نے خوف و ہراس کی ایک مستقل صورت پیدا کر دی تھی۔ بدامنی اور غارت گری سے عوام کے حوصلے پست ہو رہے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پورے معاشرے میں عدم تحفظ کا احساس عام ہو گیا۔ یہی احساس مصحفی کی شخصیت کا حصہ بنا۔ جاگیرداری نظام اپنی بدترین حالت میں زوال کی منزلیں طے کر رہا تھا۔ اس کے مقابلے میں برصغیر میں برطانوی سامراج، سامراجی واستحصالی تدابیر سے برصغیر کی بچے کھچے اقتصادی ڈھانچے کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا رہا تھا۔ زرعی زوال کے ساتھ مقامی صنعتوں کا زوال بھی روز افزوں تھا۔ مختلف پیشے ٹوٹ پھوٹ گئے تھے۔ بیکاری اور بے روزگاری نے آشوبِ زیست کی بدترین صورت حال پیدا کر دی تھی۔ جس میں برصغیر کے عوام سسک رہے تھے۔ یہ انسانی تجربات اپنے پورے آشوب کے ساتھ مصحفی کے سامنے رونما ہوتے رہے اور مصحفی کی ذات پر ان کے مسلسل اثرات مرتب ہوتے رہے۔
>
> مصحفی کے کلام میں ایک ایسا شعر بھی ملتا ہے کہ جس سے ان کی شخصیت کا ایک بہت

اہم نکتہ ہمارے ہاتھ آتا ہے۔

ہوئی جو روزِ تولد سے سرد مہری عام
تمام عمر ہماری عذاب میں گزری

مصحفی کے اس شعر سے ان کی بنیادی نفسیاتی کمزوری کا سراغ ملتا ہے۔ انھیں یہ شدید احساس ہے کہ اوائل عمر ہی سے ان کے ساتھ سرد مہری ہوتی جا رہی ہے۔ بچپن کے اس احساس نے انھیں شدید احساسِ کمتری کا شکار کر دیا۔ بچپن میں بننے والے اس پختہ نقش کا اثر تمام عمر ان کے ذہن پر مسلط رہا اور عمر کے باقی حصوں میں یہی احساس مختلف شکلوں میں رونما ہوتا رہا۔ مصحفی کے حالات سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نوجوانی میں وہ اپنے وطن اکبر پور کو چھوڑ کر پہلے دلی اور بعد ازاں لکھنو میں آباد ہو گئے۔ بے وطنی کا ایک مستقل احساس ساری عمر ان میں رہا۔ اس احساسِ محرومی نے ایک ناسٹلجیا (Nostalgia) کی صورت اختیار کر لی تھی۔

ان احساسات نے مستقل محرومی اور ناتمامی کی شکل اختیار کی اور مصحفی کی شخصیت میں "ترسنے" اور "سسکنے" کا رجحان پیدا ہوا اور اس کے باعث احساسِ کمتری کو دور کرنے کے لیے مصحفی کی شخصیت میں زبردست تعلّی رنگ نمایاں ہوا۔ اس احساسِ برتری یا تعلّی کو ہم ایک "خستہ شخصیت کو جوڑنے، مربوط کرنے اور بالآخر اسے متوازی کرنے کی ایک ترکیب سے تعبیر کر سکتے ہیں"۔

مصحفی کے اس مطالعہ، احوال میں جذباتی تشنگی اور ترسنے کا احساس خصوصی طور پر قابل ذکر ہے۔ اس احساس سے ایک ایسی شخصیت کی تصویر ابھرتی ہے، جس میں خواہشوں کا ایک سیلاب ہے، مگر تکمیل کے اسباب اور وسائل میسر نہیں ہیں۔ عدم تکمیل کا احساس، اس شخصیت کو یاسیت کا شکار کر دیتا ہے۔

ہم کسی شخصیت کا مطالعہ اس کی اپنی دستاویزات سے کس طرح کر سکتے ہیں؟ مصحفی کا یہ مطالعۂ احوال اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ شخصیت کے کون سے رجحانات زیادہ نمایاں ہوتے ہیں؟ ان کے محرکات کیا تھے؟ شخصیت کس طرح بکھر جاتی ہے؟ اور پھر کن اسباب سے شخصیت مربوط و مستحکم ہوتی ہے؟ یوں ہم شخصیت کے دفاع اور اس کے استحکام کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ نفسیاتی مطالعے کے لیے اس طرح کے کئی تجزیے کیے جا سکتے ہیں۔ مناسب ہے کہ ایسا تجزیہ کرنے سے پہلے نفسیات پر عبور حاصل کیا جائے۔ ادبی تحقیق میں یہ مہارت بھی ضروری ہے۔

مطالعۂ احوال میں خطوط، تخلیقی ادب اور ذاتی ڈائریوں کا مطالعہ اہم ماخذ ٹھہرایا گیا ہے۔ "اقبال" کا مطالعہ احوال کرتے ہوئے ان ماخذوں سے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ پروفیسر محمد عثمان نے ایک طویل مقالے کی شکل میں حیاتِ اقبال کا ایک جذباتی دور کے عنوان سے یہ مطالعہ کیا تھا۔ اس طرح ڈاکٹر وحید قریشی نے شبلی کی حیاتِ معاشقہ لکھی جو بنیادی طور پر تاریخی تنقید و تحقیق تھی۔

اور یادداشتیں شامل ہیں۔ تخلیقی شخصیات میں ان کی تخلیقات ذاتی دستاویزات میں شامل ہیں اور مطالعہء احوال میں ان سے بڑی مدد ملتی ہے۔ دستاویزی تحقیق میں ہم پہلے ہی واضح کر چکے ہیں کہ خطوط، ڈائریاں اور یادداشتیں کیا اہمیت رکھتی ہیں لیکن جب ہم کسی فرد کا مطالعہء احوال پیش کرتے ہیں تو ان دستاویزات کی اہمیت دو چند ہو جاتی ہے۔ ان سے شخصیت کے بہت سے چھپے ہوئے پہلو سامنے آتے ہیں۔ یہ دستاویزات چونکہ ذاتی ہوتی ہیں، اس لیے ان سے شخصیت کے ذاتی حالات، روزمرہ زندگی کے حادثات، پسند ناپسند، نفسیاتی الجھنیں، واقعات کے بارے میں ردِعمل، تہذیبی و ثقافتی اور سیاسی حالات کے شخصیت پر اثرات، رد و قبول کے مراحل بامر مجبوری اختیار کی جانے والی مفاہمتیں اور ان سے شخصیت میں جنم لینے والا تناؤ، نظریات کا مسئلہ اور اس نوعیت کی دیگر بے شمار باتیں ہمیں ان سے معلوم ہو جاتی ہیں۔ چونکہ یہ دستاویزات اولین ماخذ کی حیثیت رکھتی ہیں اس لیے ان کو اعتماد سے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ کسی ادبی شخصیت کا تخلیقی سرمایہ مطالعہء احوال میں سب سے زیادہ مفید سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی شاعر زیرِ بحث ہے تو اس کی شاعری کے مختلف ادوار ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں جن سے شاعر کی ذہنی کیفیات کا حال معلوم ہوتا ہے اور ان ماخذوں سے محقق تجزیہ کر کے شخصیت کی تصویر تیار کرتا ہے۔

اُردو ادب میں مصحفی، میراجی، آزاد، سعادت حسن منٹو وغیرہ کے مطالعۂ احوال کے تجزیے کیے گئے ہیں۔ پہلا کیس مصحفی کا ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری لکھتے ہیں:

> "مصحفی آخری مغل دور کے شاعر ہیں۔ یہ زبردست انتشار اور افراتفری کا دور ہے۔ جس میں ہر شے تباہ و برباد ہو رہی ہے۔ مصحفی نے اپنے سامنے دلی جیسے تاریخی شہر کا نقشہ بگڑتے ہوئے دیکھا۔ عظیم عمارتیں برباد ہو رہی تھیں۔ محلے اجڑ رہے تھے۔ انسانی خون بکھر رہا تھا۔ حملہ آوروں نے خوف و ہراس کی ایک مستقل صورت پیدا کر دی تھی۔ بدامنی اور غارت گری سے عوام کے حوصلے پست ہو رہے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پورے معاشرے میں عدم تحفظ کا احساس عام ہو گیا۔ یہی احساس مصحفی کی شخصیت کا حصہ بنا۔ جاگیرداری نظام اپنی بدترین حالت میں زوال کی منزلیں طے کر رہا تھا۔ اس کے مقابلے میں برصغیر میں برطانوی سامراج، سامراجی و استحصالی تدابیر سے برصغیر کی بچے کھچے اقتصادی ڈھانچے کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا رہا تھا۔ زرعی زوال کے ساتھ مقامی صنعتوں کا زوال بھی روز افزوں تھا۔ مختلف پیشے ٹوٹ پھوٹ گئے تھے۔ بیکاری اور بے روزگاری نے آشوبِ زیست کی بدترین صورت حال پیدا کر دی تھی۔ جس میں برصغیر کے عوام سسک رہے تھے۔ یہ انسانی تجربات اپنے پورے آشوب کے ساتھ مصحفی کے سامنے رونما ہوتے رہے اور مصحفی کی ذات پر ان کے مسلسل اثرات مرتب ہوتے رہے۔

مصحفی کے کلام میں ایک ایسا شعر بھی ملتا ہے کہ جس سے ان کی شخصیت کا ایک بہت

اہم نکتہ ہمارے ہاتھ آتا ہے۔

ہوئی جو روزِ تولد سے سرد مہری عام
تمام عمر ہماری عذاب میں گزری

مصحفی کے اس شعر سے ان کی بنیادی نفسیاتی کمزوری کا سراغ ملتا ہے۔ انھیں یہ شدید احساس ہے کہ اوائلِ عمر ہی سے ان کے ساتھ سرد مہری ہوتی جا رہی ہے۔ بچپن کے اس احساس نے انھیں شدید احساسِ کمتری کا شکار کر دیا۔ بچپن میں بننے والے اس پختہ نقش کا اثر تمام عمر ان کے ذہن پر مسلط رہا اور عمر کے باقی حصوں میں یہی احساس مختلف شکلوں میں رونما ہوتا رہا۔ مصحفی کے حالات سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نوجوانی میں وہ اپنے وطن اکبر پور کو چھوڑ کر پہلے دلی اور بعد ازاں لکھنؤ میں آباد ہو گئے۔ بے وطنی کا ایک مستقل احساس ساری عمر ان میں رہا۔ اس احساس محرومی نے ایک ناسٹلجیا (Nostalgia) کی صورت اختیار کر لی تھی۔

ان احساسات نے مستقل محرومی اور ناتمامی کی شکل اختیار کی اور مصحفی کی شخصیت میں ''ترسنے'' اور ''سسکنے'' کا رجحان پیدا ہوا اور اس کے باعث احساس کمتری کو دور کرنے کے لیے مصحفی کی شخصیت میں زبردست تعلّی رنگ نمایاں ہوا۔ اس احساس برتری یا تعلّی کو ہم ایک ''خستہ شخصیت کو جوڑنے، مربوط کرنے اور بالآخر اسے متوازی کرنے کی ایک ترکیب سے تعبیر کرسکتے ہیں''۔

مصحفی کے اس مطالعۂ احوال میں جذباتی تشنگی اور ترسنے کا احساس خصوصی طور پر قابل ذکر ہے۔ اس احساس سے ایک ایسی شخصیت کی تصویر ابھرتی ہے، جس میں خواہشوں کا ایک سیلاب ہے، مگر تکمیل کے اسباب اور وسائل میسر نہیں ہیں۔ عدمِ تکمیل کا احساس، اس شخصیت کو یاسیت کا شکار کر دیتا ہے۔

ہم کسی شخصیت کا مطالعہ اس کی اپنی دستاویزات سے کس طرح کر سکتے ہیں؟ مصحفی کا یہ مطالعۂ احوال اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ شخصیت کے کون سے رجحانات زیادہ نمایاں ہوتے ہیں؟ ان کے محرکات کیا تھے؟ شخصیت کس طرح بکھر جاتی ہے؟ اور پھر کن اسباب سے شخصیت مربوط و مستحکم ہوتی ہے؟ یوں ہم شخصیت کے دفاع اور اس کے استحکام کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ نفسیاتی مطالعے کے لیے اس طرح کے کئی تجزیے کیے جا سکتے ہیں۔ مناسب ہے کہ ایسا تجزیہ کرنے سے پہلے نفسیات پر عبور حاصل کیا جائے۔ ادبی تحقیق میں یہ مہارت بھی ضروری ہے۔

مطالعۂ احوال میں خطوط، تخلیقی ادب اور ذاتی ڈائریوں کا مطالعہ اہم ماخذ ٹھہرایا گیا ہے۔ ''اقبال'' کا مطالعہ احوال کرتے ہوئے ان ماخذوں سے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ پروفیسر محمد عثمان نے ایک طویل مقالے کی شکل میں حیاتِ اقبال کا ایک جذباتی دور کے عنوان سے یہ مطالعہ کیا تھا۔ اسی طرح ڈاکٹر وحید قریشی نے شبلی کی حیاتِ معاشقہ لکھی جو بنیادی طور پر تاریخی تنقید و تحقیق تھی۔

اُردو ادب میں ایک اور شاعر میراجی ایک مبہم اور پیچیدہ شخصیت کا ادیب ہے۔ اس کے بارے میں اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ جس میں اس کی پر اسرار شخصیت اور شاعری کے محرکات کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان بہت سی کوششوں میں سے ایک کامیاب کوشش اعجاز احمد کی ہے۔ اعجاز احمد نے میراجی کی شخصیت اور فن کا تجزیہ کیا ہے۔ اعجاز احمد کے اس مفصل تجزیے سے سب سے پہلے یہ بات سامنے آتی ہے، کہ میراجی نے اپنے لیے ایک ظاہری شخصیت ایک منصوبے کے تحت تشکیل کی تھی۔ بقول ڈاکٹر تبسم کاشمیری بعد ازاں یہی شخصیت ابھر آئی اور اس کی اصل شخصیت دبتی چلی گئی۔ بالکل اسی طرح جیسے بعض قلمی نام اصل نام کو چھپا لیتے ہیں۔

اس نوعیت کا ایک اور مطالعہ ڈاکٹر سلیم اختر نے کیا ہے: **اقبال کا نفسیاتی مطالعہ**۔ اس مطالعے میں تفصیل کے ساتھ اقبال کے ذہنی وجذباتی بحران کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح علی پور کا ایلی سے ممتاز مفتی کی الجھنیں، راجا گدھ سے بانو قدسیہ کی نفسیات اور یادوں کی برات سے جوش ملیح آبادی کے مبالغوں کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔ احسان دانش کی جہانِ دانش بھی نفسیاتی تعبیر رکھتی ہے۔ انتظار حسین کے افسانے اور ناول بھی ان کی ذاتی خواہشات کے عکاس نظر آتے ہیں لیکن فیصلہ مطالعۂ احوال کی تکنیک کے ذریعے ہوگا۔ یاد رہے کہ کوئی ادیب اپنے ماحول، ثقافت اور نظریہ حیات سے باہر نہیں ہوتا۔

بعض اوقات مطالعہ احوال میں ایسی شخصیات کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے جو کسی نہ کسی سبب سے دیوانگی کا شکار ہو جاتی ہیں۔ ایسی ادبی شخصیات کا مطالعہ احتیاط کا تقاضا کرتا ہے۔ ان کے مطالعہ میں تمام ممکنہ پہلوؤں پر گہرے غور وفکر کے بعد ہی ہم کسی نتیجے تک پہنچ سکتے ہیں، اُردو ادب میں محمد حسین آزاد کا آخری زمانہ اسی نوعیت کا ہے۔

آزاد کے مطالعۂ احوال میں بنیادی حوالہ 1857ء کا ہے، جس میں ان کے والد کو پھانسی کی سزا دی جاتی ہے اور ان کا گھر تباہ وبرباد ہو جاتا ہے۔ ایک کمسن بچی توپ کے گولے سے صدمہ اٹھا کر فوت ہو جاتی ہے۔ باپ کا خون تادمِ آخر ان کے لاشعور کا حصہ بنا رہا۔ اسے وہ کبھی فراموش نہ کر سکے۔

مطالعۂ احوال میں تحقیق کار پہلے ماحول کو پوری طرح سمجھتا ہے اور اس میں گہرائی تک اتر جاتا ہے تاکہ وہ ان متغیرات کی شناخت کر سکے جو مسئلہ زیرِ تحقیق سے تعلق رکھتے ہوں۔ اس کے سامنے یہ سوالات اُبھرتے ہیں کہ طبعی اور سماجی وتمدنی ماحول زیرِ تحقیق سماجی واحدے کو کس انداز سے متاثر کرتا ہے؟ طالب علم والدین، ساتھیوں اور اساتذہ سے باہم تعامل کے دوران میں کس قسم کے تمدنی تسلسل یا نزاع کے تجربے سے گزرتا ہے؟ مختلف باہمی تمدنوں سے تعلق رکھنے والے طالب علم ایک دوسرے کو اور اپنے مشترک مسائل کو کس انداز اور کس حوالے سے دیکھتے ہیں؟ یوں تحقیق کار تعلیمی ماحول کے اندر اور باہر دونوں جگہ امور واقعہ کو ان کی پوری واقعیت کے حوالے سے مشاہدہ کرتا ہے۔ وہ واقعات کو وقت اور جگہ میں ان کے وقوع، طبعی ماحول اور موجود اشیا اور متعلقہ افراد اور اداروں کے اعمال اور باہمی تعامل کے حوالے سے نوٹ کرتا ہے۔ وہ ان تعلقات کے ایک دوسرے پر انحصار کی طرف خصوصی توجہ دیتا ہے اور اس سلسلے میں غیر لسانی اظہارات، ان کہے پیغامات

اور تعلقات کے پنہاں یا غیر رسمی سلسلوں کو بھی نظر انداز نہیں کرتا۔

مطالعۂ احوال (Case Study) میں تحقیق کار پہلے تو موضوع کا انتخاب کرتا ہے۔ پھر اس کے متعلق تمام ضروری معلومات جمع کرتا ہے۔ ان کا تعلق زیر تحقیق اکائی کی سوانح اور نشو ونما سے ہوتا ہے۔ جب وہ چھوٹے چھوٹے حقائق کو منفصل طریقے سے جمع کر لینے کا کام مکمل کر لیتا ہے، تو پھر وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ ان حقائق کو مربوط انداز سے جوڑے اور اس اکائی کے خیالات وتجربات کی نہ صرف مکمل تصویر پیش کرے بلکہ ان کی توضیح وتوجیہ بھی کرے۔ اس طرح یوں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ طریقہ ایک خاص حد تک تاریخی، دستاویزی طریق تحقیق سے مشابہت رکھتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ اس میں ہم زندہ افراد اور سماجی گروہوں کے مطالعۂ تاریخ سے متعلق تحقیق کر رہے ہوتے ہیں جبکہ تاریخی یا دستاویزی تحقیق میں ہم گزشتہ افراد اور اداروں کی تاریخ سے متعلق تحقیق کرتے ہیں۔

مطالعۂ احوال میں استعمال ہونے والی معلومات مختلف ذرائع سے حاصل کی جاتی ہیں۔ ان میں سے بڑے بڑے ذرائع زیر تحقیق فرد یا اکائی کی ذاتی شہادت حافظے پر انحصار کرتے ہوئے وہ اپنے گزشتہ تجربات اور احساسات بیان کرتا ہے، ذاتی دستاویزات یعنی خطوط، ڈائریاں اور روزنامچے وغیرہ، حیاتیاتی، نفسیاتی اور معاشرتی کوائف وحالات، ان دستاویزات میں خود نوشت سوانح عمریاں، سکولوں اور دوسری سماجی ایجنسیوں کے ریکارڈ، طبی حالات، گفتگو اور حال ہی میں لیے گئے انٹرویو کے مسودے اور ایسا ہی اور بہت سا مواد شامل ہوتا ہے۔

تحقیق کار صرف کسی زیر تحقیق فرد یا گروہ کی مکمل وضاحت ہی نہیں کرتا بلکہ ان اسباب کی شناخت بھی کرتا ہے جو ان کو موجودہ حالت تک پہنچانے کے ذمہ دار ہیں۔ وہ ان تمام معلومات کا بغور تجزیہ کرتا ہے جو فرد، گروہ یا ادارے کی موجودہ حالت پر ممکن حد تک اثر رکھتی ہیں یا رکھ سکتی ہیں۔ بعض اوقات اس اثر کی وجوہات اور ان کی صحیح صحیح نوعیت معلوم ہو جاتی ہے۔ جب تحقیق کار کو زیر تحقیق اکائی کے بارے میں وہ تمام اہم معلومات جو اس نشو ونما اور موجودہ حالت سے متعلق ہوتی ہیں، معلوم ہو جاتی ہیں تو وہ اس حالت کی اصلاح اور بہتری کے لیے اس علم کو استعمال کر سکتا ہے یا وہ اس کو کسی ناپسندیدہ حالت کو درست کرنے کے لیے صرف کر سکتا ہے، یعنی کہا جا سکتا ہے کہ کسی مکمل مطالعۂ احوال کا نتیجہ اصلاح یا علاج کی صورت میں نکل سکتا ہے۔ یہ کام تحقیق کی حدود سے باہر ہے اور اس کا تعلق ایک بالکل مختلف معاملے "معالجہ" کے ساتھ ہے لیکن اُردو تحقیق میں مطالعۂ احوال کا طریقہ ابھی تک بہت کم استعمال کیا گیا ہے۔ محققین اس نوعیت کے علمی کام کی طرف توجہ دینا ضروری نہیں سمجھتے بلکہ گریز کرتے ہیں۔ وہ ایسی تحقیق کو صرف حقائق کی تلاش اور اعداد وشمار کا نام گردانتے ہیں۔ اس صورت حال میں مطالعۂ احوال جیسا اہم شعبہ تحقیق نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ اگر نئے تحقیق کار اس شعبے کی طرف توجہ مبذول کریں تو اُردو تحقیق میں بہت مفید اور فکر انگیز کام ہو سکتا ہے۔ چونکہ زیادہ تر کام ادبی شخصیت کا تذکرہ یا احوال وآثار ہوتا ہے اور اس کے لیے تاریخی تحقیق کا طریقہ ہی مناسب ہے، چنانچہ اب اسے مطالعۂ احوال کی صورت میں بدل لینا چاہیے۔ صاف ظاہر ہے کہ اُردو کے اعلیٰ سطحی کورسوں میں اصول

تحقیق کے ساتھ مطالعۂ نفسیات کو بھی شامل کرنا ہوگا۔ ادبی تحقیق کے محقق کو اس پہلو سے بھی ماہر ہونے کی ضرورت ہوتی ہے۔

2-انٹرویو یا مصاحبہ

تحریری سوالنامے کی بجائے کسی سے خود جا کر اپنے سوالات کا جواب پوچھنے کو انٹرویو یا مصاحبہ کہا جاتا ہے۔ یہ مطالعۂ احوال کا زود بر طریقہ ہے۔ ڈاکٹر ش اختر نے مصاحبے کی تکنیک کے بارے میں لکھا ہے:

''ادبیات میں عام طور سے بیانیہ یعنی زبان سے ادا کی گئی باتوں کو اہمیت کم دی جاتی ہے اور تحریریں زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے محقق ادب کے سلسلے میں تحریری بیانات اور مسودہ کو زیادہ قابل اعتماد، درست اور بنیادی سمجھتے ہیں اور زبانی باتوں اور گفتگو جن کی کوئی تحریری شکل موجود نہیں ہوتی، ضمنی تصور کرتے ہیں۔ اگر کسی فرد کے بیان اور تحریر میں کوئی تضاد ہو تو لوگ تحریری بیان کو زیادہ لائق اعتبار سمجھتے ہیں۔ یہ ایک طرح کی روایت بن گئی ہے اور دنیا کے تمام ادب میں عام طور سے تسلیم کی جاتی ہے۔ لیکن یہ درست نہیں ہے اور نہ اسے کلیہ تسلیم کیا جا سکتا ہے اور نہ یہ اعتراف کرنا آسان ہے کہ آدمی اپنی تحریروں میں غلط بیانی اور مبالغہ آمیزی سے کام نہیں لیتا''۔

انٹرویو یا مصاحبہ کوائف جمع کرنے کا ایک زبانی یا بالمشافہ طریق کار ہے۔ اس کے ذریعے بھی معلومات حاصل کی جاتی ہیں۔ انٹرویو مصاحبہ ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے آدمی کے خیالات، نظریات اور عقائد کو سمجھنے کے لیے موثر طور پر ساری اطلاعات حاصل کی جا سکتی ہیں۔

انٹرویو یا مصاحبے میں تحقیق کار سوالوں کا آغاز کرتا ہے اور جواب حاصل کرتا ہے۔ مگر کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ دوران گفتگو میں انٹرویو کرنے والا ضمنی سوالات بھی کرتا جاتا ہے اور اس استفسار سے مزید جوابات کی گنجائش نکلتی رہتی ہے۔ یہ بہت ہی عام صحافیانہ تکنیک ہے۔ اس میں مغالطے کی بھی گنجائش ہوتی ہے۔ ویسے سماجی اور ادبی علوم میں اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ ماہرین اس بات پر بہت زور دیتے ہیں کہ نظریاتی مباحث اور عقیدوں کی چھان بین کے لیے یہ بہت موثر ذریعہ ہے۔ ادبی تحقیق میں بھی یہ موثر ہے۔

مصاحبے یا انٹرویو کی تکنیک کوائف جمع کرنے کا زبانی وسیلہ ہے۔ سوالنامے اور انٹرویو کے درمیان بنیادی فرق یہ ہے کہ انٹرویو اطلاعات کی فراہمی زبانی ذریعے سے حاصل کرتا ہے اور سوالنامہ تحریری جو زیادہ تر مراسلات کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔ چونکہ رویوں کے مطالعے اور مشاہدے کے ذریعہ بہت سی باتیں صاف نہیں ہوتیں، اس لیے کوائف جمع کرنے کے دوسرے ذرائع کی طرف بھی محققین کی توجہ مبذول ہوئی۔

انٹرویو یا مصاحبہ عام طور سے دو یا اس سے زیادہ افراد کے مابین ہوتا ہے۔ اس کا انحصار موضوع کی نوعیت پر ہے۔ اس میں ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ بہت سے نکات کی وضاحت فوراً ہو جاتی ہے۔ ایک جواب

سے اگر تشفی نہیں ہوتی تو وہ اپنی بات کو پھر سے، نئے انداز سے پوچھ سکتا ہے۔ چونکہ انٹرویو لینے والا سوالوں کی ابتدا کرتا ہے اس لیے اسے بے حد محتاط رہنا پڑتا ہے اور اس بات کا ہر وقت خیال رکھنا ہوتا ہے کہ انٹرویو دینے والے کو اس کی کوئی بات بری نہ لگے۔ اس سے نجی زندگی کا دل چسپ خاکہ تیار ہو جاتا ہے اس کی اندرونی زندگی میں جھانکنے کا موقع ملتا ہے۔ اس کے جوابات کی روشنی میں فرد کی ذہنی حالت اور نظریاتی تعصبات کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اس لیے اسے حیاتی (Empirical) طریق مطالعہ میں کثرت سے استعمال کیا جاتا ہے۔ عام طور سے یہ تکنیک بہت مقبول ہے اور دوسری تکنیک کی بہ نسبت کوائف جمع کرنے کا آسان طریقہ بھی ہے، اس لیے ادب کے ساتھ ساتھ سماجی علوم میں بھی اس کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ خاص طور پر سے نفسیات اور عمرانیات کے دائرے میں اس کی خاصی قدر و قیمت ہے۔

مقاصد

تحقیق میں انٹرویو یا مصاحبے کا ایک اہم مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ فرضیات کو ثابت کرے۔ دراصل انٹرویو، سروے اور سوال نامہ سب کا مقصد ایک ہی ہوتا ہے۔ ایک وکیل اپنے مؤکل سے سوالات اس لیے پوچھتا ہے کہ وہ حقیقت جان سکے اور اسے قانون شکنی کے جرم سے بچایا جا سکے۔ ڈاکٹر مریض سے امراض کے متعلق تفتیش کرتا ہے پھر بہت سی اشیا کی جانچ ہوتی ہے تاکہ صحیح مرض کا پتہ چلے اور مریض کو شفاء ہو۔ اس طرح صحافی، دفتروں میں کام کرنے والے افسر، سبھی کا مقصد ایک ہی ہوتا ہے: "حقائق کا علم"۔ اسی لیے انٹرویو کی تکنیک بہت زمانے سے رائج ہے اور ابھی تک اسے ترک نہیں کیا گیا۔ ادب میں بھی اس کی اہمیت بدستور قائم ہے بلکہ شخصیتوں پر تحقیق کرنے کے لیے تو اسے لازمی سمجھا جاتا ہے اور کوئی فن کار، ادیب یا شاعر نقاد یا محقق زندہ نہیں ہے تو اس کے دوستوں، رشتہ داروں اور اس کے ہم عصروں سے انٹرویو لیا جاتا ہے تاکہ صحیح صورت حال کا اندازہ ہو اور مقالہ حقائق کی کمزوریوں کا شکار نہ ہو لیکن اس انٹرویو کا مطلب یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ یہی واحد مؤثر ذریعہ ہے جس کے ذریعے کوائف کو جمع کیا جا سکتا ہے۔

غالب کی عظمت کا راز صرف اس امر میں پوشیدہ نہیں ہے کہ وہ بہت بڑے شاعر تھے بلکہ اس حقیقت میں بھی ہے کہ غالب نے پرانی اقدار کے زوال کو اچھی طرح محسوس کر لیا تھا۔ غالب کی اقدار شکنی اور نئی آواز پر لبیک کہنا نہ صرف جرأت رندانہ تھی بلکہ غالب کے تفکر، سماجی بصیرت اور زندگی کی جد و جہد میں خود کو شامل رکھنے کا عزم بھی تھا۔ اب اس کارزار حیات سے ان کی عظمت میں کوئی کمی نہیں ہوتی لیکن ان کے علم سے تحقیق کے اہم دروازے وا ہوتے ہیں اور شخصیت کے مطالعہ کے دلچسپ پہلو ابھرتے ہیں۔ اب اگر ان کے معاصرین یا ان کے شاگردوں نے کہیں اس کی نشان دہی نہیں کی ہے تو تحقیق کا خزانہ اطلاعات سے خالی رہ گیا۔ بگا بیگم کا انٹرویو محض غالب کی سسرالی رشتہ دار ہونے کے باعث لیا گیا اور وہ یہی ایک پہلو بیان کرتا ہے، اگرچہ دیگر ذرائع اور انٹرویو موجود نہ ہونے کے باعث تائید و توثیق مشکل ہے۔ اسی لیے انٹرویو کو اکف جمع کرنے کا ایک مؤثر ذریعہ تصور کیا جاتا ہے۔ لہٰذا اس سے افراد کے نظریات اور ان کے رویے پر بھی نگاہ رکھی

جاتی ہے، ورنہ دوسرے ذرائع سے ہمیں معلومات اخذ کرنے کی زحمت اٹھانی پڑے گی اور اس میں مبالغہ کا عنصر شامل ہو جائے گا۔ جیسے ن م راشد کے بارے میں ان کی بیگم کا انٹرویو شدید مبالغہ یا جذباتی عناصر رکھتا ہے۔ انٹرویو کے سلسلے میں لیون فس ٹینجر (Leon Festenger) اور ڈینئیل کاٹز (Daniel Katz) نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ انٹرویو کے جوابات فرد کے بس کی بات نہ ہوں تو بھی کوائف جمع کرنے کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ افراد اپنے تعصبات اور پیچیدہ رویوں کی وجہ سے بہت سی اطلاعات نہ دے سکیں لیکن مصاحب یا انٹرویو کرنے والا کم از کم اپنے تعلقات، اپنی قربت کے ذریعے کوائف کا تجزیہ آسانی سے کرسکتا ہے۔ اگر ادب میں شخصیتیں تحقیق کا موضوع ہوں تو انٹرویو واحد موثر ذریعہ ہے۔ جس کی وجہ سے گوشۂ گمنامی میں رہنے والے حقائق کی روشنی میں آ جاتے ہیں۔ اس لیے یہودا (Jahoda) اور کک (Cook) نے مشاہدے اور انٹرویو کو رویوں کے مطالعہ کے لیے بنیادی واسطہ قرار دیا ہے۔ سماجی علوم اور ادبیات عالم میں تحقیق کے تقاضے اس وقت تک پورے نہیں ہوتے جب تک کہ اس طریق کار کو استعمال میں نہ لایا جائے۔ فن کاروں اور دیگر شخصیتوں کے ماضی کے کارناموں اور مستقبل کے منصوبوں کا علم اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک ان سے براہ راست رابطہ نہ کیا جائے۔ فرد کی قوت ادراک، رویے اور تصورات ونظریات کو جاننے کے لیے مشاہدہ ناکافی ہے بلکہ بے کار ہے۔ اس کے لیے صرف انٹرویو ہی واحد ذریعہ ہے۔ البتہ قباحت اس وقت ہوتی ہے جب انٹرویو دینے والا حقائق کی پردہ پوشی کرتا ہے یا ان کی ترجمانی سے کتراتا ہے۔ ایسی صورت میں تحقیق کار کی ذہانت اور صبر ہی اس کے کام آتے ہیں۔

مصاحبے یا انٹرویو کے سلسلے میں سب سے اہم شے مصاحبہ کار کی اپنی شخصیت ہوتی ہے۔ وہ ایک تکنیکی ڈمی بن جاتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنے سوالوں کو ترتیب دیتا ہے اور ان کے دائرہ کار کو متعین کرتا ہے، ان کا معیار طے کرتا ہے اور پھر معیاری سطح ہی پر انھیں تحریر بھی کرتا ہے۔ اس عمل سے اس کے جمع کیے ہوئے کوائف کو آسانی سے ترتیب دیا جا سکتا ہے اور پھر تجزیے میں اسے کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ مصاحبہ کار کا رابطہ چونکہ مختلف افراد سے ہوتا ہے، اس لیے اسے انسانی نفسیات کا علم ہونا ضروری ہے۔ اسے انسان کی بنیادی کمزوریوں اور خوبیوں کا پتا ہونا چاہیے۔

سائنس اور دوسرے سماجی علوم نے مصاحبہ کار کے دوسرے موثر ذرائع پر زیادہ روشنی نہیں ڈالی، اس لیے اس کا موجودہ طریقہ ہی بہتر ہے۔ اس کے لیے منکر ومعروف ("Do's" "Don't's") کا مشورہ برسوں سے چلا آ رہا ہے۔ تحقیق کار کبھی اس پر عمل کرتا ہے اور کبھی نہیں کیونکہ اس کی ساری کوشش انٹرویو لینے والے کی ذہانت، سمجھداری اور فنی مہارت سے تعلق رکھتی ہے۔ اسی لیے تحقیق کرنے کے سلسلے میں نگران کی ضرورت پڑتی ہے۔

مصاحبے یا انٹرویو میں سوال وجواب سے ان خواہشات اور جذبات کا پتا چلتا ہے جو محرکات بن جاتے ہیں اور جواب دینے کے لیے آدمی کو مجبور کرتے ہیں۔ سوال وجواب کی حقیقت اس امر میں پوشیدہ ہے کہ انسان فطری طور پر اپنے مقاصد، انا اور مفاد کو پیش نظر رکھتا ہے۔ اس کا تمام ذہنی رویہ انھی کے تابع کام کرتا

ہے۔اس کا مخصوص رویہ، فیصلہ، کام اور تصور سب کے سب مفادات اور مقاصد کے زیر نگیں رہتے ہیں۔مختلف افراد کے لیے مقاصد کی نوعیت مختلف ہو سکتی ہے۔

شاعروں، ادیبوں اور فن کاروں کے لیے شہرت ان کی تسکین سبب بن سکتی ہے یا پھر تحقیق کار کی شہرت اور موضوع کی دلچسپی بھی جواب دینے والے کو مجبور کر سکتی ہے کہ وہ اپنے خیالات کا من وعن اظہار کرے یا پھر بحیثیت نمونہ بندہ وہ مجبور ہو گئے ہوں کہ سوالوں کا جواب دیں۔بہت سے لوگ مصاحبہ کار کے مقاصد سے ناآشنا ہوتے ہیں۔اس لیے ان میں احتیاط کا رویہ نظر نہیں آتا۔حیرت اور استعجاب بھی اس سلسلے کے فکری عناصر ہیں۔پھر سماجی، اخلاقی اقدار بھی ان پر دباؤ ڈالتی ہیں تا کہ حقائق کو اپنی واقفیت کے مطابق بیان کریں۔مگر یہ صورت تمام جواب دینے والوں کے ساتھ یکساں نہیں رہتی۔خاص کر ادیبوں، شاعروں کی ''بے نیازی'' ''لاابالی پن'' اس سلسلے میں بڑی رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔جب مصاحبہ کار کو فرد کی رضامندی مل جاتی ہے تو وہ اپنے سارے سوالوں کو اس طرح سے ترتیب دیتا ہے کہ موضوع سے متعلق باتیں دائرۂ تحریر میں آ جائیں۔اس کے لیے وہ پہلے سے جواب دینے والے کو بذریعہ خط، فون، تار وغیرہ مطلع کر دیتا ہے تا کہ مقررہ وقت پر اس کا کام شروع ہو جائے۔مصاحبہ کار اپنی ذہانت تجربہ اور تجزیاتی شعور کے مطابق سوالوں کا انتخاب اس طرح کرتا ہے کہ پیچیدہ سے پیچیدہ بات سامنے آ جائے اور حقیقت کتنی ہی تاریک اور ناقابل اعتماد کیوں نہ ہوں، لکھی جا سکے۔

مصاحبے یا انٹرویو کا ایک نفسیاتی نکتہ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ سوالات کے ذریعے فرد کو متاثر کیا جاتا ہے تا کہ اس کے نظریات یا ذہنی رویے میں کوئی بنیادی تبدیلی واقع ہو۔مگر ادبیات میں انٹرویو کا یہ مقصد نہیں ہوتا۔ممکن ہے اس طرح کا طرز عمل نفسیاتی مریض کے لیے بہتر ثابت ہو۔مگر فنون لطیفہ کی کسی صنف میں یہ عمل نہ تو کتھارسس کی کیفیت پیدا کرتا ہے اور نہ کسی ذہنی الجھن کو دور کرتا ہے۔اس لیے ادیب کی ''انا'' کو شکست ہونے کا عمل انجام نہیں پاتا۔چنانچہ اس کی بے نیازی کو نبھانا پڑتا ہے۔

مصاحبے یا انٹرویو کی سب سے اچھی صورت یہ ہوتی ہے کہ وہ افراد جن کا انٹرویو کیا جاتا ہے، ان سے پہلے اس کام کی منظوری حاصل کریں، پھر ان کی سہولت کے پیش نظر دن، تاریخ مقرر کر لی جائے اور تب قدرے محتاط ہو کر گفتگو کا آغاز ہو۔یہ گفتگو موضوع کے دائرے میں ضرور ہونی چاہیے۔مگر ایسی بھی نہ ہو کہ جواب دینے والا اکتاہٹ محسوس کرے۔اس کی دلچسپی موضوع میں اتنی ہی ہونا چاہیے جتنی انٹرویو لینے والے کو ہے۔اس کے لیے ذہنی رابطہ بھی ایک اہم کڑی ہے۔

اقسام

ماہرین تحقیق اور سماجی علوم کے ماہرین نے انٹرویو کی قسموں کا ذکر کرتے ہوئے اس کا خیال رکھا ہے کہ انٹرویو بالکل واضح ہو اور ساری اطلاعات اپنے تک محدود رکھیں۔

Will Kinson اور Bhandatkar نے بھی انٹرویو کی کئی قسموں کا ذکر کیا ہے۔ان کا مختصر جائزہ ضروری ہے۔

1-ساختہ (Structured) انٹرویو: اس قسم کے انٹرویو میں پہلے سے سوال نامہ بنالیا جاتا ہے۔جس کا معیار اور تکنیک اعلیٰ ہوتی ہے۔اس میں ایک سوال ہر طرح کے آدمی کے لیے ایک ہی معنی رکھتا ہے اور اثبات اور نفی میں جواب دریافت کیا جاتا ہے۔

2-غیر ساختہ (Unstructured) انٹرویو: اس کے دائرے میں جو سوالات ہوتے ہیں ان میں بڑی لچک ہوتی ہے جب کہ پہلے طریقہ میں سوال کے معنی متعین اور واضح ہوتے ہیں۔اس کے معیار کی طرف بھی زیادہ توجہ نہیں دی جاتی۔سوالات بھی پہلے سے بنائے نہیں جاتے۔جوابات کے تعلق سے بھی یقین سے کوئی بات نہیں کہی جاسکتی۔البتہ جواب دینے والا اپنے خیالات اور تجربات کا بے محابا اظہار کرتا ہے۔لیکن اس سے افراد کے ذہن اور دل ودماغ کو اچھی طرح سمجھا جاسکتا ہے، بشرطیکہ اس طریق کار کا خوبی سے استعمال ہوا ہو۔ غیر ارادی طور پر بہت سے گوشے نمایاں ہو جاتے ہیں۔انٹرویو لینے والا بھی آزاد ہوتا ہے وہ جو چاہے پوچھ سکتا ہے اور اپنی مرضی سے حسب خواہش موضوع کی اہمیت کے مطابق نوٹس تیار کر لیتا ہے۔وہ جس بیان کو چاہے حذف کرسکتا ہے اور جسے چاہے شامل کرسکتا ہے۔یہ ایک طویل طریقہ ہے۔

3-مرکوز (Focussed) انٹرویو: اس کا مقصد یہ ہے کہ کسی خاص تجربی پہلو اور موضوع پر روشنی ڈالی جائے۔سوال کرنے والا اپنے مقصد میں بالکل صاف ذہن رکھتا ہے، اس لیے اس کا سوال نامہ مبہم نہیں ہوتا۔ اس کے موضوعات بھی متعین ہوتے ہیں لیکن طریق کار میں سوالات پوچھنے کی آزادی ہوتی ہے۔اس طرح کے انٹرویو سے فرضیات کی تعبیر اور تجزیہ میں آسانی ہوتی ہے۔

4-کلینکل (Clinical): یہ مرکوز انٹرویو سے قدرے مشابہ ہے۔فرق صرف اتنا ہے کہ اس سے فرد کے ان احساسات ومحرکات کے متعلق، جو اس کی زندگی میں اہم ہوتے ہیں، معلومات حاصل ہوجاتی ہیں۔یہاں بھی مقاصد واضح ہوتے ہیں۔ اس کا استعمال نفسیات کی تحقیق میں زیادہ رائج ہے۔

5-غیر ہدایتی (Nondirective): یہ طریقہ نفسی معالج کے لیے موزوں ہے۔اس میں براہ راست کوئی سوال نہیں پوچھا جاتا۔نفسیاتی طریقے سے جواب دینے والے کو ذہنی طور پر گفتگو کے لیے آمادہ کرلیا جاتا ہے کہ فلاں موضوع پر اپنے خیال کا اظہار کرے۔اس میں کسی طرح کی پابندی نہیں لیکن یہ بے حد نازک طریق کار ہے اور سوال پوچھنے والے کے لیے نفسیات کا علم ضروری ہے تاکہ بالواسطہ جوابات کا تجزیہ کرسکے۔

فوائد

-1 ذاتی انٹرویو سوال نامے کی بہ نسبت زیادہ فائدے کا سبب بنتا ہے۔سوال نامہ صرف اہل علم کے لیے مخصوص ہے، جب کہ انٹرویو کا دائرہ پوری تحقیقی آبادی کو اپنے حلقۂ اثر میں سمیٹ لیتا ہے۔

-2 اس کے ذریعے جو معلومات حاصل ہوتی ہیں وہ زیادہ درست اور صحیح ہوتی ہیں۔ جواب دینے والا بہت سی غلط فہمیوں کو دور کرسکتا ہے۔دوران گفتگو میں بہت سی باتوں

کی وضاحت ہوتی جاتی ہے اور سوال پوچھنے والا موضوع کی گہرائی دیکھ سکتا ہے۔

3- مصاحبہ کار فرد کے ماحول اور اس کی ذاتی زندگی کی تہ تک پہنچ سکتا ہے۔ حقیقت تلاش کرنے کی یہ بہتر اور اعلیٰ ترین تکنیک ہے۔ دوران گفتگو میں وہ بولنے والے کے انداز بیان اور چہرے کے اتار چڑھاؤ کے ذریعہ بھی اپنے تاثرات کی دنیا وسیع کرتا جاتا ہے۔ اس وقفے میں اسے اس امر کا بھی احساس ہو جاتا ہے کہ جواب دینے والے کی حیثیت کیا ہے۔ وہ خصوصی واقعے، موضوع یا فن کے متعلق کئی باتیں جانتا ہے لہٰذا سوالات اسی نوعیت سے بدلتے جاتے ہیں۔ یہ کسی اور ذریعے سے ممکن نہیں۔

4- پہلے سے طے کیے ہوئے انٹرویو کا سلسلہ کئی دن پہلے چل سکتا ہے۔ یہ سلسلہ کئی گھنٹوں تک جاری رہ سکتا ہے۔ اس لیے تفصیل سے باتیں ہوتی ہیں۔ خصوصیت سے ادب کے میدان اور تحقیق میں اس کی بڑی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر آپ جدید ادب پر تحقیق کر رہے ہیں تو باتیں صرف اُردو کے جدید ادب تک نہیں رہ سکتیں۔ عالمی ادب کا ذکر ضروری ہو جاتا ہے پھر اس کا اعلیٰ ادب سے رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ موجودہ صدی کی تکنیکی ترقی میں جدید ادب کے نئے تقاضوں کی بات ہوتی ہے۔ عمومی فلسفیانہ مزاج بحث میں شامل ہو جاتا ہے۔ اس طرح دو آدمیوں کے درمیان یہ گفتگو اگر معیاری ہے اور دونوں اعلیٰ علم کی سطح پر ہیں تو یہ گفتگو ٹیپ کرنے کے لائق ہوتی ہے اور ادبی و تہذیبی تذکروں میں اس کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ یہاں دونوں کی صلاحیتوں سے واقفیت کا موقع ملتا ہے۔ ادبی تحقیق میں مصاحبہ یا انٹرویو کی یہ قسم بڑی کارآمد ثابت ہوتی ہے۔

5- اس طریق کار میں مصاحبہ یا انٹرویو کی زبان خاصی اہم ہوتی ہے۔ سوال پوچھنے اور جواب دینے والے کی زبان اور اس کی لیاقت بھی مدنظر رہتی ہے اور اس کا برابر خیال رکھا جاتا ہے کہ کوئی ایسی بات نہ ہو جس سے تشریح و تفسیر میں دشواری ہو۔

6- گمبھیر اور پیچیدہ واقعات کی حقیقت کو جاننے کے لیے اس سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں۔ ادبیات اور سماجی علوم کے دائرہ سے نکل کر اگر ہم قانون شکنی کی تاریخ کا مطالعہ کریں اور سزا و جزا کی طرف نگاہ رکھیں تو اس حقیقت کا پتا چلے گا کہ پولیس کے محکمہ کا سارا نظام اسی تفتیش پر مبنی ہے۔ یہاں یہ بحث نہیں کہ اس میں صداقت کہاں تک ہاتھ لگتی ہے۔

مصاحبے یا انٹرویو کی ان تمام خصوصیات کے باوجود اس میں چند نقائص بھی ہیں۔ یہ کمزوریاں فطری ہیں۔ ان پر حیرت نہیں ہونی چاہیے۔ کوئی بھی علم اپنی جگہ مکمل نہیں۔ اگر مکمل ہو جائے تو علم کا ارتقاء ہی رک جائے۔ علم کسی مکمل ضابطے کی نفی کرتا ہے۔ اس طرح انٹرویو کی اپنی حدود بھی پیش نظر رہنی چاہئیں اور تحقیق کار کو ہر وقت کوشش کرنی چاہیے کہ وہ ان پر قابو پائے۔ اس کی یہ سعی جتنی دیانت داری کے ساتھ جاری رہے گی، اس

کا کام اتنا ہی معیاری ہوگا اور تلاشِ حق میں اس کے قدم مضبوطی سے جمے رہیں گے۔

نقائص

1- اس طریق کار کا ایک بڑا نقص یہ ہے کہ اس میں وقت، توانائی اور روپیہ بہت صرف ہوتا ہے۔ انٹرویو دینے والا کسی دوسرے شہر میں رہتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ تحقیق کار کے گھر کے آس پاس کا رہنے والا ہو۔ اسے سفر کی صعوبتیں اور اخراجات برداشت کرنے ہوں گے۔ یونیورسٹی میں کام کرنے والے اساتذہ اور طلبہ کے لیے ان کو برداشت کرنا بہت ہی مشکل ہے۔

2- اگر نگران اور تحقیق کار کی ذہنی اور علمی سطح اعلیٰ نہیں ہے اور وہ موضوع سے متعلق مختلف پہلوؤں سے واقفیت نہیں رکھتے تو وہ اس طرز کے انٹرویو کو سلیقے سے نباہنے میں معذور ہوں گے۔

3- سوال و جواب کے دوران میں تحقیق کار تعصبات سے خود کو محفوظ نہیں رکھ سکتا۔ پوچھنے والے اور جواب دہندہ کے اپنے تحفظات ہوتے ہیں۔ اپنے تعصبات کے دائروں سے وہ واقف نہیں ہوتے۔ انھیں اس کی اطلاع بھی نہیں ہوتی کہ ان کا کون سا طرزِ عمل ان کی عصبیت سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔

4- چونکہ تحقیق واقعیت کی تلاش کا بھی نام ہے، اس لیے تحقیق کار کو کوشش کرنی چاہیے کہ وہ اپنے بیانات کے علاوہ جمع کیے گئے کوائف کی چھان بین بھی اس طرح کرے کہ مبالغہ آمیزی کم سے کم رہ جائے اور موضوع سے متعلق حقائق بہتر اور معروضی طور پر سامنے لائے جائیں۔

5- ہر تحقیق کار انٹرویو لینے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اس لیے نگران کو چاہیے کہ وہ اسے اس کے طریقوں سے واقف کرائے۔ گویا ایک طرح کی تربیت اسے دی جائے تاکہ اسے استفسار کی جن منزلوں سے گزرنا ہے، ان میں کوئی مضحکہ خیز پہلو رونما نہ ہو۔

6- ذاتی تعصبات پسند اور ناپسندیدگی کی وجہ سے اس بات کا اندیشہ رہتا ہے کہ سوال اس طرح سے پوچھا جائے کہ موضوع کے تقاضے پس پشت نہ پڑ جائیں۔

7- کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ جواب دینے والا حقیقت کے بجائے اپنے تخیل کی پرواز میں مصروف اور انٹرویو لینے والا پریشان ہو جاتا ہے اور اس کے تمام سوالوں کی معنویت گم ہو جاتی ہے۔ ادیبوں اور شاعروں کے مصاحبہ میں یہ کوتاہی ممکن ہے۔

اہمیت

ان کمزوریوں کے باوجود مصاحبہ یا انٹرویو کرنے کا طریقہ نہ صرف ضروری ہے بلکہ سماجی علوم اور

ادبی تحقیق کی دنیا میں اس کی اہمیت بدستور قائم ہے۔ اس کے فوائد ان کمزوریوں سے کہیں زیادہ ہیں جن کا ذکر کیا گیا۔ البتہ ضرورت اس امر کی ہے کہ نگران تحقیق کار کی علمی سطح کے مطابق اسے تربیت دے یا تربیتی کلاس میں اسے بتایا جائے کہ انٹرویو کے طریقے کیا ہیں؟ اس کی قسمیں کتنی ہیں اور کس طرح ان کی دشواریوں پر قابو پایا جائے۔ اگر اسی کی تربیت نہیں ہوتی اور اسے علم نہیں کہ سوالات کی نوعیت کیا ہونی چاہیے، رابطہ کس طرح قائم کرنا چاہیے تو تحقیق کار بجز اپنی لاعلمی و بے خبری کے کچھ ظاہر نہیں کرسکتا۔ وہ ضروری کوائف جمع کرنے کے بجائے غیر ضروری معلومات حاصل کرے گا۔ اسی لیے سوال نامہ کی ترتیب اور اس کے ڈیزائن کی سطح اعلیٰ ہونی چاہیے اور موضوع کو پیش نظر رکھ کر ساری باتوں کو سمیٹنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ دراصل یہ ایک فن ہے۔ اگر آپ مشہور صحافیوں اور سیاسی لیڈروں کے انٹرویو کا مطالعہ کریں تو آپ کو پتا چلے گا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی رہنمایانِ وقت اپنی گفتگو کے دوران میں ان حقائق کا انکشاف کردیتے ہیں، جن کا ظاہر کرنا ان کا مقصد نہیں تھا اور جن سے ان کی حکومت کی خفیہ پالیسی وضع ہوتی ہے۔ اگر صحافی ذہین ہے، تجربہ کار ہے، انسانی نفسیات کے علم سے واقف ہے، انٹرویو کے آداب سے آشنا ہے اور ان تمام تکنیکوں کو سمجھتا ہے جو انٹرویو کے لیے ضروری ہیں تو وہ اپنے مطلب کی باتیں چند لمحوں میں نکال لیتا ہے۔

اس طرح ادبی تحقیق بھی اہمیت رکھتی ہے۔ وہ فن کار جو زندہ ہیں اور جن کا ادبی سرمایہ قابلِ لحاظ ہے۔ اپنی نجی زندگی کے اہم واقعات کو منظر عام پر لانا نہیں چاہتے، اس موضوع پر شاید بہت سے فن کار دامن بچاتے ہیں۔ اب انٹرویو لینے والا اگر ہنر مند ہے، اسرار و رموز سے باخبر ہے تو وہ ان مشکلوں پر قابو پالیتا ہے۔ وہ افراد سے ایک ایسا تعلق پیدا کرلیتا ہے جس سے قربت کی فضا بنتی ہے۔ اعتبار اور دوستی کی سازگار فضا کے ذریعے وہ اپنے مقاصد کے حصول میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ ایسا اسی وقت ممکن ہے، جب سوال کرنے والے کو ساری تکنیک معلوم ہو اور وہ جواب دینے والے کو یہ احساس نہ ہونے دے کہ اس کا امتحان لیا جارہا ہے بلکہ یہ احساس پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کرے کہ وہ تبادلۂ خیال کے ذریعے ایک اہم فرض پورا کررہا ہے۔ اس لیے بات چیت بالکل غیر رسمی ہونی چاہیے۔ غیر رسمی گفتگو میں آدمی بہت کھل کر باتیں کرتا ہے اور اپنی زندگی کے تاریک پہلوؤں کی طرف بھی اشارہ کردیتا ہے۔

ریکارڈ کرنا

تحقیق کار کو کبھی کبھی اس وقت دشواری پیش آتی ہے جب وہ بعض سوالوں کا جواب مبہم پاتا ہے۔ ایسی صورت میں اسے نہایت دانش مندی سے بہ طریق احسن اپنے سوال کی پھر وضاحت کرنی چاہیے تاکہ جواب دینے والا دلچسپی برقرار رکھ سکے اور تحقیق کار کی دشواریوں کے پیش نظر ان واقعات، خیالات کی طرف اشارہ کرے، جو مطلوب ہیں۔

کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ جواب دینے والا اکثر سوالات کو منفی صورت میں دیکھتا ہے اور ''نہیں'' میں جواب دیتا ہے۔ یہ بڑا نازک اور مشکل مسئلہ ہے۔ تحقیق کار کو یہ سوچنا چاہیے کہ کیا واقعی وہ سوال کا جواب نہیں جانتا یا قصداً لاعلمی کا اظہار کررہا ہے۔ اگر وہ واقعات یا حقیقت کو چھپانے کی کوشش کررہا ہے تو اس انکار

کی وجہ اور اسباب پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔
مصاحبہ یا انٹرویو ریکارڈ کرنے کا مسئلہ بھی اس طریق کار کا ایک حصہ ہے۔ اس سلسلے میں ان غلطیوں سے تحقیق کار کو بچنے کی کوشش کرنی چاہیے جو تحریر کے وقت اس سے سرزد ہوئی ہیں۔ چونکہ ایک ہی وقت میں اسے سوال کرنا اور جواب بھی لکھنا ہوتا ہے۔ پھر اس کی وضاحت کا مسئلہ بھی پیدا ہوتا ہے۔ جواب بھی سنتا ہے اور اس میں اپنے کام کی باتوں کو نوٹ کرنے کا مسئلہ بھی درپیش ہے۔ اس لیے برابر یہ احتمال رہتا ہے کہ غلط باتیں بھی لکھ لی جائیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بے حد ضروری اطلاعات اور معلومات چھوٹ جائیں۔ یہ ساری باتیں شعوری نہیں ہوتیں بلکہ ذہن چوکنا اور مسلسل بیدار نہ رہنے کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ ان کی ایک ہی صورت ہے کہ اہم نکات کی طرف فرد کی توجہ پھر سے مبذول کرانے کی کوشش کی جائے۔ اس کام کے لیے ہوسکتا ہے اسے کئی بار مخصوص فرد کے پاس جانا پڑے۔ لیکن یہ تحقیق کی ایسی دشواریاں ہیں جن پر قابو پائے بغیر وہ تحقیق کی ذمہ داریوں سے سبکدوش نہیں ہوسکتا۔
غیر متعین سوالوں کے جوابات کے لیے یہ ضروری ہے کہ جواب کو ہو بہو لکھا جائے۔ جوابات کو ترتیب اور سلیقے سے لکھنے کی منزل بھی اہم ہوتی ہے کیونکہ سارے جوابات ایک جیسے نہیں ہوتے۔ انٹرویو کے سلسلے میں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ تین طرح کا عمل ایک ساتھ جاری رہتا ہے۔

1- سوالات کی بوچھاڑ　2- جوابات　3- جوابات تحریر کرنے کا عمل

ان اعمال میں ہم آہنگی قائم رکھنا آسان نہیں۔ وہ مختصر نویسی کا طریقہ بھی استعمال کرسکتا ہے یا دوران تحقیق میں وہ شناخت کی خاطر بہت سی علامتیں بنالیتا ہے اور انھی علامتوں کے ذریعے وہ تفصیلات جمع کر لیتا ہے لیکن ان علامتوں کی نہ تو ادب میں اہمیت ہوتی ہے اور نہ وہ دوسروں کے کام آسکتی ہیں۔ ان کا تعلق اسی مخصوص تحقیق کار سے ہوتا ہے جس نے اپنی آسانی کی خاطر چند نقوش بنالیے ہیں اور انھیں علامتوں کی شکل دے دی ہے۔
مصاحبہ کار یا انٹرویو لینے والے کو اپنے تعصبات اور تحفظات سے بھی ہوشیار رہنا چاہیے۔ وہ بھی ایک بشر ہوتا ہے اور اپنی پسند اور ناپسند کے ساتھ زندہ رہتا ہے۔ اس لیے تعصبات کی عدم موجودگی کا امکان بہت کم ہوتا ہے۔ لہٰذا کوشش یہ ہونی چاہیے کہ اس پر زیادہ سے زیادہ قابو پایا جائے اور معروضی طریق کار کو اختیار کیا جائے۔ اس رویے کے لیے دو عناصر ذمہ دار ہوتے ہیں۔ سوال پوچھنے والا، جواب دینے والے کے تئیں مخصوص رویہ اختیار کرتا ہے اور سوال سے جواب دینے والے شخص کی گفتگو کے دوران میں ایک خاص رویہ ابھرتا ہے۔ لہٰذا دونوں کے لیے کھلے ذہن سے گفتگو کرنی ضروری ہے۔ کبھی کبھی سوال کرنے والے کی جوابات سے تشفی نہیں ہوتی کیونکہ وہ پہلے سے فرد مخصوص کے متعلق بڑی بڑی باتیں سوچ کر چلا تھا۔ جواب سن کر اسے ایک گونہ مایوسی ہوتی ہے۔ اس کا کوئی حل نہیں۔ بجز اس کے کہ سوال نامے کو از سر نو ترتیب دیا جائے تاکہ تحقیق کار کی اعلیٰ توقعات پوری ہوسکیں۔ تعصبات کے سلسلے میں ایک دشواری اس کی اپنی پیدا کردہ ہوتی ہے۔ وہ پہلے سے شخصیتوں اور افراد کے متعلق مفروضات بنالیتا ہے۔ اگر یہ مفروضات جوابات کی روشنی میں

پورے نہیں اترتے تو کبھی کبھی وہ زبردستی دخل در معقولات کی کوشش کرتا ہے۔ اس امر سے اس کی انا کو تسکین تو حاصل ہو جاتی ہے، لیکن یہ خود فریبی ہے، تحقیق نہیں۔ تحقیق حقیقت کی باقاعدہ اور منضبط تلاش کا نام ہے اور حقیقت ہمیشہ ہماری خواہشوں کے مطابق دکھائی نہیں دیتی۔ اس لیے تحقیق کار کو غیر ذمے دارانہ باتوں سے گریز کرنا چاہیے اور وہی باتیں ریکارڈ کرنی چاہئیں جو اس نے زبانی سنی ہیں اور انھی کی بنیاد پر نتائج نکالنے کی منزلوں سے گزرنا چاہیے۔ اسے صحافیوں کی طرح اپنے اندازے، اٹکل پچو باتیں اور فیصلے شامل نہیں کرنے چاہئیں۔ تحقیق اندازے لگانے اور کلی نتائج حاصل کرنے کا نام نہیں۔ یہ انتہائی دقیق اور باریک نکات کے حوالے سے حقائق معلوم کرنے کی ایک کوشش ہے۔ ایک تحقیقی عمر وایسی ہی وقت پسندی کی بنا پر تسلیم ہوتا ہے۔

ساتواں باب

ادب میں تجرباتی تحقیق

ادبی تحقیق کار عام طور پر تجرباتی تحقیق سے گھبراتے یا دور رہتے ہیں جبکہ یہ سب سے آسان تحقیق ہے۔ تجربات (Experiments) صرف سائنسی تجربہ گاہوں میں نہیں کیے جاتے، سماجی علوم میں بھی کئی طرح کے تجربات سے تحقیق کے عمل انجام دیے جاتے ہیں۔ ادبی، لسانی یا لسانیاتی تحقیق کو اب تجرباتی تحقیق کے گھاٹ پر چڑھانے کا تجربہ بھی کر لینا چاہیے تاکہ جدید تقاضے ملحوظ رکھتے ہوئے ہم دنیا سے ادبی تحقیق کو بھی ایک تحقیقی قسم کے طور پر منوا سکیں۔ ابھی تک ادبی اور لسانی شعبوں کا رویہ سائنسی اور تجرباتی تحقیق کے بارے میں استہزائی اور نفور آمیز رہا ہے جبکہ اس ناروا رویے سے نقصان ادبی و لسانی شعبے ہی کو پہنچا ہے۔

دراصل تجربہ (Experiment) کا لفظ سامنے آتے ہی ہمارے ذہنوں میں کسی سائنسی تجربہ گاہ کا تصور ابھرتا ہے اور ہم آسانی کہہ دیتے ہیں کہ ادب و لسانیات میں بھلا آلات اور تجربہ گاہ کی ضرورت کیا ہے؟ لیکن اگر ہم تجربے کی ماہیت کو سمجھیں تو خواہ اس کے مظاہر میں اختلاف کریں مگر ادب و لسانیات میں تجرباتی تحقیق کا تجربہ ہم بھی کر سکتے ہیں۔ تجرباتی طریق کار کے بارے میں یہ پہلو بھی سامنے رہنا چاہیے کہ محض کتابی علم، نکات و اقدامات کے مطالعہ سے یہ طریق کار نہیں سیکھا جا سکتا۔ اس کے لیے ایک ماہر تجربہ کار رہنما کی ضرورت ہوتی ہے، کیونکہ اس کام میں بہت سے عملی پہلو ایسے ہیں جو معروضی کی بجائے موضوعی طور ہی پر کسی سے سیکھے جا سکتے ہیں۔

اب خواہ تجرباتی تحقیق کے اصول ہمارے فہم میں آ بھی جائیں، پھر بھی ادبی تحقیق میں تجربے کا عنصر شامل کرتے ہوئے ہم متذبذب اور متامل ہوتے ہیں۔ اس کی بڑی وجہ کیا ہے؟ دراصل ایسے تحقیق کار سے بہت زیادہ مہارت اور دقت نظری کا تقاضا کیا جاتا ہے جو تجربہ گاہ کے آلات کی بجائے کاغذی آلات استعمال کرتا ہے۔ سائنسی تجربات میں بہت سے معروضی عوامل پر ان آلات سے نظر رکھی جا سکتی ہے لیکن یہاں ادبی دنیا میں تو کاغذی گھوڑے دوڑانا پڑتے ہیں اور ہر قسم کے عوامل کو مطالعاتی مشاہدے میں لانا پڑتا ہے۔ گویا یہاں ہمارے آلات کاغذی ہوں گے۔

1- تجربہ کیا ہے؟

خصوصیات کے لحاظ سے تجربہ ایک ایسے عمل کو کہتے ہیں جس میں تحقیق کار تمام قابلِ تبدیل حالات یا متغیرات (Variables) کو قابو میں لا کے ایک خاص متغیرے پر کسی دوسرے متغیرے کے اثرات یا کسی ایک متغیرے کے ارتقاء کا مشاہدہ کرتا ہے۔ منطقی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ تجربہ نتائج کے اسباب و علل کا تعین کرتا ہے اور تجربے سے ثبوت فراہم کرتا ہے۔ تجربہ کاری فرضیے کی جانچ کا ایک زیادہ معتبر طریقہ ہے۔

یہ طریق کار اتنا معروضی اور واضح ہوتا ہے کہ کوئی بھی دوسرا اسے دہرا سکتا ہے اور اگر یہ کوشش درست طور پر کی گئی ہو، نمونہ بندی درست ہو تو عین ممکن ہے کہ نتائج بھی کم و بیش یکساں برآمد ہوں۔ اس کی منفرد خوبی یہ ہے کہ اس میں تحقیق کار آزاد متغیرے کو اپنی مرضی سے استعمال کرتا ہے۔ تجربے کے عمل میں دہرانے کی اس ممکن کیفیت کے پیش نظر ہم کہہ سکتے ہیں کہ:

> "تجربہ ایک منظم و منضبط عمل کو کہتے ہیں جو حسبِ ضرورت مصنوعی ماحول میں کیا جائے...... جس میں متغیرات پر تجربہ کرنے والے کا کنٹرول ہو...... جس میں تمام اسباب و علل سے بحث کر کے ایسے نتائج نکالے جائیں جن کی تمام تر بنیاد مشاہدے پر ہو...... جس میں کسی حد تک نتائج کی پیشین گوئی کی جا سکتی ہو اور...... جس میں طریق کار واضح اور کسی دوسرے فرد کے لیے بھی قابلِ استعمال ہو"۔

تجربی تحقیق کی وضاحت یوں بھی کی جا سکتی ہے کہ:

> "ایسی تحقیق کو کہتے ہیں جس میں ایک یا زائد متغیرات کو ایک نظم کے ساتھ تبدیل کر کے آزاد منحصر متغیرہ پر پابند غیر منحصر متغیرہ کے اثرات کا مشاہدہ کیا جاتا ہے اور غیر ضروری عناصر (Extranuous Elements) کو مستقل (Constant) رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے"۔

ڈاکٹر عبدالرشید آزاد کے نزدیک تجربہ کاری سے ہم صرف مشاہدے کے حالات بہتر بنا سکتے ہیں اور تفصیلی نتائج حاصل کر سکتے ہیں۔ گویا تجربہ مشاہدے ہی کی ایک توسیعی صورت ہے اور مشاہدہ تاریخی جائزے کی اثباتی توسیع کا نام ہے۔ ڈاکٹر نثار احمد زبیری کے نزدیک تجربے کے فوائد یہ ہیں کہ کسی اثر پیدا کرنے والے متغیرات کی نشان دہی واضح طور پر ہو سکتی ہے، یعنی زیرِ غور عوامل کے سوا دوسرے عوامل کو مستقل رکھ کر زیرِ غور عوامل کے اثرات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ تحقیق کی مخصوص زبان میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ منحصر متغیرے (Independent Variable) پر غیر منحصر متغیرے (Dependent Variable) کے اثرات کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ تجربے کی مدد سے علیت (Causality) اور اس کی نوعیت کو واضح طور پر سمجھا اور بیان کیا جا سکتا ہے۔ اس کی مدد سے مختلف متغیرات کو کنٹرول کرنے اور ان کی نوعیت بدل بدل کر یعنی Manipulate کر کے ان کے اثرات کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ تجربے کے علاوہ ان عوامل کو کنٹرول

کرنے کی کوئی اور صورت نہیں ہوتی۔ اس طرح کے کنٹرول سے تحقیق کرنے والے کو یہ اعتماد حاصل ہوتا ہے کہ وہ جو نتائج حاصل کر رہا ہے، وہ صداقت پر مبنی ہیں۔ کیوں کہ اس نے اس سے متعلق اثرات پیدا کرنے والے عوامل کو خود کنٹرول کیا ہے اور تجربے کی منصوبہ بندی اس نے احتیاط کے ساتھ کی ہے۔

تجربہ، تحقیق کار کو یہ موقع بھی فراہم کرتا ہے کہ وہ وقت یا کسی اور بنا پر واقع ہونے والی تبدیلی کا جائزہ لے سکے۔ ایک تجربہ ایک وقت میں تھوڑی دیر کے لیے ہو سکتا ہے، لیکن ایک ہی تجربے کو مقررہ مدت کے بعد دہرا کر واقع ہونے والی تبدیلی کا جائزہ ممکن ہو سکتا ہے۔ مثلاً تحقیق کار یہ دیکھ سکتا ہے کہ طباعت کے پوائنٹ سائز سے اُردو میں رفتار مطالعہ پر کتنا اثر پڑتا ہے تو وہ جس نتیجے پر پہنچتا ہے اسی پر دیگر تجربہ کرنے والے بھی پہنچ سکتے ہیں۔ قدرتی ماحول میں ہم کوئی مشاہدہ کرتے ہیں تو تجربے سے اسی مشاہدے کو محدود کنٹرول میں لا کر تھوڑے عرصے اور کم لاگت میں تحقیق انجام دی جا سکتی ہے۔

تجربے کا بڑا نقصان تو یہ ہے کہ اس کا ماحول مصنوعی اور غیر فطری ہوتا ہے، مثلاً طلبہ سے کوئی بات ان کے سکول یا گھر میں پوچھی جائے تو ماحول فطری و قدرتی ہوگا لیکن تجربے کے لیے انھیں یونیورسٹی کی ایک تجربہ گاہ میں بلایا جائے تو ماحول مصنوعی ہو جائے گا۔ اس ماحول میں ممکن ہے کہ ان کے جوابات فطری اور حقیقی نہ رہ سکیں۔ اسی طرح ذاتی سطح پر قاری کسی بات کو پسند کرتا ہو مگر عوامی اور اخلاقی سطح پر وہ یہ پسند افشا کرنے پر راضی نہ ہو۔

دوسرا اہم نقصان یہ ہے کہ تجربے میں تحقیق کرنے والے کی اپنی شخصیت کے اثرات بہت زیادہ فیصلہ کن ہو سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر قارئین کی ایک جماعت کی کارکردگی بڑی حد تک اس بات پر منحصر ہوتی ہے کہ انھیں کام سمجھانے والے کا پیرایۂ اظہار کیا ہے۔

تیسرا نقصان یہ ہے کہ سارا دارومدار کنٹرول یا انضباط پر ہے، جب کہ اس کے بارے میں سو فی صد یقین کرنا دشوار ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر تجربہ گاہ میں اس امر کا اثبات کرنا کہ دیگر بیرونی اثرات کو بالکل کنٹرول یا منضبط کر لیا گیا ہے، ایک دشوار کام ہے۔ اس طرح غیر منحصر متغیرہ کی مختلف کیفیات کے بارے میں کنٹرول کی نوعیت کا صحیح اندازہ کرنا ایک مشکل امر ہے۔ بعض اوقات متغیرے پر کنٹرول نہیں ہوتا اور تحقیق کار سمجھ لیتا ہے کہ کنٹرول موجود ہے۔ ایسی حالتوں میں نتائج متاثر ہو سکتے ہیں۔

2- تجرباتی عمل کی خصوصیات

ادبی تجرباتی تحقیق کو سمجھنے سے پہلے ضروری ہے کہ تجرباتی عمل کے خواص کا اندازہ لگا لیا جائے جو مندرجہ ذیل ہو سکتے ہیں۔

1- گروہوں کا تقابل

یہ تو ہم جان چکے ہیں کہ تجربے میں دو گروہوں کا تقابل کیا جاتا ہے۔ ایک کنٹرول یا منضبط گروہ یا تقابلی گروہ اور دوسرا تجرباتی یا آزاد گروہ۔ تجرباتی گروہ پر تجربہ کیا جاتا ہے یعنی اس کو کوئی خاص تجرباتی مواد دیا

جاتا ہے جبکہ کنٹرول یا منضبط گروہ کو یا تو دیا نہیں جاتا یا اس پہلے گروہ سے مختلف دیا جاتا ہے۔ کنٹرول گروہ بڑی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ تجرباتی مواد کی کارکردگی کا پیمانہ اور نصاب یہی گروہ ہوتا ہے۔ کنٹرول گروپ اسی گروہ کو کہا جاتا ہے جس پر کوئی تجرباتی مواد نہ آزمایا جائے۔ ادبی لسانی تحقیقات میں کنٹرول گروہ پر کوئی دوسرا تجرباتی مواد آزمایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض ادبی لسانی تحقیق کار کنٹرول کی بجائے اس کو تقابلی گروہ کہتے ہیں۔

مثال کے طور پر ایک تحقیق کار اردو کتب کے مطالعے کے نئے طریقے کی تاثیر کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے۔ وہ تجرباتی گروہ کو تو نئے طریقے سے مطالعہ کرانے کا انتظام کرے گا۔ تاہم دوسرے گروہ یعنی تقابلی گروہ کے افراد حسب سابق اپنے تحقیق کار سے پرانے طریقے ہی پر مطالعہ کریں گے۔ یہاں پر ایسی صورت حال نہیں ہے کہ کنٹرول یا منضبط گروہ کچھ کر ہی نہیں رہا۔ پرانا طریقہ کنٹرول گروہ پر آزمایا جا رہا ہوگا۔

2- آزاد متغیرے کا استعمال

دوسری خصوصیت تجربات کی یہ ہے کہ تحقیق کار اس میں بھرپور طریقے سے آزاد متغیرے کا استعمال کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دانستہ اور براہ راست اس بات کا تعین کرتا ہے کہ آزاد متغیرہ کون سی شکل اختیار کرے گا اور پھر کون سی شکل کس گروہ کی ہوگی۔ ادبی و لسانی تحقیق میں جہاں بہت سے متغیرات استعمال کیے جاتے ہیں وہاں بہت سے ایسے ہیں جو استعمال نہیں کیے جا سکتے۔ استعمال کیے جا سکنے والے متغیرات کی مثالیں: طریق تدریس، تفویض شدہ کام، استعمال کردہ سامان، مشاورت اور دیگر مطالعہ جاتی، تدریسی اور ثقافتی سرگرمیاں وغیرہ جبکہ اس کے برعکس جنس، نسل، عمر اور مذہب ایسے متغیرات ہیں جو استعمال نہیں کیے جا سکتے۔

کسی تجرباتی تحقیق میں آزاد متغیرے قائم کرنے کے کئی طریقے ہیں، مثلاً (الف) ایک متغیرہ، بمقابلہ دوسرا متغیرہ، (ب) متغیرہ، بمقابلہ غیر حاضر متغیرہ، (ج) ایک ہی متغیرے کے مختلف درجے۔

3- اتفاق کاری (Randomization)

اکثر تجربات میں ایک خاص بات زیر مطالعہ افراد کو اتفاق کاری کے طریقے سے کسی گروہ میں ترتیب دینا ہے۔ افراد کو اس طریقے سے گروہ بند کیا جائے کہ ہر فرد تجرباتی صورتحال سے دوچار ہونے کا مساوی احتمال رکھتا ہو۔ اس ضمن میں تین باتیں یاد رکھنے کے قابل ہیں:

(الف) اتفاق کاری تجربہ شروع ہونے سے پہلے کی جاتی ہے۔

(ب) یہ افراد یا اشیا کی تقسیم کا عمل ہے نہ کہ نتائج کی تقسیم کا۔

(ج) اس طریقے میں برابر کے گروہ تشکیل دینے میں مدد ملتی ہے۔

یہ گروہ شاذ ہی کسی دلچسپی والے متغیرے میں مختلف ہوتے ہوں۔ گویا بیرونی متغیرات کی مداخلت کا خدشہ کافی حد تک دور ہو جاتا ہے اور یہی اتفاق کاری کا کمال ہے۔ نمونہ بندی کے اصول بھی یہاں آزمائے جا سکتے ہیں۔

انسانی بساط کے مطابق گروہوں کی برابری کی بھرپور کوشش کی جاتی ہے تاہم متوازن امر یہ ہوگا کہ کم از کم 40 افراد کا گروہ ضرور ہو۔ اس میں ہر انداز، دلچسپی، پیشے، طبقے، سطح یا درجے کے افراد ضرور شامل ہوں۔

4- بیرونی/ خارجی متغیرات کا کنٹرول

بیرونی متغیرات کو قابو یا کنٹرول کرنا بے حد مشکل کام ہوتا ہے۔ اس طریق کار میں تحقیق کے تجرباتی مواد (Treatment) کا تعین کرتے ہیں، نمونے کا انتخاب کرتے ہیں، اس بات کا فیصلہ کرتے ہیں کہ کس گروہ پر تجرباتی مواد آزمایا جائے گا۔ تجرباتی مواد کے علاوہ دوسرے عناصر کے اثر کو کنٹرول کیا جاتا ہے اور پھر تجرباتی مواد کی تاثیر کا مشاہدہ کرتے ہیں اور اس بات کی بھرپور کوشش ہوتی ہے کہ کوئی خارجی عنصر نتائج کو متاثر نہ کر سکے۔ اس کے لیے بہت دقت نظری کی ضرورت ہوتی ہے۔

ان امور کو ادبیات میں تحقیق کے حوالے سے یوں سمجھنا بھی ضروری ہے کہ تجربات ہم حال اور مستقبل پر کر سکتے ہیں، ماضی پر نہیں، البتہ ماضی کے کسی عنصر کا جائزہ، اگر اسے دہرا کر، لیا جا سکے تو ہم اسے تجربی تحقیق کے سپرد کر سکیں گے۔

3- تجربے کا تحقیقی ڈیزائن

تجرباتی ڈیزائن میں بنیادی اصول "تجربہ" ہی ہے تاہم جیسا کہ کلاسیکی طریق کار کے مطابق جواب دہندگان کو دو متوازن (Matched) گروہوں میں تقسیم کیا جاتا ہے، یہ توازن سماجی مرتبے (Social Status) ذہانت، تعلیم، صنف اور عمر وغیرہ کے پیش نظر اس طرح قائم کیا جاتا ہے کہ دونوں گروہ تقریباً ہر معاملے میں ہم پلہ ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ ایک گروہ میں زیادہ ذہین یا زیادہ عمر کے یا بہتر سماجی مرتبے والے افراد شامل ہوں جب کہ دوسرے گروہ میں غبی، کمسن اور غریب افراد ہوں۔ ظاہر ہے کہ ایسے گروہ متوازن نہیں کہلا سکیں گے۔

ایسے متوازن گروہ قائم کرنے کے پیچھے جو منطق کارفرما ہے، وہ واضح ہے۔ جب دیکھنا یہ مقصود ہو کہ غیر منحصر متغیرے کا اثر کیا ہوتا ہے تو مندرجہ بالا میں سے ایک گروہ کو اس متغیرے سے دوچار (Expose) کیا جاتا ہے۔ اس گروہ کو تجربی گروہ کہتے ہیں۔ جب کہ دوسرے گروہ کو جسے منضبط یا کنٹرول گروہ کہتے ہیں غیر منحصر متغیرے سے دوچار نہیں کیا جاتا۔ اس طریق کار کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ تجربی گروہ کے افراد میں جو تبدیلی واقع ہوئی وہ غیر منحصر متغیرے کے اثر سے ہوئی اور اگر منضبط گروہ کے افراد میں بھی کچھ تبدیلی واقع ہوئی وہ کسی بھی نامعلوم عامل کی بنیاد پر ہو سکتی ہے۔ چنانچہ تجربی گروہ پر قائم ہونے والا اصل اثر وہ ہوگا جو غیر منحصر متغیرے کے اثرات میں سے خود بہ خود قائم ہونے والے اثرات کو منفی کر کے نکالا جائے۔ سائنسی طریق کار میں اس نکتے کی دقتوں میں بے حد وسعت پائی جاتی ہے اور انتہائی باریک اور دقیق سطح تک ان باتوں کا خیال رکھا جاتا ہے۔ ادبی تحقیق میں اس عمق تک جانے کی ضرورت نہیں رہتی۔

مشکل یہ ہے کہ انسان ایک پیچیدہ نامیہ (Organism) ہے جو خارجی عوامل سے بھی متاثر ہوتا

ہے اور داخلی عوامل سے بھی۔ اس پر کچھ اثرات کسی خارجی عامل (مثلاً غیر منحصر متغیرہ) کی بنا پر قائم ہوتے ہیں اور کچھ کسی بھی داخلی سبب سے خود بہ خود قائم ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ اصل اثر اسی کو کہا جائے گا جس میں ان دونوں طرح کے اثرات کو پیش نظر رکھا جائے اور ارادتاً قائم کیے جانے والے اثر میں سے غیر ارادتاً قائم ہونے والے اثر کو نفی کر دیا جائے۔

اب تجربے کے کلاسیکی طریقے کی تفہیم کے لیے مندرجہ ذیل تقابلی اقدامات پر غور کریں تو صورت حال زیادہ واضح ہو سکے گی۔

اقدامات	تجرباتی گروہ	کنٹرول گروہ
1- پیشگی جانچ (Pretest)	دی جائے گی	دی جائے گی
2- غیر منحصر متغیرہ	اثر قائم کیا جائے گا	اثر قائم نہیں کیا جائے گا
3- مابعد جانچ (Posttest)	دی جائے گی	دی جائے گی

اقدامات سے نتیجہ نکالنے کا طریقہ مندرجہ ذیل ہوگا:

(الف) تجربی گروہ	مابعد جانچ پر سکور	نفی	مابعد جانچ پر سکور = غیر منحصر متغیرہ کے اثرات کا مظہر سکور
(ب) کنٹرول گروہ	مابعد جانچ پر سکور	نفی	مابعد جانچ پر سکور = خود بہ خود قائم شدہ اثر کا مظہر سکور
نتیجہ	غیر منحصر متغیرہ کے اثر کا مظہر سکور	نفی	خود بہ خود قائم شدہ = اصل اثر کا مظہر سکور اثر کا مظہر سکور

اس پہلو کے لیے ڈاکٹر نثار احمد زبیری نے "صحافتی تحقیق" سے دو مثالیں دی ہیں۔

جین ایس کیریک (jeans S. Kerric) نے تصویروں کو سمجھنے میں کیپشن کے اثرات کے عنوان سے ایک تجربہ کیا ہے۔ انھوں نے کچھ ایسی تصاویر لیں جو واضح نہیں تھی۔ اس کے بعد انھوں نے ان تصاویر پر اپنی مرضی کے مطابق کیپشن لگا دیے۔ انھوں نے یہ انتظام بھی کیا کہ تصاویر کو مستقل رکھا جائے اور کیپشن کو تبدیل کیا جائے۔ مقصد یہ دیکھنا تھا کہ لوگ تصویر کو الگ دیکھتے ہیں یا کیپشن کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔ انھوں نے کیپشن کو تبدیل کرنے کا اہتمام یہ دیکھنے کے لیے کیا کہ آیا کیپشن بدلنے سے تصویر کا مفہوم بھی بدلتا ہے یا نہیں۔ اس تجربے کے نتائج سے ظاہر ہوا کہ تصویر کا مفہوم متعین کرنے میں کیپشن بہت اہم کردار ادا کرتا ہے اور زیادہ تر لوگ تصویر کو کیپشن ہی کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔

ایک تجربہ الینوائے یونیورسٹی میں کیا گیا۔ اس کا موضوع تھا "خبر کے متن کی تفہیم پر سرخی کے اثرات"۔ جیسا کہ سب جانتے ہیں، خبر رساں ایجنسی کی فراہم کردہ ایک خبر کم و بیش بھی اخبارات میں یکساں طور پر چھپتی ہے، جب کہ سرخی علیحدہ علیحدہ قسم کی لگائی جاتی ہے۔ (پاکستان کے بیشتر انگریزی اخبارات میں

اے پی پی کی متعدد خبریں روزانہ لفظ بہ لفظ یکساں انداز میں چھاپی جاتی ہیں، لیکن ہر اخبار میں سرخی الگ الگ ہوتی ہے)۔

ایلی نوائے یونیورسٹی میں کیے جانے والے تجربے کا مقصد یہ معلوم کرنا تھا کہ مختلف اخبارات میں مختلف سرخیوں کے ساتھ چھپنے والی بالکل یکساں خبر، پڑھنے والوں پر کیا اثرات چھوڑتی ہے۔ کیا ان اثرات کا تعین سرخی کی بنا پر ہوتا۔

اس تجربے کے لیے سب سے پہلے ایک مقدمہ قتل کی سماعت کی مصنوعی خبر دی گئی اور اسے بالکل اسی طرح تیار کیا گیا جس طرح اخبار میں اشاعت کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔ تجربہ کرنے والے اس خبر کو سادہ کاغذ پر ٹائپ کرا کے اور مختلف سرخیاں لگا کر بھی لوگوں کے سامنے رکھ سکتے تھے، لیکن اس طرح قدرتی طور پر اخبار میں خبر پڑھنے اور کوئی اثر قبول کرنے پر تصنع غالب آجاتا، کیونکہ خبریں قدرتی طور پر تو اخبار ہی میں پڑھی جاتی ہیں۔ چنانچہ یونیورسٹی کے روزنامے کا ایک پرانا پرچہ نکالا گیا اور اس کی کاپی میں ایک خبر کاٹ کر علیحدہ نکال دی گئی۔ اس طرح کاپی میں جو خالی جگہ بنی اس میں تجربے کے لیے تیار کی جانی والی مصنوعی خبر لگا دی گئی اور پھر تین مختلف طرح کے اخبار چھاپ کر تیار کیے گئے۔ ہر طرح کے اخباروں میں یہ خبر ایک ہی تھی لیکن سرخی الگ الگ تھی:

(الف) کچھ اخبارات میں سرخی ایسی تھی کہ اس کی روشنی میں ملزم صاف مجرم نظر آتا تھا۔

(ب) کچھ اخبارات میں سرخی ایسی تھی کہ اس کی روشنی میں ملزم بے گناہ نظر آتا تھا

اور

(ج) کچھ اخبارات میں سرخی غیر جانب دار قسم کی تھی، جس کی روشنی میں ملزم مجرم ہو بھی سکتا تھا اور نہیں بھی۔

تینوں طرح کے اخبارات کی کاپیاں مطلوبہ تعداد میں چھپوا لی گئیں جواب دہندگان (Respondents) تین بڑے متوازن (Matched) گروہوں میں تقسیم تھے۔ ایک گروپ کو ایسے اخبارات دیے گئے جس میں ملزم کو مجرم گرداننے والی سرخی کے ساتھ، مصنوعی طور پر تیار کردہ خبر لگی ہوئی تھی۔ دوسرے گروہ کو ایسے اخبارات دیے گئے، جس میں خبر تو لفظ بہ لفظ وہی تھی، لیکن ان کے لیے سرخی وہ لگی تھی، جس کی روشنی میں ملزم بے گناہ لگتا تھا۔ تیسرے گروہ کو ایسے اخبارات دیے گئے کہ خبر اس میں بھی یکساں تھی، لیکن سرخی غیر جانب دار قسم کی تھی۔

اخبار کا مطالعہ کرانے کے بعد ان سے مختلف سوالات پوچھے گئے، جس میں خاموشی کے ساتھ اس نوعیت کا بھی سوال تھا کہ فلاں مقدمہ قتل میں وہ ملزم کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟ نتائج سے اندازہ ہوا کہ زیادہ تر حالات میں سرخی یہ طے کرتی ہے کہ خبر پڑھنے والا اس سے مفہوم کیا لے گا۔ جن لوگوں نے:

الف قسم کا اخبار پڑھا، ان کا کہنا تھا کہ ملزم ہی مجرم ہے۔

ب　قسم کا اخبار پڑھنے والوں نے بھی خبر تو وہی پڑھی، لیکن سرخی کی وجہ سے یہ خیال ظاہر کیا کہ ملزم حقیقت میں مجرم نہیں ہے۔ جب کہ:

ج　قسم کا اخبار پڑھنے والوں کا خیال تھا کہ ملزم مجرم ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی۔

ایک تجربہ 1998ء میں مڈل سکول پراجیکٹ کے حوالے سے عبیداللہ بیگ کی تحریر ''کالا تیتر'' اور پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کے مضمون ''فضائی آلودگی'' کے مابین ''مؤثریت'' کے حوالے سے کیا گیا۔ یہ تجربے پورے پاکستان میں چاروں صوبوں میں انجام دیا گیا۔ اس کی ڈیزائنگ کے بعد باقی صوبے دوسرے ماہرین کے سپرد کر کے راقم نے صوبہ بلوچستان میں نگرانی کا فریضہ انجام دیا۔ چھٹی جماعت کے طلبہ کو فضائی آلودگی کے بارے میں جو کچھ پڑھایا گیا وہ ایک گروہ پر مشتمل تھا جبکہ دوسرے گروہ کو نیا سبق ''کالا تیتر'' پڑھایا گیا۔

نمونہ کاری میں صوبے بھر سے لڑکوں کا ایک مڈل سکول شہر سے اور ایک گاؤں سے اور لڑکیوں کا ایک سکول شہر سے اور ایک گاؤں سے منتخب کیا گیا۔ پوری جماعت کو دو مساوی گروہوں میں تقسیم کر کے پیشگی جانچ کے طور پر ایک تحصیلی جائزہ لیا گیا۔ پھر ایک گروہ کو رواجی سبق اور دوسرے تجرباتی گروہ کو نیا سبق پڑھایا گیا۔ دونوں اسباق ایک ہی استاد نے پڑھائے۔ اس کام کے لیے دس روز تک تجربات اور مشاہدات کیے گئے۔ دوسرے ہفتے کے آخر میں دونوں گروہوں کو پھر وہی جانچ دی گئی۔ دونوں گروہوں کے ہر دو نتائج کا باہمی تقابلی جائزہ لیا گیا۔ یہ نتائج دو طرفہ سفارشات پیش کر رہے تھے۔ نمبر 1 ''کالا تیتر'' کا انداز ''فضائی آلودگی'' کی نسبت زیادہ مؤثر تھا۔ نمبر 2 ''کالا تیتر'' کے سبقی ڈیزائن میں چند تبدیلیاں ضروری ہیں۔ اسی طرح کئی نظموں اور کہانیوں پر تجربات کیے گئے۔ یہ تجربات دوسرے صوبوں میں بھی دہرائے گئے اور کم و بیش یکساں نتائج حاصل ہوئے۔ ادبی اور لسانی امور کے کئی پہلوؤں پر ایسے تجربات کیے جا سکتے ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ بین الاقوامی سطح اور منصوبے کے تعلیمی تحقیق تجربات تھے اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ اردو ادب سے متعلق تحریر کی مؤثریت کا جائزہ تھے جن کی خوانا پذیری (Readability) کا جائزہ لینے کے لیے ایک خاص جانچ ''کلوز (Cloze) ٹیسٹ'' دی گئی۔ ایسا تجربہ ہر قسم کی تحریر پر انجام دیا جا سکتا ہے۔

4- گروہی ڈیزائن

تجربے کے ڈیزائن کئی طرح کے ہو سکتے ہیں۔ ایس ایم شاہد نے ایسے چند ڈیزائنوں کی تفصیلات دی ہیں، جن کی روشنی میں ادبی تحقیق کے لیے خاکے وضع کیے جاتے ہیں۔

کمزور تجرباتی ڈیزائن

ان کی داخلی درستگی کو درپیش خدشات کنٹرول نہیں ہو پاتے لہٰذا کمزور تجرباتی ڈیزائن کہلاتے ہیں۔ آزاد متغیرے کے ساتھ ساتھ کئی ایک دوسرے عناصر نتائج کو متاثر کر رہے ہوتے ہیں۔ لہٰذا آزاد متغیرے کے اثرات کا اندازہ لگانے میں مشکل پیش آتی ہے۔

مثال کے طور پر ایک تحقیق کار یہ جاننا چاہتا ہے کہ تعریف (Praise) کا اُردو کے تعلم پر کیا اثر ہوتا ہے۔ ایک طالب علم (معمول) کی کارکردگی جو حسنِ قرأت کی مشق کر رہا ہے، پانچ روز تک نوٹ کی جاتی ہے۔ اس کے بعد پانچ روز تک اس کی زبانی حوصلہ افزائی کی مہم اختیار کی جاتی ہے اور ساتھ ہی مشاہدات بھی جاری رہتے ہیں۔ اگلے پانچ روز تک تعریف کا عمل بند کر کے مشاہدات اور پیمائشیں کی جاتی ہیں اور پھر پانچ روز کے لیے تعریف شروع اور مشاہدات بھی شروع کیے جاتے ہیں۔

ایسی ایک تحقیق کے خط پیمائش میں ایک بنیادی پیمائش کا خط واضح نظر آیا جس نے A اور A بنیادی دورانیہ میں استقراری پیمائشوں کو ظاہر کیا جبکہ B اور B تجرباتی دورانیہ میں تجرباتی مواد آزمانے کے دوران میں کارکردگی میں بہتری پیدا ہوئی۔ اس سے متغیرے کی تاثیر کی صاف پہچان ہو جاتی ہے اور کسی بھی غیر عنصر کی مداخلت کا شبہ باقی نہیں رہتا۔

2- کثیر بنیادی ڈیزائن

ایسے ڈیزائن اس وقت استعمال ہوتے ہیں جب تجرباتی مواد کو چھوڑ کر بنیادی پیمائشوں کی طرف واپس آنا ممکن نہ ہو یا کم از کم اصولی نہ رہے۔ اس میں تحقیق کار ایک ہی مجلس میں ایک ہی فرد سے کئی قسم کے حقائق جمع کرتے ہیں جو اس کے ایک ہی وقت میں مختلف رویے ظاہر کرتے ہیں۔ پھر بڑی کاریگری سے اور نظم وضبط سے تحقیق کار مختلف اوقات میں ہر رویے کے لیے تجرباتی مواد آزماتے ہیں۔ اگر ہر دفعہ تجرباتی مواد ملنے سے رویے میں تبدیلی واضح ہو تو تجرباتی مواد کو باعث تبدیلی سمجھا جاتا ہے۔

داخلی درستی کو درپیش خدشات کے امکانات کا جائزہ

تجرباتی تحقیق کو منصوبہ بندی یا نتائج اخذ کرنے میں اہم بات جس کا خیال رکھنا ہوتا ہے وہ داخلی درستی کو درپیش خطرات ہیں۔ اس طرح کے کئی خدشات کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ کسی مخصوص خدشے کے کسی تحقیق میں کتنے اور کس طرح کے امکانات ہوتے ہیں۔ اس کا اندازہ لگانے کے لیے مندرجہ ذیل طریقہ تجویز کیا جاتا ہے:

پہلا مرحلہ

یہ معلوم کیا جائے کہ ذیلی متغیرے کو متاثر کرنے والے عناصر کون کون سے ہیں؟

دوسرا مرحلہ

ان عناصر میں مختلف گروہوں کے تقابل کی کیا صورت ہے؟

تیسرا مرحلہ

اب ان عناصر کی تاثیر معلوم کی جائے اور انھیں کنٹرول یا منضبط کرنے کی تدبیر کی جائے۔ اگر کسی خدشے کا سدباب ممکن نہیں تو اس کا اعتراف کرنا چاہیے۔

ان مراحل کے اطلاق کو سمجھنے کے لیے ایک مثال پر غور کریں۔ فرض کریں کہ ایک تحقیق کار دو مختلف

طریق ہائے تدریس کو اُردو کے طلبہ کی قوتِ متخیلہ پر آزمانا چاہتا ہے۔ تحقیق کار دراصل دو گروہوں کا تقابل کرنا چاہتا ہے۔ گیارھویں جماعت کا ایک گروہ وہ ہے جسے تقریری طریقے سے پڑھایا جائے گا جبکہ دوسرے پر دریافتی طریقہ آزمایا جائے گا۔ اب کئی خدشات کے جو داخلی درستی پر اثر انداز ہو سکتے ہیں، امکانات زیرِ غور لاکر ان کا جائزہ لیا جائے گا۔

انفرادی خصوصیات

اگرچہ کئی انفرادی خصوصیات قوتِ متخیلہ کو متاثر کرتی ہیں تاہم یہاں صرف دو کا تذکرہ کیا جائے گا، ابتدائی ناقص قوتِ متخیلہ اور جنس۔

متغیرہ الف:

مرحلہ نمبر 1: تجرباتی مواد کی جانچ کے بعد ناقص قوتِ متخیلہ دونوں گروہوں کے طلبہ کی ابتدائی ناقص قوتِ متخیلہ سے مماثل ہے۔

مرحلہ 2: اگر گروہوں کا انتخاب اتفاقی طریقے سے نہ ہو تو بہت مختلف ہو سکتے ہیں۔

مرحلہ 3: لہٰذا یہ خدشہ اگر کنٹرول کیا جائے تو داخلی درستی کو متاثر کر سکتا ہے۔

متغیرہ ب:

مرحلہ نمبر 1: تجرباتی مواد کی جانچ کے بعد کے ناقص قوتِ متخیلہ کا تعلق جنس سے ہو سکتا ہے۔

مرحلہ نمبر 2: اگر گروہوں میں جنس کا فرق نمایاں ہے تو خدشے کے امکانات ہیں۔

مرحلہ نمبر 3: اس خدشے کی تاثیر کے امکانات کم ہیں۔

الف۔ فنا (Mortality)

مرحلہ نمبر 1: ناقص قوتِ متخیلہ کی پیمائش کے ہر مرحلے پر فنا کی پیمائش کو متاثر کرنے کے امکانات موجود ہیں۔

مرحلہ نمبر 2: عین ممکن ہے کہ گروہوں کی تعداد میں فرق نہ آئے۔ تاہم اس کی تصدیق ہونی چاہیے۔

مرحلہ نمبر 3: تاثیر کے امکانات معتدل ہیں۔

ب۔ محلِ وقوع (Location)

مرحلہ نمبر 1: اگر دونوں گروہوں کے تجرباتی مواد آزمانے کی جگہ یا حقائق جمع کرنے کی جگہ مختلف ہیں تو یہ مابعد تجرباتی سکور کو متاثر کر سکتی ہے۔

مرحلہ نمبر 2: گروہ مختلف ہو جائیں گے، اگر ان کے تجربہ کا محلِ وقوع مختلف ہے حتیٰ کہ ایسے حالات نہ پیدا کر لیے جائیں کہ محلِ وقوع میں مشابہت ہو جائے۔

مرحلہ نمبر 3: امکانات معتدل سے اعلیٰ کی طرف رہیں گے۔

ج۔ آلات کاری (Instrumentation)

(i) آلات کی بوسیدگی (Instrument Decay)

مرحلہ نمبر 1: نتائج کو متاثر کر سکتی ہے۔

مرحلہ نمبر 2: گروہوں کے لیے اختلاف پیدا کر سکتی ہے۔ بہر حال یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہونا چاہیے۔ بشرطیکہ تمام آلات کا بغور معائنہ کر لیا جائے اور قبل از وقت آلات درست کر لیے جائیں۔

مرحلہ نمبر 3: تاثیر کے امکانات کم ہیں۔

(ii) کوائف جمع کار (Data Collector)

مرحلہ نمبر 1: ناقص قوت متخیلہ کی جانچ میں سکور کو متاثر کر سکتا ہے۔

مرحلہ نمبر 2: اگر تمام گروہوں کے لیے ایک ہی آدمی مقرر نہ ہوا تو اختلاف آ جائے گا۔

مرحلہ نمبر 3: تاثیر کے امکانات معتدل ہیں۔

(iii) کوائف جمع کار کا تعصب (Bias)

مرحلہ نمبر 1: ناقص قوت متخیلہ کی جانچ میں یقیناً سکور کو متاثر کر سکتا ہے۔

مرحلہ نمبر 2: گروہوں کے لیے اختلاف پیدا ہو جائے گا، اگر مخصوص تربیت کے ساتھ اس سے خفیہ نہ رکھا گیا ہو کہ کس گروہ کو کونسا تجرباتی مواد مل رہا ہے۔

مرحلہ نمبر 3: تاثیر کے امکانات اگر کنٹرول نہ ہو سکیں تو بہت زیادہ ہیں۔

د۔ جانچ (Testing)

مرحلہ نمبر 1: اس تجربے میں پیشگی جانچ آخری جانچ کے نتائج کو متاثر کر سکتی ہے۔

مرحلہ نمبر 2: غالب امکان یہ ہے کہ پیشگی جانچ دونوں گروہوں کو ایک جیسا متاثر کرے گی اور اس کا طریقہ تدریس سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔

مرحلہ نمبر 3: اگر کنٹرول نہ ہو سکا تو تاثیر کے امکانات کم ہیں۔

ر۔ سابقات (History)

مرحلہ نمبر 1: قوت متخیلہ کو متاثر کرنے والے خارجی واقعات کی نشاندہی تو مشکل ہے۔ تاہم ان میں اس طرح کی اشیا شامل ہو سکتی ہیں مثلاً تخیل پر مبنی ٹی وی سلسلے یا ادبی سرگرمیوں میں شمولیت۔

مرحلہ نمبر 2: اکثر اوقات یہ واقعات دونوں گروہوں کو مساویانہ متاثر کرتے ہیں لہٰذا خطرے کی کوئی بات نہیں رہتی۔ بہر حال اس طرح کے واقعات کا نوٹس لینا چاہیے اور ممکنہ درجے کا بھی اندازہ کرنا چاہیے۔

س۔ پختگی (Maturation)

مرحلہ نمبر 1: چونکہ قوت متخیلہ انفرادی نمو سے گہرا تعلق رکھتی ہے لہٰذا یہ عنصر بھی نتائج کو متاثر کر سکتا ہے۔

مرحلہ نمبر 2: یہ فرض کرتے ہوئے کہ اساتذہ ہر طریقہ ایک وقت استعمال کر رہے ہیں، اس صورت میں پختگی یا بلوغت کا خطرہ ختم ہو جاتا ہے۔

مرحلہ نمبر 3: اگر کنٹرول یا انضباط نہ ہو سکا تو کم تاثیر ممکن ہے۔

ص۔ رویہ جاتی اثرات (Attitudinal Effects)

مرحلہ نمبر 1: آخری جانچ کے سکور کو متاثر کر سکتا ہے۔

مرحلہ نمبر 2: اگر کسی بھی گروہ کے افراد کو پتا چل گیا کہ ان کے ساتھ کوئی خصوصی سلوک ہو رہا ہے تو یہ خطرے کی بات ہو سکتی ہے۔ لہٰذا تجرباتی مواد کو عجیب و غریب انداز میں نہ آزمایا جائے۔

مرحلہ نمبر 3: تاثیر کے امکانات کم سے معتدل کی طرف موجود ہیں اگر کنٹرول یا انضباط کا اہتمام نہ ہوا۔

ط۔ رجعت (Regression)

مرحلہ نمبر 1: آخری جانچ کے سکور کو متاثر کرنے کے امکانات کم ہیں۔

مرحلہ نمبر 2: گروہی اختلاف کے امکانات کم ہیں۔

مرحلہ نمبر 3: تاثیر کے امکانات کم ہیں۔

ع۔ نفاذ

مرحلہ نمبر 1: استاد کی صلاحیت تجرباتی مواد کی جانچ کے بعد کے سکور کو متاثر کر سکتی ہے۔

مرحلہ نمبر 2: چونکہ ہر گروہ کو مختلف استاد پڑھا رہا ہے لہٰذا نفاذ میں فرق آ جائے گا۔ اساتذہ کو مناسب ہدایات و تربیت دینے سے یا ایک طریقہ کے لیے کئی اساتذہ منتخب کرنے سے مسئلے پر قابو پایا جا سکتا ہے۔

مرحلہ نمبر 3: اگر قابو نہ پایا گیا تو تاثیر کے امکانات بہت زیادہ ہیں۔

لب لباب یہ کہ داخلی درستی کو درپیش خطرات کی شناخت کے لیے پہلے مختلف متغیرات پر غور کرنا ہوگا۔ پھر تجربی واردات اور شہادت (Experience & Evidence) سے یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ آیا یہ چیزیں گروہوں کے تقابل پر اثر انداز ہو رہی ہیں۔ اگر ایسا ہو تو نتائج کی متبادل تشریح ممکن ہے اور خطرہ موجود ہے اور اس کے اثرات کم کرنے کے لیے کچھ کرنا ہوگا۔

تجرباتی مواد کا کنٹرول

یہاں بیان کیے گئے تمام تحقیقی خاکوں کا مقصد داخلی درستی کو بہتر بنانا ہے۔ ان سب کے اپنے فوائد و نقصانات ہیں اور ہر ایک خاکہ چند مخصوص خطرات کے سد باب میں معاون ہوتا ہے جبکہ بعض خطرات

کنٹرول نہیں ہو پاتے۔

مثالی صورت حال میں تو تحقیق کار کو تجرباتی مواد کے اجزاء اور جزئیات تک کا علم ہوتا ہے جبکہ عملاً اکثر تجرباتی مواد اتنے پیچیدہ ہوتے ہیں کہ ان کی جزئیات کا ٹھیک سے بیان مشکل کام ہے۔

اب مذکورہ مثال پر غور کریں جس میں دریافتی اور تقریری طریقے کی پرکھ کی گئی تھی۔ اس میں نافذہ عامل (Implementer) کی صفات کی ٹھیک ٹھیک نشاندہی نہیں ہو پاتی۔ اب جبکہ مثالی عامل مل جائے اور طریق کار متعین ہو جائے، پھر بھی اس بات کی پوری تسلی نہیں ہوتی کہ طریقہ کا نفاذ مثالی طور پر انجام پایا ہے۔ یہ مسئلہ مذکورہ بالا تمام خاکوں میں آڑے آتا ہے۔ اس معاملے کو زیرِ غور لاتے وقت بہت سی باتوں سے درگزر کرنا پڑتا ہے۔

6- تجرباتی تحقیق کے مراحل

-1 سب سے پہلے تجربے کے لیے مواد تیار کیا جائے گا۔ فرض کریں کہ ایک تجربے میں چھٹی جماعت کے بچوں کو اُردو میں علامہ اقبال پر ایک سبق پڑھانا مقصود ہے تاکہ جانچا جا سکے کہ علامہ اقبال کی نظم اس درجے یا پھر تدریس کے لیے موزوں ہے یا نہیں؟ لہٰذا ایک نیا سبق لکھ کر تیار کیا جائے گا۔ اس کے لیے ایک پیشگی جانچ (Pretest) کی ضرورت ہوگی۔ یہ ایک سوال نامہ ہوگا جس سے معلوم کیا جائے گا کہ بچے اردو زبان کے بارے میں پہلے سے کیا جانتے ہیں۔ ایک آخری جانچ (Posttest) تیار کی جائے گی۔ یہ دوسرا سوال نامہ ہوگا، جس سے یہ دیکھنا مقصود ہوگا کہ بچوں نے پڑھائے جانے والے سبق سے کیا سیکھا اور ان کی معلومات میں کتنا اضافہ ہوا۔ بعض اوقات دونوں جانچوں کا سوالنامہ ایک ہی ہوتا ہے تاکہ اسی پر دونوں مرحلوں کی پیمائش کی جا سکے۔

-2 ایک تجربہ گاہ تیار کی جائے گی، جس میں دو گروہ بنائے جائیں گے۔ ایک کنٹرول گروہ کو اسی موضوع پر پرانا سبق اور دوسرے تجرباتی گروہ کو نیا سبق پڑھایا جائے گا۔

اب ایک یا دو ہفتے جو عرصہ بھی اس کام کے لیے مقرر ہے اس کے بعد دونوں گروہوں کو آخری جانچ کر دی جائے گی اور ان نتائج کا موازنہ پیشگی جانچ کے ساتھ کیا جائے گا اور یوں کسی نتیجے پر پہنچا جائے گا۔

بنیادی تصورات

مندرجہ بالا تفصیلات اور تجربے کی مثال کی روشنی میں یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تجرباتی تحقیق کے بنیادی تصورات مندرجہ ذیل ہیں:

-1 مصنوعی ماحول کی تیاری اور ماحول پر کنٹرول

-2 متغیرات پر کنٹرول

-3 متغیرات میں تبدل (Manipulation)

-4 اثر کی علیحدگی

5- متوازن گروہ
6- غیر متعلقہ متغیرات کی یکسانیت
7- گہرا مشاہدہ

7- میدانی (Field) تجربہ

میدانی تجربے کا طریقہ بھی اُردو اور پاکستانی زبانوں میں حسبِ مقاصد استعمال کیا جاسکتا ہے اور کیا جاتا ہے۔ تجربہ گاہ میں کی جانے والی تحقیق میں تمام متغیرات تحقیق کار کے کنٹرول میں ہوتے ہیں اور وہ ان میں سے کچھ کو اپنی ضرورت کے مطابق تبدیل بھی کرسکتا ہے۔ اس کے علاوہ تجربہ گاہ میں حالات مصنوعی ہوتے ہیں یعنی تحقیق کرنے والا انھیں تجربہ گاہ میں مصنوعی طور پر تیار یا پیدا کرتا ہے۔ اس کے برعکس میدانی تجربے میں ماحول بڑی حد تک قدرتی ہوتا ہے اور تمام متغیرات پر تحقیق کار کا کنٹرول نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر نثار احمد زبیری نے ابلاغیات سے متعلق ایک مثال دی ہے کہ اگر تحقیق کار یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ ایک پریشان کرنے والی خبر عام لوگوں پر کس طرح اثر انداز ہوتی ہے تو وہ اس نوع کی ایک خبر اخبار میں شائع کراتا ہے اور پھر قدرتی ماحول میں مطالعہ کرتا ہے کہ لوگوں پر اس کے کیا اثرات ہوتے ہیں۔ لوگ عام طور پر اس خبر کو پڑھ کر کوئی ردِعمل ظاہر کرتے ہیں؟ یا نہیں؟ اگر ردِعمل ظاہر کرتے ہیں تو زیادہ لوگ کیا کرتے ہیں کیا وہ محض آپس میں تبصرہ کرکے بیٹھ جاتے ہیں یا اپنے لیڈروں کا رخ کرتے ہیں، یا اخبار کے دفتر فون کرکے مزید تفصیلات معلوم کرنے کی سعی کرتے ہیں؟ کیا ان کا ردِعمل جلوس اور جلسے وغیرہ کی شکل اختیار کرتا ہے؟ گویا ایسا ممکن ہے کہ ردِعمل پیدا کرنے والی خبر تو مصنوعی ہو اور اس پر ردِعمل کا مطالعہ قدرتی و حقیقی طور پر کیا جائے۔

ادبی و لسانی علوم میں میدانی تجربات بڑے پیمانے پر ممکن ہیں۔ چنانچہ کسی حد تک مصنوعی مہیجات (Stimuli) کے ذریعے یہ مطالعہ کیا جاسکتا ہے کہ لوگ کسی معاملے میں اتفاق رائے کس طرح حاصل کرتے ہیں، دوسری زبانوں کے مطالعے کا فیصلہ کس طرح کرتے ہیں، ادبی کتابوں پر دوسری کتابوں کی نسبت خریداری کے ضمن میں کیا ردِعمل ظاہر کرتے ہیں وغیرہ۔ عام طور پر اس طرح کی تحقیق مشاہدہ کرنے والوں کی متعدد جماعتوں کی مدد سے مکمل کی جاتی ہے اور طریق کار میں مشاہدے کے منصوبے کو تمام تر تفصیلات کے ساتھ درج کیا جاتا ہے اور کوشش کی جاتی ہے کہ مختلف جماعتوں کا مشاہدہ ایک طے شدہ نمونے کے تابع ہو۔ طریق کار کا اہم پہلو یہ ہے کہ زیرِ تجربہ متغیرے کے ذریعے سے ایک خاص صورت حال پیدا کی جائے اور اثرات کا مشاہدہ قدرتی ماحول میں کیا جائے۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس میں صرف حال اور مستقبل سے متعلق موضوعات پر تجربی تحقیق کی جاسکتی ہے، ماضی تجربہ گاہ کی حدود سے باہر ہے لیکن اگر ہم میدانی تقابلی صورت حال کو ملحوظ رکھیں تو بہت حد تک ماضی کو بھی تجربہ گاہ میں لایا جاسکتا ہے۔ اس صورت میں کچھ تحقیق دستاویزی طور پر انجام دی جائے گی، کچھ بیانیہ سروے اور انٹرویو اور کچھ تجربہ بھی انجام دیا جاسکتا ہے۔ مثلاً ایک بار پشاور یونیورسٹی کی ایک محفل میں راقم سے غالب اور اقبال کے بارے میں رائے پوچھی گئی تو جواب یہ تھا کہ "غالب مرچکا ہے اور اقبال زندہ ہے" یہ

ایک موضوعی رائے تھی۔اب اسے جانچنے کا ایک طریقہ تو دستاویزی یا تاریخی جائزے کا ہے جس میں پہلے سے مطبوعہ آراء (عمومی یا تنقیدی) جمع کی جائیں۔ان کی روشنی میں حال کا سروے کیا جائے اور اس سروے کو مزید جانچا جائے۔یوں اسے تجرباتی رائے بنایا جاسکتا ہے تبھی اس کے حق یا مخالفت میں فیصلہ دیا جاسکے گا۔اس کے لیے ایک جائزہ لیں۔ادیبوں، شاعروں، نقادوں، استادوں (اردو اور دوسرے مضامین کے)، طلبہ (اردو اور دوسرے مضامین کے)، عام قارئین (مختلف طبقوں، جنسوں سے) وغیرہ سے سروے کریں۔جماعتوں میں تحریری پرچہ دے کر غالب اور اقبال پر سوالات، اشعار، مصرعے مکمل کراکے آراء جمع کی جاسکتی ہیں۔اسی طرح اگر موضوع یہ ہو کہ غالب اقبال سے زیادہ قابل قبول شاعر ہیں تو اس کے تین تحقیقی طریقے حسب ذیل ہوسکتے ہیں:

1- تاریخی مواد کا جائزہ لینا کہ غالب اور اقبال کی قبولیت کیسی رہی؟ (تحدید اگر پاکستان تک رکھی جائے)۔

2- انٹرویو اور سروے کیے جائیں کہ ویسے ہی قارئین جو ماضی میں میسر رہے، اب ان دونوں کو کس طرح سے قبول کرتے ہیں؟ (قبولیت کے پیمانے/آلات وضع کیے جائیں گے)۔

3- ایک جیسے قارئین کے دو گروہ بنائے جائیں گے، ایک گروہ کو غالب اور دوسرے کو اقبال کا مطالعہ کرایا جائے گا اور قبولیت کے پیمانوں پر جانچ کر کوئی فیصلہ کیا جائے گا کہ قبولیت کہاں تک واقع ہوئی۔

لسانی علوم میں صوتی اثرات، خاص آوازوں کی ادائیگی، تذکیر و تانیث کا مسئلہ، بول چال کا فرق، ترجمہ کاری پر مادری زبان کا اثر، مادری زبان میں تعلق، آسان مشکل الفاظ کا معاملہ جیسے کئی موضوعات ہیں جن پر تجرباتی ڈیزائن وضع ہوسکتا ہے۔شرط صرف اس میدان میں آگے بڑھنے کی ہے۔یہ شرط جامعات میں زبانوں کے درسی شعبے ہی پوری کرسکتے ہیں لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ ان شعبوں کے اساتذہ خود بھی ایسے طریقوں سے کما حقہٗ واقفیت حاصل کریں۔ادبی مطالعے کے لیے مشاہداتی اور تجرباتی تحقیق کو تحقیر کی نظر سے نہ دیکھیں۔خود تجربات کریں، پھر طلبہ کو ان تجربات میں شریک کریں۔

آٹھواں باب

اُردو اطلاعیات اور برقیاتی تحقیق

اطلاعیات معلومات کے حوالے سے کمپیوٹر کے عملی استعمال کا نام ہے جو عبارات اور معلومات کے حصول، تجزیے اور استعمال سے متعلق ہے۔ کمپیوٹر پر کمپوزکاری یا لفظ کاری سے لے کر ای میل، انٹرنیٹ/ ویب سائٹ کے قیام اور استعمال، کتابیات، لغات اور الفاظ اور متون کے کوائفیہ (Database) وغیرہ کے اُردو میں استعمال ہی کو اُردو اطلاعیات سمجھ لیا گیا۔ جبکہ یہ معاملات اس سے کہیں وسیع تر ہیں۔ خاص طور پر اُردو کی ادبی برقیاتی تحقیق (e-research) میں ابھی اسے بہت سے در وا کرنے ہیں۔ مثلاً:

1- اُردو میں ادبی تحقیق کو برقیاتی ذرائع سے انجام دینا۔ اس میں متون کا برقیاتی یا کمپیوٹری تجزیہ اور اعداد و شمار یا کوائف کی جدولیں اور تجزیہ شامل ہیں، جن سے تحقیق کار کی برسوں کی محنت لمحوں میں بدل جائے گی۔

2- تحقیقی مقالہ جات کی کمپیوٹری پر تیاری۔

3- تحقیقی رپورٹوں/ مقالوں کی ویب سائٹ کا قیام اور اشاعت کے لیے کمپیوٹر کے ذریعے ترسیل۔ یہ تمام امور اُردو کی ادبی تحقیق کو کمپیوٹری مدد دینے کا آغاز کرتے ہیں۔

1- اُردو اطلاعیات

اُردو اطلاعیات ایک نیا مضمون ہے۔ یہ اصطلاح 1998ء میں وضع ہوئی تھی اور مقتدرہ قومی زبان میں 1999ء میں اس نام سے ایک شعبہ قائم ہوا۔ اس شعبے نے اُردو کے کمپیوٹر پر استعمال کے سلسلے میں معیار بندی کا کام انجام دیا۔ اُردو کلیدی تختہ اور کمپیوٹری کوڈ پلیٹ، آئی ایس او (ISO)، یونی کوڈ (UNICODE) جیسے عالمی اداروں میں اُردو کے معیارات کا اندراج وغیرہ۔ بعد ازاں 2003ء سے مائیکروسافٹ کے ونڈوز، آفس جیسے سافٹ ویر اُردو میں منتقل کیے اور 2004ء تک مرکزِ فضیلت برائے اُردو اطلاعیات کا منصوبہ شروع ہوا جسے 2006ء میں نظرِ ثانی کے بعد توسیع دی گئی۔ انسٹی ٹیوٹ برائے اُردو اطلاعیات کی بنیاد رکھنا اس کا رخِ نظر تھا۔

ان کاموں کے لیے اُردو کے بنیادی متون (نظم و نثر) وغیرہ کا ڈیٹا بیس یا کوائفیہ بنانا بنیادی شرط ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ تحقیقی مواد مثلاً بنیادی حوالے یا مصادر کو برقیاتی صورت میں محفوظ کرنا اہم ہے۔ نیز تحقیق کے لیے مختلف تلاش انجن (Search Engine) تیار کرنا ہوں گے۔ ان کی مدد سے مواد حاصل کیا

جائے گا یا کوائف ڈال کر ان کا تجزیہ کیا جائے گا یا کوئی رپورٹ تیار کی جائے گی، جیسے مخطوطہ شناسی، SPSS، برقیاتی تحقیق (e-Research)، قرطاسِ اُسلوب یا رہنمائے طرز (Style Guide)، کتابیات سازی اور اشاریہ بندی کے سافٹ ویئر وغیرہ۔

کمپیوٹر یا اطلاعیات کی دنیا میں ادبی تحقیق کی پورے طور پر کایا کلپ کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ مخطوطہ شناسی کے کئی سافٹ ویئر انگریزی میں زیرِ استعمال ہیں، خاص طور پر کینٹر بری ٹیلو پراجیکٹ۔ ایسے ہی سافٹ ویئر اُردو کے لیے بھی تیار کیے جائیں گے۔ اُردو کے ہر دور میں لفظیات کا کوائف گھر (Data House) تیار ہو جو یہ بتا سکے کہ فلاں لفظ فلاں دور سے پہلے استعمال میں نہیں تھا۔ اس کے ذریعے سے جیسے ہی کسی مخطوطے کو پڑھ کر برقیاتی متن میں ڈھالا جائے گا، اس کا سافٹ ویئر اس کے مختلف تجزیے کر کے رپورٹ مرتب کر دے گا۔

فی الوقت ایم اے/ ایم فل کی سطح پر مختلف اشاریہ جاتی اور کتابیاتی مواد، ذخیرۂ الفاظ اور لفظی فہرستیں یعنی کارپس (Corpus) کمپیوٹر پر تیار کرانے کے تحقیقی منصوبے بنائے جا سکتے ہیں۔ یہ منصوبے برقیاتی اور کاغذی دونوں صورتوں میں ڈگری کے لیے پیش کیے جا سکیں اور ان کا مقصد مستقبل کے تحقیق کار کے لیے بنیادی مواد برقیاتی صورت میں مہیا کرنا ہو۔ یہ مواد کچھ یوں ہو سکتا ہے:

1- ہر موضوع پر کتابوں، مضامین اور مقالات کی فہرستیں (اُردو، عربی، فارسی اور پاکستانی زبانوں میں)۔
2- ہر موضوع پر اقوال، مصرعے اور اشعار کا الگ الگ ذخیرہ۔
3- شخصیات، مقالات اور اداروں کے بارے میں کوائف۔
4- مختلف ادبی اصناف کے بارے میں معلومات۔
5- رسالوں/ اخباروں کے اشاریے مع اقتباسات۔
6- مختلف نوعیتوں کی لفظیات کے ذخیرے (عہد وار، موضوع وار، علاقہ وار، صنف وار وغیرہ)۔
7- تحقیقی مقالات کے کوائف (ادارے، جامعہ، موضوع، تحقیق کار اور نگران وغیرہ کے حوالے سے)۔
8- لسانیات، ثقافت اور عمرانیات کے حوالے سے ادبی تحقیقات کے نتائج اور حاصلات۔
9- مختلف ثقافتوں کے بارے میں اہم معلومات (مثلاً لکھنؤ کا پس منظر، دہلی میں مغل سلاطین کا دور، لاہور کے قدیم رنگ، سندھ کی قدیم تہذیب، پنجابی ثقافت وغیرہ)۔
10- گوگل اُردو اور وکی پیڈیا اُردو جیسے تلاش انجنوں اور کوائفیوں/ ویب سائٹوں پر اُردو کے مضامین میں اضافہ۔
11- نئے تلاش انجن اور ویب سائٹوں کی تیاری۔ (اُردو کے حوالے سے)

-12 اُردو اور دیگر زبانوں کے کمپیوٹری قواعد کی تیاری اور تقابلی جدولیں، تذکیر و تانیث کی صورتیں اور امکانات، افعال اور مصادر کا تقابل، واحد جمع کے انداز، املے کے مقامات، سابقے اور لاحقے، جملوں کی ساخت، معروف (Active) اور مجہول (Passive) جملوں کا دوسری زبانوں سے موازنہ، سادہ جملے اور مرکب جملے کی تقطیع، جملوں کی تبدیلی کے اُصول، صوت و حرف کا تغیر، اصطلاح سازی کے امکانات اور اصول وغیرہ، یعنی کمپیوٹری لسانیات۔

-13 اہم ادبی/کلاسیکی ادبی متون کی برقیاتی تشکیل (اشاریوں، حوالوں، حواشی کے ہمراہ)، قابلِ تحقیق کو انفیہ کی تشکیل کے ساتھ۔

-14 آن لائن برقیاتی کتب خانوں/ای لائبریری کا قیام۔

-15 تحقیقی اسالیب (Research styles) پر معیاری سافٹ ویئر کی تیاری کے لیے بنیادی دستاویزات سازی۔

اکیسویں صدی کے اُردو کے اساتذہ کا اب یہ فرض بنتا ہے کہ وہ صرف خود اس نئی ٹکنالوجی کو سمجھیں بلکہ طلبہ میں بھی نئی برقیاتی ثقافت کا شعور اجاگر کریں اور جو کام طلبہ پہلے مہینوں اور برسوں میں کرتے تھے، انھیں اس کی مدد سے لمحوں اور ثانیوں میں بدلنے کی کوشش کریں۔ اُردو کی دنیا میں یہ ایک نئی چوھدی یا حیطہ (Paradigm) وضع ہو رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے جہاں تحقیق کے انداز بدلیں گے، وہیں تحقیق کی سوچ بھی بدلے گی۔ بہت سے جدید مصنفین نے کہا ہے کہ کمپیوٹر کے استعمال سے تحقیق مقامی سے عالمی سطح کا رخ کرے گی اور یوں اس کے نتیجے میں زیادہ سے زیادہ ذہانت کے ساتھ ساتھ کڑے سے کڑے معیار کی تحقیق انجام دینے کی عادت پیدا ہوگی۔ ہر تحقیق ماقبل اور مابعد معیاری نتائج کی حامل ہوگی اور بہتر معاصر جائزے (Peer Review) کے لیے تیار رہے گی۔ اس سے اُردو کی تدریس بھی بہتر ہو سکے گی اور تحقیق کو بھی وثوق حاصل ہوگا۔

برقیاتی تحقیق کے ذریعے سے اُردو کے مقالے حجم میں مختصر، نکات دار اور نتیجہ خیز ہو جائیں گے۔ ہر عمر، جنس، نسل، طبقے، درجے، سطح، موضوع اور صنف کے لحاظ سے مختلف انداز میں تحقیق انجام دی جا سکے گی اور تحقیق کا زور طریقِ کار، حاصلات اور نتائج پر ہوگا نہ کہ عبارت آرائی پر۔

معیاراتی تحقیق (Oualitative Research) مابعد اثباتیت (Post-Positivism)، موضوعیت (Subjectivity) کا شکار ہوتی ہے اور مقداریاتی تحقیق (Quantitative Research) تجربات، کوائف واعداد و شمار، تجزیات اور معروضیت (Objectivity) وغیرہ پر منحصر ہوتی ہے۔ کمپیوٹر دونوں اقسام کی بہتری میں مدد دے سکتا ہے۔ دونوں ہی کے لیے معیار وضع ہو سکتے ہیں اور یوں دونوں ہی کا جواز اور اعتبار قائم کیا جا سکتا ہے۔ انٹرویو، مشاہدے، مطالعے اور ریکارڈنگ وغیرہ کے ذریعے سے حاصل شدہ کوائف کو متعدد پہلوؤں سے برقیاتی صورت میں تجزیے کے لیے پیش کیا جا سکتا ہے۔ حتیٰ کہ تحقیق کار کے اپنے

رجحانات اور تعصبات کے متغیرے کو بھی کنٹرول کیا جا سکتا ہے۔ اس کے سوالات کی اغلاط کو اعداد و شمار کے تقابلی تجزیے میں حائل رکاوٹوں کے تجزیے سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ SPSS کا سافٹ ویئر اسی قسم کے سروے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

برقیاتی اور اطلاعیاتی حوالوں سے وجود میں آنے والی تحقیق نظری، بیانیہ، تشریحی، تجزیاتی اور دریافتی انداز میں انجام دی جا سکتی ہے۔ شرط صرف اُردو کو اس دھارے میں شامل کرنے کی ہے، جو لسانی اور عمرانی تحقیق کے حوالے سے دنیا بھر میں سائنٹفک انداز سے کمپیوٹر دنیا میں جاری ہے۔

برقیاتی دور کو کتابوں کے "بول اٹھنے" سے بھی تشبیہ دی جاتی ہے۔ اُردو کے حوالے سے بھی یہ بات درست ہے۔ بہت جلد برقیاتی لسانیات کا دور آنے والا ہے۔ شرط یہ ہے کہ ادبی تحقیق اپنا ثقافتی پہلو سامنے لائے جو ادبی تحقیق کا بھی مستقبل ہے۔ اُردو کے اساتذہ کو اپنا نقطہ نظر اس حوالے سے بدلنے کی ضرورت ہے۔

اُردو کے شعبوں کو اُردو اطلاعیات اور ادبی تحقیق کے حوالے سے اُردو تحقیق کاروں کے تین نسلی پروگرام پر عمل کرنا ہوگا۔ پہلی نسل برقیاتی معلومات اور کوائف کے ذخیرے تیار کرے گی۔ دوسری نسل تحقیق کے برقیاتی آلات تیار کروائے گی اور تیسری نسل کہیں جا کر مختلف موضوعات پر ادبی تحقیق کو برقیاتی حوالوں اور طریقوں سے انجام دے سکے گی۔ اُردو کے اساتذہ کو تحقیقی منصوبے انھی حوالوں سے تیار کرانا ہوں گے۔ یہ سارا کام ایک عشرے سے زیادہ مدت نہیں لے گا۔ صرف پہلے دو مرحلے چار چار، پانچ پانچ برس کے ہیں۔ ان کے بعد تیسرا مرحلہ شروع ہو جاتا ہے، جو برقیاتی تحقیق کا مقصود ہے۔

2- ہم کیا چاہتے ہیں؟

برقیاتی تحقیق کا ایک اہم سوال یہ ہے: "ہم کیا چاہتے ہیں؟"۔ اطلاعیات کے حوالے سے اُردو کے ہر تحقیقی منصوبے کو سب سے پہلے اس سوال کا جواب مہیا کرنا ہے۔ یعنی تحقیق کا مقصد واضح کرنا ہے۔ یہ وضاحت معروضی طور پر کی جائے گی۔

زبانوں میں کمپیوٹر کے استعمال کی تاریخ 1968ء سے شروع ہوتی ہے جب ڈیوڈ پیکارڈ (Packard) نے ہارورڈ سائنس سنٹر کے لیے پہلے ایسے تحقیقی آلات تیار کیے جو مخطوطہ شناسی کے لیے کارآمد تھے۔ اس کے فوراً بعد تین بنیادی منصوبے وجود میں آئے:

1- TLG کی کلاسیکی یونانی ادب کی برقیاتی لائبریری (1972ء) تیار کی، پھر انھی نے (بیسویں صدی کے اختتام تک) اسے بازنطینی/رومی دور تک وسیع کیا۔

2- 70ء کی دہائی میں پیکارڈ نے TLG اور دیگر ایسے ذخائر کے لیے ایسا لفظ کاری کا نظام IBYCUS وضع کیا جو تحقیق کی ضروریات پوری کرتا ہے۔ انتہائی مہنگا ہونے کے باوجود HP کا یہ سافٹ ویئر بارہ سے زیادہ یونیورسٹیوں نے خریدا۔

3- اب TLG کی ویب سائٹ پر بیسیوں نئے سافٹ ویئر موجود ہیں جو یونانی کے علاوہ لاطینی اور

انگریزی کے لیے بھی مفید ہیں۔

مئی 2006ء سے نمونے کی تحقیق (Sample Research) کے حوالے سے بہت سے کوائف وجود میں آ چکے ہیں۔ مرکزِ فضیلت برائے اُردو اطلاعیات (مقتدرہ قومی زبان) میں بھی ایسے ایک کوائفیے کی داغ بیل ڈالی گئی تھی۔ کچھ کوائف فاسٹ یونیورسٹی لاہور اور اُردو لغت بورڈ کراچی نے بھی آن لائن کیے۔ کئی اور جامعات اور ادارے بھی اس پر عمل پیرا ہیں۔ اُردو بازار، اُردو لائبریری اور کئی اور ناموں سے کوائف گھر سیٹ پر موجود ہیں۔ انگریزی میں APEDEC یا APODEIC قسم کے سافٹ ویئر لفظ، فعل، مصدر وغیرہ کے مشتقات کو پیش کر سکتے ہیں۔ اُردو اطلاعیات کو ابھی پرانے طباعتی ثقافت (Print Culture) کے ماحول سے نکلنا ہے۔ سوچ کے تمام نمونے ابھی اسی انداز کے ہیں جو طباعتی دور میں پائے جاتے تھے جبکہ مرکزِ فضیلت برائے اُردو اطلاعیات نے "خیال سے لفظ..... تک کے سفر" کو بھی بنیاد ٹھہرایا اور یہ ایک نئی راہ تھی۔

ٹکنالوجی ہر روز بدل رہی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ تقریباً دو ہی سال بعد ایک نئی ٹکنالوجی سامنے آ جاتی ہے۔ اُردو اطلاعیات کو اسی حوالے سے تیز تر ہونا ہوگا۔ مثلاً مشین پر پڑھے جانے والے مواد/سکینگ/لفظ کاری کی مقدار میں اضافہ کرنا، قاموس اور انسائیکلوپیڈیا، مقامات، افراد اور موضوعات کے حوالے سے کوائف میں وسعت ہونی چاہیے، جیسے وکی پیڈیا (Wikipedia) ہے۔ اس میں دس لاکھ مضامین ہیں۔ اس کا اُردو ایڈیشن بھی آ چکا ہے لیکن اس میں مقالات کی تعداد چند سو سے زیادہ نہیں۔ اس کے لیے گوگل (Google) کا اُردو سرچ انجن بھی موجود ہے۔ OWL (ویب انٹالوجی لینگویج) جیسے کوائفیے بہت تیزی سے ابھر رہے ہیں۔

اس برقیاتی تحقیق سے ایک نئی ثقافت وجود میں آ رہی اور نئے طریقے اور مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔ اینڈرسن اور کانوکا کی کتاب e-Research:Methods, Strategies and Issues 2002ء میں سامنے آئی ہے جس میں برقیاتی تحقیق کے خاکے/منصوبے/تجویز کا احاطہ کرتی ہے۔ اس میں سب سے اہم بات برقیاتی تحقیق کے مستقبل پر تحریر کردہ باب ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ مستقبل میں جغرافیہ اور زبان خاصی اہمیت رکھتے ہیں (ص ص:203، 204)۔ نیٹ کی رفتار (ص:204)، معلومات اخذ کرنے کے متنوع طریقے (ص:205) اور معیاری قدر (ص:207) بے حد اہم ہیں۔

2007ء میں ایک عالمی برقیاتی تحقیق کانفرنس آسٹریلیا میں منعقد ہوئی جس میں امکانات اور ان کے عالمی اثرات کا جائزہ لیا گیا۔ 2008ء میں تحقیق کی آزادانہ رسائی کے موضوع پر بھی ایک کانفرنس آسٹریلیا ہی میں منعقد ہوئی۔

30 اپریل 2009ء سے ایک اور اہم کتاب سامنے آئی ہے۔ یہ ہے نکولس ڈبلیو جان کوونسکی (Jankowski) کی کتاب، e-Research: Transformation in Scholarly Practice۔ اس میں چند معاصر اہلِ علم نے مختلف ابواب تحریر کیے ہیں۔ اس کے مطابق برقیاتی تحقیق اب عمرانی علوم، انسانیات اور ادبیات میں بہت تیزی سے جڑیں پکڑ رہی ہے۔ علمیت اور سکالرشپ کے انداز بدل رہے ہیں۔

روایتی طریقے دم توڑ رہے ہیں۔اس میں وکی پیڈیا کو بھی بطور ماخذ اہمیت دی گئی ہے۔یوں طباعتی ثقافت سے برقیاتی ثقافت (e-culture) کی طرف منتقلی کے لیے اُردو اطلاعیات پرمبنی ادبی برقیاتی تحقیق کو گویا تین مرحلے طے کرنا پڑیں گے:

1- ابتدائی لغات اور متون کی تیاری (اندراجی الفاظ کے ساتھ۔ اشاریہ بندی)۔

2- معنویاتی تجزیہ (اسم خاص کی درجہ بندی،الفاظ کے خواص کا اندراج)۔

3- نئے اور پرانے کا ربط (امتزاج اورافتراق دونوں حوالے سے)۔

ادبی تحقیق کے مندرجہ بالا تینوں پہلو،متن،ترجمے،صرفیات،افراد،مقامات،حوالہ جات،لغات، اصطلاحات،صرف ونحواور خاص حوالہ جاتی مواد (فرہنگیں،آثاریات،واقعات وغیرہ) کو محیط ہوں گے۔

اطلاعیات کی دنیا میں نئے انداز کے ایڈیٹر درکار ہوں گے۔انھیں نئے انداز کی تربیت دینا ہوگی۔ انھیں الگورزم (Algorithm) سے آگاہی درکار ہوگی۔اپنے کاموں کے لیے انھیں علمی اساس (Knowledge Base) کمپیوٹر کی سمجھ چاہیے ہوگی۔تھیسارس کی تیاری، اشاریہ بندی، لنکس اور خود کاریت،مصنوعی ذہانت(AI)وغیرہ جیسے شعبوں میں درک اس کی خصوصیت ہوگی۔اُردو کے شعبوں میں اب ان امور کی تدریس بھی ضروری ہے۔اس سے اُردو کی دنیا میں ایک ثقافتی اطلاعیات پیدا ہوگی جو دوسرے متعلق شعبوں کا خاصا بن چکی ہے۔کمپیوٹر کے شعبوں کو بھی اُردو اطلاعیات کے ان پہلوؤں سے تیاری کے لیے اپنے ہاں جگہ دینا ہوگی۔اس سے اُردو تحقیق کے قدیم انداز اور اطلاعیات کے جدید اُردو کے درمیان موجود خلیج پاٹنے میں مدد ملے گی۔اُردو اطلاعیات کا انسٹی ٹیوٹ اس مسئلے کا بہتر حل پیش کرسکتا ہے۔ہمیں اپنے مطالعے اور تحقیق پر از سرِ نو غور وفکر کرنا ہوگا۔اُردو کوائف گھر کو نو کروڑ سے زائد الفاظ،مصرعوں، جملوں اور شعروں کا ذخیرہ جمع کرنا ہے۔اس کے لیے پروگرامنگ درکار ہے۔کوائف کاری چاہیے،منصوبے درکار ہیں اور ان منصوبوں کے لیے رقوم مختص ہونا ہیں۔اس کے لیے کمپیوٹری لسانیات(Computational Linguistics)درکار ہے، جو خودکاریت کی طرف ایک اہم قدم ہے۔یہ سب کچھ انفرادی نہیں بلکہ ادارہ جاتی (Institutionalized) سطح پر ہوسکتا ہے۔بصورت دیگر اُردو اور پاکستانی زبانوں اور اس کی تحقیق کا کوئی مستقبل نہیں۔

نواں باب

ادبی تحقیق کا مستقبل

زمانہ عجب شے ہے۔ تغیر اور تبدیلی اس کا بنیادی عنصر ہے۔ ہر بات کا ایک ماضی، حال اور ایک مستقبل ہوتا ہے۔ ادبی تحقیق بھی اس سفر سے مستثنیٰ نہیں۔ یہ بھی ایک مستقبل رکھتی ہے۔ اس کا ایک ماضی ہے اور اب حال سے گزر رہی ہے۔ اسے ایک مستقبل کا بھی سامنا ہے۔ ادبی تحقیق کے محض مخطوطات، مسودات اور متون کی تدوین اور ادیبوں کے احوال و آثار پر انجام دیے جانے کے بارے میں کئی کتابوں میں تفاصیل درج ہیں۔ یہ اس کا ماضی تھا۔ اب یہ تحقیق دنیا بھر میں ان مرحلوں سے نکل کر جن منازل کی طرف گامزن ہے، وہ ادبی نظریے کی بازیافت سے متعلق ہیں۔ جدید ادبی نظریے پر تحقیق زبان اور ثقافت کے حوالے سے انجام پا رہی ہے۔ اسے سماجی علوم کا ایک حصہ سمجھا جا رہا ہے۔ کم از کم انگریزی ادبیات میں ایسا ہی ہو رہا ہے۔ اُردو میں بھی اس طرف توجہ دی جانے لگی ہے۔ یہ عمل دنیا بھر میں ہو رہا ہے۔

مستقبل کی تحقیق کے کئی پہلو ابھر کر سامنے آ رہے ہیں۔ ایڈورڈ سعید (Edward Saeed) کی کتاب سے رولینڈ بارتھیس (Roland Barthes)، مائیکل فوکالٹ (Michel Foucault)، پال ڈی مین (Paul De Man) اور جیکوئیس ڈریڈا (Jacques Derrida) کی طرح عالمانہ انتقاد وجود میں آیا ہے جو ادبی تحقیق کا مستقبل متعین کر رہا ہے۔ ایڈورڈ سعید ادبیات کے ایک بہت واضح سکالر کی حیثیت سے سامنے آتا ہے۔ وہ ادبی مطالعے کو جمالیات اور متنیت سے کہیں آگے لے جاتا ہے۔ وہ ثقافت، سیاسیات اور تاریخ کو ملحوظ رکھتا ہے۔ اس کے نزدیک اسی سے جدید ادبی تحقیق کی راہیں متعین ہوتی ہیں۔ یعنی ادبی تحقیق تاثراتی اور جمالیاتی یا لسانی سے زیادہ سماجی اثرات کا جائزہ لینے پر مجبور ہوئی ہے۔ چنانچہ لسانیات اور سماجیات اس کا دائرۂ کار یا حیطۂ کار (Paradigm) قرار پاتے ہیں۔

1- لسانی پہلو

یہ بھی ایڈورڈ سعید ہی نے کہا ہے کہ اب علمِ زبان (Philology) کی طرف مراجعت ہو رہی ہے۔ ادھر اُردو تحقیق ابھی لسانیات میں بھی داخل نہیں ہوئی۔ اپنی کتاب کے آخر میں وہ سیاسیات اور ثقافت کے حوالے سے سماجی امور کی تحقیق پر متوجہ ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک متن الفاظ اور بیان پر مشتمل ہوتا ہے جو انسان

تاریخ کے کسی دور میں بطور زبان استعمال کرتے رہے ہیں۔ اس لیے تحقیق کا دائرہ کار زبان اور ثقافت ہیں۔ ادبی تحقیق محض تاثراتی حوالوں سے بھی کہیں زیادہ اب لسانی پہلو کی طرف منتقل ہو رہی ہے اور وہ بھی بقول ایڈورڈ سعید الفاظ اور بیان کو علم زبان کے حوالے سے پہلے بطور تخلیق کار یا مصنف دیکھنا ہے، جن کے نزدیک لکھنا فیصلے کرنے کا کام ہوتا ہے۔ یہ فیصلے ہی جمالیاتی تخلیق کرتے ہیں اور تصوراتی دنیا وجود میں لاتے ہیں۔ گویا وہ اثباتیت کے فلسفے کی تائید کرتا ہے اور تحقیق کو اسی فلسفے کے تحت لاتا ہے۔ یعنی الفاظ کا نہیں مصنف کا مطالعہ کیا جائے گا اور مصنف کی شخصیت کا نہیں اس کے لسانی ادراک کا جائزہ لیا جائے گا۔ اس کی تعلیم و تعلّم اور نفسیاتی رسائیوں اور نارسائیوں کا تجزیہ کیا جائے گا۔

پال ڈی مین نے بھی (1986) **Return to Philology** میں یہی کہا تھا کہ متن کا مطالعہ دراصل بیانیہ ساخت کا مطالعہ کرنا ہے جسے انسانی تجربے یا تاریخ کی روشنی میں دیکھنا چاہیے۔ ڈی مین نے جمالیاتی اقدار اور لسانیاتی ساخت کے مابین تعلق ڈھونڈنے کے لیے کہا تھا۔ اس کے لیے ادبی تحقیق سے کام لیا جاسکتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ادبی تحقیق کاروں کو اب ایسے تکنیکی، خشک اور سخت موضوعات کی طرف بلایا جارہا ہے۔ روایتی علمیت اور ساختیات و مابعد ساختیات کے ادبی نظریات بھی اب گرد راہ ہو رہے ہیں۔ خاص طور پر 1980ء کے بعد سے علمِ زبان ہی دوبارہ تحقیق کا موضوع بن رہا ہے۔

جیرالڈ گراف کے بقول انیسویں صدی کا علمِ زبان پھر زندہ ہو رہا ہے۔ اب ایسے نقادوں کے لیے ایک سوال ابھر کر آیا ہے جو یہ سمجھتے تھے کہ ادب کو انسانی تناظر میں دیکھنا چاہیے۔ اس کے ساتھ ان کے لیے بھی ایک نیا چیلنج بھی درپیش ہے جو ادبی زبان کا مطالعہ سائنسی طریقِ تحقیق سے کرنا چاہتے ہیں۔ بیسویں صدی کے شروع میں پہلے گروہ کو برتری حاصل تھی اور اب اکیسویں صدی کے آغاز میں تنقید کی سائنس کی طرف توجہ مبذول ہو رہی ہے، یعنی اب شاعری کا مطالعہ بھی تکنیکی اور سائنسی انداز میں کیا جائے۔ ڈریڈا کا کہنا بھی یہی ہے کہ تنقید کو اپنی بنیادیں علمِ زبان پر رکھنی چاہئیں۔ یہی اس کا سرمایہ ہے۔

اس وقت دنیا میں صرف ایک ہی یونیورسٹی اس جانب رہنمائی کر رہی ہے۔ سٹینفرڈ یونیورسٹی ادبی تحقیق کے لیے علمِ زبان کو مرکز بنائے ہوئے ہے۔ ادبی تحقیق کے مستقبل شناس اس یونیورسٹی کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ یہ سرگرمی لسانیات سے ابھری ہے جو ایک وقت حاضر زبان کے اظہار کا مطالعہ کر رہی تھی۔ لسانیات کو "علوم کی ملکہ" قرار دیا جارہا تھا لیکن تاریخ کے حوالے سے لسانیات کو اب ایک طرف رکھ کر ادبی تحقیق کو سائنسی تحقیق کے مقابلے میں لانے کے لیے کوشش ہو رہی ہے تا کہ ادبی محقق کے ہاں جو کمی محسوس ہو رہی ہے اسے دور کیا جاسکے۔ ادبی محقق اپنے طریقِ تحقیق میں بے حد کمزور اور بودا نظر آتا ہے۔ وہ معاصر جائزے (Peer Review) کے نہ ہونے سے مار کھاتا ہے۔ اس کی پیمائشیں موضوعی اور کمزور ہوتی ہیں۔ چنانچہ

معروضی پیمائشوں کے لیے اسے علمِ زبان (Philology) ہی کا سہارا لینا پڑے گا، جو مصنف کے ذہن اور ادبی دنیا کے حوالے سے تخلیق کا ایک پہلو ہے۔۔

2- سماجی وثقافتی پہلو

لسانی مطالعہ چونکہ تاریخ اور ثقافت کے حوالے سے کیا جاتا ہے، اس لیے لامحالہ ادبی تحقیق کو سماجی پہلو سے بھی آگے بڑھنا ہوتا ہے۔یعنی بشریات کی ذیل میں علمِ ثقافت یا ثقافتی مطالعے کی طرف۔ادبی تحقیق کا مستقبل علمِ زبان کے راستے ایسے ہی سماجی مطالعے کی منزل میں پوشیدہ ہے۔

اس وقت دنیا میں ایک سوال بہت ابھر کر سامنے آ رہا ہے کہ کیا ادبی تحقیق کے لیے کام کے موضوعات ختم ہو گئے ہیں؟ادب کے تحقیق کار یا تو نقل درنقل چل رہے ہیں یا پھر ان کے پاس کوئی تحقیقی مسئلہ موجود نہیں۔اس سوال کے پیدا ہونے کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہر اگلی تحقیق سابقہ تحقیق میں پیدا ہونے والے سوالات سے جنم لیتی ہے لیکن یہاں ادبی تحقیق کا ہر موضوع دوسرے سے منفرد، جدا اور مختلف ہوتا ہے،اس لیے دراصل وہ کوئی موضوع ہی نہیں ہوتا۔ہارٹ مین اور ٹونگ نے اس کے بارے میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔اُردو میں تو اور بھی بڑا مسئلہ یہ ہے کہ یہاں تنقیدی نظریات تو بڑے شدومد کے ساتھ پیش کیے جاتے ہیں لیکن کوئی ادبی نظریہ تحقیق کی بنیاد نہیں بنتا۔چنانچہ دنیا بھر میں ادبی تحقیق نے جہاں علمِ زبان کا سہارا لیا ہے وہیں موضوع کی تلاش میں ''ثقافت'' کو مرکز ٹھہرایا ہے جو سماجی مطالعے کا ایک بڑا اہم پہلو ہے۔تمام تحقیقی فرضیے اسی کے گرد وضع ہوں اور تمام نتائج اسی کا حوالہ دیں تو ادبی تحقیق کا ''موضوع'' ابھر سکتا ہے۔اُردو تحقیق کو بھی اپنے تحقیقی موضوعات کا دائرہ کار متعین کرنا ہے۔

اُردو تحقیق کی منزل اور راستہ اب یہی ہے۔اگر اُردو تحقیق کو عالمی سطح پر کوئی مقام پانا ہے تو ایسی ہی راہوں پر چلنا ہوگا اور ان فضولیات سے جان چھڑانا ہوگی جن کے طومار تحقیق کے نام پر بلند کیے گئے ہیں۔ ثقافتی،سماجی مطالعے کا پہلو تاریخی بھی ہو سکتا ہے،معاصرانہ بھی اور مستقبل کے امکانات کا بھی۔متن پر تحقیق کے یہ تمام پہلو قابلِ توجہ ہیں جبکہ اُردو تحقیق ابھی تک ماضی میں گم ہے۔اسے مستقبل کے لیے بھی کام کرنا ہے۔

احوال وآثار، تدوینِ متن، اصنافِ ادب یا دیگر ایسے تحقیقی موضوعات رہے ہیں۔ثقافتی اثرات یا ثقافت پر اثرات کا جائزہ لینا اب ادبی تحقیق کا مرکز ومحور ہے۔تشریح وتوضیح کو تحقیق سمجھنے کا زمانہ گزر گیا۔اب زمانہ ادبی بشریات، ادبی سماجیات، معصری تجزیے وتاریخ اور ذہنیت کا مطالعہ کرنے کا ہے۔آج ثقافت کی اصطلاح محض انسانوں کے مادی سرمائے تک محدود نہیں بلکہ وسیع تر ہو کر ذہنی وتعقلی بالیدگی تک جا چکی ہے اور معاشرے کو ایک کل کے طور پر دیکھ رہی ہے۔اس لحاظ سے ادبی تحقیق ادبی مؤرخ کو محض دستاویز کے مطالعے کی طرف راغب نہیں کر رہی بلکہ اس عہد کی ثقافت کی چھان بین کو بھی ملحوظ رکھ رہی ہے۔آج محض ادبی تاریخ ہی نہیں لکھی جا رہی جس میں صرف اصناف کے ارتقا کا بیان ہوتا ہے بلکہ یہ ثقافت کی علامت کے طور پر بھی پیش کی جا رہی ہے جیسا کہ ڈاکٹر ابنِ کنول نے اپنے مقالے بوستانِ خیال ایک مطالعہ میں کیا ہے اور جس میں کسی

ثقافت کا علم اور اس کے اثرات کی نشانیاں سامنے آئیں اور یوں ادبی تاریخ سماجی نظام کا متبادل ٹھہرے گی۔
محض سیاسی وسماجی پس منظر کو تحقیق اور کتاب کا موضوع یا باب بنانا کافی نہ ہوگا۔

اُردو اور پاکستانی زبانوں میں بھی مستقبل کے تحقیق کار کو علمِ زبان اور علمِ ثقافت سے آگاہ ہونا ہوگا اور اپنے تحقیقی موضوع کو انھی حوالوں سے محدود کرنا ہوگا۔ چنانچہ لسانی اور ثقافتی مطالعے بھی نفسیات کی طرح ادبی تحقیق کے اعلیٰ سطحی کورسوں کا حصہ ہونا چاہئیں یا طالب علم کو سماجیات/عمرانیات کا بھرپور علم ہونا چاہیے۔
اُردو کے اعلیٰ سطحی نصاب میں علمِ زبان اور عمرانیات کو بھی اب علمِ تحقیق کے ساتھ ساتھ شامل رکھنا چاہیے۔

3-ادبی سماجیات/عمرانیات

"ادبی سماجیات" (Literary Sociology) کی اصطلاح حال ہی میں ابھر کر سامنے آئی ہے، جس سے ادبیات کو سائنٹیفک تحقیق کہلانے کے لیے ایک اہم علمی سہارا ملا ہے۔ اس موضوع پر یووے کرچین فشر نے اہم تحریر پیش کی ہے۔ اس کے نزدیک نہ تو یہ کوئی نئی بات ہے اور نہ کوئی تازہ دریافت ہے جو عمرانیات/سماجیات کے کسی پہلو کو مرکزی ٹھہراتی ہے۔ اس کے نزدیک ادبیات میں اس بات کو مرکزیت حاصل ہونی چاہیے جو دیگر تمام تحقیقی امور اور نکات کو مجتمع کر رکھتی ہے۔ یہ سماجی اقدار کا مطالعہ کرتی ہے۔ ادب یقیناً سماج ہی کی متعین کردہ صنف ہے۔ ادبی نظریہ اس تعین کا جائزہ لیتا ہے۔ ادبی محقق جاننا چاہتا ہے کہ ادب میں سماجی عوامل کس طور سے شامل ہوتے ہیں۔ ادب عمرانیات کی حدود کے اندر کام کرتا ہے۔ انھیں سمجھنے کے لیے ادبی نظریہ تلاش کیا جاتا ہے۔

ادبی سماجیات کا نظریہ اقدار پر مبنی اور تاثراتی نظریات کے برعکس ہے۔ اس میدان میں تحقیق کرنے پر ادبی تحقیق ایک سماجی یا عمرانی سائنس کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔ فیوجن ناربرٹ نے اپنی کتاب میں اسے مصنف اور قاری کے درمیان سماجی رشتہ تلاش کرنے کا عمل قرار دیا ہے۔ اس کے نزدیک ادب بنیادی طور پر ادبی نہیں سماجی عمل ہے۔ مصنف اور قاری کے طرزِ عمل کا مطالعہ کرنا ضروری ہوتا ہے جو سماجی تحقیق سے ممکن ہے۔ یہ تحقیق مقداری ہوتی ہے۔

یہ سماجی تحقیق اطلاعاتی نظریہ پر مبنی ہوتی ہے۔ اس لیے تحقیق کار کا اطلاعاتی نظریے سے آگاہ ہونا ضروری ہے۔ اطلاعاتی نظریہ اب کمپیوٹر سائنس سے وابستہ ہے اور یوں جدید ترین تحقیق مع کمپیوٹر اور اطلاعاتی ٹیکنالوجی سے متعلق ہونا لازمی امر بن گیا ہے۔

کلی یا مجموعی طور پر تحقیق کا گروادبی سماجیات کا ماہر ہوتا ہے ایڈورڈ سعید بھی دراصل سماجی پہلو ہی سے ادب کا مستقبل سامنے لاتا ہے۔ چنانچہ ادبی تحقیق کو اس کی سائنٹیفک رسمیات کے باوصف سماجی/عمرانی تحقیق ہی کے گروہ میں شامل کرنا پڑے گا۔

تحقیقی گروکی مہارتوں کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔ یعنی اسے رسمیات تحقیق کے ساتھ ساتھ نفسیات، لسانیات، سماجیات/عمرانیات اور تاریخ وثقافت کا احاطہ بھی کرنا ہوگا۔

اُردو تحقیق ابھی اپنا سماجی نظریہ تلاش کرنے کے دورانیے میں ہے۔ ادبی متن کے کئی سماجی پہلو بھی ہوتے ہیں جن کی حقیقت تلاش کرنے کی ضرورت ہوتی ہے لیکن نظریہ (Theory) خواہ اثباتیت کا ہو یا مابعد اثباتیت کے متعدد نظریات، اُردو تحقیق میں ابھی داخل نہیں ہو سکا۔ سماجی مطالعات کے لیے اُردو کی ادبی تحقیق کو اب اپنا تحقیقی نظریہ وضع کرنا ہوگا۔ یہی اس کی بقا کا ضامن ہوگا۔ تمام تر تحقیق اسی نظریے کی روشنی میں انجام پائے گی۔

دسواں باب

لسانی ولسانیاتی تحقیق

زبان پر تحقیق کو جب ہم ماضی، حال اور مستقبل کے حوالے سے دیکھتے ہیں تو ماضی میں زبان کے آغاز کی داستان، ماضی قریب میں زبان کی مختلف اصناف، اسالیب اور مضمرات (discourses)، توضیحی لسانیات، نیز قواعد ولغات اور زمانہ حال میں خاص مضمرات، صوتیات، بول چال، آداب اور زمانہ مستقبل میں کمپیوگرامر، تقابلی گرامر، کمپیوٹرلٹریسی، تدریسیات اور نہ جانے کتنے ہی پہلو ہیں جن پر تحقیق انجام دی جاسکتی ہے۔

لسانی (Lingual) اور لسانیاتی (Linguistic) تحقیق میں امتیاز اور فہم زبان وادب سے وابستہ افراد کے حصے میں بہت کم آیا ہے۔ عموماً ان دونوں کو ایک ہی اصطلاح "لسانیات" کے حوالے سے یاد کیا جاتا ہے۔ مگر تحقیق کے طالب علم کے لیے اپنے تحقیقی طریق کار کے لحاظ سے ہر دو میں اختلاف وامتیاز کرنا ضروری ہے۔ زبان کو اس کے ماضی کے حوالے سے دیکھنے کو علم زبان (Philology) کا نام دیا جاتا ہے۔ اُردو میں عام طور پر ایسے مطالعات کو لسانی کہا جاتا رہا ہے۔ حالانکہ وہ محض متنی تدوین سے متعلق ہوتے ہیں۔ علم زبان کے حوالے سے زبان کے ماضی میں جھانکتے ہوئے کوئی شخص جس قدر تحقیق انجام دے گا، اسے ہم لسانی تحقیق کا نام دیں گے۔ اس کے لیے عموماً دستاویزی یا تاریخی طریق تحقیق کام میں لایا جاتا ہے۔ اس کے علی الرغم زبان کے زمانہ حال کے علم کو جب صوتیات یا بول چال کے حوالے سے تحقیق کی روشنی میں دیکھا جائے گا تو اسے لسانیات (Linguistics) کے حوالے سے لسانیاتی تحقیق قرار دیا جائے گا۔ اس کے لیے عموماً بیانیہ اور خصوصاً تجرباتی یا سائنسی طریق تحقیق کو استعمال کیا جاتا ہے لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ ہر دو کے لیے دیگر تحقیقی طریقے ممنوع ہیں۔ ایک بات بے حد ضروری ہے کہ اب لسانی مطالعات دنیا بھر میں تقریباً متروک ہو چکے ہیں، البتہ لسانیاتی میدان کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔

1- تدریجی منزلیں

زبان پر تحقیق نے اب تک تین تدریجی منزلیں طے کی ہیں:

(الف) مرحلہ اول (تاریخی)

زبانوں کے آغاز وارتقا اور خاندانی رشتوں پر بحث یا قواعد ولغات کی تاریخی تحقیق۔ اس میدان یا

مرحلے میں بوپ، گریم، میکس ملر، وھٹنے اور پاکستانی زبانوں کے لحاظ سے جان بیمز اور گریرسن اہم ہیں۔
(ب) مرحلہ دوم (تقابلی) اس درجے پر صوتی اصولوں اور صوتی تغیرات پر بحث کی گئی لیکن یہ تحقیق بھی تاریخ اور تشکیل کے نظریات سے متعلق تھی۔ اس کے اہم ماہرین برگیمین، ملیٹ، جیسپرسن اور وینڈرے تھے۔ آخری دو افراد نے سماجی وثقافتی پہلوؤں کا ذکر بھی کیا ہے۔
(ج) مرحلہ سوم (جدید)

تیسری منزل، دور یا مرحلہ جدید لسانیات کا ہے جس میں فونیمیات (Phonemics) پر زور دیا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ قرنیاتی (Diachronic) اور توضیحاتی (Synchronic) پہلوؤں پر بھی توجہ دی گئی۔ 1930ء کے بعد سے تقابلی لسانیات کی محدود دنیا کو چھوڑ کر لسانیاتی تحقیق خالص نفسیاتی اور سماجیاتی پہلوؤں پر انجام دی جانے لگی۔ چومسکی اور ہالیڈے آج کے جدید ترین ماہرین کے نام ہیں۔ ابھی اور کوئی نام ان سے آگے نہیں بڑھا۔ آج اس تیسرے عہد کے چار مکاتبِ فکر ہیں۔ انھیں پراگ، کوپن ہیگن، لندن اور امریکی سکول یا دبستان کہا جاتا ہے۔

پاکستانی زبانوں کے جدید تحقیق کاروں کو اس تیسرے مرحلے کے حوالے سے اپنی تحقیقی کاوشوں کا آغاز کرنا چاہیے۔ اگرچہ اس کے ساتھ ساتھ تاریخی اور تقابلی جائزے بھی جاری رکھے جاسکتے ہیں لیکن آج ان موضوعات میں محض بیانات دہرانے اور چبائے ہوئے لقمے اگلنے کے سوا کچھ باقی نہیں جس پر تحقیق کے ڈسپلن کی عمارت استوار کی جاسکے۔

2- اُردو میں لسانی تحقیق

اُردو اور پاکستانی زبانوں میں ابھی تک لسانی تحقیق پہلے تاریخی مرحلے پر ہے اور بہت کم تقابلی اور جدید لسانیات کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے۔ روایتی تحقیق جو ڈاکٹر محی الدین زور، حافظ محمود شیرانی اور نصیر الدین ہاشمی سے شروع ہوتی ہے اور وحید الدین سلیم، ڈاکٹر مسعود حسین، ڈاکٹر سہیل بخاری، ڈاکٹر شوکت سبزواری سے چل کر ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ وغیرہ تک آتی ہے، ابھی تک ڈاکٹر محی الدین قادری زور کی تحقیقی کاوشوں سے آگے نہیں بڑھ سکی۔ ڈاکٹر زور نے 1929ء میں "ہندوستانی صوتیات" یا "لسانیات" کے موضوع پر مقالہ لکھا۔ دورِ جدید میں اگرچہ ڈاکٹر انور شبنم دل نے لسانیات کے تحقیقی موضوعات پر توجہ دلائی ہے لیکن ان کے ملک سے باہر چلے جانے کے بعد ان کی تحریک آگے نہیں بڑھ سکی۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو میں قواعد ولغات کے تحقیقی مطالعے سے بات آگے نہیں چلی۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے جدید لسانیات کے حوالے سے شمالی ہند میں ہند آریائی زبانوں کے ارتقا کے موضوع پر بات شروع کی تھی یا پھر ڈاکٹر سہیل بخاری نے اُردو زبان کا صوتی نظام اور ڈاکٹر محبوب عالم نے اُردو کا صوتیاتی نظام جیسی کتابیں پیش کی ہیں لیکن یہ مطالعے بھی زیادہ سے زیادہ دوسری منزل تک کی کوششیں قرار پاتے ہیں۔

اگرچہ اُردو برصغیر کی مؤثر زبانوں میں سے ہے لیکن اتنی وسعت رکھنے کے باوجود اس میں صحیح لسانی

اور لسانیاتی تحقیق ابھی کسی خاص نوعیت کی حد تک انجام نہیں دی جا سکی۔ اس لیے اُردو لسانیات میں تحقیق کرنے کی بہت حد تک گنجائش موجود ہے۔ صرف اُردو کے توضیحی مطالعے کو لیں تو بھی کئی برسوں بعد ایک آدھ تحقیقی مضمون سامنے آتا ہے۔ ہرچند کہ ڈاکٹر زور، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر گیان چند اور دیگر محققین نے چند تاریخی اور تقابلی مطالعے پیش کیے ہیں، تاہم اُردو میں لسانیاتی تحقیق کا ڈسپلن وضع کرنے کے لیے مزید کام کی ضرورت ہے۔ بقول ڈاکٹر سلیم اختر:

> ''اُردو لسانیات کا جلد ظہور اس لیے بھی ممکن نہ تھا کہ پرانے زمانے میں زبان و بیان سے وابستہ جملہ مباحث کے لیے علم بیان اور بدیع موجود تھے جو اس عہد مخصوص کے شعری تقاضوں کے لیے مناسب اور موزوں تھے''۔

اُردو کی لسانی تحقیق کے حوالے سے پہلا موضوع اُردو زبان کی تاریخ ہے۔ احسن مارہروی کی نمونہ منثورات کے بعد ڈاکٹر سلیم اختر نے اُردو زبان کی مختصر تاریخ میں ایک مختصر سا جائزہ پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔ پھر اس جائزے کو دو مختلف کتابوں کی صورت میں بیک وقت شائع کر دیا گیا لیکن ابھی اس موضوع پر جامع تحقیق کی ضرورت ہے۔ اُردو زبان کی ایک جامع تاریخ لکھنے کی ضرورت باقی ہے۔ اس کے مختلف ابواب پر موضوع وار الگ الگ تحقیق کی جا سکتی ہے۔ جیسے ''اُردو قواعد نویسی''؛ ''اُردو بول چال کے سانچے''؛ ''اُردو میں دفتری اور عدالتی عنصر''؛ ''صحافتی اُردو''؛ ''اُردو کا سائنسی و تکنیکی طرز بیان''؛ ''اُردو کا درسی کینڈا''؛ ''اُردو میں لفظ سازی''؛ ''اُردو کے عوامی پہلو'' کا تاریخی جائزہ۔

اُردو زبان کی تاریخ کے کم از کم تین ادوار ضروری ہیں۔ حد بندی یا تحدید فورٹ ولیم کالج (1800ء) اور آزادی (1947ء) کے بعد جنگ ستمبر (1965ء) کے اثرات سے کی جا سکتی ہے لیکن یہ تجویز بھی مفروضوں کی بجائے تحقیقی بنیاد پر استوار ہونی چاہیے اور یوں قدیم اُردو، درمیانی کلاسیکی دور اور جدید ادوار کے عنوانات میں اسے تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ جدید اُردو میں بھی ''پاکستانی اُردو کے خدوخال'' ایک ضمنی اور منفرد موضوع ہے۔

زبان کا مسلسل جائزہ لینے کے لیے اس کے نفسیاتی اور سماجی عمل کی تشریح و توضیح تو ایک مستقل موضوع ہے۔ اس کے ساتھ بول چال کے انداز، ذخیرہ الفاظ کا مختلف صورتوں میں جائزہ، ہجے اور تلفظ پر تحقیق اور روایتی قواعد، ساختیاتی قواعد (Structural Grammar)، انتقالی قواعد اور جدید قواعد کے حوالے سے بھی تحقیق کی جاتی رہنی چاہیے۔ کمپیوٹر سکرین کے اُردو میں بدلنے اور مائیکروسافٹ ویئر اُردو میں آنے کے بعد کمپیوٹنگ کی نئی قسم کی اُردو ایجاد ہوئی ہے جو تخصیص کو اہمیت دیتی ہے۔ اس مختصر کے کئی پہلو تحقیق طلب ہیں۔

حروف لفظ کی اور الفاظ زبان کی بنیادی اینٹ کہلاتے ہیں۔ یہ لسانیاتی علامت ہے۔ اس حوالے سے کی گئی تحقیق گویا علم زبان اور لسانیات دونوں کی بنیادی تحقیق کہلائے گی۔ اس کے بھی کئی پہلوؤں پر تحقیق انجام دی جا سکتی ہے مثلاً ''اشتقاقات'' اور اس کی ذیل میں لفظی مادوں پر بحث، خاص طور پر غیر عربی الفاظ

کے مادوں کا تجزیہ، ملحقات سے یعنی لاحقوں، سابقوں اور حرفوں کا تجزیہ، فارسی امر اور لاحقوں میں امتیاز کی واضح حدود، اصول نحت کے ساتھ مختصر کیے گئے الفاظ اور سابقوں میں امتیاز وغیرہ۔ لفظوں کی تشکیل اور بُنت میں ساق (Stem)، مفرد آمیزش (Odd mixing)، تصریف (Inflexion)، صوتیات اور تشکیلیات یا فونیمیات کے کئی پہلو تشنۂ تحقیق ہیں۔ اس کے لیے ''اخبار اُردو'' اسلام آباد کے جون 2003ء اور دسمبر 2004ء کے شمارے ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں۔

لفظوں کے استعمال کی بحث میں سیاق و سباق کے اشارات کی تلاش، معنویات اور اس کی حدود، تعبیر و ادعائے مفہوم، الفاظ کے وضعی، لغوی، استعاراتی، مجازی، اصطلاحی مفاہیم، قرار داد معنی، ادبی ترادف، ادبی تضاد اور ادبی تلازم کے امور، لغت سازی، لغت میں الفاظ کی ترتیب، تھیسارس کی حدود، لغات کی ترتیب و تدوین کے اصول، بنیادی اُردو الفاظ اور ثانوی یا اضافی اُردو الفاظ کا تعین، کلیدی الفاظ، تلفظ کی وضاحت کے طریقے، اصول اور معیارات، تعریف و توضیح کے طریقے، کلمہ کی تعریف، تقطیع یا لغات کے حوالے سے نحوی مطالعہ، مترادفات اور متضادات کا مطالعہ، معروف، مجہول، ابتدائی اور مستعمل الفاظ کی حدود (لفظوں کا عوامی استعمال، طلبہ، اساتذہ، نسوانی، سکول سطح، کالج سطح، تحقیقی و جامعاتی سطح، ادبی، صحافتی، مذہبی، سیاسی، پیشہ ورانہ، شاذ، خاص زبان کے مضمرات وغیرہ) قابل توجہ ہیں۔ پاکستانی اُردو کے خدوخال اور کرخنداری اُردو کے علاوہ ''اخبار اُردو'' شمارہ جنوری 2005ء میں ''کوئٹہ کی عوامی زبان'' کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

ہجے اور تلفظ تحقیق کے خصوصی طور پر متقاضی ہیں۔ وضعی اور اشتقاقی ہجوں اور تلفظ کے ساتھ ساتھ مختلف طبقوں کے تلفظات اور ان کی سماجی و نفسی مجبوریوں کو بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ بول چال کے تقاضوں کے تحت تلفظ کے اصول، عربی الفاظ کا تلفظ، فارسی الفاظ کا تلفظ اور مقامی الفاظ کے تلفظی طریقوں پر بحث، ان پر اُردو کا تصرف یا دیگر پاکستانی زبانوں کے اثرات، ذولسانیت وغیرہ، یہ سب کچھ نفسی سماجی تحقیق کا متقاضی ہے۔ عمومی غلطیوں اور ان کے اسباب کا سروے کیا جانا ضروری ہے۔ اس کے لیے تجاویز بھی اقدامی یا عملی تحقیق (Action Research) کی بنیاد پر استوار ہونی چاہئیں۔

قواعد پر تحقیق بہت کم انجام دی گئی۔ اسم خاص یا اسم معرفہ اور اسم عام یا نکرہ میں امتیاز کی واضح حد فاصل نہیں کھینچی جا سکی۔ اسم مجرد اور اسم کیفیت کا فرق مثالوں کی وسعت سے معلوم کرنا باقی ہے۔ اسم اور صفت کی بحث میں اسم صفت اور مجرد صفت کا تعین بھی نہیں ہوسکا۔ واحد جمع کے واضح اصول سامنے نہیں آسکے۔ جمع کے صیغے کے لیے حیدرآباد دکن کی تعیین اور مستعملات بھی فروغ نہیں پاسکے تو کیوں؟ واحد لکھ کر جمع مراد لینا اور جمع لکھ کر واحد کا اظہار کس کس طرح سے ممکن ہے؟ ضمائر کی تقسیم کیا عربی اصولوں پر ہونی چاہیے؟ یعنی ذات، نسبت، مطلق اور مجازی ضمائر کی حدود کیا ہوں؟ ضمائر اور اسم پر بھی امتیاز کیسے کیا جائے؟ صفات میں، صفات کی حدود و قیود، صفات کا تقابل اور انتخاب بے حد اہم ہیں۔ افعال میں متعدی اور لازم کی پرانی بحث بھی ابھی تک واضح نہیں ہوئی۔ خاص طور پر انگریزی سے ترجمہ کرتے ہوئے بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ امدادی مشترک افعال پر تو بحث ہو ہی نہیں سکی۔ افعال کی اقسام پر صرف ایک تحقیق سامنے آئی ہے۔ مصادر، اسم مصدر

اور فعل کا تعین ہونا باقی ہے۔ اُردو افعال کی تقطیع کر کے اس کے اجزاء کا مطالعہ کرنا۔ افعال کی گردان کے عربی، فارسی یا دیگر طریقوں پر بحث۔ متعلق فعل کی اقسام، تقابل اور استعمال کا جائزہ شاید ہی کبھی لیا گیا ہو۔ حرف ربط، حرف جار اور حرف عطف کا باہمی فرق طلبہ تو کیا اکثر اساتذہ کی سمجھ سے بھی اکثر بالاتر ہوتا ہے۔ حرف ندا یا حرف فجائیہ / استعجابیہ کا فرق، اس کا تلفظ اور املا بے حد گنجلک امور ہیں۔ ابھی تک ان کے لیے عربی فارسی بنیادیں ہی مہیا کی گئی ہیں، اُردو کو خالص اُردو کے انداز میں نہیں سمجھا گیا۔

اُردو نحو یا جملے کی تقطیع پر بھی ابھی تک اہل ادب کا زور چل رہا ہے۔ مسند یا مسندالیہ، خبر یا مبداء کی وضاحت اور ان کے مرکبات یا ترکیبات کی توضیح، کلمہ، جملہ، جملے کے اجزاء یعنی (Clause اور Phrase) کا امتیاز واضح نہیں۔ اسم مصدر کی صحیح تعریف ضروری ہے۔ تاہم، مفرد اور مرکب، سادہ اور پیچیدہ جملے، جملوں کی اقسام (عموماً مثبت، منفی، سوالیہ جملوں کی تقسیم بتائی جاتی ہے، ڈھیلے جملے، مقطوعہ اور متوازن جملوں کی پہچان کے گر ہاتھ نہیں لگے)۔ خیال اور بیان کے ربط اور مضمون آفرینی کا تجزیہ، خاص طور پر استاد شعراء کے ہاں سے تحقیق کر کے تلاش کرنا اور ترتیب دینا باقی ہے۔

جملوں کی ترتیب و تخلیق میں رسمی اور غیر رسمی فقروں میں امتیاز کی طرف ابھی اہل تحقیق کی نظر نہیں گئی۔ خاص طور پر مرکب مصادر اور منقسم مصادر میں جب مفہوم کی یکتائی اور وحدت تلاش کی جاتی ہے، جیسے "پرندے اڑتے چلے جا رہے ہوں گے" یا "بہکنا" یعنی مصدر اور "بہک جانا" یعنی مرکب مصدر میں امتیاز جیسے مسائل اپنی اصولی اور تحقیقی بنیادوں پر کیا ہیں اور کیوں کر واضح ہوں گے؟

رموز اوقاف ابھی تک لاینحل مسئلہ بنے ہوئے ہیں۔ وقفہ (کاما) سب سے بنیادی معاملہ ہے۔ دیگر علامتیں بعد کے مسائل ہیں۔ حروف ربط اور وقفے کا استعمال تحقیق طلب امور ہیں۔

تسوید یا تحریر کے اصولوں کو ہدایت ناموں، خلاصوں اور قواعد کی کتابوں تک رہنے دیا گیا ہے، ان پر تحقیقی نظر ڈالنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی۔ حروف ابجد اور املا کے مسائل کے ضمن میں اخباروں، رسالوں کے رجحانات کے ساتھ ساتھ تحریر میں پیراگراف، پیراگراف میں تقسیم کے اصول، سہ پیراگرافی مضمون اور پنج پیراگرافی مضمون کی وضاحت، نظر ثانی کے اصول، علمی تدوین کے اصول، فنی تدوین کے اصول، تحریر کی اقسام، غیر ادبی تحریر، مروی بیانیہ (Narrative) اور وضاحتی بیانیہ (Descriptive) میں امتیاز، استدلالی اور جذباتی، ذاتی اور غیر ذاتی تحریر کے نکات، مراسلات کی اقسام، مشق، تفویض اور مقالے کی تحریر میں فرق، علمی اور کاروباری تحریر، دفتری اور عدالتی تحریر، درخواستیں اور اپیلیں، خبر اور اداریے کی تحریر، غرضیکہ موضوعات کا ایک جہان ہے جو اہل تحقیق کا منتظر ہے۔

زبان بنیادی طور پر بول چال کا نام ہے اور زبان پر تحقیق کا آغاز بول چال پر تحقیق سے ہونا چاہیے۔ بول چال میں صوت کا علم یا صوتیات، سننا اور بولنا بنیادی موضوعات ہیں۔ چنانچہ صوت یا آواز، اس کے ضمن میں سانس، حرکیات، گونج، تکلم، آواز کی بلندی، ارتفاع، رفتار، شرح، معیار، لکنت اور ٹھہراؤ کے بہت سے امور ہیں۔ Tone, Pitch, Volume وغیرہ ابھی تک تحقیق طلب ہیں۔ بولنے کی مہارت سکھانے

میں آواز کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ چہرے کے اتار چڑھاؤ، انداز، حرکات، اشارات، نظر اور بولنے کے آلات اور ان کا استعمال، تقریر کے اصول، سامعین کے ردعمل، جذبات کا اتار چڑھاؤ، سامعین کی نفسیات، ریہرسل کے طریقے وغیرہ بھی تحقیق کے اہم موضوعات ہیں۔ یہی صورت سننے کی مہارتوں کو جاننے اور سمجھنے کی ہے۔ خاص طور پر ہم جماعتوں سے گفتگو، استاد اور طلبہ سے گفتگو، گروہی مباحث اور مذاکروں کی زبان سے تقریری مقالوں کی تکنیک وغیرہ۔ FAST لاہور اور مقتدرہ قومی زبان کے مطالعے خاص طور پر ڈاکٹر محبوب عالم کی کتاب اُردو کا صوتی نظام کے بعد بھی کئی ایسے مطالعے تحقیق کے منتظر ہیں۔

''اخبار اُردو'' اسلام آباد کے شمارہ جون 2003ء میں آمنہ خان کے مقالے ''اُردو کے دہرے مصوتوں کی شناخت'' اور ''اخبار اُردو'' دسمبر 2004ء میں کرن خورشید اور ساتھیوں کی ''اُردو میں دہرے تہرے مصوتوں کے وجود'' پر مقالات کا مطالعہ مزید راہیں کھولتے ہیں۔

جدید صوت کاری میں میکانکی اصوات کا مطالعہ، سپیکر کا استعمال، ٹیلی فون پر گفتگو اور صوتیات، ریڈیو اور ٹیلی وژن کی صوتیات، اعلانات وغیرہ کے طریقوں پر بحث کی جانی چاہیے۔

گفتگو کے آداب میں روزمرہ گفتگو سے لے کر ریڈیو، ٹی وی پر گفتگو، پبلک اور پارلیمنٹ کی گفتگو، مبارکبادوں اور تعزیتوں پر گفتگو کے رویے اور رجحانات قابل مطالعہ ہیں۔ مختلف پیشہ وروں، ڈاکٹروں، مریضوں، دکانداروں، گاہکوں، پولیس، مجسٹریٹوں، ججوں اور وکیلوں سے گفتگو کے آداب، طریقے، رویے، رجحانات بھی زیر مطالعہ آ سکتے ہیں۔

خواندگی، مطالعہ اور ان کے رجحانات کے کئی اصولوں اور طریقوں، گوشوں اور نکات پر بہت گفتگو ہو چکی ہے۔ خاص طور پر رفتار مطالعہ، طریق مطالعہ اور اصول مطالعہ کے موضوعات مسلسل تحقیق کا تقاضا کرتے ہیں۔ مختصر نویسی اور مسلسل نویسی کے کئی ایسے پہلو ہیں جو تحقیق طلب ہیں۔

تدریسی اطلاقات کے کئی پہلو ایسے ہیں جن پر تجرباتی یا سائنسی تحقیق انجام دی جا سکتی ہے۔ اُردو کے ترقیاتی ادارے اور جامعاتی شعبے ان پہلوؤں پر خصوصی توجہ دیں اور مذاکروں اور مکالموں کے بعد عملی تحقیق کا ڈول ڈالیں۔ ایسے ہی کام دوسری پاکستانی زبانوں کے حوالے سے بھی انجام دیے جا سکتے ہیں۔

3-ادبی لسانیات

ڈاکٹر گیان چند نے اپنی کتاب تحقیق کا فن میں ''ادبی لسانیات'' کی اصطلاح استعمال کر کے لسانیات (Linguistics) سے ہٹ کر خالص ادبی موضوعات کے حوالے سے لسانی تحقیق کے کام کی گنجائش نکالی ہے۔ درحقیقت اس اصطلاح کی وسعت دو میدانوں کے ادغام یا انضمام کی صورت رکھتی ہے۔ گویا ادب اور لسانیات کے میدانوں میں کسی مشترک موضوع پر تحقیق ادبی لسانیات کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسے متنی لسانیات کا نام دیا جاتا ہے۔ اس میں عنصری تجزیہ انجام دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر گیان چند کے نزدیک:

''ان میں کچھ ایسے موضوعات ہیں جو لسانیات اور ادب کو ملانے والے بین العلوی

(Inter-disciplinary) ہیں۔ان پر محض لسانیات کا طالب علم کام نہیں کرسکتا کیوں کہ ان کے لیے ادبیات کی معلومات درکار ہیں۔ان پر صرف ادبیات کا طالب علم کام نہیں کرسکتا کیوں کہ ان کے لیے تاریخی لسانیات کی خاصی اور صوتیات کی سرسری معلومات ضروری ہیں"۔

بین العلومی موضوعات پر تحقیق اُردو یا پاکستانی زبانوں کے شعبے میں نہیں بلکہ دوسرے شعبوں میں انجام دی جانی چاہیے جیسے "انگریزی الفاظ کی اُردو یا پنجابی میں ادائیگی" یا انگریزی کے شعبے میں "پنجابی اصوات کا اُردو پر اثر"۔ پنجابی کے شعبے میں اسی طرح "اُردو اور پشتو تذکیر وتانیث" کی تحقیق بنیادی طور پر پشتو کے شعبے میں انجام پائے۔ بین العلومی موضوعات کے لیے یاد رہے کہ ان میں زبان وادب کے زاویہ نظر سے تحقیق انجام دی جانی چاہیے۔لسانیاتی تحقیق تقابلی مطالعے میں انجام پائے گی۔

تحقیق کا کام کبھی ختم نہیں ہوتا یعنی ہر تحقیق مزید تحقیق کا تقاضا کرتی ہے۔ کچھ نہ کچھ ترقی واضافہ ممکن ہوتا ہے۔ذیل میں مندرجہ بالا موضوعات پر کام کرنے کے طریقوں پر غور کیا جاتا ہے۔زاویہ نظر بدلنے اور کسی بھی پاکستانی زبان کے حوالے سے ایسے کئی کام انجام دیے جاسکتے ہیں مثلاً مختلف پاکستانی زبانوں کے باہمی رشتوں پر بہت کام ہو چکا ہے،اب باہمی لہجوں، ترکیبوں، بازاری اور عوامی جملوں وغیرہ پر بھی کام ہوسکتا ہے۔

ڈاکٹر گیان چند کے دیے گئے ان موضوعات کو پاکستانی زبانوں کے حوالے سے دیکھیں تو کچھ مندرجہ ذیل صورت سامنے آئے گی:

1- کسی ادیب کی تخلیقات کا مجموعی لسانیاتی مطالعہ

جب آپ ایسا جائزہ لینے لگیں تو زیر مطالعہ ادیب کی جملہ نظم ونثر کا گہرا مطالعہ کریں۔اس کے قابل ذکر، یعنی معمول سے ہٹے ہوئے، انوکھے الفاظ اور اظہارات کی فہرست بنالیں۔خواہ کوئی بولی ہو یا قدیم زبان، پرکھنے کی کسوٹی موجودہ معیاری زبان ہوگی۔اس سے جو بھی فرق دکھائی دے گا وہ سب نشان دہی کے قابل ہیں۔انھیں ذیل کے زمروں میں تقسیم کرکے کارڈوں یا موٹے کاغذوں پر لکھ لیں۔

صوتیات، املا، صرف، نحو، لفظیات، معنیات مع محاورہ وروزمرہ، تراکیب وغیرہ۔صوتیات کے تحت موجودہ تلفظ سے جدا ہر تلفظ کی نشان دہی کریں۔اختلافات کی گروہ بندی کریں اور ممکن ہو تو یہ بتائیں کہ یہ کس زبان یا بولی کا اثر ہے۔املا کے تحت مصنف کے متون کے املا اور ہجا کا جائزہ لیں۔اگر مصنف کی دستی تحریر ملے تو کیا کہنا ورنہ اس کے متن سے اس دور کے کام کی کوئی قابل ذکر خصوصیت ہو تو صراحت کریں۔دیگر تقابلی تحقیقات کو کام میں لائیں۔صرف کے تحت لفظ کے تشکیلی اجزا، لاحقوں اور سابقوں کا جائزہ لیا جائے۔نحو کے تحت مرکبات، فقروں اور جملوں کی ساخت کا مثلاً صفت وموصوف، مضاف، مضاف الیہ، جار مجرور، جملے کی نحوی کیفیت، ضمیر، حروف جار، حروف استفہام، حروف عطف، اسم وصفت وفعل کی تذکیر وتانیث، واحد وجمع وغیرہ میں معیاری زبان سے جو بھی فرق ہوں، وہ سب کے سب شمار کیے جائیں۔لوک روایت، لوک بولی اور

لوک دانش بھی ملحوظ خاطر رہے۔

ذخیرہ الفاظ یا لفظیات کے تحت اس مصنف کے زیر استعمال مخصوص الفاظ درج کیجیے۔ یہ بھی بتائیے کہ اس کی لفظیات میں عربی، فارسی، ہندی، اُردو، انگریزی اور دیگر دیسی بولیوں نے الفاظ کا کیا تناسب ہے۔ اس نے اپنے الفاظ کہاں سے لیے ہیں۔ اسی سلسلے میں اس کے یہاں روزمرہ کا جائزہ لیں۔ معنویت میں اس کے یہاں لفظوں کے موجودہ معنی سے مختلف مفاہیم کی شناخت کریں اور اس نے جو محاورے لیے ان کا جائزہ لیں۔ دیکھیں کہ اس نے ایک لفظ یا محاورے کو کن کن متنوع مفاہیم میں باندھا ہے۔ تراکیب سازی کا جائزہ لیں۔ مقامی بولی سے تقابل کریں۔

صرف ضروری اور اپنے حدودِ کار یا حد بندی کے مطابق مشاہدات کو قلم بند کریں۔ خواہ مخواہ تجزیے کا طول اور ضخامت بڑھانے کی کوشش نہ کریں۔ ہوسکتا ہے کہ آپ کا لسانی جائزہ پچاس صفحات ہی میں ختم ہو جائے۔ مقالے کی ضخامت نہیں عمق اہمیت رکھتا ہے۔ یعنی آپ کس وقت نظری سے مطالعہ کر رہے ہیں۔ اسی سے بہتر نتائج برآمد ہوں گے۔ دو زبانوں کے ادیبوں کا باہمی لسانیاتی تقابل بھی کیا جاسکتا ہے۔ دو یا دو سے زیادہ ماہرین لسانیات کی ادبی خدمات کا تقابل بھی ہوسکتا ہے۔ شوکت صدیقی کے ناول جانگلوس کا مختصر لسانیاتی جائزہ لیا گیا تھا، اس کا موازنہ انجم کے ناول خدا کی بستی کے ساتھ کیا جاسکتا ہے۔

2- کسی کتاب کا لسانیاتی مطالعہ

کسی ادبی کتاب کا انفرادی تجزیہ یا مطالعہ ادیب کے لسانیاتی مطالعے سے مختلف نہیں۔ اکثر ادیبوں کی ایک کتاب یا ایک مجموعہ اس کے لسانیاتی خصائص کا نمائندہ ہوتا ہے۔ صرف وہی کتاب لسانیاتی مطالعے کے لیے منتخب کی جائے جو اپنی قدیم زبان یا اسلوب کے امتیازات کی وجہ سے ممتاز ہو۔ جیسے فسانۂ عجائب، جدید عہد میں جہان دانش، یادوں کی برات جیسی آپ بیتیاں۔ جانگلوس کی طرح کے جامع ناول دیکھے جاسکتے ہیں۔ یہ ناول پاکستانی اُردو کا ایک نمائندہ ناول قرار دیا جاسکتا ہے۔ کتاب پاکستانی اُردو کے خدوخال میں اس کا ایک جائزہ موجود ہے۔ ان کا عنصری تجزیہ کیا جاسکتا ہے اور توضیحی لسانیات کے اصول استعمال کیے جاسکتے ہیں۔

3- زبان کا آغاز و ارتقاء

اس موضوع پر اُردو اور پاکستانی زبانوں میں بہت سا کام ہو چکا ہے، پھر بھی اتفاقِ رائے نہیں، اس لیے ابھی لسانیاتی بنیادوں پر مزید کام کیا جاسکتا ہے۔ اس موضوع میں اسی وقت آئیں جب آپ کے پاس مزید کچھ کہنے کو موجود ہے اور آپ لسانیات سے پوری طرح آگاہ ہوں۔ اُردو تحریروں کے علاوہ انگریزی اور دیگر زبانوں سے بھی ضرور استفادہ کریں۔ مستشرقین کے بیان میں غیر جانب داری اور عدم واقفیت اور دونوں کی دھوپ چھاؤں یا ان کا مخصوص نقطۂ نظر بھی زیرِ بحث رکھنا ہوگا۔ پاکستانی زبانوں پر اکثر کام غیر ملکیوں نے کیا ہے، ان سے استفادہ بھی ضروری ہے اور ان پر تنقید و تحقیق بھی درکار ہے۔

کسی بھی پاکستانی زبان کے موضوع پر لکھتے وقت شورسینی اور اس سے مماثل اپ بھرنشوں، جدید

ہند آریائی خاندان میں ہندی، کھڑی بولی اور اُردو کا مقام، اُردو کا پنجابی، برج بھاشا، ہریانی اور راجستھانی زبانوں اور بولیوں سے تعلق، ان سبھی یا اکثر عنوانات پر لکھنا ہوگا۔ مارفیمیات، لفظ سازی یعنی تشکیلیات وغیرہ اور تصنیفی اور نحوی حوالوں سے بھی جائزہ لینا ہوگا۔ سب سے پہلے اس موضوع پر اب تک کی تمام اردو، ہندی اور انگریزی تحریروں کا مطالعہ کریں پھر تاریخی اور لسانیاتی شعور کی دست گیری کے ساتھ لکھیں۔ زبان کے ماخذ خاندان کا تعین کریں، پھر اس کا آغاز و نشوونما دکھائیں۔ قدم قدم پر دوسروں کے بیانات کا حوالہ اور اقتباسات دیں تاکہ قاری سب کی آراء اور آپ کے نتائج کو پڑھ کر خود اپنی رائے بھی قائم کر سکے۔ ایسا ہی کام دوسری پاکستانی زبانوں کے تقابل اور حوالے سے انجام دیا جا سکتا ہے۔

4-زبانوں کے لسانی رشتے

اُردو کے حوالے سے سندھی، پنجابی، پشتو، کھوار، ہندکو، سرائیکی، پہاڑی، بلوچی کے تعلق پر بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن یہ سارا کام عموماً لسانی یا لغوی بنیادوں پر ہوا ہے، لسانیاتی حوالے باقی ہیں۔ آریائی اور غیر آریائی زبانوں کے شجرے میں ان کی جگہ کو متعین کیا جا سکتا ہے؟ یہ بتائیں کہ آپ کسی زبان سے کیا مراد لیتے ہیں؟ اس کی حدود کار کیا ہیں؟ اس کے بعد اس زبان کے آغاز پر بحث کریں، ارتقاء کا جائزہ لیں اور اس کی ساخت و نشوونما میں دوسری زبانوں کے اثرات اور عناصر کی نشان دہی کریں۔ برصغیر کی تمام بولیوں، مشرقی ہندی، بہاری، راجستھانی، پنجابی، گجراتی، مرہٹی، عربی، فارسی، ترکی، انگریزی، یونانی، پرتگالی، ولندیزی، اطالوی وغیرہ کی لفظیات کا شمار کریں۔ بعض ایسی تحریریں لیں جو ہندی یا عربی فارسی لفظیات کی افراط کے لیے بدنام ہیں۔ ان میں شمار کر کے ایک طرف اُردو، ہندی اور دوسری طرف عربی فارسی الفاظ کا تناسب دکھائیں۔ ان الفاظ کا تعدد استعمال (Frequency of Use) دریافت کریں اور پھر یہ دکھائیں کہ جملے میں مرکزی معنی کی ترجمانی کس زبان کے الفاظ کر رہے ہیں یا کون سی زبان زیادہ تر سامنے آ رہی ہے۔

صوتیاتی، تشکیلی اور صرفی اور نحوی ساخت میں مندرجہ بالا زبانوں کے اثرات دکھائیں، مثلاً پنجابی کے لاحقہ "اں" سے جمع بنانا، گجراتی مراٹھی کا لاحقہ "چ" بمعنی "ہی"، عربی فارسی کے غیر معمولی صوتیاتی و قواعدی اثرات، اُردو میں انگریزی اصوات مثلاً لارڈ، کلب، گرل وغیرہ میں، انگریزی لاحقہ جمع "س" یا "ز" گرلس، کلبز، لارڈز وغیرہ میں۔ اپنی مادری یا زیرِ تحقیق زبان پر اُردو اور انگریزی کے نحوی اثرات بھی دکھائے جا سکتے ہیں۔

5-اصطلاحات و لغات کا مزید جائزہ

کسی بھی زبان میں لغات نویسی کے حوالے سے اس موضوع پر قلم اٹھانے سے پہلے لسانیات کی شاخ لغات نگاری (Lexicography) یا علم لغات (Lexicology) اور اصطلاح نگاری (Terminography) کا گہرا مطالعہ کارپس لسانیات (Linguisttics Corpus) میں کرنا چاہیے۔ اس کے بعد تاریخی ترتیب سے ایک ایک لغت کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ مقتدرہ قومی زبان نے اردو

لغات کے تجزیات کا ایک سلسلۂ کتب شائع کیا ہے۔ اُردو اصطلاحات سازی کا جائزہ بھی لیا جا چکا ہے لیکن تمام عمومی لغات کا جائزہ ابھی باقی ہے۔ اس کام کو وہی شخص بخوبی سرانجام دے سکتا ہے جو لسانیات اور عربی فارسی دونوں پر نظر رکھتا ہو۔ اصطلاحی لغات کے جائزے میں یونانی اور لاطینی کا علم بھی ملحوظ رکھنا ہوگا۔ پاکستانی زبانوں کے اصطلاحی، انفرادی اور مشترک جائزے لیے جا سکتے ہیں۔

اُردو لغت کی تیاری کا کام ایک طرف اُردو لغت بورڈ، کراچی، پاکستان کر رہا ہے، دوسری طرف اس سے مختصر پیمانے پر ترقی اردو بیورو نئی دہلی، بھارت کر رہا ہے۔ آخر الذکر کی لغت ڈاکٹر مسعود حسین خان مرتب کر رہے تھے۔ ایسا ہی کام سندھی، پشتو اور پنجابی لغات کے حوالے سے انجام دیا جا رہا ہے۔ ان زبانوں کی لغات سازی کا بھی بخوبی تنقیدی اور تحقیقی جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ فرہنگ تلفظ اور فرہنگِ املا کا مطالعہ بھی ان پر اضافہ ہے۔

6- قواعد نویسی کا جائزہ

اُردو کے ابتدائی قواعد کے بارے میں کتابیں یورپی زبانوں مثلاً لاطینی، اطالوی، ولندیزی، پرتگالی وغیرہ میں لکھی گئیں۔ چند ایک قومی کتب خانہ اسلام آباد میں ذخیرہ احسان دانش میں دستیاب ہیں، دوسری اگر مل بھی جائیں تو ''زبان یار من ترکی و من ترکی نمی دانم''، والا معاملہ ہوگا۔ اکثر کتابیں یورپ، انگلستان وغیرہ کے کتب خانوں میں ہیں۔

جدید لسانیات میں قواعد کا فن بہت ترقی کر گیا ہے۔ لسانیاتی قواعد روایتی قواعد سے بالکل مختلف ہیں، اس لیے ہمیں قواعد کا جائزہ لیتے وقت لسانیات کے صرف و نحو سے، سختی کے ساتھ صرفِ نظر کرنا پڑے گا۔ وہ ایک دوسری اور بالکل مختلف دنیا ہے۔ اہل یورپ کی دیکھا دیکھی اہل ہند نے بھی ''اُردو قواعد'' پر کام کیا لیکن عربی فارسی کے قواعد کا تتبع کیا جس سے اردو کی اپنی قواعد وجود میں نہ آ سکی۔ مولوی فتح محمد جالندھری کی مصباح القواعد قابل توجہ رہی ہے۔ شعبۂ لسانیات مسلم یونیورسٹی کے ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ نے علی گڑھ سے شمالی ہند کی اُردو کی تاریخی قواعد 1600ء تا 1810ء کے موضوع پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی۔ ظاہر ہے کہ اس کام میں انھوں نے قواعد نویسی کا جائزہ نہیں لیا ہوگا بلکہ قواعد کی تشکیل کی ہوگی یا صرف و نحو میں عہد بہ عہد ارتقا دکھایا ہوگا۔ ایک کام ڈاکٹر شوکت سبزواری نے شروع کیا تھا لیکن نامکمل رہا۔ ڈاکٹر عصمت جاوید کی نئی اُردو قواعد اس لحاظ سے خاطر خواہ اہمیت رکھتی ہے کہ اس میں خود قواعدی اصول وضع کرنے کی بجائے لسانیاتی بنیادوں اور تقابلی جائزے وضع کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ کمپیوٹر کے حوالے سے تقابلی قواعد کے اصول دیکھتے ہوئے کئی طرح کی تحقیق درکار ہے جو پاکستانی زبانوں میں انجام دی جانی چاہیے۔ نیشنل یونیورسٹی FAST لاہور اور مقتدرہ قومی زبان میں اُردو کمپیوٹر کے حوالے سے تقابلی قواعد پر ایسا کام انجام دیا جا رہا ہے۔ اس میں پاکستانی زبانوں کے قواعد اور اُردو اور انگریزی کی تقابلی قواعد کا جائزہ بھی ضروری ہے۔

4- لسانی یا لسانیاتی تحقیق؟

لسانی ولسانیاتی تحقیق کے اصول ومبادیات میں پہلا اور لازمی امر یہ ہے کہ تحقیق کو سابق میں مذکور تین منزلوں یا ادوار کے حوالے سے دیکھ کر طریق تحقیق کو متعین کیا جائے۔ کسی ایک مقالے میں ایک سے زیادہ تحقیقی طریقے بھی استعمال میں لائے جاسکتے ہیں لیکن ضروری ہے کہ ہر حصے اور اس کے طریق کار کے تعین کے بارے میں گہرے غور وخوض سے کام لیا جائے۔

وہ زمانہ گزر گیا جب ماہرین زبان صرف ایک زبان پر بحث کیا کرتے تھے۔ وہ ایک ہی زبان کے مطالعے سے نکلنے والے اصولوں کو تمام زبانوں پر منطبق کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ جدید تحقیق نے یہ مشترک اصول اور قوانین مسترد کر دیے ہیں۔ خاص طور پر صوتیات کی ابتدا انگریزی اور بعض یورپی زبانوں کے مطالعے سے ہوئی لیکن اُردو اور ہندی یا پشتو، پنجابی، سندھی، بلوچی وغیرہ کے سلسلے میں یہ اصول زیادہ کارآمد ثابت نہیں ہوئے۔

لسانیاتی یا لسانی تحقیق کار کے لیے لازم ہے کہ وہ نہ صرف اس زبان سے پوری طرح آگاہ ہو جس پر وہ کام کر رہا ہے بلکہ اس سے متعلق دیگر زبانوں سے بھی واقفیت رکھتا ہو جن کا حوالہ بار بار اس کے دیے گئے مواد اور کوائف میں جھلکتا ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ ان زبانوں کے اصل مقام، علاقے اور جگہ کے بارے میں سماجی اور تاریخی معلومات رکھتا ہو۔ خاص طور پر جغرافیائی معلومات اس پر مستزاد ہیں۔ یعنی ملک کی زمین کی نوعیت، آب وہوا کی کیفیت اور اثرات، ثقافت، موسموں کے تفاوت کا جائزہ لے۔ کیوں کہ یہ سب چیزیں ملک کے بسنے والوں کے خصائل، ان کے رسم ورواج کو متاثر کرتی ہیں اور زبان کی تشکیل میں سب کا حصہ بہت نمایاں ہے۔ لہٰذا تحقیق کے سلسلے میں تحقیق کار کو ان مخصوص حلقوں میں جانا ہوگا۔ لسانی تحقیق میں حلقہ جاتی کام کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ اس کے لیے تحقیق کار کو ایک ایسے اطلاع کار کی ضرورت ہوگی جو اس مخصوص علاقے سے تعلق اور پوری واقفیت رکھتا ہو اور جو مفید مواد فراہم کرنے میں مدد دے سکتا ہو۔ تحقیق کار کو اپنے مقالے کی تیاری کے لیے اپنے مخصوص علاقے کے لسانی حالات کا پورا پورا جائزہ لینا ہوتا ہے اور وہ جس زبان کے بارے میں تحقیق کر رہا ہو اس کے مختلف اسالیب اور ہیئتوں کا مطالعہ اصولی انداز میں کرنا چاہیے۔ اگر کسی تحریر کے مخصوص قلمی نسخوں کے بارے میں تحقیق کرنی ہو تو اسے اس مخصوص رسم الخط سے پوری پوری واقفیت ضروری ہوتی ہے۔ اس تحقیقی عمل میں جو باتیں کسی تحریری ماخذ سے حاصل نہیں ہو سکتیں انھیں وہاں کے مقامی لوگوں کے صدری علم اور سینہ بہ سینہ روایات کے ذریعے حاصل کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں مقامی بولیوں اور سماجی لسانیات کے محقق کو ان کی مدد کے لیے ایک سے زیادہ اطلاع کار درکار ہوتے ہیں جو قوم، مذہب، عمر، جنس اور پیشے کے اعتبار سے مختلف ہوں۔ اطلاع کار کی تربیت کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے تا کہ وہ اپنے کام کے مقصد اور اہمیت سے آگاہ ہو سکے۔ مواد کی فراہمی کے طریقے معروضی اور سائنسی ہوں۔ اس سلسلے میں کچھ اصول مقرر کیے جاسکتے ہیں اور کام کے لیے مدت کا تعین کیا جاسکتا ہے تا کہ اطلاع کار سہولت سے معلومات بہم پہنچائے۔

لسانیاتی تحقیق میں کئی طرح کا مواد فراہم کیا جاسکتا ہے۔ ذخیرہ الفاظ، فقرہ جات اور مختلف ساخت کے جملے۔ اس کے علاوہ ایک سے زیادہ کہانیاں یا تقریر، اسی مواد پر تحقیق کی تکمیل کا انحصار ہوتا ہے۔ ذخیرۂ الفاظ میں ان الفاظ کا استعمال صوتیات کے تجزیے کے لیے اور اصول وقواعد کے تعین کے سلسلے میں کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں چند باتیں ملحوظ رکھی جاتی ہیں کہ ذخیرۂ الفاظ وسیع سے وسیع تر ہو، جمع شدہ الفاظ کو ممکنہ حد تک زیادہ سے زیادہ حوالوں کے ساتھ استعمال کرکے جانچا جاتا ہے۔ ایک ہی لفظ کے مختلف تلفظ ہونے کی صورت میں صحیح تلفظ کا تعین کثرت استعمال کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں شان الحق حقی کی فرہنگ تلفظ (مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد) ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ نیز جملوں کی فہرست بنائی جاتی ہے۔ زبان کی وسعت اور ہمہ گیری کا اندازہ ایسی کہانی سے بھی ہوسکتا ہے جو عوام میں مقبول ہو۔

لسانیاتی مواد کو محفوظ کرنے کے لیے دستی تحریر اور ٹیپ کرنے کے طریقے استعمال کیے جاسکتے ہیں۔ جائزہ کاری کے لیے سوالنامے سے مدد لی جاسکتی ہے۔ جائزہ کاری میں کسی مخصوص مسئلے پر مختلف لوگوں کے خیالات جمع کرکے ان کا آپس میں موازنہ اور ان سے نتیجہ اخذ کرنا اس تحقیقی عمل کا ایک اہم جزو ہے۔ یہ عمل سوالنامے اور انٹرویو کے ذریعے ہوسکتا ہے۔

لسانی تحقیق کا خاص طور پر پاکستانی زبانوں میں ایک بڑا موضوع اشتراک واختلاف کے حوالے سے سامنے آتا ہے اور محض اصوات، حروف تہجی، الفاظ، صرف ونحو وغیرہ ہی کا تقابل کرلیا جاتا ہے جب کہ لسانیاتی بنیادوں پر اور بھی کئی پہلوؤں سے تحقیق انجام دی جاسکتی ہے۔ یہ تحقیق بیانیہ اور تجرباتی ہر دو طریقوں سے سامنے لائی جاسکتی ہے۔ اس مقصد کے لیے ادارہ مطالعۂ پاکستان، قائداعظم یونیورسٹی، اسلام آباد، اور FAST لاہور کی لسانی تحقیقات کو بھی پیش نظر رکھا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ لسانی پالیسی کے کئی موضوعات قابل توجہ ہیں۔ اُردو اور لسانی پالیسی کے علاوہ ڈاکٹر طارق رحمان اور ڈاکٹر قاسم بگھیو کی تحریریں قابل ذکر ہیں۔ عالمی پیمانوں جیسے ویبر (Weber) کا پیمانہ بھی پیش نظر رکھنا ہوگا۔

5- نمونے کی بعض تحقیقات

پاکستانی زبانوں میں تحقیق انجام دینے کے لیے ضروری ہے کہ اب تک ان زبانوں پر انجام دی گئی بعض تقابلی تحقیقات کا مختصر سا مطالعہ کرلیا جائے تاکہ انھیں بطور نمونہ دیکھتے ہوئے ان کے محاسن اور نقائص سے آگاہ ہوا جائے اور نیا تحقیقی ڈیزائن وضع کیا جاسکے۔

لسانیاتی تحقیق کا بنیادی سماجی لسانیاتی نمونہ ڈاکٹر انور شبنم دل کی معروف اور متداول کتاب **Pakistani Linguistics** سے مل جائے گا یا پھر تقابلی نمونہ عین الحق فرید کوٹی کی کتاب **Pre-Aryan Origins of Pakistani Languages** میں کسی حد تک دیکھا جاسکتا ہے۔ ''اخبار اُردو'' مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد کے شمارہ دسمبر 2004ء میں نیشنل یونیورسٹی FAST لاہور کی بعض لسانی تحقیقات اُردو، پنجابی اور سندھی کے حوالے سے شائع کی گئی ہیں، ان کا جائزہ اور مطالعہ مفید ہوگا۔ ڈاکٹر

میمن عبدالمجید سندھی کی کتاب لسانیات پاکستان میں اگرچہ پاکستانی زبانوں پر صوبہ وار الگ الگ ابواب دیے گئے ہیں لیکن آغاز میں ان کا باہمی تقابل بھی کیا گیا ہے۔ "اُردو اور وادی سندھ" کی زبانیں کے عنوان سے انھوں نے تاریخی پس منظر، لسانی تعلقات، زبانوں کے خاندان، منڈا اور آریائی زبانوں کے اثرات، سامی زبانوں کے اثرات، فارسی کے اثرات، ترکی کے اثرات، یورپی لوگوں کی آمد اور زبانوں کے اشتراک کے حوالے سے غذا، عام استعمال کی اشیاء، مدرسے کی چیزیں، رشتے ناتے، اعضائے جسم، جانوروں کے نام اور گنتی کے مشترک الفاظ پیش کیے ہیں۔

اُردو اور کسی ایک پاکستانی زبان کے تقابلی مطالعے میں ڈاکٹر مہر عبدالحق کی ملتانی زبان اور اس کا اُردو سے تعلق معرکے کی چیز ہے۔ اس میں زبان کی ماہیت اور عالمی تقسیم کے جائزے کے بعد آریائی زبانوں کی گروہ بندی، پراکرتیں، پنجابی، لہندا اور ملتانی کے ہند آریائی زبانوں میں مقام کا جائزہ لینے کے بعد ملتانی کے جغرافیے، ملتانی زبان کی خصوصیت، اس میں فارسی عربی کے الفاظ اور اس کی ہمسایہ زبانوں سندھی، بلوچی، پنجابی کا جائزہ لیا گیا ہے۔ بعد ازاں ملتانی ادبیات، ملتانی قواعد کی تفصیلات کے بعد ملتانی زبان کے اُردو سے تعلق کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ اس میں اُردوئے قدیم اور ملتانی، ملتانی اور اُردو کے اصول و قواعد اور بعض دلچسپ الفاظ کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ آخر میں اُردو کے پنجابی پن پر حافظ محمود شیرانی، سید سلیمان ندوی، علامہ راشدی، سنیتی کمار چٹرجی، ڈاکٹر زور وغیرہ کے نظریے کے بعد اپنا نقطۂ نظر بیان کیا ہے۔ زبانوں کے تقابلی مطالعے کے حوالے سے یہ ایک مفصل مطالعہ ہے۔

سماجی لسانیاتی مطالعوں کے حوالے سے ایک تقابلی بیانیہ تحقیق صبیحہ منصور نے اپنی کتاب "Punjabi, Urdu, English in Pakistan" کے نام سے انجام دی ہے، جس میں جدید تحقیقی طریق کار قرار پایا ہے۔ تعارف یا پہلے باب میں مطالعے کی اہمیت اور مطالعے کا پس منظر بیان کیا گیا ہے۔ دوسرے باب میں متعلقہ ادبیات/تحقیق کا مطالعہ لسانی رویوں کے حوالے سے کیا گیا ہے۔ تیسرے باب میں مطالعے کا استدلال و جواز، طریق کار طلبہ اور اساتذہ کے گروہوں وغیرہ کا ذکر ہے۔ چوتھے باب میں نتائج، پنجابی طلبہ، اُردو بولنے والے طلبہ اور ان کے تقابل، پاکستانی اساتذہ کے مطالعے کے حوالے سے پیش کیے گئے ہیں۔ بحث کے باب میں زبان اور لسانی گروہوں سے متعلق رویوں، لسانی رویوں کے نتائج، لسانی منصوبہ بندی کے لیے سفارشات وغیرہ دی گئی ہیں۔ ضمیمے میں سوالنامے، انٹرویو، جائزے کا چارٹ، کلوز (CLOZE) ٹیسٹ وغیرہ کے نمونے لگائے گئے ہیں۔

ادبیات کا تقابلی مطالعہ بھی پاکستانی زبانوں میں انجام دیا جا سکتا ہے۔ اُردو سے پاکستانی زبانوں میں ہونے والے تراجم، ناولوں، افسانوں کے بنیادی خیال اور پلاٹ وغیرہ کا تقابل کیا جا سکتا ہے۔ ادب کی مختلف اصناف، شعر و سخن میں تراکیب، طرز بیان، تغزل، ہیئت وغیرہ کا تقابل بھی قابل تحقیق موضوعات ہیں۔ سماجی اور نفسیاتی عناصر کا اشتراک بھی پاکستانی زبانوں کے ادب میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔

لسانی مطالعے کا بیانیہ نمونہ دیکھنے کے لیے ایک مثال قائداعظم یونیورسٹی کے شعبہ قومی ادارہ مطالعۂ

پاکستان کے کاموں سے لی جا سکتی ہے۔ اس شعبے نے Summer Institute of Linguistics کی طرف سے Sociological Survey of Northern Pakistan کے نام سے پانچ جلدوں پر مشتمل ایک مطالعہ 1992ء میں شائع کیا ہے۔ پہلی جلد کوہستان کی زبانوں پر مشتمل ہے۔ اس میں سوات کی زبانوں کے نمونے، اوشوجو اور کوہستانی زبانوں کے مطالعے کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ضمیمے میں طریق کار اور سروے کے کوائف درج کیے گئے ہیں۔ لسانی اشتراک جانچنے کا طریقہ بتایا گیا ہے۔ اس میں مصوتوں، مصمتوں، صوتیاتی اجزا اور دیگر صرفی تقابل کیے گئے ہیں۔ دوسری جلد میں شمالی علاقہ جات کی زبانوں بلتی، بروشسکی، وخی، دوماکی، اور شنائی بولیوں کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ ان کا تقابل پشتو اور اُردو سے بھی کیا گیا ہے۔ تیسری جلد میں ہندکو اور گوجری کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ہندکو بولنے والے افراد کے لسانی ماحول اور پاکستانی گوجروں کی بولیوں کی رنگارنگی اور متنوع زبان میں بولنے کے انداز کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ ان کا تقابل اُردو اور پشتو سے کیا گیا ہے۔ چوتھی جلد میں پشتو، وینگی اور اُڑمڑی زبانوں کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ پانچویں جلد چترال کی زبانوں کھوار، یدغا، پھلورا، کلاشا، دیمالی، کٹیوری، کموریں، شیخانی اور گوار بتی کا مطالعہ پشتو اور اُردو کے تقابل سے کیا گیا ہے۔ تمام جلدوں میں زبانوں کے جغرافیائی نقشے بھی شامل کیے گئے ہیں۔

ادارہ مطالعۂ پاکستان، قائداعظم یونیورسٹی نے شمالی علاقہ جات کی زبانوں پر جو تحقیق کی تھی، ان سب کا تحقیقی ڈیزائن ایک سا تھا۔ اس لیے کسی ایک نمونے کا مطالعہ تمام زبانوں کے ڈیزائن کا مطالعہ پیش کر دے گا۔ یہ مطالعات انگریزی میں پیش کیے گئے ہیں۔

اُردو اور پاکستانی زبانوں میں لسانیات پر تجرباتی تحقیق ابھی کسی فرد یا ادارے کی طرف سے سامنے نہیں آئی۔ یہ کام تدریسیات، نفسیات اور عمرانیات کے شعبوں میں بآسانی انجام پا سکتا ہے۔ مثلاً کوئی زبان سیکھنے کی راہ میں حائل مشکلات، ترجمہ کے ذریعے دوسری زبانوں کی تدریس وغیرہ ایسے موضوعات ہیں جن پر تجربے کیے جا سکتے ہیں۔ مختصراً یہ کہ ہم زبان کے حوالے سے جو دعوے کرتے ہیں، انھیں تجربے کے گھاٹ پر لا کر ثابت بھی تو کریں۔

ڈاکٹر طارق رحمان نے اپنی کتاب Language and Politics میں جو سوالات اٹھائے ہیں، ان کے جوابات علمی سے زیادہ جذباتی طور پر دیے جاتے ہیں۔ تحقیق کار کسی بھی مرحلے پر جذباتی نہیں ہوگا۔ اگر تحقیق سے میری مادری یا پسندیدہ زبان کے خلاف نتیجہ نکلتا ہے تو اسے قبول کر کے بیان کر دینا چاہیے۔ اسی سے زبان کی ترقی کے نئے راستے نکلیں گے۔

گیارھواں باب

تدوینِ متن

اُردو اور پاکستانی زبانوں میں بہت عرصہ تک تنقیدی مقالوں کے علاوہ صرف تصحیح و تدوین متن کو تحقیقی کام قرار دیا جاتا رہا اور محض ایک متن کو نک سک سے درست کر دینا ہی تحقیقی کارنامہ سمجھا گیا۔ یہ بجا کہ بہت سے اچھے متون عمدہ تحقیقی کاوش کے بعد تیار ہوئے لیکن جدید تحقیق کے اصولوں کے تحت ہم متن اور متنیت کو سمجھے بغیر اس کا کوئی دائرہ کار متعین نہیں کر سکتے۔

1- متن (Text)

متن کسی بھی بامعنی پیشکش کا نام ہے جو تحریری علامتوں کی صورت میں پیش کی گئی ہو۔ ادبی دنیا میں کسی ادب پارے کی تحریر میں خواہ مطبوعہ ہو یا غیر مطبوعہ اور لسانی امور میں زبان سے متعلق وہ حقائق، بیانات اور اعداد و شمار جو ورطۂ تحریر میں لائے گئے ہوں اور ان کی معنوی تفہیم ممکن ہو متن کہلاتے ہیں۔

ادبیات میں متن کو جاننے، اس میں معنی تلاش کرنے اور اس کو صحت کے ساتھ ترتیب دینے کو تحقیق میں شامل کیا جاتا ہے اور اسے ادبی تحقیق کہا جاتا ہے جبکہ اس کے لیے مناسب اصطلاح ''متنی تنقید'' یا درست طور پر ''تدوینِ متن'' ہے۔ انگریزی میں اسے Textual Criticism کہتے ہیں۔ اگرچہ اس میں تحقیق بھی انجام دی جاتی ہے لیکن کسی متن کی تدوین، تحقیق کے ڈسپلن کا حصہ نہیں ٹھہرتی، اس لیے اسے کامل تحقیق قرار دینا مشکل ہوگا، کیونکہ یہ کام کسی مستقل تحقیقی ڈیزائن کی بنا پر انجام نہیں پاتا۔ اس کے باوجود بڑے بڑے تحقیقی متن وجود میں آئے۔ انجیل کے نسخوں سے لے کر تدوینِ قرآن، تدوینِ حدیث، کئی گمشدہ اور نایاب نسخوں کی فراہمی، تدوین اور اشاعت اس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

پاک و ہند میں مقامی بولیوں اور زبانوں کے سیکڑوں لوک قصے اور لوک گیت ایسے ہیں جو کبھی ورطۂ تحریر میں نہ آئے لیکن آج تک انسانی سینوں میں محفوظ ہیں۔ اگر کوئی شخص انھیں مرتب کرنا چاہتا ہے تو ہمارے نقطۂ نظر سے وہ متن نہیں ہوں گے۔ متنی تنقید کے لیے صرف وہ کام متن کہلائے گا جو ہم تک تحریری شکل میں پہنچا ہے۔ یہ تحریر کاغذ پر، مطبوعہ یا غیر مطبوعہ، دھات کے مختلف ٹکڑوں، مٹی یا لکڑی کی بنائی ہوئی لوحوں، پتوں اور پتھوں یا چمڑوں چٹانوں وغیرہ کسی بھی چیز پر ہو سکتی ہے۔ متن نظم بھی ہو سکتا ہے اور نثر بھی۔ متن ہزاروں سال قدیم بھی ہو سکتا ہے اور ہمارے عہد کے کسی مصنف کی تحریر بھی۔ اس کے لیے زمانے اور وقت کی

قید نہیں۔ ہزاروں صفحات پر پھیلی ہوئی یا ایک سطر کی مختصر سی تحریر، دونوں متن کہلا سکتے ہیں۔

1- متنیت (Textuality)

متن کے اندر وہ کیا خصوصیات پائی جاتی ہیں جن کی بنا پر اسے متن اور ان خصوصیات کو متنیت (Textuality) کا نام دیا جاتا ہے، اس کے بارے میں تفصیل کے ساتھ تو بہت کم معلومات ملتی ہیں۔

قدیم مشرقی اور مغربی زبانوں کا کلاسیکی ادب زیادہ تر مخطوطات کی صورت میں ملتا ہے اور انھی قلمی نسخوں کی مدد سے ان کی ہیئت اور حدود تک رسائی ممکن ہے۔ مصادر کے لحاظ سے بھی متن مختلف الحیثیت ہوتے ہیں۔ بعض متنوں کی قلمی یا مطبوعہ صورت میں صرف ایک روایت دستیاب ہوتی ہے اور بعض کے متعدد قلمی نسخے ملتے ہیں اور بعض متنوں کے قلمی نسخے مختلف رسم الخط میں ملتے ہیں۔ معلومہ قلمی نسخوں میں سب سے اہم وہ قلمی نسخے ہو سکتے ہیں جو خود مؤلف یا مصنف کے قلم کے مرہونِ منت ہوں اور جن کے بارے میں داخلی و خارجی شہادت موجود ہو۔ یہ صاحبِ تصنیف کا اپنا خطی نسخہ ہے۔ ایسے کسی نسخے میں موجود متن کو "اساسی متن" قرار دیا جا سکتا ہے۔ دوسرے درجے پر ایسے قلمی نسخے آ سکتے ہیں جو مصنف کی نظر سے گزر چکے ہوں (شہادت موجود ہو) یا مصنف نے جن پر ... مصنف کے سامنے تیار کیے گئے ہوں یا جن کی تیاری میں مصنف کے کسی عزیز شاگرد ... ایسے متن کو فرقِ مراتب کے ساتھ "استشہادی متن" کہا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد ... قلمی نسخوں سے ... متن جنھیں مستند قرار دیا جائے "استنادی متن" کہنا مناسب ہوگا۔

مطبوعہ نسخوں میں بھی قدیم و جدید اور درجہ استناد کے اعتبار سے اہم اور غیر اہم کا فیصلہ انھی اور ایسے ہی ... جن متنوں کی کتابت شدہ روایت اور بروقت کاپیوں کی تصحیح خود مصنف نے کی ہو، اسے مطبوعہ متنوں میں "اساسی متن" کا درجہ دیا جا سکتا ہے لیکن اس کی پہچان بین میں بڑے حزم و احتیاط کی ضرورت ہے۔ اس کے ساتھ ان روایتوں (مطبوعہ) کی اہمیت زیادہ ہوگی جو صاحبِ متن کے قریب تر افراد یا زمانے سے تعلق رکھتی ہوں۔ ان کو "استنادی متن" میں شامل قرار دیا جا سکتا ہے۔ دیگر مطبوعہ شکل میں نسبتاً زیادہ معتبر متن کو "استشہادی متن" کی روایت کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ یہ تمام پہلو متنیت کے مختلف پہلو کہلاتے ہیں۔

2- متنی تنقید یا تدوین (Textual Criticism)

متن اصل اور اضافی صورتوں میں موجود ہوتا ہے۔ عموماً اضافی متن دستاویز کے حاشیے یا آخر میں درج ہوتا ہے لیکن بعض اوقات کچھ الحاقی متن بھی شامل ہوتا ہے جو اصل مصنف نے لکھا نہیں ہوتا۔ مصنف کے اصل متن کو اس کے اصل املا، الفاظ اور معنی میں دریافت کرنا متنی تنقید کہلاتا ہے۔ چونکہ اس کی پرکھ نقد و نظر کے اصولوں پر کی جاتی ہے، اس لیے اسے تنقیدِ متن بھی کہا جاتا ہے۔ دراصل کسی متن کا تنقیدی ایڈیشن تیار کرنے کا عمل متنی تنقید کہلاتا ہے۔ تدوین ممکن حد تک متنیت کو دریافت کر کے اسے علمی اصولوں کے مطابق

مرتب کرنے کا نام ہے۔ انگریزی میں اسے متنی تنقید (Textual Criticism) یا متنی تدوین کا نام دیا گیا ہے۔

تنقیدی ایڈیشن کا مطلب ہے کسی مصنف کے اصل یا اساسی متن کے حق میں جتنی شہادت ملتی ہے، اس کی مدد سے متن کو اس شکل میں پیش کرنا جیسے خود مصنف نے مبیضہ یا صاف مسودہ تیار کیا ہو۔

کاترے نے بھی اپنی کتاب میں یہی کہا ہے کہ متنی تنقید کا کام، مخطوطات کی داخلی کیفیات کی شہادت پر مصنف کے متن تک پہنچنے کی کوشش ہے۔

فریڈسن باورس نے متنی تنقید کا مقصد، مصنف کے متن کی اولین خالص پن (Purity) اور بعد از اں نظر ثانی کی بازیافت قرار دیا ہے۔ درآں حالیکہ بعد کے ایڈیشنوں میں مسخ واقع ہوگئی ہو۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے انگریزی اصطلاح Textual Criticism کا لفظی ترجمہ کرکے ''متنی تنقید'' کے نام سے کتاب لکھی۔ اردو تنقید کے مخصوص معنی ہیں: ''ادب پارے کی قدر بندی''۔ متنی تنقید سے ذہن قدر بندی کی طرف جاتا ہے اور التباس کا موجب بنتا ہے۔ ڈاکٹر گیان چند لکھتے ہیں کہ کسی درس گاہ میں ایک صاحب نے امتحان کا پرچہ بنایا۔ انھوں نے غلط فہمی کی بنا پر ایک سوال لکھا تھا:

''مندرجہ ذیل عبارت کی متنی تنقید کیجیے''۔

ان کی مراد محض تنقید سے تھی جو متن کی لفظیات پر بطور خاص مرکوز ہو۔ ''متنی تنقید'' کے لفظی اور صحیح معنی یہی معلوم ہوتے ہیں۔ اس لیے اس فن کو ''متنی تنقید'' نہ کہہ کر ''تدوینِ متن'' یا ''متنی تدوین'' کہنا بہتر ہے۔ واضح ہو کہ انگریزی میں تدوین کے فن کو ببلیو گرافی اور مدونِ متن کو ببلیو گرافر بھی کہتے ہیں۔ لندن میں تدوینِ متن کی ایک انجمن کا نام 'ببلیو گرافیکل سوسائٹی' ہے۔

اردو اور پاکستانی زبانوں میں ''تدوینِ متن'' سے بھی زیادہ مقبول اصطلاح ''ترتیبِ متن'' ہے۔ ترتیب کے معنی کسی شے کے اجزا کو مناسب تقویم و تاخیر سے رکھنا ہے۔ تدوین کے معنی متفرق اجزا کو اکٹھا کر کے ان کی شیرازہ بندی کرنا ہے۔ شعراء کے مجموعہ کلام کو اسی لیے دیوان کہا گیا کہ ان میں غزلیں اور نظمیں جمع کی جاتی تھیں۔ متفرق اور منتشر چیزوں کو یکجا کرنے کی مثال جواہر خسروی میں خسرو سے منسوب ہندی (اردو) کلام کو جمع کرنا ہے یا اقبال کے متفرق منسوخ کلام کو باقیاتِ اقبال کے نام سے اکٹھا کرنا ہے یا جیسے شاہ عبداللطیف بھٹائی کے متفرق کلام کو مرتب کرنا، خواجہ فرید یا خوش حال خٹک کی باقیات مرتب کرنا وغیرہ۔ چونکہ مجتمع کرنے میں بھی ایک ترتیب سے کام لیا جاتا ہے، اس لیے اس باب کے موضوع کی حد تک ترتیب اور تدوین میں کوئی فرق نہیں اور چونکہ ترتیب ایک عام لفظ ہے اور تدوین کا تعلق کتابوں سے ہے، اس لیے اس اصطلاح کو ترجیح دینی چاہیے یعنی ''تدوینِ متن'' کی اصطلاح استعمال کی جانی چاہیے۔

تدوینِ متن ایک پوری کتاب کا موضوع ہے۔ اس پر دو کتابیں اور ایک مجموعہ مضامین ملتا ہے۔ پہلی کتاب ڈاکٹر خلیق انجم کی متنی تنقید ہے۔ اسے ادارہ خرام پبلیکیشنز دہلی نے مارچ 1967ء میں شائع کیا۔ دوسری کتاب ڈاکٹر تنویر علوی کی اصولِ تحقیق و ترتیبِ متن دلی سے شائع ہوئی۔ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں اس

موضوع پر ایک سیمینار ہوا۔ ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے اس میں پڑھے گئے مقالات کو تدوینِ متن کے مسائل کے نام سے شائع کر دیا ہے۔ اس میں تاریخ طبع موجود نہیں۔

رشید حسن خان کے خیال میں تدوین تحقیق سے جدا فن ہے۔ وہ ہمارے نقطۂ نظر کے زیادہ قریب ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند کے نزدیک یہ تحقیق ہی کی ایک صورت بھی ہے۔ اس میں انھی صلاحیتوں اور ذہنی رجحان کی ضرورت ہوتی ہے جو تحقیق کے لیے درکار ہیں۔ اچھے مدون محققوں کے سوا کوئی دوسرے نہیں۔ اگرچہ یہ باضابطہ تحقیق نہیں مگر محمود شیرانی محقق تدوینِ متن کے بھی کچھ کام کرتا ہے۔ تاہم اسے باضابطہ یا اصولی تحقیق قرار نہیں دیا جا سکتا۔

2- متنی تنقید کی روایت

متنی تنقید، تدوین یا تحقیقِ متن کا آغاز اس وقت ہوا جب عیسائیت یونان میں پہنچی اور وہاں 200ء میں علمائے تورات نے علم (ایلو...) کا آغاز کیا۔ یونان ایک شاندار علمی روایت کا حامل تھا۔ سقراط، افلاطون، ارسطو جیسے بڑے بڑے نام اس سے وابستہ تھے۔ عیسائیت نے وہاں بائبل کے یونانی میں اور بعد ازاں روما کی طرف سے لاطینی روایت تحقیق ہونے پر لاطینی میں ترجمے کیے۔ اصل بائبل تو جانے کہاں رہ گئی۔ دنیا انھی یونانی اور لاطینی اور بعد ازاں انگریزی تراجم سے واقف ہوئی۔

پندرھویں صدی میں یونانی اور لاطینی متون، نسخوں اور مخطوطوں کو مرتب کرنے والا پہلا تحقیق کار اراسمس (Erasmus) تھا، جس نے 1516ء میں اس کام کا آغاز کیا اور معتبر متون ہی مرتب کیے۔ 1518ء میں آلڈس (Aldus) نے اراسمس ہی کے تلاش کردہ یونانی متون مرتب کیے۔ 1521ء میں گربل (Gerbel)، 1522ء میں سٹونیکا (Stunica) اور سیفالیوس (Cephalaeus) نے اراسمس کے کاموں کو آگے بڑھایا۔

1526ء میں ٹائن ڈیل (Tyndale) نے اراسمس کے مرتبہ مسودوں کو انگریزی میں تبدیل کیا۔ اس کے بعد کولنز (Colines)، کوورڈیل (Coverdale) اور روجرز (Rogers) انھی کاموں کو آگے بڑھاتے اور نظرِ ثانی کرتے رہے۔

اراسمس کے بعد دوسرا بڑا نام اسٹینے (Estienne) کا ہے جس نے 1546ء میں اراسمس اور سٹونیکا کے یونانی متون پر کام کیا۔ اس روایت کو وٹنگھم (Whittingham) (1557ء) اور بیزا (Beza) (1565ء) نے آگے بڑھایا۔

1592ء میں کلیمنٹ (Clement) نے اسٹینے کے لاطینی مسودات کی تدوین کی۔ بیزا کے کاموں کو سمتھ (Smith) اور ایلزیویر (Elzevir) نے اور 1657ء میں والٹن (Walton) نے آلات کی مدد سے پہلی بار متعدد زبانوں کے مسودات کی جانچ پرکھ کی۔ تکنیکی آلات کے استعمال کی یہ روایت کورسیلز (Courcelles) اور فیل (Fell) نے بڑھائی۔

متنی تنقید پر پہلا رسالہ یا کتابچہ 1689ء میں سائمن(Simon) نے تحریر کیا۔ یہ گویا اس علم پر پہلی باقاعدہ کتاب تھی۔ 1709ء میں لانگ (Long) نے پہلی بار مسودات کی وضاحتی کتابیات یا **Bibliography of Critical Literature** شائع کی۔ اس کے بعد ویلز(Wells)، بینگل(Bengel) نے اس روایت کو تنقیدی نگاہ بخشی۔

1730ء میں ویٹ سٹین(Wettstein) نے بھی متنی تنقید پر ایک کتابچہ شائع کیا۔ 1750ء میں ایک اور کتاب میکالیس(Michaelis) کی **Intoduction to Textual Criticism** تھی اور ولچ(Walch) کی کتابیات شائع ہوئی۔ 1763ء میں متنی تنقید پر برک(Burk) کے مقالات(Essays) کے نام سے شائع ہوئے۔ اگلے سال 1764ء میں سیملر (Semler) نے بھی متنی تنقید پر ایک کتابچہ شائع کیا۔

1767ء میں اس موضوع پر دو کتابیں سیملر (emler اور ہرووڈ(Harwood) نے شائع کیں۔ 1808ء میں کہیں جا کر ہمیں ہگ(Hug) کی کتاب **Introduction** نظر آتی ہے۔ اس کے بعد تو اس علم پر کتابوں کی ایک قطار لگ گئی۔

نشاۃ ثانیہ کے بعد یہ بحث زور پکڑنے لگی تھی۔ بائبل (عہد نامہ عتیق اور جدید) کے نسخے یونانی اور لاطینی ماخذوں کے علاوہ اصل میں کیا تھے۔ کیا واقعی یہ خدا کا کلام ہے یا انسانوں نے انھیں خود تحریر کیا ہے؟ کیا واقعی یونانی اور لاطینی تراجم درست ہیں یا مفاہیم بدل گئے ہیں۔ کسی مخطوطے یا دستاویز کو منتخب کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ مخطوطے یا دستاویز کی اغلاط کی نشاندہی کیوں کر کی جا سکتی ہے؟

اس کام کے لیے اٹھارویں صدی میں ایک جرمن سکالر فریڈرک ولف(Friedrich Wolf) (1759ء۔1824ء) نے جدید متنی تنقید کی بنیاد ڈالی۔ وہ کلاسیکل علم زبان (Philology) کا ماہر اور بانی تھا۔ اس کے علاوہ اس کے دو اور ماہرین عمانوایل بیکر (Immanuel Bekker) (1785ء۔1871ء) اور کارل لخمان(Karl Lachmann)(1793ء۔1851ء) تھے۔

بیکر نے یونانی متون اور مخطوطوں کو مرتب کرنے ہی میں ساری زندگی گزار دی اور کوئی 400 دستاویزات اور یونانی مصنفین کی ساٹھ کتابیں مرتب کیں۔

لخمان نے 1831ء میں یونانی متون کا تنقیدی مطالعہ کیا، تقابلی مطالعے کی بنیاد رکھی اور اصولِ مخطوطہ شناسی وضع کیے۔ بعد ازاں فان ٹشن ڈورف (L.F.C.Von Tischendorf) (1815ء۔1874ء) نے اس کے لیے مندرجہ ذیل چھ قوانین وضع کیے تا کہ یونانی کتابوں کے مخطوطوں کی تدوین ہو سکے:

1- متن قدیم ترین شہادت سے حاصل ہونا چاہیے۔
2- واحد یا وحید نسخہ ہمیشہ مشکوک ہوگا۔
3- مخطوطے کی غلطی پکڑنی چاہیے خواہ مسودے میں اس کے حق میں شواہد ملیں۔
4- کاتبوں اور ناقلوں کے موازنے سے ان کے رجحانات کو ملحوظ رکھیں۔

5- اس مخطوطے یا قرأت کو اہمیت دیں جو سب میں مشترک ہو۔

6- وہ مخطوطہ یا قرأت قابلِ اعتماد ہے جو مصنف کے اسلوب سے قریب تر ہے۔

1836ء میں بگ نے اپنی کتاب دوبارہ شائع کی۔ فان ٹش ڈورف اور لخمان نے اپنے تحقیقی کام آلات کی مدد سے انجام دیے جو 1852ء تک سامنے آتے رہے۔ 1861ء میں سکری ویز (Scrivener) کی کتاب Introduction شائع ہوئی۔ 1866ء میں متنی تنقید کی تاریخ پر پہلی کتاب اورے (Orme) کی Teatise تھی۔ اس کے بعد 1870ء میں ایک اور اصولی کتاب ویسٹ کاٹ (Westcott) نے Introduction کے نام سے شائع کی۔ 1872ء میں ایسی ہی ایک کتاب ہیمنڈ (Hammond) اور 1875ء میں سکری ویز نے ایک کتاب شائع کی۔ سکری ویز نے یہ کتاب ملر کے ساتھ مل کر 1894ء میں نظرِ ثانی کے بعد دوبارہ شائع کی۔ انیسویں صدی میں اس علم پر آخری کتاب لیک (Lake) اور گریگوری کی تھیں، جو 1900ء میں شائع ہوئیں۔

1908ء میں گریگوری نے یونانی مخطوطات کی ایک بہت بڑی فہرست شائع کی۔ 1925ء میں رابرٹ سن، 1935ء میں سوتر (Souter)، 1961ء میں ٹیلر، 1864ء میں میٹزگر (Metzger) اور گرین لی (Greenlee)، 1967ء میں مولٹن (Moulton) کی کتابیں اس علم پر وجود میں آئیں۔

1968ء میں پیپرس پر مخطوطات کے تعارف کے موضوع پر ایک کتاب ٹرنر (Turner) نے مرتب کی۔ 1974ء میں جدید حوالوں سے اس علم پر ایک کتاب فنیگان (Finegan) نے شائع کی۔ 1979ء میں ورتھ وین (Wurthwein) نے، 1981ء میں ایلنڈ (Aland) اور ایلنڈ نے، 1993ء میں ایپ (Epp) اور فی (Fee) اور اہرمان (Ehrman) نے اس موضوع پر اپنی اُصولی کتابیں شائع کیں۔ بیسویں صدی کی آخری کتاب اہرمان نے اپنی ہی کتاب کو ہولمز (Holmes) کے ساتھ مل کر 1995ء میں نظرِ ثانی کے بعد شائع کیا۔ یوں ہم جدید متنی تنقید کے دور تک پہنچ پاتے ہیں۔ ہمارے معاصر بہت سے ماہرین ہمارے سامنے آرہے ہیں، جو اس علم کے متعدد پہلوؤں پر تفصیلی بحث جاری رکھے ہوئے ہیں جیسے آلنگ، ہوئے، باورز، وغیرہ، جنھوں نے اس علم کو ادبی مخطوطوں کی تدوین تک وسیع کیا۔ اردو میں اسی پہلو سے پیروی کی جانے لگی ہے۔

جیروم میک گان (McGonn) اور پی آرون پوٹر (Potter) اس بات پر تشویش میں مبتلا ہیں کہ عالمانہ تدوین اور متنی علمیت برقیاتی آلات کے خطرے میں گھری ہوئی ہے۔ کسی پر واضح نہیں ہو رہا کہ یہ نئی دنیا کمپیوٹر کے ذریعے کیا کیا انقلاب لاسکتی ہے۔ آج سے پانچ سو سال پہلے چھاپے خانے کی ایجاد نے نشاۃ ثانیہ کی ابتدا کی تھی اور اب کمپیوٹر ایک اور نشاۃ ثالث لا رہا ہے۔ تحریر یا متن تو شاید آئندہ چند دہائیوں میں غائب ہونے والا ہے۔ اسی بات کے خدشات میں گھر کر 1992ء سے The Rossetti Archives نے یونیورسٹی آف ورجینیا میں ملٹی میڈیا کے ذریعے ایک برقیاتی تحقیق کا ماڈل وضع کیا، جس سے متنی تحقیق وتدوین انجام دی جاسکے گی۔ یہ ایک بہت بڑا کوائفیہ (Database) ہے اور برقیاتی متنیت کا ایک آغاز ہے۔ اس

سے متن سیال صورت میں قابلِ تدوین ہو رہا ہے۔ اس میں متن کا تجزیہ کمپیوٹر کرتا ہے۔ اس آلے سے کتاب شناسی میں آسانی پیدا ہوئی ہے۔

3- جدید متنی تدوین

متنی تنقید (Textual criticism) عیسائیت کے پیروکاروں اور اس کے نقادوں اور محققوں کی وضع کردہ ایک خاص اصطلاح ہے۔ لیکن یہ جانے بغیر کہ دراصل یہ میدان بائبل کے "ماخذوں" کی تفہیم اور تجہیل پر آمادہ پیکار لوگوں نے عیسائیت کے فروغ اور استرداد کے لیے تخلیق کیا، اُردو میں ادبی کام کرنے والوں نے اسے اُردو تحقیق کے متبادل کے طور پر پیش کرنا شروع کیا اور متنی تدوین کی ضرورتیں پوری کرنے لگے۔ وہاں یہ میدان اب اور آگے بڑھ چکا ہے اور بعض جدید تقاضے اعلیٰ متنی تنقید (Higher Textual Criticism) کے نام سے سامنے آنے لگے ہیں۔

اس میدانِ تحقیق کے لیے ایک اور اصطلاح تنقیدِ تسوید (Redaction Criticism) بھی استعمال ہوتی ہے۔ مقصود صحائف پر تحقیق اور ان کے "مصنفین" کا سراغ لگانا ہے تاکہ ان کے استناد اور جعل کو ثابت کیا جاسکے۔ ان تمام کاوشوں کا نتیجہ زیادہ تر بائبل کو رد کرنے ہی کے بارے میں نکلتا ہے۔ شاید اس کا یہی مقصود ہو کہ یہ ثابت کیا جاسکے کہ بائبل مختلف لوگوں کی لکھی ہوئی عبارتوں کا مجموعہ ہے۔

بائبل کی تدوین

بائبل پر کی گئی تحقیقات کے دو پہلو ہیں۔ پہلا متنی تنقید اور دوسرا اعلیٰ متنی تنقید ہے۔ پہلی کاوش متن کے اصل الفاظ کی دریافت ہے جبکہ ہمارے پاس اس کے اصل الفاظ موجود نہیں۔ دوسری متن کی اصلیت سے متعلق ہے کہ وہ متن حقیقت میں کب وجود میں آیا یا لکھا گیا اور کس نے لکھا؟ اُردو تحقیق کے اس پہلو کہ متن کی تدوین کے بعد متن پر تحقیق انجام دی جائے، پہلے کی نسبت زیادہ کارآمد اور مفید ہے۔ چنانچہ اعلیٰ متنی تنقید کو اُردو تحقیق کا ایک باب بنایا جاسکتا ہے جبکہ متنی تنقید کو صرف لفظی جائزے یا تدوینِ متن کے طور پر لیا جاسکتا ہے۔

اعلیٰ متنی تنقید کے ماہرین کا خیال ہے کہ بائبل محض زبانی روایات کی ایک تحریری صورت ہے اور کسی روح القدس نے انھیں لوگوں پر القا نہیں کیا اور عہد نامۂ قدیم بابل میں یہودیوں کی قید (۵۸۶ قبل مسیح) سے پہلے ورطۂ تحریر میں نہیں آیا۔ اگر حضرت موسیٰؑ کے دیے گئے قوانین اور پہلے پانچ صحائف حضرت موسیٰؑ کے زمانے میں تحریر نہیں ہوئے تھے تو یہ کب تحریر میں آئے تھے۔ اسی طرح اناجیل اگر حضرت عیسیٰؑ کے زمانے میں نہیں لکھی گئی تھیں اور عرصہ بعد محض زبانی روایات کے مرتبین نے انھیں وجود بخشا تو کیا یہ انھی مصنفین نے تحریر کی تھیں، جن کے نام "یوحنا"، "متی" وغیرہ دیے گئے ہیں یا کسی اور نے ان کی روایات کو قلم بند کیا تھا؟ مجموعی طور پر یہ تمام محققین انھیں الہامی تحریریں ماننے سے بنیادی طور پر انکاری ہوتے ہیں۔

لغات اور انسائیکلوپیڈیا میں اعلیٰ متنی تنقید کی تعریف کچھ اس طرح سے کی گئی ہے:

"بائبل پر تنقید کی ایک قسم جو متنی تنقید سے مختلف ہے۔ اس کا مقصود اعتزانی یا عقائداتی الٰہیات سے قطع نظر بائبل کے متن کی تشریح کرنا ہے۔ یہ بائبل کے متن پر وہی اصول لاگو کرتی ہے جو سائنسی اور تاریخی طریق سے اخذ ہوتے ہیں۔ یہ زیادہ تر داخلی شہادت پر مبنی ہے اور لسانیاتی کوائف اور آثاریات سے حاصل شدہ شواہد بھی استعمال میں آتے ہیں۔

بنیادی سوالات یہ ہیں کہ استناد کی دریافت، قرأت کی ترتیب و تنظیم کو متن کے مختلف ماخذوں سے جانچا جائے اور مصنفین کے تشخص اور نیتوں کو بھی ملحوظ رکھا جائے۔ اس کا آغاز جرمن سکالر جوہان سلوموسیملر (۹۱۔۱۷۲۵ء) سے ہوا تھا"

اعلیٰ متنی تنقید کا ایک بنیادی اصول ایک سکالر چارلس اے برگس (Briggs) (۱۸۴۱ء) سے سامنے آتا ہے۔ لیکن ۱۸۸۶ء میں یہ ایک سکالر گراف ولہوزن (Graf Wellhausen) کا فرضیہ (Hypothesis) کہلایا۔ اس کے نزدیک تورات چار ماخذوں سے وجود میں آئی۔ جنھیں ایک محرر (Redactor) R نے مرتب کیا۔ اس میں:

J: یہوائی (انسان نما خدا) ایک شخص تھا جو عبرانی کی ابتدائی صورت استعمال کرتا تھا، اور وہ P استعمال نہیں کرتا تھا۔

F: ایلوہی (انسان نما خدا) ایک شخص تھا جو عبرانی کے بعض قواعد کے مطابق ایلوہیم کہلاتا تھا، بعد میں یہوبہ (Yahweh) تھا۔ اس کی بنیادی دلچسپی بائبل اسرائیل اور شیلوہ کی پیشوائی تھا۔ اس کا اسلوب بھی P سے قدیم تر لیکن ذرا بہتر تھا۔

P: پیشواؤں کا ماخذ ایک دور اور بے رحم خدا جسے کبھی ایلوہیم اور کبھی ایل شدائی کہا گیا۔ یہ جزوی طور پر J اور E کی نقل تھا، لیکن تفاصیل کو اپنی ضرورت کے مطابق ادلتا بدلتا تھا۔ اس کی دلچسپی کا محور ہارونی پیشوائی اور شاہ حزقیاہ تھے۔ یہ نچلے درجے کا ادبی اسلوب استعمال کرتا تھا اور اسے فہرستوں اور تاریخوں سے دلچسپی تھی۔

D: یہ ڈوناہی (Deuteronomy) میں دلچسپی رکھتا تھا۔ اس نے یشوع، قضاۃ ۱، ۲، سموئیل ۱، ۲ اور سلاطین ۱، ۲ تحریر کیں۔ اسے شیلوہ کی پیشوائی اور بادشاہ یسعیاہ سے دلچسپی تھی۔ وہ P کی طرح کی عبرانی زبان استعمال کرتا تھا لیکن دوسرے ادبی اسلوب میں۔

اب انھی تمام لوگوں کو ملا کر ایک خدا مان لیں یا مختلف اشخاص یا عہد مان لیں یا متعدد افراد JEPD بہر حال ان کے نزدیک یہ ایک گروہ ہے۔ جس نے مل کر بائبل تحریر کی تھی۔

اعلیٰ متنی تنقید کے ان طریقوں سے ایک تحقیقی ڈیزائن وضع ہوا جو کسی نہ کسی ضرورت اور متنی یا دستاویزی فرضیے (Documentary Hypothesis) پر مبنی ہوتا ہے۔ پھر یہ ایک موزوں طریق تحقیق کو استعمال کرتی ہے تاکہ تحقیقی ڈیزائن کے لیے مطلوبہ معلومات فراہم ہو سکیں۔

نتائج کا تحقیقی ڈیزائن کے مطابق تجزیہ کیا جاتا ہے اور پھر اس کے نتائج شائع کیے جاتے ہیں۔ یہ تمام مراحل کسی معیار کے مطابق وضع کیے جاتے ہیں۔

معیارات کی تحقیق کے رہنما اصول تاریخی دستاویز کاری سے اخذ کیے جا سکتے ہیں۔ اس میں مقاصد سے لے کر سفارشات درج کرنے تک کے نکات بیان ہوتے ہیں۔

اعلیٰ متنی تنقید کسی کتاب (بائبل) کے مختلف نسخوں، ترجموں اور ادوار میں پیش کیے گئے متنوں میں غیر ارادی تبدیلیوں کو بھی ملحوظ رکھتی ہے اور اسے ایک بہت بڑا تحقیقی اصول مانتی ہے۔ اس کے علاوہ ہجوں اور قواعد کے لحاظ سے تبدیلیوں پر بھی نظر رکھتی ہے۔ بیری آر لسکی نے اس کے نکات واضح کیے ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اعلیٰ متنی تنقید کا واقعی کوئی تعلق سکالرشپ یا علمیت سے ہے یا یہ محض ایک تکنیک ہے۔ ڈاکٹر رابرٹ ڈک ولسن اس کے بارے میں کہتا ہے کہ اگر بائبل شکوک وشبہات کا شکار ہوئی ہے تو ایمان رکھنے والوں کو بھی اسی تکنیک اور اصولِ تحقیق کو اپنانا ہوگا۔ انھیں بھی تاریخ، قرائن، شواہد ہی کی روشنی میں اس کا جواب تلاش کرنا ہوگا جیسے ان سوالوں کا جواب کہ فارسی الفاظ بائبل سے غائب کیوں ہیں؟ یونانی الفاظ کیوں شامل ہیں؟ دانیال نے فارسی الفاظ کیوں استعمال کیے؟ عبرانی میں آرامی کیوں؟ عبرانی کے ادبی اسالیب کیا تھے؟ وغیرہ۔ یہ وہی قدیم علم الکلام کا اُسلوب ہے کہ ہر حال میں اپنے عقیدے کو تحقیق کے ذریعے درست ثابت کریں۔

دستاویزی فرضیہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ کوئی بھی متن یا دستاویز شک سے بالاتر نہیں۔ اس لیے ہمیں تحقیق انجام دینا ہوتی ہے۔

اغلاط کا مسئلہ

متنی تنقید کے دو اصول (۱) خارجی شواہد (۲) داخلی شواہد اور مخطوطوں کا امتزاج ہیں۔ اعلیٰ متنی تنقید میں دستاویزی فرضیہ کام کرتا ہے جس کا ذکر ہم تورات کے حوالے سے کر آئے ہیں۔ دانستہ یا غیر دانستہ اغلاط کا ایک ذکر ڈاکٹر خلیق انجم کے حوالے سے ہم کر آئے ہیں۔

اب کلین (Klein) کے حوالے سے دیکھتے ہیں:

(الف) غیر دانستہ یا غیر ارادی

1۔ تجنیس حرفی اور تجنیس شکل حرفی کا التباس (Similar letters)

2۔ تجنیس صوتی اور تجنیس صوتی حروف کا التباس (Sound alike)

3۔ ہم خاتمہ حذف یعنی یکساں خاتمہ پر حذفِ حروف (Homoeoteleuton)

4۔ ہم آغاز حذف یعنی یکساں آغاز پر حذفِ حروف (Homoeoarchton)

5۔ ہم نگاری یا دو حروف یا الفاظ کو ایک سا تحریر کرنا (Haplography)

6۔ مکرر نگاری یا لفظ یا حرف مکرر درج کرنا (Dittography)

7۔ لفظوں میں غلط فاصل ہونا یعنی الفاظ کا مل جانا
8۔ غلط حروفِ علت درج کرنا (Incorrect vocalization)
9۔ ماورائے دعوی یعنی الفاظ یا حروف الٹ پلٹ لکھنا (Meta thesis)
10۔ غلط مترادفات دینا (Substitution of synonyms)
11۔ کسی پیرا کے الفاظ ذرا سے بدل کر آگے لکھنا
12۔ متن میں حواشی یا تشریح شامل کر لینا

(ب) دانستہ یا ارادی

1۔ ہجوں یا قواعد میں تبدیلی
2۔ ہم آہنگی یا ملتے جلتے الفاظ اضافہ کرنا (Harmonization)
3۔ دو مختلف نسخے یا قرأتیں شامل کرنا (Conflation of variants)
4۔ نام اور کنیت شامل کر لینا
5۔ فاعل اور مفعول کی تشریح کرنا
6۔ کسی اور پیرے سے معلومات کا اضافہ کرنا
7۔ مشکل مقامات حذف کر دینا
8۔ غریب اور نادر الفاظ نکال کر بدل دینا

کتابی نسخوں کی تدوین کو سائنسی تحقیق کا جز و ماننے میں علمائے تحقیق کو ہمیشہ تامل رہا ہے جبکہ اعلیٰ متنی تنقید میں نسخہ پیمائی کو سائنسی طریقوں سے بھی رو بہ عمل لایا جا سکتا ہے۔ شرط صرف سائنسی ذہنیت اختیار کرنے کی ہے۔ دورِ جدید میں یہ کام کمپیوٹر کی مدد سے انجام دیا جا سکتا ہے۔ اطلاعیات کا میدان اس کے لیے خاصا سرگرم ہے۔ بنیادی اصول یہ ہے کہ دو نسخوں کو باہم جانچنے کے لیے اطلاعیات کا علم اور تکنیک استعمال کی جائے اور نظریۂ اطلاعات کے سافٹ ویر کو استعمال کر کے اس سے حاصل شدہ لفظیات کے "فاصلے" کا تجزیہ کیا جائے۔ نظریۂ اطلاعات کا یہ انداز شینون جیسے محقق نے برقیاتی ابلاغ کے حوالے سے پیش کیا تھا۔ آج یہ نظریہ کمپیوٹر سائنس، موبائل فون، خفیہ نگاری، حیاتیات اور طبیعیات کے علاوہ ابلاغ اور ادبیات کے لیے بھی استعمال ہو رہا ہے۔ یہ اکیسویں صدی کی پیداوار اور تحفہ ہے۔

ڈاکٹر خلیق انجم سے لے کر ڈاکٹر تنویر علوی، رشید حسن خان اور پھر ڈاکٹر گیان چند تک ہمارے اکثر قدیم اور روایتی محققین ہمیں نسخوں کے تنقیدی ایڈیشن شائع کرنے تک محدود کرتے رہے اور اسی کام کو تحقیق قرار دینے پر بضد تھے۔ تاہم یہ عالمانہ انتقاد یا علمی تنقیدی علیت کا اظہار تھا۔ انکشافِ متن (Heuristics) اور تنقیدِ متون (Recension) کو مسخ (Corruption) کے جس عمل کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اس کے لیے اصول بھی وضع ہوئے اور نسخوں کی تقدیم و تاخیر اور گروہ بندی کے کئی طریقے بھی سامنے آئے۔ اختلافِ نسخہ

جات معلوم کرنے کی بھی کئی تکنیکیں وضع کرنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن ہمارے اکثر تدوین کار کسی نسخے کی تدوین کے بعد ان سب باتوں کو درج کرنا تحقیق کی شان سمجھتے اور یوں "محقق" بننے کا عمل پورا کرتے۔ جدید سائنسی تحقیق میں یہ سب کچھ "گرد راہ" ہے جسے "منزل" پر موجود نہیں ہونا چاہیے مگر اُردو کے تدوین کاروں کا کیا کیا جائے کہ وہ اسی کی پیش کش کو تحقیق اعظم قرار دینے پر مُصر ہیں۔ اپنے آلات کار اور حساب کاری ہی کو "کارنامہ" سمجھتے ہیں۔ ایسے تمام پہلوؤں کو یہ سافٹ ویر سنبھال سکتا ہے۔ نتیجے کے طور پر نسخوں کی قدامت، استناد، الفاظ اور عبارتوں کی صحت اور درست نسخ کی بنیاد حاصل ہوتی ہے۔

4-روایتِ متن

متن کی روایت کی جڑیں حسیت کے فہم میں گڑی ہیں یعنی وہ متن کس طرح سے ہم تک پہنچا اور کن کن معانی میں پہنچا اسے حسیت کے حوالے سے دیکھ کر اس کی روایت کو جانچنا روایت متن کہلاتا ہے۔ اس حوالے سے ہم دیکھیں تو ہر متن مختلف مخطوطوں، نسخوں، بیانوں اور طباعتوں کے بعد ہم تک پہنچتا ہے۔

ہر متن ایک مستقل وجود ہے اور اپنی مختلف روایتوں کی شکل میں ایک سے زیادہ ذیلی وجود رکھتا ہے۔ ایسی صورت حال میں متنوں کی صحیح ہیئت اور جدید روایت کا تعین ایک نہایت مشکل مگر نتیجہ خیز کام ہے۔ جس کے لیے غیر معمولی سطح پر ذہنی کاوش اور جزئیات کی تلاش کا اہتمام ضروری ہوتا ہے۔ اس کے بغیر حتمی حقیقت تک رسائی ممکن نہیں۔

متن کی روایتیں تقریری بھی ہو سکتی ہیں اور تحریری بھی، دونوں صورتوں میں روایت و درایت کے اسلامی اصولوں کے تحت، روایتِ متن کی صحت وعدم صحت کے بارے میں کوئی فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔

1- متنی تبدیلیاں

"زبانی" تقریر کے مقابلے میں "تحریر" روایت کی اصل صورت کے تحفظ کا بڑا ذریعہ ہے لیکن نقل در نقل روایت کی صورت میں ان جانے میں بہت سی تبدیلیاں راہ پا جاتی ہیں۔ کبھی خود مصنف بھی غیر ارادی طور پر کچھ کا کچھ لکھ جاتا ہے جو اس کا مقصد نہیں ہوتا۔ یہی صورت کاتب کے ساتھ بھی پیش آ سکتی ہے۔ کبھی غلطی خود روایت نگار کرتا ہے اور کبھی وہ کسی دوسری روایت یا نسخے سے ماخوذ ہوتی ہے۔ جس کے باعث یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ ایک ہی قسم کی تبدیلی یا غلطی ایک سے زیادہ روایتوں میں ملتی ہے۔ یہ تبدیلیاں مختلف قسم کی ہوتی ہیں:

1- ترمیم: نامعلوم اسباب کے تحت ہونے والی تبدیلیاں، جن میں سہوِ نظر اور لغزشِ قلم بھی شامل ہیں۔

2- تعبیر: جس میں مبہم الفاظ کی وضاحت کے لیے کسی عبارت کو بڑھایا گیا ہو۔

3- تنسیخ: جس میں جان بوجھ کر کسی متن یا اجزائے متن کو منسوخ کیا گیا ہو۔

4- تصحیح: صاحبِ متن نے خود اپنی خواہش کے مطابق عبارت میں تبدیلی کی ہو۔

5- تصحیف: صاحبِ متن کے علاوہ کسی اور نے متن یا اجزائے متن میں دانستہ تبدیلی کی ہو۔

6- غلط انتساب: کبھی مصنف ارادتاً اپنی تصنیف کو از راہ عقیدت دوسرے کے نام کر دیتا ہے۔ کبھی

مصنفوں یا کتابوں کے ناموں کی مشابہت اور کبھی طرز ادا، خیالات، بحور و اوزان کی یکسانی اور کبھی خاص مقصد کے لیے بھی تبدیلی کی جاتی ہے۔

صورت حال خواہ کچھ بھی ہو، متنی حقائق کی جستجو کا مقصد متن کی صحیح حدود اور روایتوں کا تعین ہے۔اس کا فیصلہ کرنے کے لیے کہ متن میں کس نوعیت کی غلطی کہاں موجود ہے؟ گہری چھان بین، تقابلی مطالعہ اور نظرداری کی ضرورت ہے۔

اگر کسی متنی روایت کے ایک سے زیادہ قلمی یا مطبوعہ مآخذ موجود ہوں اور ان کے زمانہ تحریر کا تعین داخلی اور خارجی شہادتوں کی مدد سے ممکن ہو تو تدریج متن (Gradation of Text) کے اصول پر ان کے درجۂ استناد کا فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔تاہم اس پر تفصیلی بحث درکار ہے۔

2- ترتیب و قرأتِ متن

تحقیق کا ایک نہایت اہم دائرہ کار متن کی تحقیقی تدوین یا ترتیب کا ہے جو کسی روایت یا روایتوں کی محض جمع آوری و ترتیب دہی کے کام سے مختلف ہے۔یہ کام اساسی حیثیت رکھتا ہے۔

قدیم متنوں میں قرأتِ متن کا مسئلہ خصوصیت کے ساتھ اہم اور دشوار طلب ہے۔اس سلسلے میں کسی متن کی تقابلی روایتیں، مختلف زبانوں، ثقافتوں اور ملکوں کے باہمی روابط کو سمجھنے میں مدد دیتی ہیں۔اس کے علاوہ بہت سی مشتبہ یا مبہم روایتوں کی تفہیم میں بھی ان سے بڑی مدد مل سکتی ہے۔لفظ کی صحیح شکل کا تعین بسا اوقات تقابلی مطالعے کی روشنی میں آسان ہو جاتا ہے۔

متن کی تقابلی روایتوں کے مطالعے سے نہ صرف یہ کہ متن کی قرأت، تحقیق تصحیح اور تعیین روایت میں مدد ملتی ہے بلکہ اس کی حدود کا تعین بھی آسان ہو جاتا ہے۔داخلی اور خارجی شواہد کی روشنی بھی مطالعۂ متن کی الحاقی یا اضافی روایتوں کی نشان دہی میں معاون ہوتی ہے۔

ڈاکٹر تنویر علوی نے اپنی کتاب میں مخطوطات کے یہ مراتب طے کیے ہیں:۔

1- مصنف کے ہاتھ کا لکھا نسخہ۔
2- وہ نسخے جو مصنف کی زیرِ نگرانی تیار کیے گئے ہوں یا اس کی نظر سے گزر چکے ہوں۔
3- وہ نسخے جنھیں مصنف کے کسی نزدیکی فرد نے مرتب کیا ہو
4- وہ نسخے جنھیں خاص اہتمام سے تیار کیا گیا یا کسی مقتدر شخصیت کو پیش کیا گیا ہو۔
5- وہ نسخے جو قدیم ہوں یا خوش خط ہوں یا نسبتاً زیادہ جامع اور مکمل ہوں۔

3- تدوینی زمرے

تدوینِ متن کی تاریخ میں اس کے چار بڑے زمرے یا دھارے ملتے ہیں۔قدیم یونانی اور لاطینی نسخوں یا مخطوطوں کی تدوین: ہومر کی ایلیڈ اور اوڈیسی ایسی کتابیں ہیں جن کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ کئی صدیوں کے ارتقاء کا نتیجہ ہیں۔یونانی ڈراما نگاروں کے ڈرامے بھی تاریخ تصنیف سے کئی صدیوں کے بعد

تحریری شکل میں سامنے آئے۔ ان دونوں زبانوں کے شاہکاروں کی تدوین کے لیے، بہت بعد میں ''متنی تنقید'' کا فن وجود میں آیا۔ یہ بیسویں صدی کے دوسرے عشرے کی بات ہے۔

-2 سنسکرت متون کی تدوین: قدیم سنسکرت کتابیں: وید، پُران، رامائن، مہابھارت، قبل تاریخ کے متون ہیں۔ ان میں سے بعض کے بارے میں یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ یہ ایک ہی مصنف اور ایک ہی دور کی تخلیق ہیں۔ ان کا ارتقا صدیوں میں ہوا ہے۔ سنسکرت ادبیات کے شاہکار بھی تاریخی دھند لکے میں نہیں تو کم از کم غیر یقینی اسناد کی دھول میں لپٹے ہوئے ہیں۔ ان میں سے بعض کے مصنفوں، مثلاً کالی داس کے دور کا بھی صحیح اندازہ نہیں۔ سنسکرت نسخے اور مخطوطے بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ یہ برصغیر کے مختلف رسوم الخط میں ملتے ہیں۔ بعض اوقات ان میں ہزار سال سے زیادہ کا زمانی تفاوت ہوسکتا ہے۔ ان میں حجم اور متن کے بہت اختلافات ملتے ہیں۔ اس افراتفری میں ایک ترتیب پیدا کرنا، ایک معتبر نسخہ تیار کرنا کتنا مشکل، کتنا ضروری کام ہے۔ سنسکرت کی تدوین متن میں کارناموں کا بطور خاص خیال رکھا جائے گا۔

سنسکرت میں تدوین کے اہم کاموں کو پیش نظر رکھ کر ایس ایم کاترے نے اپنی کتاب لکھی:

S.M. Katre, Introduction to Indian Textual Criticism (Poona, 1941)

اس میں یونانی اور لاطینی نے تدوین متن کے اصولوں کا، بالخصوص ایف ڈبلیو ہال کے وضع کردہ قواعد کا سنسکرت تدوین پر اطلاق کیا ہے۔ ڈاکٹر گیان چند نے زیادہ تر اسی سے استفادہ کیا ہے۔ ملر (Mullar) نے سنسکرت، پالی، چینی اور بہت سی متنی روایات کو انگریزی میں مرتب کر کے شائع کیا ہے۔

-3 انگریزی ادب، بالخصوص شیکسپیئر کی تدوین: برطانیہ میں فن طباعت قدیم دور سے رائج ہے۔ جس کی وجہ سے انگریزی کے متون تقریباً مطبوعہ ملتے ہیں۔ انگریزی میں تدوین متن کی بحثوں میں مخطوطوں کا ذکر شاذ ہی ہوتا ہے، وہ مطبوعہ ایڈیشنوں کے گرد ہی گھومتی ہیں۔ انگریزی کا قدیم ترین بڑا شاعر چاسر ہے۔ اس کی مشہور کتاب کو دو مدونوں نے 80 مخطوطات کی مدد سے آٹھ جلدوں میں مدون کیا۔ لیکن انگریزی کی تدوین میں شیکسپیئر کے ڈراموں کے متون تیار کرنا اہم کارنامہ ہے۔ انگریزی کے قدیم مدونوں میں Mc Kerrow اور Sir William G Greg اور جدید میں Fredson Bowers اہم ہیں۔

-4 عربی، فارسی، اردو اور پاکستانی زبانوں کی روایت: یہ روایت اتنی مستحکم نہیں جتنی پہلی تین ہیں۔ ان زبانوں کی قدیم تحقیق میں علیحدہ سے تدوین متن کا شعبہ نہیں تھا۔ عربی میں قرآن مجید اور احادیث کی تدوینی روایت کے بعد بیسویں صدی میں تحقیق اور اس کی شاخ تدوین دونوں کے جدید ترین ضابطے مغربی اصولوں کو دیکھ کر بنائے گئے۔ اُردو میں مخطوطوں پر عالمانہ تدوین کی ابتدا محمود شیرانی اور مولانا امتیاز علی عرشی نے کی۔ تدوین کے فن پر کتابیں تو حال ہی میں لکھی گئیں۔ عربی فارسی کے کئی متون جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں مرتب کیے گئے۔ برصغیر میں مختلف ماہرین، محققین اور تحقیقی اداروں نے ادبی متون مرتب کیے، جن میں اُردو، پنجابی، پشتو، سندھی وغیرہ کے کئی ادب پاروں جیسے ہیر وارث شاہ، ابیات سلطان باہو، شاہ جو رسالو، کلام خوشحال خان خٹک، دیوان خواجہ فرید وغیرہ اور دیگر مقامی زبانوں کے متون شامل ہیں۔ مجلس ترقی ادب لاہور نے ڈراموں،

کلاسیکی شاعری اور سرسید کے مقالات کے سلسلے مرتب کرائے۔

جارج واٹسن نے لکھا ہے کہ انگریزی میں ابھی بہت سے اہم متن مدون نہیں کیے گئے۔ اگر انگریزی کا یہ حال ہے تو اُردو اور دیگر پاکستانی زبانوں کی صورت حال کے بارے میں تصور کیا جا سکتا ہے۔ یہاں تدوین کے جدید اصولوں کے مطابق معدودے چند متن ہی مدون کیے گئے ہیں۔ بہت سا کام ہونا باقی ہے۔ اردو میں تو مخطوطات کی اکثر فہرستیں شائع ہوتی رہی ہیں۔ اردو میں مشفق خواجہ، پنجابی میں کسی حد تک ڈاکٹر شہباز ملک جیسے محققین نے مخطوطات کی فہرستیں شائع کی ہیں لیکن ابھی بہت سا کام ہونا سبھی زبانوں میں باقی ہے۔

5- تالیفِ متن

تالیفِ متن کو عام طور پر تدوین سے قبل کا عمل قرار دیا جاتا ہے۔ کسی بھی متن کے مختلف نسخوں کی فراہمی، نقل، نسخوں کی گروہ بندی اور موازنہ کرنے کا عمل اس درجے پر انجام دیا جاتا ہے۔

واضح ہو کہ مخطوطات اور مطبوعات کی تدوین کے اصول مختلف ہوتے ہیں۔ جن زبانوں میں کتابیں ٹائپ میں چھاپی جاتی ہیں وہاں دونوں کا طریق کار بہت مختلف ہوتا ہے۔ ٹائپ میں کمپوزیٹر حروف کو جوڑتا ہے جس میں غلطی کی گنجائش کم رہتی ہے۔ کتابت کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔ وہاں مصنف اور قاری کے بیچ ایک اور شخص کے قلم کی کارفرمائی (کتابت) دخل انداز ہوتی ہے۔ مطبوعات کے مختلف ایڈیشن ایک دوسرے پر مبنی ہوتے ہیں۔ جس قلمی یا مطبوعہ نسخے سے بعد کی نقل تیار کی جائے، اسے انگریزی میں Exemplar (خطی نسخہ یا مخطوطہ) کہتے ہیں۔ مصنف کے ہاتھ کے لکھے ہوئے نیز اس کے ہاتھ کے ٹائپ کیے ہوئے نسخے کو Autograph (خود نوشتہ مخطوطہ) کہتے ہیں۔ جو صاف نسخہ تیار کر کے طباعت کے لیے دیا جاتا ہے اسے مبیضہ یا تحقیقی متن (Copy Text) کہتے ہیں۔ قلمی نسخے یا مخطوطے کا ماخذی نسخہ اور آخر الذکر کے بھی اوپر کا ماخذی نسخہ بہت کچھ مختلف ہو سکتے ہیں جب کہ مطبوعہ ایڈیشنوں میں ایسا کم ہوتا ہے۔

6- عملِ تدوین

کاترے نے لکھا ہے کہ تدوینِ متن کے عمل کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

1- تنقیدِ متون (Recension)۔
2- تصحیحِ متون (Emendation)۔

یعنی جو کچھ تحریری شکل میں دستیاب ہے، اس میں کچھ اگر صریحاً غلط ہے تو اس کی تصحیح۔ بعد میں کاترے نے اسے بڑھا کر عملِ تدوین کے چار مرحلے قرار دیے۔

1- انکشافِ متون (Heuristics) یعنی مختلف ماخذ سے مواد کی تلاش۔
2- تنقیدِ متون (Recension) یعنی مختلف نسخوں کی تنقید کر کے قابلِ اعتماد مخطوطات کا انتخاب۔
3- تصحیحِ متون (Emendation) یعنی مختلف مخطوطات کی، جہاں مصنف کے اصل لفظ کو فراہم نہیں کر سکتے، وہاں تصحیح کے ذریعے بازیافت۔

4- تنقیدِ اعلیٰ (Higher Criticism) اس میں مصنف کے ماخذ وغیرہ کو دریافت کیا جاتا ہے۔
آخر الذکر تدوینِ متن کا جزو نہیں بلکہ عام ادبی تحقیق کے تحت آتا ہے۔ ہم اسے فی الحال نظر انداز کر سکتے ہیں۔ دوسری اور تیسری منزل بھی دراصل ایک ہی ہیں۔ نسخوں میں سے انتخاب کر کے متن تیار کرنے کے لیے تصحیح کا عمل دخل بھی ساتھ ساتھ چلے گا۔ اس سے بہتر یہ ہے کہ محض متن کی حد تک تین منزلیں قرار دی جائیں:

ا۔ تلاشِ ماخذ یا مواد کی تلاش کرنا۔
ب۔ مختلف نسخوں کے اندراجات کا موازنہ (Collation)۔
ج۔ مختلف اندراجات میں سے چن کر تنقیدی متن تیار کرنا۔ انگریزی میں نقدِ متون (Critical Recension) واضح متن (Definitive Text) کہتے ہیں۔

الف۔ انکشافِ متون یا تلاشِ ماخذ

ماخذ کی جستجو اور معیار بندی انکشافِ متن کہلاتی ہے، جس کے لیے وسائل و مصادر کی طرف رجوع ایک ناگزیر صورت ہے۔ اس لیے کسی متن کو تحقیقی طور پر مرتب کرنے کے لیے سب سے پہلا اور ضروری کام ایسے ماخذ کی جستجو اور سند کی دریافت ہے جن پر اس متن کی اساس قائم کی جا سکے اور جن کی مدد سے اس سے متعلق دوسرے ضروری مسائل کی تحقیق اور توجیہہ ممکن ہو سکے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں وسائل کی کمی نے تحقیق کاروں کی دشواریوں میں اضافہ کر دیا ہے۔ وہ اپنے مطلوبہ مواد اور متعلقہ مصادر تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے۔

اپنے ہاں ایسے کتاب خانے بہت کم ہیں جن کی توضیحی فہرستیں چھپ گئی ہوں تاہم اجمالی فہرستوں سے کم و بیش ضروری باتوں کا علم ہو جاتا ہے لیکن وضاحتی فہرستوں کی عدم موجودگی میں یہ جاننا دشوار ہوتا ہے کہ کسی مخطوطے یا مطبوعہ نسخے کی اہمیت اس موضوعِ تحقیق سے متعلق کیا ہے یا پھر کیا ہو سکتی ہے۔ اگر کسی نسخے کے بارے میں صحیح معلومات حاصل ہو جائیں تو اس کی طرف رجوع کرنا اور اس سے استفادے میں سہولت رہتی ہے۔ موضوع سے متعلق اہم نسخوں کے مقابلے میں غیر اہم نسخوں پر ایک سرسری نظر ڈالنا بھی بعض حالتوں میں کافی ہو سکتا ہے۔

دیگر تحقیق کاروں کی فراہم کردہ معلومات اور اطلاعات بھی مفید ہو سکتی ہیں لیکن کسی تحریر یا متن کا ذاتی مطالعہ کبھی کبھی نہایت اہم اور غیر متوقع نتائج تک پہنچا دیتا ہے۔ بڑے بڑے کتب خانوں کے علاوہ ممکن ہو تو ذاتی ذخیروں سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ بعض اہلِ علم سے مشورہ یا مراسلت بھی کبھی کبھی گراں قدر معلومات یا اہم دریافتوں تک رسائی کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

کسی موضوع سے متعلق مصادر تک رسائی کے لیے کتب خانوں کی فہرست کے مطالعے کے علاوہ اشاعتی اداروں کی فہرستوں پر بھی ایک نظر ڈالنا مفید ہو سکتا ہے۔ اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس موضوع پر یہ

کتابیں اشاعت پذیر ہو چکی ہیں۔

بعض علمی مقالوں اور تحقیقی کتابوں کے مآخذ اور حواشی پر نظر ڈالنے سے بھی، مطبوعہ مآخذ کی دریافت میں سہولت ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ مختلف موضوعات پر تحقیق اور ترتیب کے سلسلے کا ضروری اور کبھی کبھی بہت اہم مواد تحقیقی صحیفوں اور علمی جریدوں میں بکھرا ہوا مل جاتا ہے۔

٥ معلومات کے تمام وسائل اور تفہیم کے تمام ممکن ذرائع تک رسائی اور ان کے مطالعے کے بعد اساسی مآخذ ذیلی، ضمنی اور اضافی مآخذ علیحدہ کر لیے جائیں۔ اساسی مآخذ کا اطلاق ان مصادر پر ہو سکتا ہے جن کا اس موضوع سے تعلق ہو یا جن سے رجوع اور استفادے کے بغیر، اس متن کی تحقیق و ترتیب ممکن نہ ہو۔ اگر کسی متن کے متعدد نسخے موجود ہوں تو ان سے حسب ضرورت استفادہ کیا جا سکتا ہے لیکن صرف اہم اور قدیم نسخے ہی متن کی اساس بنائے جا سکتے ہیں۔

ترتیب متن کا کام سائنسی نہ ہوتے ہوئے بھی ایک سائنسی طریق کار کا تقاضا کرتا ہے۔ اس کے لیے ذہنی تربیت کی ضرورت ہے۔ یہ تربیت محض تدوین کے مختلف مرحلوں کی مشق کرنے سے حاصل ہو سکتی ہے۔ کسی کتاب کی تدوین کے لیے اس کے جملہ قلمی اور مطبوعہ نسخے فراہم کرنے چاہئیں۔ چوں کہ عملاً ایسا مشکل ہے، اس لیے اہم نسخوں کی مدد لینا کافی ہے۔ اہم اور غیر اہم نسخوں کی شناخت کے لیے انھیں جا کر دیکھنا ضروری ہے۔ اردو اور پاکستانی زبانوں میں مخطوطات کی وضاحتی فہرستیں کم ملتی ہیں۔ جن کتب خانوں کی فہرستیں موجود ہیں وہ بھی کتب خانے کی موجودہ صورت حال کو پیش نہیں کرتیں۔ بعض نسخے گم ہو گئے ہوں گے، بعض نئے نسخوں کا اضافہ ہو گیا ہوگا۔ فہرستوں کو دیکھ کر، اس موضوع سے متعلق کتابیں پڑھ کر، ماہرین موضوع سے استفسار کر کے، نیز بڑے کتب خانوں میں جا کر اہم مخطوطات کا پتا چل جائے گا۔ اب مشکل یہ درپیش آئے گی کہ نسخوں کو کیسے حاصل کیا جائے۔

بہت کم کتب خانے دوسرے کتب خانوں کو اپنے مخطوطات مستعار دیتے ہیں۔ اصل مخطوطہ نہ ملنے کی صورت میں اس کا عکس حاصل کرنا چاہیے۔ مغربی لائبریریاں بآسانی عکس فراہم کر دیتی ہیں لیکن ہمارے کتب خانوں سے عکس لینا ایک مشکل کام ہے۔ بعض کتب خانے عکس لینے کی اجازت ہی نہیں دیتے۔ درس گاہوں کے شعبے اور لائبریریاں اتنے مصارف ادا کرنے میں پہلوتہی کرتی ہیں۔

نجی ملکیت کے مخطوطات میں سے بعض تو ذاتی تعلقات کے طفیل حاصل ہو سکتے ہیں۔ بیشتر صورتوں میں نہیں مل سکتے۔ خلیق انجم متنی تنقید میں لکھتے ہیں کہ ایک جاگیردار خاندان کے فرد ان کے دوست تھے۔ ان کے پاس کلیات سودا کا ایک نسخہ تھا۔ وہ دکھانے میں ٹال مٹول کرتے رہے، زیادہ تقاضا کرنے پر وہ ایک کوٹھڑی میں سے ایک بوری لائے اور اس میں سے کئی نسخے الٹ دیے۔ ان میں کلیات سودا کا نسخہ بھی تھا۔ انھوں نے اسے ساتھ لے جانے کی اجازت نہ دی، کیوں کہ یہ ان کے بزرگوں کی نشانی تھا۔ آخر خلیق صاحب کو وہاں تین چار دن ٹھہر کر استفادہ کرنا پڑا۔ بعد میں ان صاحب نے مخطوطات کو بوری میں واپس بھر کر رکھ دیا۔

ایسے لوگ علمی دفینے کے سانپ ہیں اور اس سے بھی بدتر صورت وہ ہے جب مالک یہ بتانے کو بھی

تیار نہ ہو کہ اس کے پاس مخطوطہ ہے کہ نہیں۔ اگر ہے تو وہ دکھانے کو تیار نہیں ہوتا۔
اس سے ظاہر ہے کہ تحقیق کار مخطوطوں کے بھی مالک کو اپنے اخلاق اور چرب زبانی سے متاثر کر کے ہی نسخے کو دیکھ سکتا ہے۔ چوں کہ محض چند بااثر افراد ہی مخطوطے یا ان کے عکس حاصل کر سکتے ہیں اس لیے دوسرے حضرات کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں بچتا کہ اپنا نسخوں کو لے کر گھو میں اور وہاں قیام کر کے موازنہ کر لیں۔

اگر زیرِ تدوین متن اس سے پہلے شائع ہو چکا ہے تو تمام مطبوعہ ایڈیشن فراہم کریں۔ اگر کوئی مقبول متن بار بار مختلف ناشرین نے چھاپا ہے تو اس کے قدیمی ایڈیشن نیز بعد کے اہم ایڈیشن سامنے رکھیں۔ اہم تر ایڈیشن ضرور سامنے رکھیں۔ بیشتر متون کی یہ صورت ہوتی ہے کہ کچھ مخطوطات اور کچھ مطبوعہ ایڈیشن دونوں ملتے ہیں۔ قدیم ادب، بالخصوص پاکستانی زبانوں کے ادب کی بہت سی اہم کتابیں ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں۔ ان کے مخطوطات ہی سے تدوین کرنا ہوگی۔

زیرِ تدوین متن کے کچھ حصے اور اقتباسات بعض دوسری کتابوں میں بھی مل سکتے ہیں۔ ممکنہ مصادر یہ ہیں:۔

1- تذکروں میں نمونۂ کلام۔
2- زبانوں کی تاریخیں، ملفوظات کے مجموعے اور سفرنامے۔
3- قواعد اور بلاغت کی کتابوں میں نمونے۔
4- لغات میں مثالیں۔
5- بیاض، کشکول، مشاعروں کے گلدستے یا گلدستوں پر مشتمل رسالے۔
6- رسائل۔
7- تراجم۔
8- پیروڈی وغیرہ۔
9- جامعات کے تحقیقی مقالات۔

کاترے نے اپنی کتاب میں جابجا یورپی کلاسیکی متون کی تدوینی اصطلاحات کو استعمال کیا ہے۔ مندرجہ بالا جزوی مآخذ کو انگریزی میں صیغہ واحد میں Testimonium اور جمع میں Testimonia کہتے ہیں۔ اردو میں انھیں جزوی مصادر کہہ سکتے ہیں۔ نثر ہو یا نظم، ہر متن کے کچھ اشعار یا جملے ان مصادر میں مل جاتے ہیں۔ ان سے استفادہ ضروری ہے۔

1- نقول کی قسمیں

مصنف کے نسخے کو آٹوگراف یا خود نوشتہ کہتے ہیں۔ تدوینِ متن میں ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ مصنف کے ہاتھ کا مکمل نسخہ مل جائے۔ خود مصنف بھی مبیضہ تیار کرنے میں لغزشِ قلم کے سبب کچھ غلطیاں کر سکتا ہے

لیکن اس کا ناقل تو اس سے بھی زیادہ غلطیاں کرے گا۔

بقول ڈاکٹر گیان چند:

''اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ دوسرے کی دستی تحریر کو پڑھنے میں کہیں کہیں غلط فہمی ہو جاتی ہے۔ کوئی بھی ناقل گھنٹوں، دنوں اور مہینوں تک مسلسل ہو بہو نقل نہیں کر سکتا۔ بصری، نفسیاتی اور علمی وجوہ سے کچھ نہ کچھ اختلاف یا اغلاط شامل ہو ہی جاتی ہیں۔ ناقل حروف کی نہیں، لفظ کی نقل کرتا ہے۔ مدون کو نقل در نقل...... الخ سے واسطہ پڑتا ہے۔ کاترے نے حساب لگایا ہے کہ اگر ایک ناقل 3 فی صد غلطی کرے تو اس کی نقل 97 فی صد ہی درست ہوگی، اس سے نقل کرنے والے کی 94.09 فی صد اور اس سے بھی نقل کرنے والے کی 91.17 فی صد۔ ٹائپ کے ذریعے طباعت والے متون میں غلطی کا تناسب کم ہوتا ہے۔ ایک ایڈیشن سے دوسرا ایڈیشن ناپا جائے گا تو برائے نام ہی فرق ہوگا لیکن اردو میں نستعلیق طباعت میں ہر ایڈیشن میں کاتب کی دستی نقل درمیان آتی ہے اس لیے یہاں مطبوعات میں بھی اغلاطِ نقل کا تناسب وہی رہے گا۔ جدید دور میں پروف خوانوں کی نیم خواندگی کے باعث اغلاط مزید بڑھ رہی ہیں۔

ظاہر ہے کہ بعد کے تمام نسخے اور ایڈیشن مصنف کے خود نوشتہ (آٹو گراف Autograph) سے نکلتے ہیں۔ ان کے بعد کے پھیلاؤ کو تشعیر (Transmission) کہتے ہیں۔ انسائیکلوپیڈیا امریکانا کے مطابق یہ تین قسم کی ہوتی ہے۔

1- سادہ یا جدی (Ancestoral): اس میں ایک نسخے سے دوسرا نسخہ اور دوسرے سے تیسرا نسخہ نقل کیا جاتا ہے علیٰ ہذا القیاس۔ یہ عمودی تشعیر مخطوطات میں کم اور مطبوعات میں زیادہ ملتی ہے۔

2- افقی (Collateral): یہ وہ صورت ہے جب کسی نسخے سے دوسرا نسخہ یا ایڈیشن تیار کیا گیا اور اسی اولیں نسخے یا ایڈیشن سے کوئی اور نسخہ یا ایڈیشن۔ اس طرح بعد کے دو چچیرے ممیرے بھائیوں کی طرح مساوی حیثیت کے ہوتے ہیں۔

دیوان غالب کے تیسرے ایڈیشن سے ایک طرف مطبع نظامی کانپور کا چوتھا ایڈیشن تیار کیا گیا، دوسری طرف اسی تیسرے ایڈیشن سے مطبع شوزاین آگرہ کا پانچواں ایڈیشن چھاپا گیا۔ مخطوطات میں بھی ایسا ہوتا ہے لیکن ہمیں اس کا علم نہیں ہوتا۔

3- مخلوط (Mixed): جب کسی کتاب کے دو ایسے نسخے یا ایڈیشن ملیں جن میں بہت اختلاف ہو اور یہ طے نہ کیا جا سکے کہ کس کا استناد زیادہ ہے اور کس کا کم تو ایسی صورت کو مخلوط تشعیر کہتے ہیں''۔

جیسے پنجابی میں ہیر وارث شاہ کے پرانے نسخوں اور بلھے شاہ کے مطبوعہ کلام کے کئی نسخوں میں ایسا ہی اختلاف پایا جاتا ہے۔ کاترے نے مخطوطات کی تمشیر کی دو قسمیں کی ہیں۔ ایک وہ جو اہلِ اقتدار یا اہلِ علم کی خواہش پر تیار کرائی جاتی ہے، دوسری من مانی یا غیر مصدقہ جو کم علم و کم سواد کاتبوں کا کارنامہ ہوتی تھی۔ بیشتر نسخے دوسری قسم کے ہوتے ہیں۔

2- تمسیخ (Corruption)

ہر قسم کے مخطوطوں میں اغلاط کی دو قسمیں ہوتی ہیں: ہیئتی اور معنوی یعنی سوادی۔ نذیر احمد، کاترے، خلیق انجم اور تنویر علوی نے مخطوطوں میں کاتب کی اغلاط اور قاری کے سہو قرأت کی تفصیلات دی ہیں۔ نذیر احمد نے عربی رسم خط میں خرابیوں کی تفصیل دیتے ہوئے کہا ہے کہ جن زبانوں نے عربی سے اپنا خط ماخوذ کیا ہے ان زبانوں کی کتابیں دوسری زبانوں کی کتابوں کے مقابلے میں اپنی اصل سے زیادہ دور جا پڑی ہیں۔ عربی رسم خط کی چند قباحتیں حسب ذیل ہیں:۔

1- عربی میں بہت سے حروف کا تعین محض نقطوں سے ہوتا ہے۔ کاتب نقطے لگانے میں صحت نہیں برتتا۔ وہ صحیح شوشے یا دندانے کے ساتھ نقطے نہیں لکھتا بلکہ دور لکھ دیتا ہے۔ وہ پورے نقطے نہیں لگاتا اور اس میں کسی اصول کی پابندی نہیں کرتا۔ ایک حرف پر کہیں نقطے لگاتا ہے، کہیں نہیں لگاتا۔ دو یا تین نقطوں کو ملا کر لکھنے سے پتا نہیں چلتا کہ یہ ایک نقطہ ہے یا دو یا تین؟ ڈاکٹر خلیق انجم نے قاضی عبدالودود سے لے کر ایک مثال درج کی ہے کہ ڈاکٹر زور نے تذکرہ مخطوطات اُردو جلد 4 میں کلیات جعفر زٹلی کے تعارف میں لکھا ہے کہ اس میں شاہ حاتم کی ہجو ہے۔ قاضی صاحب نے معلوم کیا کہ یہ کسی عورت شاہ خانم کی ہجو ہے۔ اب یہی وقت کمپیوٹر کی کمپوزنگ میں آ رہی ہے۔ کہیں اس کا انداز بدل گیا ہے۔

2- اس رسم خط میں حروف ملا کر لکھے جاتے ہیں اور جوڑ کی شکل میں بیشتر حروف کی ابتدائی اور درمیانی شکلیں نہایت مختصر ہو جاتی ہیں۔ محض شوشوں اور دندانوں سے حروف کی تعیین کی جاتی ہے۔ ان میں نقطے آگے پیچھے یا کم زیادہ ہو جائیں تو حروف و لفظ کے تعین میں گڑبڑ ہو جاتی ہے۔

3- جو حروف عربی میں نہیں ہوتے اور فارسی یا اُردو یا پاکستانی زبانوں میں اضافہ کیے گئے وہ ہمیشہ بدنظمی کا شکار رہے۔ فارسی کے خاص حروف پ، چ، ژ، گ ہیں۔ ابتدائی تین حروف کو کاتب حسب خواہش محض ایک نقطے سے لکھ دیتا ہے تا کہ عربی خط کی تقلید ہو۔ گ کا دوسرا کش اُردو میں تو انیسویں صدی کے وسط کے بعد ملا۔ اس سے پہلے ک گ میں کوئی تمیز نہ تھی۔ پشتو، سرائیکی اور سندھی میں ایک ایک حرف کی کئی صورتیں ملتی ہیں۔

4- اُردو میں عربی فارسی کے برعکس ہائے مخلوط کی آواز بھی ہے۔ انیسویں صدی کی ابتدا سے فورٹ ولیم کالج میں اس کے لیے دو چشمی ھ مخصوص کر دی گئی لیکن عام تحریروں میں انیسویں صدی کے وسط

تک لوگ حسب خواہش ہائے ملفوظی اور ہائے مخلوط کو ادل بدل کر لکھ دیتے تھے۔ گہر (موتی) کو گھر، اور گھر (خانہ) کو گہر (موتی) لکھ دیا جاتا تھا۔ آج تک متعدد حضرات لفظوں کی ابتدا میں دو چشمی ھ لکھ دیتے ہیں۔ مثلاً ہے کو ھے لکھنا۔

5- معکوسی آوازوں ٹ، تھ، ڈ، ڑ کو بھی بہت منزلوں سے گزرنا پڑا ہے۔ یہ آوازیں فارسی میں بھی نہ تھیں۔ بقول ڈاکٹر گیان چند اُردو کے کاتبوں کی سمجھ میں نہ آیا کہ انھیں کیوں کر ظاہر کیا جائے۔ اکثر نے تو یہ کیا کہ انھیں بالترتیب ت، تھ (یا "تہ")، دھ (یا "دہ") اور رھ (یا "رہ") لکھنے ہی پر اکتفا کی جس سے کھری اور کھڑی، پری اور پڑی میں کوئی فرق نہ رہا۔ دوسروں کے یہاں مختلف صورتیں دیکھنے میں آتی ہیں۔ بالائی چار نقطے ، دو نقطے اور ان پر ایک خط۔ انتہا یہ ہے کہ "نورس" کے ایک کاتب نے ٹ، ٹھ، ڈ، ڑ اور گ تک کے لیے ت، د، ر، ک کے نیچے تین نقطے لگا کر کام چلایا۔ پشتو اور سندھی کے مخطوطوں میں یہ مسئلہ بہت زیادہ قدیم تو نہیں لیکن اُردو سے کہیں زیادہ ضرور ہے۔ سرائیکی اور سندھی میں تو حروف کے مختلف سیٹوں کی وجہ سے بھی دقت سامنے آتی ہے۔ خسرو کی "خالق باری" کے ابتدائی نسخے تین اور چار نقطوں کے حوالے سے ملتے ہیں۔

6- اعراب کے حذف سے بہت دقتیں پیش آتی ہیں۔ ماضی میں جب اعراب بالحروف لکھے جاتے تھے تو اور بھی دقت تھی۔ "اوس" لکھا ہو تو اسے اس (ضمیر اشارہ بعید) اور "اوس" (شبنم) دونوں پڑھا جا سکتا تھا۔ ادھر اور اودھر دونوں یکساں تھے۔

7- یائے معروف و مجہول کو حسب منشا کبھی "ی" اور کبھی "ے" لکھ دیا جاتا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ "میری بیٹی" اور "میرے بیٹے" کے املا میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا تھا۔ پشتو میں بھی مسئلہ یائے تانیث کے ساتھ ہے۔

8- اُردو میں ایک کا عدد اور الف دونوں ایک طرح سے لکھے جاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے بعض اوقات ایک کو دوسرے کی جگہ پڑھا جا سکتا ہے۔

9- اُردو اور پاکستانی زبانوں کے ہر لفظ میں بعض حروف متصل لکھے جاتے ہیں بعض منفصل۔ دوسری طرف انگریزی طباعت میں سب حروف منفصل لکھے جاتے ہیں۔ قدیم کاتب لفظوں کے بیچ پابندی سے جگہ نہیں چھوڑتے تھے جس کے نتیجے میں ایک لفظ کا آخری حرف یا جزو اگلے لفظ کے ساتھ ملا کر پڑھا جا سکتا ہے۔ اسی طرح لفظ کا ابتدائی حرف ماقبل لفظ کے آخر میں ملا ہوا سمجھا جا سکتا ہے۔

10- پرانے لوگ لفظوں کے منقطع اجزا ہی کو نہیں بلکہ دو تین مسلسل لفظوں کو ملا کر لکھ دیتے ہیں۔ جیسے "کیلیے"، "انکو" وغیرہ۔ سینما کے چلتے پھرتے اشتہاروں میں "آج شب کو" کے بجائے ہمیشہ "آجشبکو" لکھا ہوتا تھا۔ بہت سے حضرات اب بھی "اس لیے ہے کہ" کو ملا کر "اسلیے ہیکہ"

لکھ دیتے ہیں۔ قاضی عبدالودود اور مالک رام لفظ کے آزاد اجزا کو ملا کر لکھنے پر اصرار کرتے ہیں۔ مقتدرہ قومی زبان نے سفارش کی ہے کہ "ٹیلی وژن" کی طرح کے الفاظ کی املا بھی الگ الگ کی جائے۔

11- فارسی اضافت کا زیر، تشدید کا نشان، الف ممدودہ کا، مد، کا نشان اور بعض اوقات واؤ عطف تک حذف کر دیا جاتا ہے جس سے قرأت میں التباس ہو سکتا ہے۔

ان سب پر مستزاد یہ کہ مختلف کاتبوں کا اپنا مخصوص انداز املا ہوتا ہے مثلاً ایک کاتب نے ٹ، ڈ، ڑ، گ کے لیے ت، د، ر، ک لکھا۔ کوئی س مہملہ کے نیچے تین نقطے لگا دیتا ہے، کوئی آخری یائے مجہول کے نیچے دو نقطے لگاتا ہے۔ کوئی "کے" کو "کہ" لکھ دیتا ہے۔

3- دانستہ اغلاط

کسی نسخے کا ناقل پہلے کے نسخے کی صحیح قرأت نہیں کر پاتا تو وہ اپنی نقل میں کچھ کا کچھ لکھ جاتا ہے۔ اس سے بھی بڑی مشکل تب آن پڑتی ہے جب کسی ناقل نے کسی پیشتر نسخے کے کسی لفظ یا فقرے کو غلط سمجھ کر اس کی قیاسی تصحیح (تخریب؟) کر دی ہو۔ بعد کے مدون متن کو مصنف کے عندیے اور کاتب کی تصحیح میں تمیز کرنے کا کوئی طریقہ نہیں۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے متنی تنقید میں نادانستہ و دانستہ اغلاط کا مفصل بیان کیا ہے۔ دانستہ غلطیوں میں سے اہم تر یہ ہیں جو کاتب یا مؤلف کسی سے بھی سرزد ہو سکتی ہیں:

1- امکان ہے کہ قدیم نسخے کی کتابت میں کاتب لفظوں کے تلفظ کو جدید کر دے۔ اس قسم کی عبرت ناک مثال ڈاکٹر زور کا مرتبہ اُردو شاعری کا انتخاب ہے۔ رشید حسن خاں نے اپنی کتاب میں دکھایا کہ کاتب نے نہیں بلکہ خود مولف نے قلی قطب شاہ کے قدیم الفاظ کو جدید تلفظ کے مطابق ڈھال دیا ہے۔

2- الفاظ کی تذکیر و تانیث بدلتی رہتی ہے۔ کاتب یا مولف انھیں بدل کر اپنے عہد کے مطابق کر دیتا ہے جیسا کہ عبدالباری آسی نے کلیات سودا میں کیا۔

3- کاتب یا قدیم مولف کسی متروک لفظ کی تحریف کر کے جدید لفظ استعمال کر دیتا ہے۔

4- قدیم متون میں فحش الفاظ کو درج کرنے میں کوئی تکلف نہ کیا جاتا تھا۔

5- بعض نسخوں میں کاتب جان بوجھ کر عبارتیں حذف کر دیتا ہے۔

6- بعض اوقات کاتب یا مولف جان بوجھ کر بعض مصلحتوں کے تحت کچھ اضافہ کر دیتا ہے مثلاً خان آرزو نے تذکرہ مجمع النفائس میں میر کا ذکر نہیں کیا لیکن رام پور کے ایک نسخے میں میر کا ذکر ہے اور بڑی توصیف و تحسین کے ساتھ ہے۔

یورپی زبانوں کے مخطوطات میں بھی اغلاط موجود ہوتی ہیں۔ ہال کی کتاب سے لے کر کاترے نے جو صورتیں درج کی ہیں ان میں سے ذیل کی اغلاط ہمارے ہاں بھی وارد ہو سکتی ہیں۔ یعنی:

1- حرف، لفظ اور جملوں کو ادھر اُدھر کر دینا، جملوں، پیراگرافوں اور صفحات کی ترتیب میں انتشار۔

2- اعداد میں التباس۔

3- کاتب یا مؤلف کسی مبینہ غلطی کی قیاسی تصحیح کرتا ہے جو تحریف ہے۔

4- حذف۔ مماثل آغاز یا اختتام والے الفاظ میں سے ایک کا حذف (اردو میں اوپر نیچے دو سطروں میں اگر کہیں یکساں لفظ آ گیا ہے تو پہلی سطر کے اس لفظ کے آگے دوسری سطر کے اس لفظ کے آگے کی عبارت نقل کر دی جاتی ہے یعنی ایک سطر کا بعد کا حصہ اور دوسری سطر کا ابتدائی حصہ حذف ہو جاتا ہے)۔

5- اگر مخطوطے میں بین السطور کچھ اضافے ہیں تو صحیح مقام کے بجائے غلط مقام پر پڑھے جا سکتے ہیں۔

4- نسخوں کی گروہ بندی

ایک سے زیادہ نسخے موجود ہوں تو ان میں اولیت اور استناد طے کی جائے۔ زیادہ نسخے ہوں تو ان کی گروہ بندی کر کے شجرہ بنائیں۔ ان میں مخطوطات کے ساتھ مطبوعات بھی شامل کیے جا سکتے ہیں۔ کاترے نے نسخوں کی خاندانی گروہ بندی کا مفصل طریقہ بیان کیا ہے۔ فرض کریں کہ ایک متن کے آٹھ نسخے "اب ج د ہ وز ح" موجود ہیں اگر مقابلہ کرنے سے معلوم ہو کہ مشمولات، حذف واضافہ اور قراُتوں کی خصوصیات کے لحاظ سے سات نسخے ایک طرح کے ہیں اور آٹھواں مختلف ہے تو بقول ڈاکٹر گیان چند: یہ دو گروہ ہوئے۔ واضح ہو کہ دو نسخوں یا نسخوں کے گروہوں میں یکساں چیزوں کا حذف ان کے خاندانی قرب کی قوی دلیل ہے۔ ایک گروہ کے سات نسخوں میں بھی اشتراک واختلاف کے ذریعے ذیلی گروہ اور پھر ان میں تحت ذیلی گروہ قائم کیے جا سکتے ہیں۔ ذیلی گروہوں کا مشترک ماخذی نسخہ ناموجود اور محض فرضی ہو سکتا ہے۔ ہم اسے بھی کوئی نشان یا نام دیں گے۔

ہم نے فرض کر لیا ہے کہ وہ موجود تھے۔ لاطینی میں مختلف نسخوں کو Codex اور انگریزی میں Code کہتے ہیں۔ مندرجہ بالا نقشے کو نسخوں کا شجرہ یعنی (Stemma Codicum) کہتے ہیں۔ سب سے اوپر قیاسی قدیم ترین ماخذ ہے، اسے آرکی ٹائپ "اولین نمونہ" کہتے ہیں۔ یہ نسخہ مصنف کے نسخے کی نقل در نقل ہو سکتا ہے لیکن وہ ہمارے سامنے موجود نسخوں کا مورث اعلیٰ ہے اور سب سے معتبر ہے۔

اس سے نسخوں کی جو روایتیں پھوٹتی ہیں انھیں تنقید متن (Recension) ان کی ذیل کو ذیلی تنقید متن (Sub-recension) اور ان کی بھی ذیل کو نسخہ (Version) اور آخر الذکر کی اقسام کو ذیلی نسخہ (Sub-version) کہتے ہیں۔

5- نسخوں کا شجرہ

ڈاکٹر گیان چند کے نزدیک نسخوں کا شجرہ بنانے کا یہ طریق کار دو صورتوں میں مفید ہوتا ہے۔ اول ان متون میں جن کا پھیلاؤ کئی صدیوں پر ہے، جن کے نسخے بہت بڑی تعداد میں ہیں، جن میں مشمولات کا

اختلاف بہت زیادہ ہے جیسے سنسکرت، یونانی اور لاطینی کے شاہکار۔ دوم وہ متون جو بہت عرصے تک مطبوعہ شکل میں ملتے ہیں۔ مندرجہ بالا طریقے سے ایڈیشنوں کے ماخذ اور باہمی رشتوں کا بخوبی تعین ہو سکتا ہے۔ شیکسپیر کے ڈراموں کے نسخوں میں یا اردو پنجابی اور دیگر پاکستانی زبانوں میں یہ طریق کار مستثنیٰ صورتوں ہی میں سود مند ہو سکتا ہے مثلاً کلیات سودا یا کلیات میر یا ہیر وارث شاہ، چچ نامہ، ابیات سلطان باہو، شاہ جو رسالو کے نسخوں میں جہاں حذف، اضافہ اور الحاق کافی ملتا ہے۔ عام متون پر مندرجہ بالا طریقے کا اطلاق کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم اس کے بجائے مختلف نسخوں کا پایہ اعتبار متعین کرنے کی کوشش کریں تو وہ زیادہ سود مند ہوگا۔

6- تشجیر

کاترے کے مطابق مصنف کے نسخے کے بعد اس کی تشجیر کے استناد کے یہ مدارج ہیں۔

1- جب نسخہ مصنف کی نگرانی میں نقل کیا گیا ہو۔
2- مصنف کے نمائندے کی نگرانی میں نقل کیا گیا ہو۔
3- کسی عالم کی نگرانی میں اس کے نسخے کی نقل کی گئی ہو۔
4- کسی والیِ ملک کے حکم سے علماء کی نگرانی میں تیار شدہ نسخہ۔

اکثر نسخے اسی قسم کے ہوتے ہیں۔

کاترے کی پہلی نوع کی درجہ بندی سنسکرت نسخوں کو پیش نظر رکھ کر کی گئی ہے۔ اردو اور پاکستانی زبانوں کے نسخے کہاں کسی حکمران کے حکم سے یا عالم کی نگرانی میں تیار کیے جاتے ہیں۔ ہاں مغلیہ عہد کے بعض فارسی نسخوں کو یہ شرف حاصل ہوا ہے۔ ڈاکٹر صلاح الدین المنجد نے عربی نسخوں کو پیش نظر رکھ کر ذیل کی درجہ بندی کی ہے:

1- بہترین نسخہ مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہوتا ہے۔ مصنف کے نسخے میں حذف و اضافہ دکھائی دے تو یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ کتاب کی تصنیف ایک وقت میں ہوئی یا کئی مراحل ہیں۔
2- مصنف کے نسخے کے بعد وہ نسخہ وقیع ہے جو مصنف نے پڑھا یا سنا اور اس نے اپنے قلم سے اس کی تصدیق کی ہو۔
3- اس کے بعد وہ نسخہ وقیع ہے جو مصنف کے نسخے سے منقول ہو۔
4- پھر وہ نسخہ جو عہد مصنف میں نقل کیا گیا ہو اور علماء نے اسے پڑھا یا سنا ہو۔
5- پھر وہ نسخہ جو عہد مصنف کے جلد ہی بعد نقل کیا گیا لیکن اس پر علما نے تصدیق نہ کی ہو۔
6- مصنف کے بعد کے نسخوں میں زمانے کے لحاظ سے اولیت اور افضلیت مقرر کی جائے گی۔ ان نسخوں میں وہ اہم ہوگا جسے کسی عالم نے نقل کیا ہو یا کسی عالم کے سامنے اس کی قرأت کی گئی ہو۔

7- استثناء

بڑے کتب خانوں میں بیشتر نسخے ایسے ہیں جو پہلے چار زمروں میں نہیں رکھے جا سکتے، پانچویں

زمرے کے حوالے سے بھی بہت کم نسخے ہوں گے۔ دراصل تدوین میں کسی اصول پر آنکھ بند کر کے عمل نہیں کیا جاسکتا۔ استثنیٰ، ہر جگہ ہے۔ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں دسمبر 81ء میں تدوین متن کے مسائل پر سیمینار ہوا۔ اس میں بحث کے دوران میں رشید حسن خاں نے کہا کہ نوابین کے سامنے جو نسخے بہت مطلا پیش کیے گئے متن کے لحاظ سے ناقص نکلیں گے۔

مخطوطوں کا مرتبہ متعین کرنے میں اصول اس قدر رہنمائی نہیں کر سکتے جتنا کہ بقول ڈاکٹر گیان چند مدون کا تجربہ، مشق اور نظر۔ ایف ڈبلیو ہال نے اصول درج کیا ہے کہ اچھا تقابلی نقاد ماہر قدیمہ سے زیادہ کچھ اور ہوتا ہے۔ یعنی اس کو عقل اور نظر کی ضرورت ہوتی ہے۔ کہا گیا ہے کہ ایک گواہ کی شہادت سے بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ یہ صادق ہے یا نہیں۔ اسی طرح ایک صاحب نظر تحقیق کار کسی مخطوطے کو دیکھ کر اندازہ لگا سکتا ہے کہ یہ معتبر ہے کہ نہیں۔ اسے اس کے کاتب اور مولف دونوں کی علیت کو جانچنا ہوتا ہے۔ کاتب کے املا، ہجا اور تحریر سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ یہ کہاں تک محتاط ہے۔ بعض نسخوں کا ظاہری دروبست ہی ان کے کاتب کی لاپروائی اور بے سلیقگی کی غمازی کرتا ہے۔ اگر کسی نسخے میں ہجے کی غلطیاں ہوں تو کاتب کی نااہلی کے مزید ثبوت کی ضرورت نہیں رہتی۔

کاتب لفظ کی صحیح قرأت کا ذمے دار ہوتا ہے لیکن نسخے کے مولف کی ذمے داری اس سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ اگر نسخہ کسی دوسرے نسخے کی نقل ہے تو ان سب کے اولین نمونے کا مولف، نسخے کی قدر و قیمت کا منبع ہوتا ہے اس نے کن مشمولات کو لیا ہے اور کن کو چھوڑا ہے، مدون کو اس کی تنقید کرنی ہوتی ہے۔ اچھا مولف وہ ہے جس نے نسخے کو جامع و مانع بنانے کی پوری کوشش کی ہو یعنی اس میں مصنف اصلی کی کوئی تخلیق حذف نہ ہوئی ہو اور کسی دوسرے کی تخلیق کا الحاق نہ ہوا ہو۔ مختلف مخطوطات کے مشمولات کے موازنے سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ کون کون سے مخطوطے زیادہ مکمل ہیں۔ واضح ہو کہ بعض اوقات نامکمل مخطوطات، حد یہ ہے کہ منتشر اوراق تک، خاص صحت کے حامل ہوتے ہیں اور مکمل مخطوطے نقل در نقل اغلاط کا پلندہ ٹھہرتے ہیں۔

8-اختلافِ نسخہ جات

نسخہ کی جمع ہے نسخہ جات یا نسخ۔ انگریزی میں بجا طور پر متنوعات (Variants) کہتے ہیں لیکن ان پر مشتمل ''اختلافِ نسخ'' نام کے جزو کو آلۂ انتقاد (Critical Apparatus) یا محض آلہ (Apparatus) کہا گیا ہے۔

چوں کہ متن تمام نسخوں کی بنا پر تدوین کیا جاتا ہے اس لیے مدون کو چاہیے کہ اپنے تشکیل شدہ متن اور دوسرے نسخوں میں جو اختلافات ہیں ان سب کی تفصیل دے دے۔ یہ کسی جج کے کام کی طرح ہو جو تمام شہادتوں کی بنا پر فیصلہ لکھتا ہے لیکن مختلف جج انھی شہادتوں کی بنا پر مختلف فیصلہ کر سکتے ہیں۔ اسی طرح کچھ صاحب نظر قارئین، جو غالباً مدون ہی کے برابر اہل ہیں لیکن جنھیں شہادتیں درج کرنے کا موقع نہیں ملا، مدون کے فیصلے سے اتفاق یا اختلاف کر سکتے ہیں۔ تحقیقی متن ایسے ہی قارئین ہی کے لیے ہوتا ہے، اس لیے

مدوّن کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے متن سے دوسروں کے تمام اختلافات درج کردے۔

تدوین میں اختلافاتِ نسخہ جات دینے کا مقصد یہی ہے کہ تمام نسخوں کے اندراجات مختصر ہو کر یک جا ہو جائیں تاکہ ہر قاری تنقیدی متن کے کسی بھی حصے کے بارے میں فیصلہ کر سکے کہ مدوّن نے جو انتخاب کیا وہی بہترین تھا یا اس کی جگہ کچھ اور ہونا چاہیے تھے۔ اس مقصد کو پورا کرنے کی بہترین مثال دیوانِ غالب نسخۂ عرشی کی ہے جس کے اختلافاتِ نسخہ جات سے غالب کے اہم مخطوطوں اور جملہ ایڈیشنوں کے اندراجات کی مکمل تصویر مل جاتی ہے۔ کاترے نے لکھا ہے کہ جملہ اختلافات دیے جائیں یہاں تک کہ سہو کتابت بھی۔ باورس نے لکھا ہے:

> ''پہلے یہ فیشن ہوا کرتا تھا کہ ہر صفحے کے نچلے حصے میں اختلافاتِ نسخہ جات کی اتنی طویل فہرست دی جائے کہ عام قاری مرعوب ہو جائے اور اس بھیڑ میں سے راستہ تلاش کرنے میں بھی تامل کرے۔ علمیت کی یہ نمود، جو ایسے قاری تک کے لیے بے کار تھی جو پیشہ ورتنی نقاد ہو، اب فیشن سے اتر گئی ہے۔ متن کے صفحے کے نیچے صرف وہ اختلافات دیے جاتے ہیں جو فوری اہمیت کے ہوتے ہیں، بقیہ کو کسی اور جگہ ڈال دیا جاتا ہے جنھیں ان کا کوئی شائق دیکھنا چاہے تو دیکھ لے''۔

تعلیقات کی صورت میں ایسے حواشی مقالے کے آخر میں دیے جاتے ہیں۔ باورس کی رائے یہ ہے کہ اختلافاتِ نسخہ جات کے دو حصے کر دیے جائیں۔ اہم اختلافات فٹ نوٹ یا پاورقی میں اور بقیہ تمام کتاب کے آخر میں بطور تعلیقات دیے جائیں۔ انھوں نے حیدرآباد والے انگریزی مجموعے کے مضمون میں زور دیا ہے کہ قیاسی تصحیحات کو پاورقی میں دیا جائے، اختلافاتِ نسخہ جات سے عام قاری کو کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔

ڈاکٹر تنویر علوی کے نزدیک ''اختلافات کی بھرمار کی صورت میں بھی یہ کیفیت بھی ہوتی ہے کہ یہ خواب کثرتِ تعبیر سے پریشان ہو جاتا ہے۔ بایں ہمہ اس کثرت کو انگیز کرنا اس سے گریز کے مقابلے میں زیادہ صحیح ہے۔''

گویا وہ کثرتِ تعبیر سے خواب کو پریشان کرنے کے حق میں ہیں لیکن دوسروں کی یہ رائے نہیں۔ عبدالرزاق قریشی کی رائے ہے کہ اختلافاتِ نسخ میں ہر اختلاف کا بتانا ضروری نہیں، صرف اہم اختلافات بتائے جائیں۔ ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے بھی یہی بات کی ہے:

> ''اختلافاتِ قرأت میں سامنے کے معمولی اختلافات سے جو کسی کم سواد کاتب کی کم فہمی کے سبب نسخے میں راہ پا گئے ہوں، صرفِ نظر کرنا چاہیے۔ صرف اہم اختلافات جن سے متن کی تفہیم میں بنیادی فرق واقع ہوتا ہے درج کرنا ضروری ہے۔''

ڈاکٹر گیان چند کے نزدیک صرف اہم اختلافات دیے جائیں۔ انھیں قدرے ترمیم کے ساتھ یہ طریقہ پسند ہے کہ نہایت غیر اہم اختلافات، بالخصوص سہو کتابت کو حذف کر دیا جائے، بقیہ کو دیا جائے۔ ساتھ ہی یہ بھی مدنظر رہے کہ اہم نسخوں اور ایڈیشنوں کے بیشتر اختلافات دیے جائیں، کم اہم نسخوں اور ایڈیشنوں

کے کم اہم اختلافات کو نظر انداز کر دیا جائے۔ضروری ہے کہ ایک نسخہ مرتب کر دیا جائے اور بعض نکات اور مقامات پر نمبر لگا کر آخر میں اختلافات کے حواشی تعلیقات کی صورت میں دے دیے جائیں۔

9- بڑے اختلافات

اختلاف متن کی ایک خصوصی صورت وہ ہے جب ایک مصنف نے اپنی کتاب کے دو ایڈیشنوں میں اتنی تبدیلی کی ہو کہ معتد بہ اضافوں اور اختلافات کے سبب ان کو سمو کر پیش کرنا ممکن نہ ہو۔ایسا ایک کتاب کے دو قلمی نسخوں میں بھی ہو سکتا ہے۔ان کی تدوین کا قاعدہ یہ ہے:

1- اگر ایک نثری کتاب کے مختلف ایڈیشنوں یا قلمی نسخوں میں خاصا فرق ہے تو چند جملوں یا پیراگرافوں کے فرق کو اختلاف نسخ میں دیں اور طویل تر کو ایک علیحدہ ضمیمے میں دیں۔ڈاکٹر تنویر علوی اس سے قدرے مختلف روش پسند کرتے ہیں:

> ''اگر متبادل روایت اس صورت میں سامنے آتی ہو کہ دونوں روایتوں کو ایک متن میں سمونا اور ان کی اجزائی ترکیب پر قابو پانا ممکن نہ ہو، تو ترجیحی روایت کو متن میں شامل کرتے ہوئے غیر مرجح صورت کو ذیلی حواشی میں جگہ دی جاسکتی ہے۔''

انھوں نے پوری منسوخ روایت کو حواشی میں شامل کرنے کی تجویز ہے جبکہ ڈاکٹر گیان چند مختصر اختلافات کو اختلافات نسخ کے باب میں اور طویل تر کو ضمیمے میں دینے کے حق میں ہیں۔ہاں اگر وہ دو بالکل مختلف روایتوں کی طرف اشارہ کر رہے ہوں تو دوسری بات ہے جیسا کہ ذیل کی شق میں ہے۔

2- اگر ایک کتاب کے دو ایڈیشنوں میں زیادہ فرق ہو تو ان کے متن کو پیش کرنے کے لیے دو الگ الگ ایڈیشن چھاپنے کے سوا کوئی چارہ نہیں یا باورس کے مطابق متوازی متون چھاپے جاسکتے ہیں یعنی دو کالم بنا کر دونوں میں سے ہر ایک کا متن دیا جائے۔

کسی مصنف کی زندگی کا آخری ایڈیشن مستند ہوتا ہے لیکن بعض اوقات پرانے ایڈیشنوں میں تحقیق اعتبار سے کوئی ایسی اہم بات ہوتی ہے کہ اسے بھی منظر عام پر لانا ضروری ہوتا ہے مثلاً غالب اور اقبال کے منسوخ کلام کو شائع کرنا ضروری ہے حالاں کہ مصنفوں نے اسے شعوری طور پر قلم زد کر دیا تھا۔فسانہ عجائب کے متداول متن کے باوجود اس کے بنیادی متن کو بھی سامنے لانا ضروری تھا۔دونوں اتنے مختلف ہیں کہ انھیں ملانا ممکن نہیں، یہ دو الگ کتابوں ہی کے طور پر چھاپے جاسکتے ہیں۔

احمد دین کی کتاب اقبال کے پہلے ایڈیشن میں اقبال کا بہت سا قلم زد کلام اور متداول کلام کی ابتدائی روایت تھی۔دوسرے ایڈیشن میں کلام کو بانگ درا کے مطابق کر دیا گیا۔پہلے ایڈیشن کی اہمیت مسلمہ ہے۔مشفق خواجہ نے دونوں کو ملا کر ایک جلد میں چھاپا ہے لیکن مجموعے کے دو حصے دو کتابوں کے برابر ہیں۔اگر کوئی تحقیق روایت کی پہلی مثال کے طور پر سرسید کی آثار الصنادید کی تدوین کرے تو پہلے اور بعد کے ایڈیشنوں کو باہم شامل کرنا ممکن ہی نہیں۔ہر پیراگراف کا اسلوب مختلف ہے۔یا تو پہلے ایڈیشن کو نظر انداز

کر دیا جائے یا دونوں کو الگ الگ شائع کیا جائے۔

11-اختلاف کی تحشیہ نگاری

سوال یہ ہے کہ اختلافات کہاں درج کیے جائیں، پاورقی میں یا پورے متن کے بعد آخر میں تعلیقات کی صورت میں؟

کاترے لکھتے ہیں کہ کچھ لوگ اختلاف نسخ متن یعنی کتاب کے آخر میں دیتے ہیں لیکن اکثریت یوں کرتی ہے کہ متن صفحے کے اوپر نصف حصے میں ہوتا ہے جب کہ اختلافات صفحے کے نچلے نصف میں۔ اس سے سہولت یہ ہے کہ اختلافات، متن کے ساتھ ساتھ دیکھے جا سکتے ہیں۔

ڈاکٹر تنویر علوی بھی کاترے کے ہم نوا ہیں:

> ''بعض مرتبین متن کے ذیل میں اختلاف متن یا تقابلی روایتوں کو پیش کرنے کے بجائے نشانات شمار دے کر انھیں متن کے آخر میں حوالہ قلم کرتے ہیں مگر اس سے ایک عام قاری کے لیے متن کے اختلافات میں دلچسپی لینا زیادہ مشکل ہو جاتا ہے اور متن کے سیاق و سباق سے ان کا رشتہ ٹوٹتا سا محسوس ہوتا ہے۔ اس لیے زیادہ مناسب صورت، اختلافات نسخ کو، اگر وہ زیادہ طویل نہ ہوں، متن کے ذیلی حواشی ہی میں دینا ہے''۔

عام قاری کو متن کے اختلافات سے دلچسپی نہیں ہوتی۔ اگر وہ ایسی دلچسپی لے تو یقیناً وہ عام قاری نہیں، خصوصی ماہر ہے۔ ذیلی حواشی سے ڈاکٹر تنویر کی مراد پاورقی حوالے ہیں۔ اُردو میں پاورقی میں اختلاف نسخ کی مثالیں بہت کم ہیں۔ جو لوگ بہت کم اختلافات دیتے ہیں وہ حسب ضرورت پاورقی ہی میں دے دیتے ہیں ورنہ عموماً متن کے بعد ہی دینا چاہیے۔ وہ صفحے کے نیچے ہی دیے ہوں تو سہولت ہے لیکن اختلافات نسخ کو متن کے ساتھ معلوم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ متن کے تسلسل میں مخل ہوتے ہیں تاہم ڈگری کے لیے لکھے گئے مقالے میں پاورقی حواشی ہی مناسب ہوتے ہیں۔

اختلافات نسخ درج کرنے کے عمل کے دو مراحل ہوتے ہیں:

(1) پہلے مرحلے میں مختلف نسخوں کی نشان دہی کے لیے کسی مخفف علامت سگلم (Sigium) کا تعین کیا جاتا ہے۔ کاترے نے درست لکھا ہے کہ یہ علامات من مانی نہیں ہونی چاہئیں بلکہ یہ مخطوطے کے خواص کی طرف اشارہ کریں مثلاً مقام، رسم الخط وغیرہ۔ قاضی عبدالودود ایسی غیر متعلق علامات استعمال کیا کرتے تھے مثلاً نخ= کلیات نظم فارسی...... مص= کلیات کا وہ نسخہ جس کی کتابت 54ء میں تمام ہوئی۔

مطبوعہ کلیات کے لیے ''خ'' اور ایک قلمی نسخے لیے ''مص'' من مانی غیر متعلق علامات ہیں۔ عرشی صاحب نے ''نسخۂ عرشی'' میں دیوان غالب کے قلمی نسخوں کو تاریخی ترتیب سے ق، قا، قب، قج، قد وغیرہ اور مطبوعہ ایڈیشنوں کو بالترتیب م، ما، مب، مج وغیرہ کی علامتیں دیں۔ یہ من مانی نہیں۔ ان میں ایک سلیقہ مضمر ہے

لیکن یہ بھی مستحسن نہیں۔ بعض حضرات مختلف نسخوں کو محض نمبروں سے ظاہر کرتے ہیں وغیرہ۔ اس سے قاری کے ذہن پر بہت بار پڑتا ہے۔ اپنی سہولت پر قاری کی سہولت کو ترجیح دیں۔ حرفی یا عددی علامت نہ لیں ہمیشہ لفظی علامت استعمال کریں تا کہ اس سے بآسانی نسخے کی نشان دہی ہو جائے۔ ڈاکٹر تنویر علوی نے ہدایت کی ہے کہ ماخذ کو حواشی میں بالعموم کتاب کے مختصر نام یا مرتب یا مولف کے مختصر نام یا تخلص سے ظاہر کیا جانا چاہیے چنانچہ انھوں نے کلیات ذوق کی تدوین میں نسخوں کے قابل فہم مخففات دیے ہیں۔ یہ کچھ بھی ہوں البتہ ان مخففات کی نشان دہی/فہرست شروع میں ہو۔

(2) دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ متن میں اختلافات کی نشان دہی کیونکر کی جائے تا کہ اختلاف نسخ کے باب میں اسے تلاش کیا جائے۔

عرشی صاحب نے نسخۂ عرشی میں صفحے اور سطر کا نمبر دے کر شعر کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ایسا کرنا ٹائپ کی طباعت میں نسبتاً آسان ہے کہ مسطر کے مطابق صفحے کا صحیح اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ کتابت کی صورت میں متن کے لکھے جانے کے بعد ہی صفحے کی نشان دہی ہو سکتی ہے۔ تنویر علوی نے ''کلیات ذوق'' میں غزل نمبر دے کر الفاظ درج کیے ہیں۔ جس شعر کے جس لفظ یا الفاظ کا اختلاف درج کرنا ہے اس پر نمبر حوالہ ڈال دیا ہے اور اختلاف نسخ میں وہی نمبر دیا ہے۔ نمبر کی وجہ سے متن کے اس لفظ کی صحیح صحیح نشان دہی ہو جاتی ہے جس کے اختلافات درج کیے جا رہے ہیں۔ خیال رہے کہ اختلافات نسخ کے نمبر حواشی (مع حوالہ) کے نمبروں سے الگ علامتوں سے ظاہر کیے جائیں۔ نمبر شمار درج کرنے کے کئی طریقے ہو سکتے ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک حواشی و حوالہ کے لیے اور دوسرا اختلاف نسخ کے لیے مخصوص کر دیا جائے۔ ہر مدون کو اختیار ہے کہ اپنے متن کے مطابق اختلافات نسخ درج کرنے کا طریقہ اختیار کرے لیکن مقالے کے شروع میں اسے بیان کر دے۔

ب- نسخوں کا موازنہ (Collation)

مختلف نسخوں کے الفاظ کا تقابلی مطالعہ کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اول ایک نسخے کو تقابل کے لیے اساسی نسخہ بنا لیں۔ ڈاکٹر گیان چند کہتے ہیں کہ اس کے بعد کاغذ کے ایک پرزے پر کالم، سطور اور مربع بنائیں۔ عمودی کالم میں مختلف نسخوں کے شناختی نشان سگلم (Siglum) لکھیں جو ایسے مخففات ہوں جن سے ذہن آسانی سے نسخے کی طرف متوجہ ہو سکے۔ افقی سطر میں شعر کا مصرع یا نثر کا جملہ لکھیں۔ سب سے اوپر کی سطر میں اساسی نسخے کا متن لکھیں۔ نیچے کی سطور میں بالترتیب دوسرے نسخوں کے محض متنی اختلاف لکھیں۔ پورا مصرع یا جملہ نہ لکھیں۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے لکھا ہے کہ تقابل کا یہ عمل مختلف کارڈوں پر کیا جائے۔ کارڈوں پر سہولت تو رہے گی، لیکن اگر ہمارے طلبہ ان کی قیمت کے متحمل نہ ہوں تو موٹے کاغذ کے ٹکڑے کاٹے جا سکتے ہیں۔ بہرحال مدون پر منحصر ہے کہ وہ اپنی سہولت کے مطابق جو طریق کار چاہے اختیار کرے۔

1- بنیادی سوالات

ڈاکٹر گیان چند نے اس موضوع کا مطالعہ کیے بغیر شعبۂ تحقیق، انجمن اساتذہ اُردو کی کانفرنس واقعہ

لکھنؤ کے خطبہ صدارت میں دو سوال اٹھائے تھے۔

1- اگر ایک متن کے کئی نسخے میسر ہوں تو مرتب کیا طریقہ اختیار کرے؟ ایک نسخے کو بنیادی نسخہ بنائے یا جملہ نسخوں کا عطر مجموعہ تیار کرے؟

2- متن کی اشاعت میں قدیم املا برقرار رکھا جائے یا جدید۔

تدوینِ متن میں یہ دونوں سوالات سے زیادہ مشکل ہیں۔ انگریزی کے مدون فریڈسن باورس نے انھی کو دو اہم سوالات قرار دیا ہے۔ دونوں کے بارے میں بحث ہے اور دو دو فریق ہیں۔ فی الحال پہلے سوال کو لیں۔ اس پر دو آراء ہیں، جو مکاتب فکر کا روپ اختیار کر گئی ہیں:۔

1- سائنٹفک یا ببلیو گرافک سکول۔ اس کا فروغ جرمنی میں ہوا۔

لخمان (Lachmann) نے کہا کہ نسخوں کا شجرہ بنا کر ایک بہترین نسخے تک پہنچیں۔ لاطینی متون کا مدون پوسٹ گیٹ (Postgate) بھی اسی طریقے کا حامی ہے۔ میک کیرو (McKerrow) نے 1904ء میں مطبوعات کو پیش نظر رکھ کر صحیفہ یا تحقیقی متن (Copy Text) کی اصطلاح وضع کی۔ اس سے مراد قدیم مصنف کا وہ دستی نسخہ تھا جسے پریس کو دیا گیا ہو۔ بعد میں یہ اصطلاح بنیادی نسخے کے لیے استعمال ہونے لگی۔

2- دوسرے مکتب فکر کو امتزاجی (Eclectic) کہتے ہیں۔ اس کے مطابق جملہ معتبر نسخوں کو لے کر سب کی مدد سے اپنا نسخہ تیار کیا جاتا ہے۔ اس عطر مجموعہ کو انگریزی میں Definitive text کہتے ہیں۔ ہاؤس مین (A.E. House Man) نے اپنے مرتبہ **Manilius** کے ایڈیشن میں اس کی وکالت کی اور اس مفروضے کی تردید کی کہ بہر صورت ایک بہترین مخطوطہ موجود ہوتا ہے۔ گریگ بھی اس کا حامی ہے۔ کہتا ہے کہ مدون اگر صریح اغلاط طباعت کی تصحیح کر سکتا ہے تو نسخوں میں دوسرے ماخذ سے آئی ہوئی اغلاط کی تصحیح کیوں نہ کرے۔

باورس کے مطابق یہ مکتب فکر پہلے سے جنگ جیت گیا ہے۔ یعنی اب انگریزی میں عام طور سے بقول ڈاکٹر گیان چند "عطر مجموعہ" ایڈیشن کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔

مالک رام نے دیوان غالب نسخہ عرشی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

"پرانی کتابوں کے مرتب کرنے کے چند مسلم اصول ہیں:۔

1- اگر کسی غیر مطبوعہ قلمی کتاب کو مرتب کرنا منظور ہے تو تلاش کی جائے کہ خود مصنف کے ہاتھ کا یعنی اس کا دستخطی نسخہ دستیاب ہو جائے۔ اگر خوش قسمتی سے ایسا نسخہ مل جائے تو یہی متن ہوگا۔ اگر حسن اتفاق سے متعدد قلمی نسخے مل جائیں تو اس نسخے کو ترجیح دی جائے گی جو مصنف نے سب سے آخر میں لکھا یا دیکھا تھا، اس کے علاوہ تمام نسخے اختلافات کی ذیل میں آئیں گے۔

2- دستخطی نسخہ مل سکے تو وہ قلمی نسخہ جو مصنف کے زمانے سے قریب ترین ہو متن قرار

پائے گا"۔

ڈاکٹر نذیر احمد نے تحقیق شدہ متن کی ترتیب کے لیے لکھا:

"تحقیق متن کی ترتیب وغیرہ کے سلسلے میں کئی طریقے رائج ہیں۔ایک طریقہ یہ ہے کہ جونسخہ سب سے اچھا اور معتبر ہوتا ہے اس کو بنیاد بنا کر اس کے سارے مندرجات متن و عن متن قرار پاتے اور دوسرے تمام نسخوں کے اختلافات حاشیے میں درج کر دیے جاتے ہیں۔یہ اختلافات آخر کتاب میں بھی رکھے جاسکتے ہیں......اس طریقہ کار میں ایک بڑا نقص یہ ہے کہ اگر ایک نسخے کو پورے کا پورا متن قرار دے دیا جائے اور دوسرے تمام نسخوں کے اختلافات کو حاشیے میں جگہ دی جائے تو یہ کام ایسا شخص بھی کرسکتا ہے جو زبان متعلقہ سے بہت ہی کم واقفیت رکھتا ہو۔دوسرے نسخوں کے اختلافات (کو)" خواہ وہ کتنے و قیع کیوں نہ ہوں"

محقق کو متن کے ایک ایک لفظ پر غور کرنا ہوتا ہے۔پھر جو لفظ صحیح ہوں وہ داخل متن کیے جائیں اور صحت کا معیار محض اصل مصنف کے کلام کا تعین ہو اور کوئی چیز نہ ہو۔

ایک اور مسئلہ نسخوں کی جعل سازی جانچنے کا بھی ہے۔ ہمارے ملک میں ایسا کوئی سائنسی طریقہ نہیں کہ جعلسازی کا پتا چلایا جاسکے لیکن ڈاکٹر نجم الاسلام کے بقول یورپ میں ایسی مشینیں موجود ہیں جو روشنائی اور کاغذ کا جائزہ لے کر بتا دیتی ہیں کہ کیا یا نسخہ واقعی قدیم ہے اور اسی دور سے تعلق رکھتا ہے۔جس کے بارے میں دعویٰ کیا گیا تھا یا نہیں۔

ج۔ تنقیدِ متن

جس عمل کو تنقیدِ متن کہا جاتا ہے ڈاکٹر گیان چند اسے مناسب نام "انتخابِ متن" کا دیتے ہیں۔متن کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں:۔

1۔اس کا ایک ہی نسخہ ہو۔لاطینی میں اسے Codus Unicus کہتے ہیں اور اردو میں "وحید نسخہ" کا نام دیا گیا ہے۔

2۔ایک سے زیادہ نسخے ہوں۔

اگر وحید نسخہ ہے تو مدون کا کام بہت آسان ہونا چاہیے۔اگر مصنف کے ہاتھ کا مخطوطہ ہو تو محض دو مسائل در پیش ہوں گے۔

1۔اس کی دستی تحریر کی صحیح قرأت۔

2۔اس سے ذہنی غیر حاضری میں جو غلطیاں ہو گئی ہوں ان کی گرفت کر کے قیاسی تصحیح کرنا۔

زیادہ توجہ پہلے عمل پر دینی ہوگی کیوں کہ اکثر ادیب خط شکستہ یا زیادہ سے زیادہ خط شفیعا میں لکھتے ہیں۔اُردو میں ایسی صورتیں نہایت شاذ ہیں۔ جیسے احسان دانش کا طرزِ تحریر۔ جہاں کسی کتاب کا محض ایک نسخہ

ہواور وہ مصنف کے خط میں ہو۔ وحید نسخے کے معنی ہیں کہ وہ غیر مطبوعہ ہے۔

اگر وحید نسخہ ہے اور اس کا کاتب کوئی اور ہے تو پھر قراتوں کا سوال آئے گا اور اگر کاتب غلط نویس ہے تو مشکل ہو جائے گی جیسا کہ کربل کتھا کے وحید نسخے میں ہوا۔ اس میں بعض اوقات جملہ یا مصرع صریحاً مہمل ہوتا ہے لیکن اس کا کوئی علاج نہیں۔

ایلیٹ، سائمن اور اوویز نے نسخہ جات کی تدوین کے چند بنیادی امور پر بحث کی ہے لیکن وہ کاتر ے، ایلاک اور فینسٹر سے کوئی زیادہ اضافہ نہیں کر سکے۔ رابرٹ ملر (Miller) کے دستور العمل (Handbook) میں البتہ بہت زیادہ تکنیکی امور اور دقیق نکات بیان ہوئے ہیں جو مبتدی تحقیق کار کے لیے زیادہ کارآمد نہیں۔ عام ادبی موضوعات پر کام کرنے کے لیے جن وسائل کی ضرورت ہوتی ہے، اردو میں ان کی کوئی مدوّن صورت سامنے نہیں، البتہ عمومی ادبی موضوعات پر تحقیقی وسائل اور ماخذ جیمز ہارنر (Harner) کی کتاب **Literary Research Guide** سے جو دراصل حوالہ جاتی ماخذوں کو بیان کرتی ہے، سامنے آتے ہیں۔ اگرچہ یہ انگریزی ادبیات کا احاطہ کرتی ہے لیکن دوسرے متعلقہ موضوعات مثلاً اصناف ادب، ادبی تحریکات، اصطلاحات، عنوانات وغیرہ کی تعریفات، تشریحات اور تفصیلات سے آگاہی حاصل ہوتی ہے، جو کسی مبتدی ادبی تحقیق کار کے لیے رہنما کی حیثیت رکھتی ہے۔

بارھواں باب

تصحیح وتحقیقِ متن

متنی تدوین کا اگلا مگر بنیادی مرحلہ تصحیح متن ہے یعنی ایک ایسے معیاری متن کی تیاری جسے شائع کیا جا سکے۔ اسے مکمل تحقیق کہنا تو مشکل ہے اور نہ یہ جدید اصولوں کی بناء پر تحقیقی ڈسپلن کا کوئی تقاضا پیش کرتی ہے، تاہم اس میں مشمولات کے بارے میں تحقیق ضرور انجام دی جاتی ہے۔ چنانچہ اس عمل کا پہلا حصہ ''تنقیدِ متن'' کہلائے گا اور دوسرا ''تحقیقِ متن'' کا نام پائے گا۔ اس حوالے سے ڈاکٹر گوہر نوشاہی لکھتے ہیں:

> ''ہمارے اہم محققین متنی تحقیق اور متنی تنقید کو ہم معنی قرار دیتے ہیں جب کہ میرے نزدیک دونوں اصطلاحوں میں نمایاں فرق ہے۔
>
> متنی تنقید اور متنی تحقیق، دو مختلف تحقیقی زاویوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ متنی تحقیق متن کی اصلیت اور صحت سے اور متنی تنقید کی متن کی غایت تخلیق یا تحریر سے تعلق رکھتی ہے۔ متنی تحقیق اس امر پر بحث کرتی ہے کہ کوئی متن اس کے مصنف سے فی الواقع تعلق رکھتا ہے۔ اس میں کہیں منسوباتی، الحاقی یا جعلی متن تو شامل نہیں۔ متنی تحقیق کا اصل مقصد نقل در نقل اور روایت در روایت کے عمل سے گزرے ہوئے اغلاط واشتباہات سے پُر متن کو درست کر کے منشائے مصنف کے مطابق پیش کرنے کی کوشش کرنا ہے۔ اس کے برعکس متنی تنقید متن کے فنی، لسانیاتی، تاریخی اور تہذیبی پہلوؤں کے ذریعے مصنف کی غایت تصنیف یا تخلیق سے سروکار رکھتی ہے''۔

ڈاکٹر گوہر نوشاہی کے نزدیک متن پر انجام دیے گئے عملِ تحقیق کے دو نمایاں وظائف ہیں:

1- ایک عہد یا دور کا متن حق وصداقت کے ساتھ نقد وتحقیق کے تمام پیمانوں کو بروئے کار لا کر ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل کرنا۔

2- دریافت اور تنقیح کے تمام اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے کسی متن یا اس کے مصنف کے بارے میں فیصلہ کرنا کہ وہ تاریخ ادب کا حصہ بن سکتا ہے یا نہیں۔

وہ وسیع المطالعہ ہونے اور حزم واحتیاط برتنے کو بنیادی اصول قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک متن سے متعلق زبانوں اور مصنف کی متن کے علاوہ تہذیبی اور ترسیلی زبانوں سے واقفیت نہ ہونے سے متنی

تحقیق کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ محقق نے عبدی کی قصہ، ہندی کا متن ایک قلمی نسخے سے تیار کر کے رسالہ ''اُردو'' میں شائع کرایا تھا۔ عبدی پنجابی کے الفاظ کثرت سے استعمال کرتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب پنجابی سے ناواقف ہونے کے باعث ہر ایسے لفظ پر یا کذا لکھتے ہیں یا غلط اور اشتباہ کا الزام مصنف پر عائد کرتے ہیں۔ ایسی ہی مثالیں دیتے ہوئے ڈاکٹر گوہر نوشاہی لکھتے ہیں:

> ''رسم الخط سے ناآشنا ہونے کی مثالیں بھی عام ہیں مثلاً ایک ممتاز محقق نے کئی سال پہلے ایک قلمی بیاض سے کلام نگار مرتب کیا تھا۔ وہ شکستہ خط میں لکھے ہوئے ''ہے'' کو ہر جگہ ''ہو'' پڑھتے رہے۔ اس طرح پورے متن میں چار سو سے زیادہ اغلاط در آئیں۔
>
> سندھ کے ایک قدیم شاعر میر محمود صابر کے اُردو دیوان کا مخطوطہ عکسی طباعت میں شائع ہوا تھا۔ اس کے مقدمے میں متن کی جو مثالیں آتی ہیں، وہ اصل متن سے مختلف ہیں۔ مثلاً مرتب نے شکل کو ''مشکل''، کے طرف کو'' کی طرف''، ڈھکتا کو'' ڈھلتا '' پڑھا ہے۔ مخطوطے کا رسم الخط میر و سودا کے دور سے تعلق رکھتا ہے اس لیے مدون کو اسے پڑھنے میں دقت کا سامنا ہوا۔
>
> قدیم متون کئی صورتوں میں دستیاب ہیں۔ ان میں سے ایک صورت املائی متون کی ہے۔ املائی متون حدوث اور سماعت کی مشکلات سے دوچار ہوتے ہیں۔ یعنی املا دینے والے کا تلفظ اور سننے والے کی استعداد دونوں اس میں اغلاط کا سبب بن سکتی ہیں۔ تحقیق محقق کو ان مشکلات پر بھی نظر رکھنی چاہیے''۔

تصحیح اور تدوین متن کے حوالے سے دستیاب نسخوں کو استعمال کرنے کے الگ الگ تقاضے ہیں۔ مخطوطات کی تدوین اور مطبوعات کی تدوین ہر دو الگ الگ شرائط لیے ہوئے ہیں۔ منظوم متون کی تدوین اور منثور متون کی تدوین کی الگ الگ ذمہ داریاں ہیں۔ محقق کو ان سب سے عہدہ برآ ہونا چاہیے اور اسے شعری و نثری نزاکتوں کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔

1-انتخابی تصحیح

تدوین متن میں ایک بنیادی نسخے کا انتخاب کرنا بہت مشکل کام ہے۔ مالک رام لکھتے ہیں:

> ''اگر آپ نے تمام شرطوں کا لحاظ رکھتے ہوئے اساسی نسخے کا انتخاب کر لیا تو آپ اسی کے متن کو بنیادی قرار دیں اور دوسرے تمام نسخوں کو اختلاف کے لیے استعمال کیجیے، الا کہ بداہتہً معلوم ہو جائے کہ اساسی نسخے کا متن ناقص ہے اور کسی دوسرے نسخے کا ٹھیک ہے۔ اس صورت میں آپ دوسرے متن کو لے کر اساسی نسخے کے الفاظ حاشیے میں رکھ سکتے ہیں لیکن یہ بہت بڑی ذمہ داری ہے اور اس کا جواز ثابت کرنے کے لیے آپ کو مضبوط دلائل پیش کرنا پڑیں گے۔''

ڈاکٹر گیان چند انتخابی طریقے کے حامی ہیں۔ انھوں نے انجمن اساتذہ اردو کے اجلاس منعقدہ لکھنؤ میں اپنے خطبے میں اس کی وکالت کی۔ ان کے نزدیک اساسی نسخے کے حامی مدون تمام متون تو دے دیتے ہیں لیکن ان میں تنقید و تحقیق نہیں کرتے اور اس طرح قاری کی کوئی مدد نہیں کرتے جب کہ انتخابی نسخے کا مدون متون بھی دیتا ہے اور ان پر تنقید کر کے قاری کی دست گیری بھی کرتا ہے۔

ڈاکٹر سید حسن نے خدا بخش سیمینار میں مضمون پڑھا "تصحیح متن کے طریقے"۔ اس میں انھوں نے کئی طریقوں کا ذکر کیا جس میں پہلے طریقے کو انھوں نے روش انتقادی کہا اور مالک رام والی بات دہرائی:

"روش انتقادی کا مقصد یہ ہے کہ تاریخ کتابت کے لحاظ سے قدیم ترین نسخے کو نسخۂ اساسی یعنی بنیادی نسخہ قرار دیا جائے اور اس کے متن کو کسی تغیر و تبدیل کے بغیر نقل کیا جائے۔"

انھوں نے یہ بھی کہا کہ بہترین نسخہ مصنف کے ہاتھ کا ہوتا ہے اور اگر اس نے کئی نسخے لکھے ہیں تو "بہتر نسخہ وہ ہوتا ہے جو سب سے آخر میں لکھا ہو" ان کے مطابق ایران میں اساسی نسخے کو نسخۂ مادر کہتے ہیں۔

انگریزی کے لحاظ سے اس روش کو انتقادی کہنا مناسب نہیں۔ انگریزی میں انتقادی روش انتخابی طریقے کو کہتے ہیں۔

یہ ضروری نہیں کہ قدیم ترین نسخہ مصنف کے قریب ترین ہو اور اس باعث صحیح ترین ہو۔ ہو سکتا ہے کہ قدیمی نسخوں اور مصنف کے درمیان بہت سے واسطے رہے ہوں۔

اکثر نسخوں میں تاریخ کتابت نہیں دی ہوتی۔ جن میں درج ہوتی ہے، ان پر آنکھیں بند کر کے بھروسا نہیں کر لینا چاہیے۔ کیونکہ بعض ناقل مکھی پر مکھی مارنے کے مصداق اپنے ماخذ خطی نسخے (Exempler) کا ترقیمہ تک نقل کر دیتے ہیں جس کی وجہ سے مقدم نسخے کی تاریخ کتابت موخر نسخے کی تاریخ کتابت معلوم ہونے لگتی ہے۔ بغیر تاریخ والے نسخوں کی تاریخ کتابت موخر نسخے کی تاریخ کتابت معلوم ہونے لگتی ہے۔ بعض لوگ جعلسازی کی بنا پر بھی ایسا کرتے ہیں۔ بغیر تاریخ والے نسخوں کے زمانے کا تعین کرنے کی ایک ترکیب ڈاکٹر کاترے ایلنک اور اس کے شرکا نے یہ بتائی ہے کہ نسخوں کے مشمولات وغیرہ کو دیکھ کر شجرہ مرتب کیا جائے جس سے قدیم نسخے کا اندازہ ہو سکے گا۔ لیکن یہ بھی قطعی نہیں ہے۔ بقول ڈاکٹر گیان چند:

"تشجیر ہمیشہ سیدھے عمودی خط میں نہیں چلتی۔ بعض اوقات ایک مخطوطے کا متن پہلے کے دو نسخوں کے متن سے ملا جلا کر تیار کیا جاتا ہے۔ اسے لاطینی میں Misch Codicus اور انگریزی میں Conflated version کہتے ہیں۔ اردو میں آمیختہ نسخہ کہہ سکتے ہیں۔ اس قسم کے نسخوں کا زمانہ اور شجری رشتہ طے کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ برٹش لائبریری (برٹش میوزیم) لندن میں چار درویش کا ایک ایسا فارسی نسخہ ہے جس میں اصلاً باغ و بہار والے کردار ہیں لیکن ان کی سرگزشت مختلف ہے"۔

ڈاکٹر گیان چند لکھتے ہیں مؤلف نے دو قصوں یا نسخوں کو ملا دیا ہوگا۔ کاترے کے نزدیک ایک متن کا جو نسخہ نسبتاً مختصر اور سادہ ہوتا ہے اسے Textus Simplicitor کہتے ہیں۔ جو مفصل اور ترقی یافتہ ہوتا ہے

اسے Textus Ornatior یعنی مرصع کہتے ہیں۔ کاترے نے اصول درج کیا ہے کہ سادہ مختصر نسخہ قدیم تر ہوگا، مرصع ومفصل اس کے بعد کا ہے۔

ڈاکٹر سید حسن نے دوسری روش کو التقاطی کہا۔ اردو میں یہ لفظ اجنبی ہے۔ "التقاط" کے معنی چننے کے ہیں۔ بقول ڈاکٹر گیان چند اس طریقے میں مخطوطے کی تاریخ کتابت کی اہمیت نہیں بلکہ جو مخطوطہ بہترین معلوم ہوتا ہے اس کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ واضح ہو کہ اس روش کے تحت مختلف مخطوطوں کو لے کر بہترین متون کا انتخاب نہیں کیا جاتا بلکہ پوری کتاب کی حد تک کیا جاتا ہے۔ بعد کا کوئی پورے کا پورا نسخہ لیا اور اسے اساسی نسخہ بنالیا۔

ڈاکٹر گیان چند کے نزدیک یہ طریقہ صحیح ہے اور دراصل اسی کو روش التقاطی کہنا چاہیے۔ سفارش یہ رہی کہ مختلف نسخوں کے ہر لفظ پر تنقید کر کے صحیح ترین لفظ منتخب کیجیے۔ اختلاف نسخ میں لفظ منتخب کے دوسرے تمام نسخے موجود ہوں گے۔ قاری انھیں دیکھ کر فیصلہ کرسکتا ہے۔

کتابت، عہد تصنیف، نقول کے خواص اور مشمولات کی داخلی تنقید کے حوالے سے چند بہتر نسخے منتخب کیے جاسکتے ہیں۔ تدوین کا عمل محدود تعداد تک یعنی زیادہ تر آٹھ دس نسخوں پر مرکوز رکھیں۔ باقی نسخوں میں اگر کوئی اہم اختلاف دکھائی دے تبھی ان کا ذکر کیا جائے۔ سوال درپیش ہے کہ مختلف قرأتوں میں سے کس بنا پر، کس کا انتخاب کیا جائے۔ یہ بہت مشکل امر ہے۔ اس میں مدون کا علم اور گہری نظر ہی آخری فیصلہ کرسکتے ہیں۔ پھر بھی کچھ اصول درج کیے جاتے ہیں:

1- کاترے نے ایک اہم اصول درج کیا ہے کہ نسخوں کو تولا جاتا ہے، گنا نہیں جاتا۔ یعنی اگر کوئی متن زیادہ نسخوں میں ہے تو اسے لازماً اس متن پر ترجیح نہیں دی جائے گی جو کم نسخوں میں ہے۔ اہمیت نسخے کی کیفیت کی ہے۔

2- دو نسخوں کی قرأتوں میں جو زیادہ مشکل ہو اسے ترجیح دیں۔

3- نسخوں کا شجرہ بناتے وقت اگر آپ پائیں کہ کسی امر میں زیادہ تعداد میں نسخے دوسری زیادہ تعداد سے مختلف ہیں تو یہ اختلاف قدیم ہے۔ اس پر توجہ کریں۔ اگر کم نسخوں میں کم نسخوں سے اختلاف ہے تو یہ بعد کا ہے اس کی چنداں اہمیت نہیں۔

ڈاکٹر خلیق انجم کے اصولوں میں سے چند قابل ذکر یہ ہیں:

"1- اگر ایک نسخے میں ایسا لفظ استعمال ہوا ہے جو مصنف کے عہد میں رائج نہیں تھا یا کم رائج تھا جب کہ دوسرے نسخے میں ایسا لفظ ہے جو مصنف کے عہد سے نزدیک تر ہے تو دوسری قرأت کو ترجیح دی جائے گی۔

2- بامعنی قرأت کو بے معنی قرأت پر ترجیح دی جائے گی۔

3- اگر کسی نسخے میں ایک یا ایک سے زیادہ لفظ زائد ہیں تو زائد الفاظ والی قرأت سے رجوع کریں۔

4 اگر ایک قرأت بامعنی ہے لیکن سیاق وسباق کے مطابق نہیں جب کہ دوسری

مطابق ہے تو دوسری کو ترجیح دی جائے گی"۔

چوتھے قاعدے میں یہ واضح نہیں کہ دوسری قرأت، جو سیاق و سباق کے مطابق ہے، با معنی بھی ہے کہ نہیں۔ اگر با معنی ہے تو انتخاب کا سوال ہی نہیں۔ دونوں قرأتیں با معنی ہیں جب کہ ان میں سے محض ایک سیاق کے مطابق ہے، دوسری نہیں۔ ظاہر ہے کہ اول الذکر کو ترجیح دی جائے گی۔ مشکل اس وقت درپیش آتی ہے جب قرأت کسی بھی نسخے میں با معنی نہ ہو۔ ایسے میں تصحیح (Emendation) کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ یہ تصحیح عقل و شعور کی بنا ہی پر کیوں نہ کی جائے لیکن قیاسی ہی ہوگی۔ اس کی تفصیلات حسب ذیل ہیں۔

2- قیاسی تصحیح

جب مدون مختلف نسخوں سے ایک متن تیار کرتا ہے اسے تنقیدی نسخہ (Critical Recension) کہتے ہیں۔ بعض اوقات وہ ایسی صورت حال سے دوچار ہوتا ہے کہ کوئی بھی قرأت تسلی بخش نہیں ہوتی۔ آپ جس قرأت کو بہتر سمجھیں، اس کے بارے میں سوال کریں کہ کیا قدیم مصنف نے اسے لکھا ہوگا۔ اس میں مصنف کے اسلوب، لفظیات اور خیالات کا لحاظ رکھیں۔ شاید آپ اس سوال کا جواب کامل یقین سے نہیں دے سکتے۔ دوسرا سوال یہ ہو سکتا ہے کہ کیا مصنف نے ایسا نہیں لکھا ہوگا۔ اس کا جواب کئی صورتوں میں یقین سے دیا جا سکتا ہے کہ واقعی مصنف نے یہ نہیں لکھا ہوگا۔ بینٹلے (Bentley) کا پیمانہ یہ ہے کہ بہترین قرأت وہ ہے جو سب سے زیادہ با معنی ہو۔ گریگ نے اس میں اضافہ کیا "جو معقول حد تک مصنف سے منسوب کی جا سکتی ہے۔"

ڈاکٹر گیان چند لکھتے ہیں کہ اگر مختلف نسخوں کی مدد سے ہم جو متن تیار کریں وہ لفظاً و معناً غلط نظر آئے تو سوائے تصحیح کے چارہ نہیں۔ کاترے نے کہا ہے کہ تصحیح کے لیے دو اوصاف مدنظر رکھیں:

(الف) داخلی معنوی اعتبار سے اس کی صحت کا قوی امکان ہو۔

(ب) کتابتی اعتبار سے دکھایا جا سکے کہ ہمارے تجویز کردہ صحیح لفظ کا نسخے میں موجود مسخ لفظ سے بدلنے کا قوی صوری امکان تھا۔

ان دو تقاضوں کے لحاظ سے کاترے نے تین صورتیں گنائی ہیں:

1- اگر مندرجہ بالا دونوں تقاضے پورے ہوتے ہوں تو قیاسی تصحیح درست ہے۔

2- اگر کوئی تصحیح معنوی اعتبار سے برجستہ ہے لیکن اس کا کتابتی اعتبار سے مخطوطے میں لکھے لفظ میں بدلنے کا امکان کم ہے یعنی دونوں میں تحریری مشابہت کم ہے تو اس تصحیح کی درستی کا امکان ہے لیکن اس قدر نہیں جتنا پہلی شکل میں تھا۔

3- تیسری صورت یہ ہے کہ تصحیح کتابتی اعتبار سے قریب الامکان ہو لیکن معنوی اعتبار سے غلط۔ ایسی تصحیح بالکل بے کار ہے۔

اگر کسی متن میں کسی لفظ کے ہجے غلط ہیں تو مدون اپنے متن میں انھیں درست کر کے لکھ دے گا

لیکن عام رواج یہ ہے کہ ان الفاظ کے پہلے اوپر کی طرف ایک ستارہ (*) بنا کر تصحیح حرفی کی طرف اشارہ کر دیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر گیان چند کے نزدیک: ''نزدیک غلط ہجے کی تصحیح میں ستارے کی بھی ضرورت نہیں۔ یہ تصحیح اتنی بدیہی اور ضروری ہے کہ اس کا اظہار کرنا بھی تضیع اوقات ہے۔ بالفرض اظہار کرنا بھی ہو تو اختلافات نسخ کے باب میں کیا جا سکتا ہے''۔

پرانے نسخوں میں بعض اوقات کرم خوردگی یا بوسیدگی کی وجہ سے کچھ الفاظ ضائع ہو جاتے ہیں۔ اگر قیاسی طور پر ان کا اضافہ کیا جائے تو اسے قوسین کے درمیان لکھا جائے۔ جرمن مدون متن پال میسن (Paul Mass) کی تجویز ہے کہ اس لفظ یا الفاظ کو زاویے کی علامتوں < > کے درمیان لکھا جائے اور اگر دو نسخوں کو ملا کر متن تیار کرتے وقت کسی لفظ یا بعض الفاظ کو حذف کرنے کی ضرورت آئے تو انھیں درمیانی اور بڑے بریکٹوں [{ }] کے درمیان لکھا جائے لیکن حذف کی ضرورت تو کبھی کبھار ہوگی۔ اگر ایک نسخے میں کچھ الفاظ مکرر درج ہو گئے ہیں تو انھیں حذف کر دیجیے۔ اپنے تیار شدہ نسخے میں کچھ نہ لکھیے۔ حذف کا اظہار اختلاف نسخ میں کر دیجیے۔ اسی طرح قیاسی اضافے کے الفاظ کو بڑے بریکٹ [ ] میں دینا کافی ہے۔ عجوبہ قسم کی علامتوں کے استعمال کی ضرورت نہیں۔ ویسے جو علامتیں چاہیں اپنائیں۔ صرف تحقیق کی ابتدا میں ان کی وضاحت کر دیں۔ اس مقصد کے لیے الگ صفحہ بھی دیا جا سکتا ہے۔

متنی تصحیح کے بارے میں دو نظریے ہیں:

1- قدامت پسند (Conservative): جو اہل مغرب کو پسند ہے۔ اس کے حامی تصحیح کے خلاف ہیں اور موجود متن کو برقرار رکھ کر اس کی تاویل کرتے ہیں۔ جسے وہ سائنسی تشریح (Exegesis) کا نام دیتے ہیں۔ اس میں الفاظ سے زبردستی وہ معنی اخذ کرتے ہیں جو ان میں موجود نہیں۔ اگر تشریح ممکن نہیں تو کہہ دیتے ہیں کہ یہ مصنف کا جنون ہوگا جو اس نے ایسا لکھ دیا۔ ان کے بقول مشکوک متن مشکوک تصحیح سے بہتر ہے۔ وہ [غلط] لفظ جس کے لیے کچھ تو امکان ہے کہ مصنف نے لکھا ہو، اس [درست] لفظ سے بہتر ہے جو مصنف نے لکھا ہی نہیں۔ اس مکتب فکر کے حامیوں کو ماہر آثار قدیمہ کہتے ہیں۔

رشید حسن خاں لکھتے ہیں:

> ''قیاس کے دائرے کو اس قدر وسیع نہ کیا جائے کہ وہ مرتب کے اضافوں کا مجموعہ بن کر رہ جائے۔ یہ قطعاً ضروری نہیں کہ کسی متن کے سارے مقامات حل ہو جائیں۔''

2- نقاد: دوسرا مکتب فکر تصحیح کا حامی ہے اور تشریح و تاویل کے خلاف ہے۔ اس کے حامی کہتے ہیں کہ تصحیح کو تاویل پر سبقت حاصل ہے۔ یہ لوگ متن میں مناسب ترین لفظ دیتے ہیں لیکن اختلاف نسخ میں دوسرے تمام نسخ دے دیتے ہیں تاکہ قاری خود نتیجہ نکال سکے۔ انھیں نقاد کہہ سکتے ہیں۔

ان دونوں انتہاؤں کے درمیان ایک مکتب فکر ہے جو کہتا ہے کہ مختلف نسخوں کے مشکوک الفاظ پر سائنسی تشریح کا اصول لگائیں لیکن جہاں لفظ بالکل بے محل ہو وہاں قیاسی تصحیح کریں۔ اگر اس تصحیح کے متوازی

مثال اس متن میں اور کہیں بھی ملتی ہو تو کیا کہنا۔ اس طرح یہ مکتب فکر 75 فی صد پہلے کا اور 25 فی صد دوسرے کا حامی ہے۔

قیاسی تصحیح کم سے کم صورتوں میں کرنی چاہیے۔ اس بارے میں تین آراء قابل ذکر ہیں:

1- واٹسن کی کتاب میں مشمولہ اپنے مضمون میں چیپ مین نے لکھا ہے:

''قیاسی تصحیح مدون کا پہلا نہیں، آخری فرض ہے۔''

2- کاترے کا قول ہے کہ تصحیح محض موافق حالات ہی میں کرنی چاہیے اور محض اس وقت جب موجودہ متن کی کوئی سائنسی تشریح نہ کی جاسکے۔

3- خدا بخش سیمینار میں رشید حسن خاں نے قیاسی تصحیح کی بحث میں کہا:

''قیاسی تصحیح کا دائرہ محدود رہنا چاہیے اور وہیں آزمانا چاہیے جہاں حق الیقین ہو ورنہ متن میں دس پندرہ فی صدی حصہ ہمارا ہوگا، مصنف کا نہیں''۔

انھوں نے رائے دی کہ جن نسخوں میں تصحیح کے نام پر ہر چار چھے اشعار میں اضافے کرنے پڑیں ایسے نسخے کو فوٹو اسٹیٹ لے کر ویسے ہی چھاپ دیا جائے اور تصحیح کے نام پر دخل اندازی نہ کریں۔ انھوں نے بتایا کہ فسانۂ عجائب کے 280 الفاظ میں انھیں صرف تین الفاظ ملے جنھیں حق یقین کے ساتھ تصحیح کر سکے۔

متنی تصحیح میں موضوعیت یا ذاتی پسندیدگی کا اندیشہ رہتا ہے۔ اس سے گریز کریں۔

تدوین متن کے دو سوالوں کا ذکر کیا گیا تھا۔ پہلے سوال پر بہت مفصل بحث ہو چکی۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ قدیم متون کو قدیم املا میں چھاپا جائے یا جدید املا میں۔ پہلے اس پر کچھ آراملاحظہ کریں:

انگریزی میں قدیم و جدید یا املا کا مسئلہ انیسویں صدی کے آخر میں ابھرا جب کہ 1550ء اور 1560ء کے درمیانی متون چھاپے گئے۔ انگریزی میں کئی صدیوں کے دوران میں لفظوں کی تصریف اور ہجوں میں بہت اختلافات رونما ہوئے ہیں، اُردو سے کہیں زیادہ مثلاً Strike کا صیغۂ ماضی پہلے Strook تھا جو بعد میں Struck ہو گیا۔ اُردو میں صرفی لاحقوں میں کوئی قابل ذکر تبدیلی نہیں ہوئی۔ انگریزی میں انیسویں صدی کے شروع میں مدونین نے قدیم متون کو ان کے قدیمی ایڈیشن کے مطابق قدیم ہجے میں چھاپا جس سے تدوین کے ساتھ فرسودہ متن میں دلچسپی پیدا ہوئی۔

محققین نے Early English Text Society یا سپنسر سوسائٹی جیسی انجمنیں بنائیں۔ انگریزی میں تدوین متن سے متعلق ایک رسالہ Studies in Bibliography شائع ہوتا ہے۔ مندرجہ رسالے کے شمارہ 13 متعلقہ 1960ء میں قدیم اور جدید ہجے سے متعلق دو مضمون نکلے۔ پہلا مضمون جون رسل براؤن کا تھا ''شیکسپیئر اور اس کے معاصرین کے ڈراموں میں قدیمی ہجوں کی معقولیت۔'' اس شمارے میں آرتھر براؤن کا جوابی مضمون نکلا۔

''شیکسپیر اور اس کے معاصرین کے ڈراموں میں قدیمی ہجوں کی معقولیت، ایک تردیدی جواب''

باورس (Bowers) لکھتا ہے کہ تنقیدی قدیم املائی ایڈیشن قدیم متن کی بازیافت کی کوشش کرتا ہے۔ سر والٹر گریگ نے دو قسم کے ایڈیشنوں کا ذکر کیا، علماء کے لیے اور عوام کے لیے۔ کہتے ہیں کہ تنقیدی ایڈیشن نقاد کا ایڈیشن ہوتا ہے۔ جس کے مقابلے میں مقبول عام ایڈیشن ہوتا ہے۔ محققین کے لیے جو ایڈیشن تیار کیا جائے، اس میں پہلے ایڈیشن کے ہجے برقرار رکھے جائیں تو مصنف کی صحیح شخصیت سامنے آجائے گی۔

گریگ نے اس سلسلے میں دو اصطلاحیں وضع کیں جو بقول ڈاکٹر گیان چند اب عام طور سے استعمال کی جاتی ہیں:

1-Substantives جن میں الفاظ و طریق اظہار شامل ہیں۔ اردو میں انھیں مفرد وار جزو کہہ سکتے ہیں۔

2-Accidentals یعنی اتفاقیے۔ ان میں چار چیزیں شامل ہیں۔

3- لفظوں کی تقسیم اور حد بندی۔

4-Capitalization یعنی کن لفظوں کی ابتدا میں بڑا حرف ہو۔

اُردو اور پاکستانی زبانوں کی حد تک چوتھا نکتہ غیر متعلق ہے، پہلے تین ہی متعلق ہو سکتے ہیں۔ گریگ اور دوسرے تمام لکھنے والے مفرد وار جزو کو قدیم انداز پر برقرار رکھنے کے حامی ہیں۔ ہجوں کے مقابلے میں گریگ پہلے ایڈیشن کی تقلید چاہتا ہے۔ اس کے نزدیک مدون کے لیے تجدید میں کوئی دلکشی نہیں لیکن وہ بھی کتاب کے نام کو جدید املا ہی دینا چاہے گا۔ اتفاقیوں کی بقیہ تینوں قسموں کی تجدید پر اسے اعتراض نہیں بشرطیکہ وہ مصنف کے عندیے سے نہ ٹکرائیں۔

بیٹ سن کہتا ہے کہ مفرد وار جزو قدیم انداز پر باقی رکھیں، اتفاقیوں کی ہمیشہ تجدید کر دیں۔ اس نے اس طرف توجہ دلائی کہ بڑے ادیب لازماً ہجوں اور اوقاف کے عالم نہیں ہوتے۔ شیکسپیئر کے سات دستخط موجود ہیں، ان میں ہجے مختلف ہیں۔ اس کے ہاتھ کے لکھے تین صفحے ملتے ہیں۔ ان میں ہجوں کا خلفشار ہے اور بقیہ اتفاقیوں میں غلطی ہے۔

باورس کی رائے متوازن ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ محققین کے لیے جو ایڈیشن تیار کیا جائے اس میں قدیم ہجے برقرار رکھے جائیں۔ عوامی مطالعے کا ایڈیشن جدید ہجے میں ہو۔ اگر کسی کتاب یا مضمون میں قدیم متن میں اقتباس دیا جائے تو وہ جدید ہجے میں دیا جائے قدیم میں نہیں۔ ہجوں کے علاوہ بقیہ تمام اتفاقیوں کو ہمیشہ جدید کر دیا جائے۔

انگریزی تدوین میں مخطوطات سے تو سابقہ پڑتا نہیں، ہمیشہ ایڈیشنوں کی بات کی جاتی ہے۔ جس طرح اُردو کی نستعلیق طباعت میں مصنف کے علاوہ کاتب کا عمل دخل رہتا ہے اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ کسی لفظ کے ہجے کی ذمہ داری مصنف کی ہے کہ کاتب کی، اسی طرح انگریزی طباعت میں مصنف کے علاوہ مطبع کے کمپوزر یا ٹائپ کار کی ذات درمیان ہوتی ہے۔ نہیں کہا جا سکتا کہ لفظوں کا املا مصنف کا تھا یا یہ ٹائپ کار کی غلطی ہے۔ اسی لیے باورس کہتا ہے کہ مصنف کی نظر سے گزرا ہوا ایڈیشن بھی مل جائے تو مدون اس کے ہجوں میں تین موقعوں پر تبدیلیاں کر سکتا ہے۔ اب کمپیوٹر نے جدید کمپوزنگ میں ایڈیٹر کے فرائض سنبھال لیے ہیں۔ اس لیے

املا کا مسئلہ بہت حد تک حل ہو جاتا ہے۔ اُردو میں بھی کمپیوٹر پر ٹیکسٹ ایڈیٹر سامنے آ چکا ہے۔ اس سے مدد لی جا سکتی ہے۔

1- ایک ایڈیشن میں ایک ہی لفظ کے ہجوں میں اختلاف دکھائی دے تو اس کی ذمے داری ٹائپ کار کی ہے۔ مدون اسے درست کر دے۔

2- اگر نسخے میں ایک جگہ کوئی لفظ یا صرفی روپ ایک طرح سے ہے اور دوسری جگہ دوسری طرح سے تو مدون جس لفظ کو مصنف کا اصلی منشا سمجھے، ہر جگہ اسی طرح کر کے باضابطگی لے آئے۔

3- جو غلطیاں واضح ہوں، ان میں کوئی ہرج نہیں۔

اب اسی موضوع پر آرا، ملاحظہ ہوں۔

1- ڈاکٹر سید مبارز الدین رفعت نے "نوائے ادب" جنوری 1967ء میں لکھا:

"بعض الفاظ کا املا ان کے قدیم متون میں ان کے اس وقت کے تلفظ کے مطابق لکھا گیا ہے۔ آج ان کا املا مروجہ املا کے مطابق ہو جائے گا لیکن تلفظ وہی رہے گا لیکن ایسی صورت میں کہ وزن کی تکمیل کے لیے قدیم املا کی پابندی ضروری ہو تو ایسا کرنا ہی مستحسن ہوگا"۔

2- عبدالرزاق قریشی:

"متن تیار کرتے وقت املا کا خیال رکھنا ضروری ہے یعنی املا وہی ہوگا جو اس عہد میں رائج تھا۔"

3- ڈاکٹر گیان چند

"میں نے انجمن اساتذہ اُردو، لکھنؤ 73-1972 کے شعبہ تحقیق کی صدارت کرتے ہوئے املا کے بارے میں ذیل کے اصول پیش کیے تھے:

1- جن مقامات پر مخطوطے کا املا موجودہ تلفظ سے کوئی فرق ظاہر نہیں کرتا بلکہ محض فرسودگی املا ہے وہاں جدید املا اختیار کر لیا جائے مثلاً اوس، فرسنگ، خوشے، ساتھی کو بالترتیب، اس، فرسنگ، خوشی، ساتھی لکھا جائے۔

2- جن مقامات پر فرسودہ املا فرسودہ تلفظ کی ترجمانی کرتا ہے اور جسے بدلنے میں مصنف کا پیش کردہ تلفظ بدل جائے گا وہاں مخطوطے کا اصل املا برقرار رکھا جائے مثلاً کوں، سوں، کبھو، جد، تد، تلبھنا، کو جدید کر کے کو، سے، جب، تب، تڑپنا، ہرگز نہ لکھا جائے۔

میرے نزدیک اب بھی یہ اصول معقول ہیں۔ میرا دوسرا اصول بھی ہے جو مبارز الدین رفعت کے دوسرے پیراگراف میں دیا ہے"۔

4- ڈاکٹر تنویر علوی:

"قدیم متون کا املا ان کے رائج الوقت املا ہی کے مطابق ہونا چاہیے۔ جدید املا میں

ان کو پیش کرنا حقائق سے ان کا رشتہ توڑنا ہے۔"

5- رشید حسن خاں کی کتاب ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ 1978ء میں شائع ہوئی، جب کہ تنویر علوی کی اکتوبر 1977ء میں۔ رشید حسن خاں کی کتاب میں ان کا مضمون دیوان غالب، صدی ایڈیشن بھی شامل ہے۔ یہ پہلے رسالہ تحریک میں شائع ہوا تھا، اس طرح اسے ڈاکٹر تنویر پر سبقت حاصل ہے۔ بہر حال کتاب کی اشاعت کا لحاظ کرتے ہوئے اسے ڈاکٹر تنویر کے بعد لیا جاتا ہے۔ اس مضمون میں رشید حسن خاں نے غالب کے خطوط وغیرہ سے بعض الفاظ کے املا سے متعلق ان کے نظریات کو لیا ہے۔ رشید حسن خاں کا مطالبہ ہے کہ غالب کے متن میں ان کے خاص خاص الفاظ میں املائے غالب کی پیروی کی جائے۔

سوال یہ ہے کہ اگر ہر مصنف کی تحریر کو اس کے املا میں دیا جائے تو یائے معروف و مجہول ک، گ، یائے مخلوط و ملفوظی میں بھی اس خلفشار کو برقرار رکھنا ہوگا۔ لیکن واضح ہو کہ پرانے مخطوطے بہ خط مصنف نہ ہونے کے برابر ہیں، وہ کاتب ہی کی روش کے آئینہ دار ہیں۔ اگر ہیں اور ان میں مندرجہ بالا ناپسندیدہ خلفشار ہے تو رشید حسن خاں نے اپنے مضمون "منشائے مصنف کا تعین" میں اس کا یہ حل پیش کیا ہے:

"مخطوطے میں واقعی املا کے پیچھے منشائے مصنف کی تلاش کیجیے۔ اگر چہ اس نے "کی" کو یائے مجہول سے "کے" لکھا ہے تو بھی اس کا منشا "کی" لکھنے کا تھا، اس لیے آج ہم اسے "کی" ہی لکھیں گے۔ اگر اس نے "گھر" کو "گہر" لکھا ہے تو ہم جانتے ہیں کہ اس کا منشا "گھر" لکھنے کا تھا۔ ہم گھر لکھیں لیکن اگر کوئی مصنف صریحاً کسی خاص املا کے حق میں لکھتا ہے مثلاً غالب کا "خور" اور "خرشید" لکھنا تو ہم اسے "خورشید" لکھیں تو منشائے مصنف کی خلاف ورزی ہوگی۔ یعنی جن مصنفین کے مختارات کا ہم کو علم ہے ہم اسکی تقلید کریں لیکن ہمیں جن مصنفین کے مختارات کا ہم کو علم نہیں ان کے کلام کے سلسلے میں ان کے عہد کے اور ان کے معاصرین کے کلام سے مدد لی جائے گی"۔

قدیم ادیبوں کی اپنی تحریریں بہت کم ملتی ہیں۔ ان کے کسی خصوصی املا کا تعین نہیں ہو سکتا اور مصنف کی نگرانی میں بھی کوئی کتاب چھپی ہو اور جس میں مندرج ہو کہ یہ مصنف کی نظر ثانی کا نتیجہ ہے مثلاً دیوان غالب نسخہ نظامی، فسانہ عجائب اور گلزار نسیم کے بعض ایڈیشن اور جہلم سے شائع ہونے والا میاں محمد بخش کی سیف الملوک کا پہلا نسخہ اس سب میں مصنف اور قاری کے درمیان کاتب کی ذات رہتی ہے۔ عام مصنف خود پروف نہیں پڑھتے، پڑھتے بھی ہیں تو کمال توجہ سے اغلاط کی نشان دہی نہیں کرتے۔ کرتے بھی ہیں تو کوئی یقین نہیں کہ کاتب ان سب کو صحیح کر دے گا۔

ڈاکٹر گیان چند اس اصول ہی سے متفق نہیں کہ مصنف کا خصوصی املا برقرار رکھا جائے۔ غالب کا "خورشید" کو "خر" لکھنا اور آزادانہ حیثیت سے خور کو بہ شمول واؤ لکھنا ہی غیر معقول ہے۔ دونوں جگہ ایک ہی لفظ ہے اور ترکیب کی صورت میں بھی اس میں کوئی تخفیف واقع نہیں ہوتی۔ منطقی تکملیت کا تقاضا ہے کہ ہم ان

کے املا اور روش تحریر کی سو فی صد تقلید کریں۔ مصنف کے املا کی تقلید کا محض یہ نتیجہ نہ ہوگا کہ ہم رشید حسن خاں کے اقتباس میں "نبل ہوی" لکھیں گے اور عابد پشاوری کی تحریر میں "بوالہوس"، بلکہ ہم اس لغو صورت حال سے دوچار ہوں گے کہ ڈاکٹر جعفر حسن کا نام ہمیشہ "جافر حسن" لکھنا ہوگا اور ان کی تحریروں کے اقتباس میں تمام عربی حروف کو ہم صوت فارسی یا ہندی حروف میں بدلنا ہوگا۔ ہمارا املا ہمارے دور کے لیے ہے اور اس کا اطلاق کریں۔ ڈاکٹر گیان چند کے دوسرے اصول کو ملحوظ رکھیں کہ مصنف کا املا بدلنے سے تلفظ میں کوئی فرق واقع ہوتا ہو تو مصنف کا املا ہی دیا جائے مثلاً انھیں اور انھی، تمھیں اور تمھی میں تلفظ کا فرق ہے اس لیے مصنف نے جس طرح لکھا ہے اس کی تقلید کی جائے۔

6- ڈاکٹر عبدالحق دلی یونیورسٹی:

"عام پڑھنے والا موجودہ رسم الخط سے مانوس ہے۔ اگر پرانا املا رکھا جائے تو کافی پریشانی ہوگی"۔

جہاں تک رہا اوقاف اور الفاظ کی تقسیم کا مسئلہ ہے، تو ان کے بارے میں عام اتفاق ہے کہ یہ پوری طرح جدید ہونے چاہئیں۔ مدون کو اختیار ہے کہ وضاحت کے لیے جہاں جس قسم کے نشانات یا رموز اوقاف کی ضرورت ہو لگائے، لیکن شروع میں ان کی وضاحت کردے۔ الفاظ کی حد بندی کے بارے میں دو بزرگوں قاضی عبدالودود اور مالک رام کا اصرار ہے کہ ایک مرکب لفظ کے آزاد اجزا کو بھی ملا کر لکھا جائے۔ جبکہ مقتدرہ کی سفارشات اس کے برعکس ہیں۔

3- متنی خوبیاں

متنی خوبیوں میں اسلوب نگارش پر خالص علمی اور لسانی نقطۂ نظر سے بحث کی جاسکتی ہے۔ اس میں بنیادی مسئلہ لسانیاتی مطالعے کا ہے۔ کسی تصنیف کا اپنے زمانے کے تعین میں لسانی مطالعے سے بڑی مدد ملتی ہے۔ متنی خوبیوں میں متن کی ادبی اور لسانی محاسن زیر بحث آتے ہیں۔ ادبی خوبیوں سے یہاں مراد طرز نگارش سے متعلق ایسے حقائق ہیں جن سے متن کے بارے میں ضروری معلومات حاصل ہوں۔ اس ضمن میں حسب ضرورت تراکیب تراشی، الفاظ و فقرات کی بندش اور جملوں کی ساخت کی جانب تنقیدی اشارے کیے جاسکتے ہیں۔ لسانی مطالعے میں متن کی زبان اور لفظیات اور حروف وغیرہ کا لسانی حوالوں سے تنقیدی جائزہ شامل ہے۔

معروضی مطالعے کے متنی معارض اور متنی مواقف کا اندازہ زیر بحث مثالوں سے کیا جاسکتا ہے۔

رضا لائبریری رام پور میں میر تقی میر کے کلیات کا ایک بہت اچھا نسخہ محفوظ ہے۔ اس میں نکات الشعراء کے علاوہ ان کی نظم و نثر کا سارا کام، دیوان اردو 1 تا 6، دیوان فارسی، "فیض میر" اور "ذکر میر" شامل ہیں۔ جس کی کتابت نہایت اہتمام سے کی گئی ہے۔ ذکر میر کے علاوہ سب کتابوں کے شروع میں طلائی لوح اور پوری کتاب میں رنگین جدول کھینچی گئی ہے۔ پوری کتاب کے اوراق کی تعداد 832 ہے اور فل اسکیپ کا 17 سطری مسطر کام میں لایا گیا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ شیخ لطف علی حیدری نے مرزا قمر علی کے لیے ایک برس اور دو یا تین دن میں اسے لکھا اور 29 رمضان سنہ 1246ھ اس کی تاریخ اختتامیہ ہے:

"کسی صاحب ذوق نے اس نسخہ کے ابتدائی تین دیوان، دیوان سوم کی ردیف "م" تک بغور پڑھے ہیں۔ چنانچہ جگہ جگہ بین السطور اور حاشیوں میں الفاظ اور محاورات کے معنی مصرعوں اور شعروں کی تشریح اور متبادل الفاظ درج کیے ہیں جن میں سے اکثر اختلاف نسخ کی حیثیت رکھتے ہیں۔"

اس تعارف کا پہلا حصہ متنی معارض سے تعلق رکھتا ہے اور دوسرا حصہ متنی مواقف ہے۔

اس ضمن میں زیادہ اہم بات اس رشتے کا پتہ چلانا ہوتا ہے جو کسی نسخے اور اس کے مالک یا مخزن کے مابین ہوتا ہے۔ ان رشتوں کا علم اس کی تحقیق اہمیت کو بڑھا دیتا ہے۔ مالک رام صاحب ہی کے قلم سے متن کا تعارف ملاحظہ فرمائیں:

"گل رعنا کا یہ نسخہ مکمل ہے۔ کاغذ کا سائز ساڑھے چوبیس × چودہ سم ہے اور حوض ساڑھے انیس × سوا نو سم۔ کاغذ باریک ولایتی ہلکے بادامی رنگ کا ہے۔ کہیں کہیں کرم خوردگی کے آثار ملتے ہیں لیکن اس سے نہ کتاب کو کوئی نقصان پہنچا ہے نہ متن ہی کا کوئی حصہ ضائع ہوا ہے۔ پوری کتاب کی نظم و نثر ایک ہاتھ میں سیاہ روشنائی سے نستعلیق خط میں لکھی گئی ہے۔ کاتب کو اگرچہ بہت خوش خط تو نہیں کہا جا سکتا لیکن بدخط بھی نہیں ہے۔ غلطی بھی کم کرتا ہے...... ہر جگہ تخلص عنوان وغیرہ لفظ سرخ روشنائی سے لکھے ہیں۔ ہر ایک صفحے پر دو جدولیں ہیں...... باہر نیلا خط ہے اور اندر کی طرف شنگرفی رنگ کے دو خط۔ غزلوں کے درمیان کے خطوط بھی شنگرفی ہیں۔ پوری کتاب 92 صفحات پر مشتمل ہے۔ ص 8 سے اردو حصہ انتخاب شروع ہوتا ہے اور یہ ص 27 تک چلا گیا ہے۔ اردو انتخاب 116 غزلوں سے لیا گیا ہے اور اس میں کل 455 شعر ملتے ہیں۔"

مندرجہ بالا مثالیں معروضی مطالعے میں متنی معارض اور متنی مواقف کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔

متن کے مطالعے کی اہمیت و افادیت کا جتنا تعلق متن کے خارجی حقائق کے مطالعے سے ہے۔ اس سے زیادہ تعلق متن کے داخلی کوائف کے مطالعے اور حقائق کی جستجو سے ہے جسے موضوعی مطالعہ کہا جاتا ہے۔

ادبی کتب و رسائل کا اگرچہ براہ راست موضوع تاریخ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا لیکن اس کی بدولت ہمیں ایسے حقائق مل جاتے ہیں جو بعض تاریخی کوائف اور واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ان میں کچھ ایسے واقعات و حالات کہیں تفصیل اور کہیں اختصار کے ساتھ بیان کیے جاتے ہیں جن کی بدولت بعض تخلیقات کی شان نزول کو سمجھنے کے علاوہ اس عہد کے تمدنی مزاج اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس متن کی اپنی تاریخی حیثیت متعین کرنے میں مدد ملتی ہے۔ یوں متنی تدوین تاریخی تحقیق کے زمرے میں آن کھڑی ہوتی ہے۔

کسی عہد کے ادبی مزاج اور تنقیدی معیار کو ایک دوسرے سے الگ کر کے دیکھنا مشکل ہے۔ اس لیے تنقید متن میں اس مطالعے کی بنیادی اہمیت ہے۔ جس سے متنی حقائق کی تقسیم میں بھی مدد ملتی ہے۔ اس کے علاوہ کسی تصنیف کی ادبی یا علمی حیثیت کے تعین میں بھی مدد ملتی ہے۔

متن کے بارے میں بعض شہادتیں کسی دوسرے متن یا ماخذ میں ملتی ہیں جس سے متن کی حدود، اس کے زمانہ تالیف کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ تذکروں، خطوط، دواوین نیز سوانح عمریوں میں بھی متنی شواہد کی مثالیں ملتی ہیں۔

متنی معارض کا دوسرا اہم حصہ متنی مآخذ ہیں۔ تنقید متن میں یہ ایک اہم مخزن ہیں۔ متنی مآخذ کی نشان دہی کبھی کتاب کے دیباچہ کبھی سبب تالیف میں ہوتی ہے۔ متنی مآخذ کی نشان دہی سبب تالیف کے ضمن میں اس طرح ہوتی ہے۔

جب کسی متن میں اس کے مآخذ کے سلسلے میں ایسے ضمنی حوالے موجود نہ ہوں تو مآخذ کا پتہ چلانے کے لیے تحقیقی وتقابلی مطالعے سے کام لینا پڑتا ہے۔ خطوط اور دواوین میں مآخذ کی تلاش اس طرح نہیں کی جاتی بلکہ تخلیقی سرچشموں کی کھوج کی جاتی ہے۔

متنی محاسن تنقیدی متن کی تیسری کڑی ہے۔ جس میں متن کا ادبی اسلوب سب سے اہم ہے۔ متنی تنقید کا اندازہ حقائق متن کی جانب واضح اشاروں سے زیادہ نہیں ہوتا۔ متنی نقاد اس کے حسن وقبح پر بھی کوئی رائے نہیں دیتا۔ بقول ڈاکٹر تنویر احمد علوی:

> ''بحیثیت متن اس کے لیے سادہ وپیچیدہ عبارت کی اہمیت یکساں ہے۔ بشرطیکہ اس کی قرأت ممکن ہو اور کہیں سے متن ضائع نہ ہو گیا ہو۔''

تنقید متن کے ضمن میں ایک مرتب متن کے لیے اس پر اظہار خیال مناسب حدود کے ساتھ ضروری ہوتا ہے کہ متن میں کس کس طرح کا انداز نگارش ملتا ہے۔ تنقید متن میں متنی محاسن کا سب سے اہم پہلو لسانی مطالعہ ہے۔ قدیم تحریروں کو سمجھنے اور جاننے کے لیے قدیم زبان کا جاننا بہت ضروری ہے۔ لسانی مطالعے کے بھی کچھ اصول وضوابط ہیں۔

شعراء کے دواوین سے بھی لسانی حقائق کی نشان دہی ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ اسم، فعل، حروف، ضمائر، تذکیر وتانیث، جمع بنانے کے طریقے غرض کہ زبان کے بنیادی ڈھانچے کو سمجھنے سے متعلق تمام امور لسانی مطالعے میں آتے ہیں۔ جن کا متن کی نوعیت، ادبی، لسانی اور لغوی ضروریات کے پیش نظر مطالعہ ضروری ہے۔ سماجی اور نفسی لسانیات کی روشنی میں بھی پرکھ انجام دی جا سکتی ہے۔

4- مشمولات کی تحقیق

متن کی تصحیح اور تدوین کرتے ہوئے انتخاب یا قیاس، کسی بھی طرح سے بحث کرنے کے ساتھ ساتھ بہت سے تحقیقی کام انجام دینا پڑتے ہیں۔ سب سے پہلا کام تو متنی تاریخ کے تعین کا ہے۔ پھر اور کئی

امور ہیں۔ڈاکٹر گیان چند لکھتے ہیں:

''تدوین متن میں ایک اہم تحقیقی پہلو یہ ہوتا ہے کہ مشمولات جامع ومانع ہوں۔ جامع سے یہ مراد ہے کہ مصنف کی کوئی تخلیق یا زیر تدوین کتاب کا کوئی جزو شامل ہونے سے نہ رہ جائے مثلاً اگر کسی مصنف کی کلیات زیر تدوین ہے تو مختلف ذرائع سے لے کر اس کی جملہ تخلیقات کو شامل کیا جائے۔کوئی تذکرہ یا دیوان یا مجموعہ مراثی زیر تدوین ہو تو اس کے تمام حصے جمع کر دیے جائیں۔ مانع سے یہ مراد ہے کہ کوئی بھی ایسا جزو شامل نہ ہونے پائے جو اس مصنف کی تخلیق نہ ہو۔عدالتی زبان میں یوں کہہ سکتے ہیں۔''مصنف یا مجموعے کی جملہ تخلیقات، مصنف کی اس مجموعے کے علاوہ کوئی دوسری تخلیق نہیں۔''یعنی نہ حذف ہو نہ الحاق''۔

متن کی کئی شکلیں ہوتی ہیں۔ان میں سے کچھ کا ذکر ڈاکٹر تنویر علوی نے اپنی کتاب کے باب ''تحقیق متن'' میں کیا ہے۔ذیل میں چند ایک کا ذکر کیا جا رہا ہے:

(الف) کلیات

یہ اصطلاح نظم کے لیے مخصوص ہو گئی ہے۔ اگرچہ نثر کی بھی ہو سکتی ہے۔کلیات نظم کی دو شکلیں ہیں۔ایک تو وہ جو خود شاعر نے یا اس کے انتقال کے فوراً بعد اس کے کسی شاگرد یا دوست نے مرتب کی ہو۔دوسری شکل وہ ہے جب بعد میں کسی نے منتشر اجزاء کو جمع کر کے بنائی ہو مثلاً جواہر خسروی میں خسرو کا ہندی کلام۔دوسری صورت وہ ہے کہ شاعر کے کسی مجموعے یا پہلے کی کلیات کو لے کر اس میں ادھر ادھر سے منتشر کلام کو لے کر شامل کر دیا جائے۔اس کی بہترین مثال دیوان غالب نسخہ عرشی ہے جو دراصل کلیات نظم غالب ہے۔

(ب) کلیات سے کم مجموعے

بعض اوقات منتشر چیزوں کو لے کر نثر یا نظم کے مجموعے تیار کیے جاتے ہیں مثلاً اقبال کے نثری افکار مرتبہ ڈاکٹر عبدالغفار شکیل جس میں اقبال کے خطوط کے علاوہ ان کی دوسری تمام نثری تحریریں ہیں۔ خطوط غالب مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم جس میں غالب کے جملہ خطوط ہوں گے۔

(ج) غیر متداول یا منسوخ کلام

اگر شاعر نے اپنے کلام کا ایک حصہ منتخب کیا اور بقیہ کو منسوخ کر دیا اور تحقیق کار نے منسوخ کلام کو دریافت کر لیا تو ایسے مجموعے کو منسوخ یا غیر متداول کہیں گے۔ظاہر ہے کہ یہ ایک جگہ مدون شکل میں تو ملے گا نہیں۔جگہ جگہ سے لے کر جمع کرنا ہوگا۔نسخہ عرشی کے اجزا گنجینہ معنی اور یادگار نامہ غالب کا غیر متداول کلام ہیں۔اقبال کے منسوخ کلام کے بہت سے مجموعے شائع ہوئے ہیں جن میں سے مبسوط باقیات اقبال مرتبہ

عبدالواحد معینی و عبداللہ قریشی طبع سوم ہے۔

مندرجہ بالا مجموعوں میں الحاق وحذف دونوں کا اندیشہ رہتا ہے، حذف کا زیادہ، الحاق کا کم۔ الحاق یعنی دوسرے کی تخلیق کو شامل کر دینا تحقیقی اعتبار سے بڑی غلطی ہے۔

دور قدیم سے مصنفوں کے جو دیوان، کلیات اور دوسرے مجموعے مروج ہیں، ان میں بھی کثرت سے الحاق ہے غیر شعوری بھی شعوری بھی۔ قاضی عبدالودود نے اپنے مضامین میں اور ڈاکٹر خلیق انجم اور ڈاکٹر تنویر علوی نے اپنی کتابوں میں انگریزی، فارسی اور اُردو کے الحاقات کی دلچسپ تفصیل دی ہے۔

بیاضوں، قواعد اور لغات میں سند کے اشعار میں غلط انتساب بہت عام ہے کیوں کہ وہاں تحقیقی احتیاط ملحوظ نہیں رکھی جاتی۔ دقت یہ ہے کہ مجموعے کو جامع بنانے کی کوشش کی جائے تو اس میں الحاق کا اندیشہ ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر گیان چند لکھتے ہیں کہ نو دریافت چیزوں کی اصلیت طے کرنے کے لیے داخلی اور خارجی دونوں شہادتوں پر توجہ کیجیے۔ خارجی شہادت یہ ہے کہ اسے کس شخص نے دریافت کیا ہے، کس ذخیرے سے ملی ہے اور کس مجموعے یا رسالے میں پائی گئی۔ ان سب کا پایہ اعتبار طے کیجیے۔ اگر اس کو شامل کرنے والا مخطوطہ (مثلاً کلیات یا دیوان) عام طور پر معتبر ہے، قدیم ہے، اس میں دوسری تمام چیزیں اسی شاعر یا نثر نگار کی ہیں تو بڑی حد تک امکان ہے کہ وہ اسی تخلیق کار کی ہو۔ داخلی شہادت اس کا موضوع، اس کا اسلوب، لفظیات، دروبست اور ادبی روایات ہیں۔ انھیں دیکھ کر فیصلہ کیجیے کہ کیا یہ اس مصنف کی دوسری تخلیقات سے ہم آہنگ ہیں۔ ان تمام شہادتوں کو دیکھ کر مدون اپنے تجربے اور نظر کے سہارے کچھ فیصلہ کرے گا۔

الحاق ہی سے ملتا جلتا مسئلہ انتحال کا ہے۔ انتحال کے معنی غلط نسبت کے ہیں۔ بقول ڈاکٹر گیان چند یہ اصطلاح ان صورتوں میں استعمال ہوتی ہے جہاں کوئی سارق کسی دوسرے کی تخلیق کو اپنا مال بنا کر پیش کرتا ہے۔ مثلاً انجمن ترقی اردو ہند میں غلام حسین بخشی کی قلمی مثنوی **معدن یاقوت** (1221ھ) موجود ہے۔ اس کو قدرے مختصر کر کے محمد ناصر خاں رام پوری نے **نسخۂ یاقوت** (1223ھ) کا نام دے کر اپنی تصنیف بنا لیا۔ یہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ لائبریری میں ہے۔ محمد عبداللہ عطا ساکن چرکھاری نے اقبال کی نظم نیا شوالہ (1905ء) کو رسالہ "شاہد سخن" حیدر آباد، دسمبر 1913ء میں اپنا مال بنا کر شائع کر دیا ہے۔ ان سرقوں کی شناخت کا کوئی اصول نہیں۔ محقق کا مطالعہ اور علمی تجربہ ہی اس کی رہنمائی کرے گا۔ سرقوں اور توارد کے حوالے سے بھی کئی مقالات سامنے آتے رہتے ہیں۔ ان کا مطالعہ بھی مفید ہوتا ہے۔

اس کے مقابلے میں وہ جعل ہیں۔ جن میں کوئی خود تصنیف کر کے دوسرے کے نام سے شائع کر دیتا ہے۔ ملاحظہ ہو ڈاکٹر گیان چند کا مضمون "کچھ جعلی کتابوں کے بارے میں" "ہماری زبان" 22 اکتوبر 1986ء۔ اس قسم کی کچھ مثالیں یہ ہیں:

1- محمد حسین آزاد نے بہت سی غزلیں اور قصیدے تصنیف کر کے "دیوان ذوق" میں شامل کر دیے۔

2- "صراط مستقیم عرف سیدھا راستہ" تمنا عمادی پھلواروی نے تصنیف کر کے عماد

الدین قلندر پھلواروی سے منسوب کر دی۔

3- عبدالباری آسی نے 26 غزلیں تصنیف کر کے غالب کے نام سے چلا دیں۔

4- محمد اسمٰعیل رسا گیاوی نے نادر خطوط غالب کے نام سے غالب کے کچھ خطوط تصنیف کر دیے۔

5- شرافت نوشاہی نے حاجی نوشہ متوفی 1064ھ سے منسوب کر کے دو کتابیں مثنوی گنج الاسرار اور انتخاب گنج شریف وضع کر دیں۔

ایسی چیزوں کی تفصیلی اور جزئیاتی پرکھ کی ضرورت ہے تبھی ان کے وضعی ہونے کا سراغ مل سکتا ہے۔ جعل ساز جتنا بڑا عالم ہوگا، جعل کے پوشیدہ رہنے کا اتنا ہی زیادہ امکان ہوگا۔ بعض نامعلوم افراد بھی الحاق کرتے رہتے ہیں جیسے ہیر وارث شاہ یا ابیات باہو کے ساتھ ہوا۔

متون کی تدوین میں ایک اور اندیشہ ہوتا ہے کہ مخطوطے کے اوراق آگے پیچھے نہ ہو گئے ہوں یا ایک جلد میں مجلد دو کتابوں کو (جن میں سے پہلی ناقص الآخر اور دوسری ناقص الاول ہو) ایک ہی کتاب نہ سمجھ لیا جائے جو مخطوطے ابتدا یا آخر میں ناقص ہوتے ہیں، ان میں مصنف اور کتاب کے التباس کا بہت اندیشہ رہتا ہے۔ مدون متن کو اپنا نسخہ تیار کرتے وقت ایسی تمام صورتوں سے خبردار رہنا چاہیے۔ اس کی ترکیب یہ ہے کہ وہ مخطوطے کے ایک ایک صفحے کو توجہ سے پڑھے اور اس میں یک رنگی اور تسلسل پر نظر رکھے۔ تجربہ ہی اس میدان میں کسی کو ماہر ٹھہراتا ہے۔

5- تعیینِ تاریخ

کسی دستاویز یا مخطوطے کے لیے حافظ محمود شیرانی نے تاریخ و سن کا تعین کرنے کے کئی اصول وضع کیے۔ جو خارجی اور داخلی ہر دو اصولوں کو پیش نظر رکھنے کا نام ہے۔ ڈاکٹر اورنگ زیب عالمگیر کے نزدیک تعیین تاریخ کے عمل کی ایسی حدود کا تعین جس سے یہ مخطوطہ شناسی کے عمل کے دوسرے مباحث، مثلاً جعلی واصلی اور تعیین متن میں اضافہ والحاق اور تحریف کے مسائل و مباحث سے علیحدہ ہے، ممکن نہیں۔ اس کا تعلق کہیں نہ کہیں ان مباحث سے جا ملتا ہے۔

تعیین تاریخ کے عمل میں کتاب سے متعلق تمام علوم وفنون یعنی تحریر، زبان، املا، کاغذ، قلم، سیاہی و روشنائی، تجلید، مصوری، ڈرائنگ، تصویر چہ سازی، رنگ سازی، رنگ کاٹ (Bleach)، نقش ونگار و علامات اور علامتی سیاسی وتہذیبی، ادبی ثقافتی تاریخ، ان سب علوم کا ارتقا اور ان میں آنے والی عہد بہ عہد تبدیلیاں اور ایسی خصوصیات کا جن سے زمانے اور عہد کی تعیین کی جا سکے، بروئے کار لانا ضروری ہے۔ تقویم کے نظام اور ان کی پیچیدگیوں، تعمیہ و تخرجہ، زبر و بینات جیسے علوم سے کما حقہ آگاہ ہونا ضروری ہے تاہم ایسا وسیع و عمیق علم، منطقی و تجزیاتی ذہن اور سراغ رسانی و تلاش کار، رجحان و لگن تقریباً ناپید ہے۔ حافظ محمود شیرانی ایک استثنائی مثال ہے۔

ایک پہلو تو یہ ہے کہ تاریخ و سنہ اگر لکھا بھی ہو تو ضروری نہیں کہ وہ صحیح ہو۔ عمداً سہواً وہ غلط بھی لکھا گیا ہو سکتا ہے۔ مگر اس کے علاوہ تکنیکی پہلو یہ ہے کہ اگر کوئی باقاعدہ واقعہ مختلف علاقوں میں مختلف اوقات میں ہوا تھا تو ایک ہی ملک میں اس میں تغیر و اختلاف پایا جاتا تھا۔

آج کی مروج عیسوی تقویم میں 1582ء میں پوپ گریگری ہشتم نے اصلاحات کا آغاز کیا تھا، مگر پروٹسٹنٹ انگلینڈ نے 1752ء یعنی تقریباً ایک سو ستر سال بعد انھیں اختیار کیا تھا۔

صرف اس ایک بات سے ثابت ہو جاتا ہے کہ کسی خاص نظام تقویم کی تحریر شدہ تاریخ کے متغیر اور ناقابل اعتماد ہونے کا بہت حد تک امکان ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی بادشاہ کے عہد کا دورانیہ درج کیا گیا ہو تو تحقیق کر لینی چاہیے کہ اس کا شمار بادشاہت ملنے کی تاریخ سے کیا گیا ہے یا تخت نشینی کی تاریخ سے؟

داخلی شہادتوں کے حوالے سے بھی تاریخ کی تعیین کی جا سکتی ہے۔ نوادرات، مخطوطات اور دستاویزات اپنے داخل میں ایسی خصوصیت لیے ہوتی ہیں جو یہ شہادت مہیا کرتی ہیں کہ وہ کب اور کہاں وجود میں آئی ہیں۔ تخلیق کار کا اپنا انداز، رجحان اور ذوق ہوتا ہے جو اس سے مخصوص ہوتا ہے اور شناخت کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر اورنگ زیب کے نزدیک اگر کوئی عمداً ایسی دستاویز تحریر کرتا ہے یا غلط زمانہ یا انتساب کرتا ہے تو اس کا بھی تعیین داخلی شواہد سے ہو جاتا ہے۔ کوئی بھی صاحب علم و صاحب نظر اپنے علم اور تجربے کی بنیاد پر کم و بیش حتمی طور پر صحیح عہد و تاریخ اور ان امور کا تعین کر سکتا ہے۔ اس کے لیے عموماً زبان، تاریخی حقائق و معلومات، اسلوب اور ''تجزیہ طرز'' اور ''تجزیہ تکنیک'' کی بنیاد پر فیصلہ کیا جاتا ہے۔ ایک طریقہ کار سے حاصل ہونے والے نتائج کی توثیق یا تنسیخ سے دوسرا طریقہ کار ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ دونوں طریق کار کے بیک وقت استعمال ہی سے بہترین نتائج تک پہنچا جا سکتا ہے۔ اس سارے عمل کی بنیاد باریک بینی، تیز مشاہدے، منطقی طرز فکر، قوت امتیاز، یادداشت اور وسیع علم پر ہوتی ہے۔ تجربہ اس میں پختگی پیدا کرتا ہے

ڈاکٹر اورنگ زیب نے تعیین تاریخ میں مخطوطے یا دستاویز میں استعمال شدہ اشیاء یعنی، کاغذ سیاہی، جلد، رنگوں، ڈرائنگ اور نقش و نگار، تصویر چہ نگاری یعنی Miniature Painting اور طرز تحریر، املا، زبان کے تغیرات پر مفصل بحث اور تاریخ ارتقاء و تغیر پر علیحدہ ابواب کے تحت بحث کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ مختصراً یہ کہ:

> ''کاغذ کی رنگت، موٹائی، سطح کی ملائمت، جذب کرنے کی صلاحیت، ریشے کی مصنوعی لگدی، اور تیاری کی تکنیک کے مطالعے سے تعیین تاریخ میں مدد ملتی ہے۔ ان سب میں مختلف علاقوں اور زمانوں میں تبدیلی آتی رہی ہے۔ کاغذ کی رنگت جو ابتدا میں خاصی زیادہ خاکستری اور پیلی ہوا کرتی تھی، بتدریج ہلکی ہو گئی، موٹائی بھی کم ہوتی چلی گئی، ملائمت زیادہ ہوتی چلی گئی۔ ہندوستان میں بلیچ یا رنگ کاٹ کی دریافت اور اس کا استعمال پہلے ہونے کی وجہ سے یہاں کاغذ سفید بننے لگا تھا۔ رنگ سازی کی صنعت میں کاشمیر کا کوئی مقابل نہ تھا۔ یہاں مختلف رنگوں کا کاغذ بنتا تھا۔ ریشم کی صنعت کے

امتزاج اور مدد سے ریشمی، ملائم نفیس کاغذ بنتا تھا۔ کاشمیری کاغذ ہلکے نیلے، پیلے، سرخ، گلابی، سبز رنگ کا بنتا تھا۔ ہندوستان میں رنگ گدلے اور ان کا امتزاج بھی غیر نفیس تھا۔ حنائی رنگ دستی طور پر عبارت پر پھیرنے کا رواج تھا جو کاغذ کو بھربھرا کر دیتا تھا"۔

تاریخ کے علم کی بنیاد پر بھی تعیین تاریخ ہوتا ہے۔ داخلی شواہد سے حافظ محمود شیرانی صاحب نے یہ ثابت کرنے میں کیوں کر مدد لی ہے کہ قصہ چہار درویش جدید الاصل ہے اور خسرو سے اس کا منسوب کرنا صریحاً غلط ہے۔

-1 خواجہ حافظ کے اشعار جو خسرو سے بہت بعد ہوا ہے، کثرت سے شامل متن ہیں۔

-2 حافظ کی طرح فغانی، نظیری، عرفی، شاپوری اور شیخ سعدی کے اشعار و اقوال شامل متن ہیں۔

-3 دوربین کا ذکر شامل ہے۔ حالانکہ یورپ میں بھی دوربین سترھویں صدی عیسوی میں رائج ہوئی تھی جو بہت بعد کا زمانہ تھا۔

زبان سے رہنمائی اور تعیین تاریخ و جعل سازی کی نشان دہی کی ایک مثال قاضی عبدالودود نے اپنے رسالے "معیار" شمارہ مارچ 1926ء میں شائع کی تھی۔ تنویر احمد علوی نے اپنی کتاب اصول تحقیق و ترتیب متن میں اس کو دوبارہ پیش کیا ہے۔ گویا صرف کسی دور کے لفظ ہی سے معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ لفظ اس دور میں بولا جاتا تھا یا نہیں اور کیا یہ بعد کے دور میں تو نہیں بولا جاتا تھا۔ اس سے تعیین تاریخ ہو سکتی ہے۔

طرز املا اور خط کی تاریخ سے واقفیت بھی جہاں تعیین تاریخ اور جعل کے تدارک میں مدد دیتی ہے وہاں عہد بعہد زبان کے ارتقاء کا وسیع تر مطالعہ بھی تحقیق کار کو یہ امور طے کرنے میں بے حد مدد دیتا ہے۔ چنانچہ جس زبان سے متعلق متن کی تدوین کی جا رہی ہو، اس کی تاریخ، املا کے انداز اور خطاطی کی تاریخ جاننا ضروری ہو جاتا ہے۔

مقالے کی تیاری

تیرھواں باب

خاکہ سازی یا تحقیقی تجویز کی تیاری

کسی بھی تعمیری کام کے آغاز سے پہلے اس کی مناسب منصوبہ بندی کی جاتی ہے، خاکہ وضع ہوتا ہے اور اقدامات (SOP,s) تحریر کیے جاتے ہیں۔ تحقیق بھی ایک تعمیری کام ہے۔ تحقیقی کام کرنے یا مقالے کا آغاز کرنے سے پہلے اس کی مناسب منصوبہ بندی کرلی جاتی ہے۔ یہ تحقیق کار کی اپنے کام انجام دینے کی تجویز ہوتی ہے۔ عام طور پر تحقیقی تجویز تیار کرنے کو خاکہ سازی کہا جاتا ہے۔ اس میں بھی صرف ابواب کی نشان دہی خاکہ سازی سمجھی جاتی ہے یا پھر اس کے پس منظر، احوال، آثار، تاریخ، تنقید وغیرہ کو خاکے کا حصہ بنالیا جاتا ہے۔ یوں گویا ایک کتاب کی تیاری کا عمومی نقشہ وضع کیا جاتا ہے جبکہ یہ کام اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اس کی کئی تکنیکی جہتیں ہیں جس میں اجزائے تحقیق کے مطابق اپنے کام کرنے کی تجویز پیش کی جاتی ہے۔ ضروری ہے کہ تجویز دیتے وقت مقداری کی نسبت معیاری، تنقیدی کی نسبت یا نئی تحقیق کی تجویز دی جائے۔

1- بنیادی تصور

اُردو اور پاکستانی زبانوں میں ادبی تحقیق میں عام طور پر موضوع کی تلاش ہی کو بنیادی تصور قرار دیا جاتا ہے۔ طلبہ کے لیے آسان طریقہ اپنے اساتذہ سے مدد لے لینا ہے۔ بعض اوقات صدر شعبہ کے پاس کوئی منصوبہ یا اس کے حصے ہوتے ہیں۔ روایتی طریقہ کسی موضوع پر تصنیف و تالیف ہی کا ہے۔

تحقیق کا موضوع سوالات سے پیدا ہوتا ہے۔ سوالات (کیا، کیوں، کون، کب، کیسے، کس طرح) کسی مسئلے سے پیدا ہوتے ہیں۔ لسانی، ثقافتی اور سماجی پہلو سے ادب کے بارے میں سوالات کیے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند اور اُردو کے ایسے کئی اور مصنفین نے موضوع کی تلاش اور خاکے کی تیاری کی کم و بیش ایک سی مثالیں دی ہیں اور انھوں نے بھی اُردو کے تحقیقی خاکے کو گویا کسی کتاب کی تالیف کے حوالے سے ابواب کی نشاندہی پر زور دیا ہے۔ موضوع تلاش ہو جانے پر اس کی پرکھ کے لیے چند اصول پیش نظر رکھے جاتے ہیں، جن میں موزونیت علم، جامعیت، تجزیے، تالیف، جائزے، اطلاق، نتائج وغیرہ کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ مجموعی طور پر موضوع محض کسی کتاب کا عنوان نہیں بلکہ ایک مکمل تحقیقی ڈیزائن اور خاکہ ہوتا ہے۔ تعلیمی حوالے سے ڈاکٹر احسان اللہ خان، ڈاکٹر عبدالرشید اور ایس ایم شاہد نے تعلیمی حوالے سے ہیئت یا وضع (Format) اور تحقیقی

ڈیزائن پر توجہ دی ہے۔

تحقیقی خاکے کی تیاری کے لیے کچھ اور بھی امور پیش نظر رکھنا ہوتے ہیں تاہم خاکہ جیسا بھی ہو اس میں تحقیقی وقعت ، وثوق اور معروضیت کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ تحقیقی سوال یا مسئلہ اور ممکنہ حل یا فرضیے لازم ہوتے ہیں۔ گویا دراصل یہ ایک تحقیقی تجویز تیار کرنا ہوتی ہے، جس میں یہ بتانا ضروری ہے کہ تحقیق کار کس موضوع پر، کس انداز سے، کتنی وسعت میں، کیا تحقیق انجام دے گا؟ اس کے لیے طریق تحقیق کیا ہوگا اور یہ سب کچھ کتنے عرصے میں کن وسائل سے انجام پائے گا۔

تحقیقی مقالہ (Thesis) یا (Dissertation) ایک مسلسل مضمون، افسانے یا ناول کی طرح نہیں ہوتا کہ ایک طرف سے شروع کر کے آخر تک تسلسل کے ساتھ بڑھتے جائیں، لکھتے جائیں اور پڑھتے جائیں۔ اسے مخصوص انداز میں پیش کیا جاتا ہے یعنی اس کی ہیئت کے مخصوص اجزا ہوتے ہیں، جنھیں ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے۔ اس سے مقالے کی تحقیقی اور علمی شان بھی پیدا ہوتی ہے اور اس کے جائزے یا امتحان کے لیے ایک رسمی وضع بھی استعمال ہوتی ہے۔ اسے قرطاسِ طرز (style sheet) کہتے ہیں۔

2- مقالے کے عمومی اجزاء

اُردو اور پاکستانی زبانوں میں مقالے کے عمومی حصے یا اس کی ہیئت پر گفتگو کرنے سے پہلے اس بات کا جائزہ لینا ضروری ہے کہ مقالہ ہوتا کیا ہے؟ تحقیق کار تحقیق کی راہوں پر چل نکلا ہے تو اس سلسلے میں جو کچھ حاصل ہوتا ہے، وہ دوسروں کو بتانے کے لیے ایک دستاویز یا رپورٹ کی صورت میں پیش کرتا ہے۔ یوں گویا تحقیقی مقالہ ایک تحقیقی رپورٹ کا نام ہے جس میں ایک بات کا مخصوص دعویٰ (Thesis) پیش کیا جاتا ہے۔ یہ دعویٰ کسی مسئلے (Problem) کی بنا پر کیا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ مسئلہ کیا ہے اور اس مسئلے سے کون سے تحقیقی سوالات پیدا ہوتے ہیں اور ان سوالات کے امکانی حل کیا ہیں؟ انھیں فرضیے (Hypotheses) کہتے ہیں، جن کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ انھی فرضیوں کی تصدیق کے لیے تحقیق انجام دی جاتی ہے۔

اپنے مقالے میں تحقیق کار بتاتا ہے کہ کن باتوں کو وہ تسلیم کر کے آگے بڑھنے لگا ہے اور ان پر کی گئی کون کون سی سابقہ تحقیق کو کافی سمجھتا ہے۔ ان مسلّمات (axioms) کو مفروضے (Assumption) کا نام دے کر درج کرتے ہیں۔ پھر بتاتا ہے کہ اس کا طریق تحقیق کیا ہوگا اور وہ خود کس حد تک تحقیق انجام دے گا۔ تحقیق کی حدود (Limitations) یا تحدید (Delimitation) بھی درج کی جاتی ہے۔ اگر وہ اپنی تحقیق کے لیے خاص نئے الفاظ اور اصطلاحات وضع کر رہا ہو تو ان کا ذکر بھی کیا جاتا ہے۔

اپنے تحقیقی کام کا ذکر کرنے سے پہلے تحقیق کار بتاتا ہے کہ اس سے پہلے اس تحقیقی سوال کا جواب دینے کی کون کون سی کوششیں ہوئیں یعنی سابقہ تحقیقی رپورٹس یا مقالے کون کون سے تھے اور ان سے کیا نتیجہ نکلا۔ ان کی روشنی میں اس تحقیق کا کیا جواز ہے؟

یہ تحقیقی مقالہ ممتحن کے علاوہ آئندہ کے تحقیق کار بھی پڑھیں گے اور تحقیق کار کو اس میدان کا ماہر سمجھ کر

اس سے استفادہ کریں گے۔ اس لیے تحقیقی مواد نہایت ایمانداری، غیر جانبداری اور غیر شخصی انداز میں سائنسی اور معروضی طور پر پیش کیا جاتا ہے اور یہ پیش کش مختلف ابواب کی صورت میں ہوتی ہے۔ اپنی ابواب بندی کے جواز اور منطق کا ذکر پہلے حصے ہی میں کیا جاتا ہے۔

آخر میں سارے متن کا خلاصہ اور تحقیق کے نتائج یعنی فرضیوں کی تصدیق یا تردید بیان ہوتا ہے اور ان نتائج کی روشنی یعنی لب لباب (Conclusions) سے آئندہ رہنمائی کے لیے تحقیق کاروں کو مختلف سفارشات پیش کی جاتی ہیں۔

تحقیق کار اپنے تحقیقی ماخذوں کو پوری دیانت کے ساتھ خاص طرز کی وضع میں درج کرتا ہے۔ یہ تمام ماخذ (تحریری، زبانی، سمعی، بصری) ضمیموں سے پہلے درج ہوں گے۔ ضمیموں میں ایسی دستاویزات بطور ثبوت درج کی جاتی ہیں جو اس نے تحقیقی متن میں استعمال کی ہوں۔

پوری دستاویز آسان، سادہ، اصطلاحی اور درست زبان میں درج کی جاتی ہے۔ ان تمام اندراجات، حوالوں، حواشی، تعلیقات کا انداز پورے مقالے میں یکساں ہونا چاہیے۔ عبارت مختصر مگر وضاحتی انداز میں ہو۔ غیر ضروری تفاصیل نہ دی جائیں۔ دیگر مصنفین کے اقتباسات کم سے کم مقدار اور طوالت میں ہوں۔ واضح رہے کہ تحقیق کار مقالے میں اپنے تحقیقی سوالوں کا جواب تلاش کر رہا ہے اور اپنی اس کوشش کا بیان سامنے رکھ رہا ہے۔

یاد رہے کہ مقالے کی ضخامت بے معنی شے ہے، اس کی علمیت اصل چیز ہے، جسے مخصوص ہیئت، وضع اور اسلوب یا طرز درکار ہوتا ہے۔ ہر ادارہ، یونیورسٹی یا تحقیقی جریدہ اپنی مخصوص ہیئت، وضع اور طرز طے کرتا ہے۔ تحقیقی مقالہ اسی کے مطابق پیش کرنا ضروری ہوتا ہے۔

اُردو اور پاکستانی زبانوں میں مقالے کی زبان عام ادبی، تنقیدی زبان نہیں ہوتی۔ اس کا خاص انداز ہے، جو عالمی وضع کا حامل ہوتا ہے۔ علمی تقاضے ایسی ہی وضع سے پورے ہوتے ہیں۔ جملے سادہ، چھوٹے، رسمی اور غیر ذاتی انداز میں ہوتے ہیں۔ اصطلاحیں وہی استعمال کی جاتی ہیں جو عام رسمی اور طے شدہ ہوتی ہیں۔ جب، جہاں اور تب جیسے الفاظ عام ہوتے ہیں۔ تشبیہ اور استعارے سے گریز کیا جاتا ہے، غرضیکہ ایک واضح اسلوب یا انداز بیان اختیار کیا جاتا ہے۔ مقالہ تحقیق کار تنقیدی یا ادبی مضمون نہیں ہوتا۔ اس لیے اس میں عبارت آرائی کی گنجائش کم ہے۔

3- تحقیقی خاکہ یا تجویز

اُردو اور پاکستانی زبانوں میں طلبہ کو مقالے کے موضوعات منظوری کے لیے ایک تجویز یا خاکہ تیار کرنا ہوتا ہے۔ اکثر اساتذہ کے نزدیک اتنا بہت ہے کہ تحقیق کار کمیٹی کی منظوری کے لیے صرف دو تین صفحات پر ابواب کی ایک فہرست اور ممکنہ ماخذ لکھ کر لے آئے۔ جبکہ جدید تحقیقی ڈیزائن اسکے تمام تقاضے چاہتا ہے۔ اب اسے ترک کر دینا چاہیے تا کہ کمیٹی کے سامنے تحقیق کا پورا منصوبہ آ سکے۔ اس مقصد کے لیے متعلقہ فارم بڑے

غور و غوض اور مشوروں کے بعد پر کرنا چاہیے۔ تحقیقی تجویز داخلے کے وقت ہی پیش ہو جانی چاہیے۔ یہ مہینوں کا کام ہے۔

تحقیقی تجویز یونیورسٹی کی طے کردہ وضع (Format) کے مطابق پیش کرنی چاہیے۔ بعض ادارے تجویز سے پہلے ایک یا دو پیراگراف میں تجویز کا تعارف بھی چاہتے ہیں، جس میں واضح طور پر بتایا جائے کہ آپ کس ادبی پہلو سے تحقیق انجام دینا چاہتے ہیں اور اس مقصد کے لیے مواد کہاں کہاں دستیاب ہوگا۔ نیز یہ کہ کم از کم ایسے ہی دو سابقہ مطالعات یا تحقیقات کا حوالہ ضرور دیں، ان کے نتائج کا خلاصہ بتائیں اور یہ بتائیں کہ آپ کو ان سے آگے کچھ تلاش کرنے کی توقع کیوں کر ہے؟

چنانچہ یہ ڈیزائن مندرجہ ذیل امور کا احاطہ کرے گا:

1- تحقیقی مقاصد، تحقیق کا تعارف، ضرورت، اہمیت وغیرہ۔
2- مسئلہ اور اس کا بیان، تحقیقی سوال، جس کا جوب تلاش کیا جائے گا۔
3- فرضیے یا تحقیقی سوالات کے جوابات جن پر تحقیق کرنا ہے۔ ان میں سے صرف وہی فرضیہ درج ہوگا جس پر تحقیق کی جا رہی ہے۔
4- تحقیق کا دائرہ کار، حدود اور حد بندی یا تحدید۔
5- متعلقہ ادبیات کی فہرست جس کا مطالعہ مقصد ہے۔ (سابقہ نظریات، تحقیق اور خلاصہ)
6- تحقیق کا طریقہ، وسعت، آلاتِ تحقیق، ابتدائی مطالعہ اور کوائف کے استعمال کا طریقہ۔
7- مدتِ مطالعہ اور دیگر نکات۔ (کام کرنے کا طریق کار وغیرہ)
8- ابتدائی کتابیات یا بنیادی ضروری ماخذات کی فہرست۔

بعض ادارے یہاں تک پابندی لگاتے ہیں کہ آپ خاکے کے عنوانات متوازی قواعد میں درج کریں یعنی تمام عنوانات اسم ہوں یا تمام ہی فعل کی صورت میں درج ہوں مثلاً:

1- متعلقہ آراء (رائے اسم ہے)
2- سابقہ حوالہ جات (حوالہ اسم ہے)

یا پھر:

1- متعلقہ آراء درج کرنا (درج کرنا فعل ہے)
2- سابقہ حوالے بیان کرنا (بیان کرنا فعل ہے)

بعض ادارے یہ بھی چاہتے ہیں کہ آپ بتائیں کہ آپ اپنا کام کس طرح سے انجام دیں گے مثلاً:

1- اپنے ادارے کے علاوہ قومی کتب خانے سے استفادہ
2- متعلقہ جیسیوں ویب سائٹوں سے استفادہ
3- اہم نمائندہ نقادوں سے سروے
4- کوئی ابتدائی مختصر سی تحقیق

بعض اداروں کے نزدیک یہ بتانا ضروری ہے کہ کوائف کس طرح سے حاصل کیے جائیں گے کیونکہ طریق کار نتائج پر اثر انداز ہوتا ہے اور یہ کہ اس خاص تحقیق کے لیے کون سا طریق کار موزوں ہے؟ اس سے کوئی غرض نہیں کہ آپ نے کیا چھوڑ دیا ہے، اس سے غرض ہے کہ آپ نے جو کچھ جمع اور پیش کیا ہے، وہ کیا ہے، کتنا ہے اور کیسے حاصل کیا گیا ہے؟ کوائف کے حصول کا طریقہ یکساں اور متواتر ہونا چاہیے۔ ایسا کیونکر ہو سکے گا، اس امر کو بیان کرنا ضروری ہے۔ قبل از وقت یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ آپ حاصل کردہ مواد کا تجزیہ کس طرح سے کریں گے۔ کیا محض اپنی انکل پچو رائے سے یا کسی خاص پیمائشی طریقے سے؟ یا کسی خاص آلۂ تحقیق کے ذریعے؟ یا پھر تقابلی انداز سے؟ ہر طریقے کی وضاحت ضروری ہے۔

بعض ادارے سابقہ تحقیقات اور مقالوں کا ایک خلاصہ پہلے سے کیا ہوا چاہتے ہیں۔ گویا ایک مختصر سی تحقیق یا پائلٹ سٹڈی (Pilot study) انجام دینے کے بعد اصل تحقیقی تجویز تیار کی جا سکتی ہے اور ایسا ہی ہونا چاہیے۔ مختصر مطالعہ یا پائلٹ سٹڈی اصل تحقیق کی بنیاد بنتے ہیں۔

تحقیقی تجویز تیار کرنے کے اقدامات کیا ہوں۔ ڈاکٹر جوزف لیوائن نے اپنی ویب سائٹ میں تجویز کے مرحلے پر ان اقدامات کا ذکر کیا ہے:

1- دوسروں کی تجاویز کا مطالعہ کریں۔
2- سابقہ تحقیقی ادبیات کا جامع مطالعہ کریں۔
3- متعلقہ مضامین کی عکسی نقول حاصل کریں۔
4- اپنی تجویز کا عنوان وضع کریں۔
5- تجویز کو تحقیقی سوالات کے گرد منظم کریں۔
6- اپنا تحقیقی ڈیزائن موضوع کے فائدے، طریق کار اور مقام تحقیق کے حوالے سے وضع کریں۔
7- تجویز میں پہلے ابواب تحریر کر لیں۔
8- اپنا نگران سوچ سمجھ کر منتخب کریں اور اس کے مشورے سے تجویز وضع کریں۔

مندرجہ بالا امور کی روشنی ہی میں تحقیقی تجویز یا خاکہ تیار کیا جاتا ہے۔ یہ تجویز ایک سے زیادہ صفحات پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس میں مندرجہ بالا تمام امور کا ذکر ہوتا ہے۔ ذیلی اور ضمنی نکات درج کیے جاتے ہیں۔ سابقہ تحقیقات اور مقالوں کا ایک خلاصہ اور ابواب بندی کے منطق بیان ہوتی ہے اور اپنا ارادہ (Design) ظاہر کیا جاتا ہے تاکہ اسے پڑھ کر پورے تحقیقی منصوبے کو سمجھا جا سکے اور کوئی بات، عمل یا طریق کار پوشیدہ، موضوع، یا ذاتی نہ رہ جائے۔

یعنی جو کام کرنا ہے، پہلے سے واضح ہو۔ تحقیقی تجویز دراصل مکان کا بنیادی نقشہ ہوتی ہے۔

4- تحقیقی تجویز کا جائزہ

اس بات کا جائزہ لیا جائے گا کہ تحقیق کار نے اپنا تحقیقی خاکہ یا تجویز کیوں کر بنائی ہے؟ اور کیا

مخصوص ہیئت کو ملحوظ رکھا گیا ہے؟ کیا غور وفکر نظر آتا ہے؟ اگرچہ طلبہ/ طالبات/ اساتذہ اسے بدل بھی سکتے ہیں اوراس میں سے کسی حصے کو اپنی ضروریات کے لیے حذف بھی کر سکتے ہیں لیکن شرط صرف تفکر کی ہے۔ تفکر کا کوئی متبادل نہیں اور تحقیق کا کوئی مختصر راستہ نہیں۔ محنت اور صبر تحقیق کے صرف یہی دو ہتھیار ہیں۔ ڈان تھیکرے نے مشی گن یونیورسٹی میں تحقیقی تجویز کا جائزہ لیتے ہوئے چند سفارشات پیش کی ہیں۔ ان میں اس نے کل دو سو نمبر میں سے عنوان اور مسئلے کو 58 نمبر دیے ہیں، انداز یا طریق تحقیق کو 70 نمبر، تحقیق کار کی اپنی اہلیت کو 55 نمبر اور دیگر امور کو 17 نمبر دیے ہیں۔

تعارف

(الف) یہ درج ہو کہ یہ تحقیق کرنا کیوں ضروری ہے؟
(ب) بتایا گیا ہو کہ اسے کس طرح سے انجام دیا جائے گا؟
(ج) اس کے نتائج کا استعمال کہاں کہاں ہوگا۔ یعنی کون مستفید ہوگا؟
(د) کیا کم از کم دو افراد سے اس تحقیق کے جواز پر رائے لے لی گئی ہے؟

مسئلے کا بیان

کسی تجویز/ خاکے کے جائزے میں مندرجہ ذیل امور ملحوظ رکھے جائیں گے:
(الف) عنوان واضح طور پر درج ہو، جو مسئلے کا اظہار کرے۔
(ب) عمومی تعلق جس کی بنا پر مسئلہ وقیع اور دلچسپی کا باعث ہو سکے۔
(ج) عملی نوعیت اور صورت کا مسئلہ ہو۔

نظری پہلو

(الف) مسئلے کے لیے جس نظریے کو استعمال کیا جا رہا ہو، اس کی وضاحت موجود ہو۔
(ب) اہم متعلقہ تصورات اور ان کے باہمی تعلق کا بیان موجود ہو۔

سابقہ ادبیات کا جائزہ

(الف) یہ بحث کہ سابقہ تحقیق کے نتائج کو کس طرح سے فرضیوں کا ماخذ بنایا گیا ہے۔ اگر پہلے کوئی تحقیق انجام نہ دی گئی ہو تو اس کا ذکر ہو۔ اس کے نتائج بیان ہوں۔
(ب) یہ بحث کہ سابقہ ادبیات کس طرح موجودہ تحقیق کا جواز پیدا کرتے ہیں۔ ان میں کون سی کمی نظر آتی ہے؟ وہ کمی کس طرح دور کی جا سکتی ہے؟

طریق یا منہاج تحقیق

(الف) مسئلہ یا تحقیقی سوال: صراحت اور واضح مقاصد تحقیق جنھیں جانچا جا سکے، ثابت کیا جا سکے۔ پرکھا جا سکے اور باہمی تعلق واضح کیا جا سکے۔

(ب) فرضیے: سوال کے ممکنہ جوابات، جن پر تحقیق کی جارہی ہے۔ وہ عملی نوعیت کے ہوں۔ ان میں تحقیق کا دائرہ کار اور متوقع نتائج اپنی جزئیات کے ساتھ واضح ہوں۔

(ج) تعیینِ معنی یا مخصوص اصطلاحات: جن الفاظ میں تحقیقی نتائج بیان ہوں، ان کی وضاحت معنی کی صراحت کے ساتھ پہلے ہی کی گئی ہو۔ تنقیدی اصطلاحات سے گریز موجود ہو۔ تشبیہ و استعارے کا استعمال کم ہو۔

(د) عمومی وضاحت: تحدید، تاریخ آغاز، اختتام، تجزیے کا طریق کار، ڈیزائن وغیرہ واضح ہوں۔

فرضیے کی جانچ

فرضیے قائم کر لینا ہی کافی نہیں، تجویز پیش کرنے سے پہلے اور موصولہ تجویز میں کمیٹی کی طرف سے جانچ کے لیے کم از کم چار نکات ضرور ملحوظ رکھے جاتے ہیں۔

-1 مفروضہ، فرضیہ (H)، صفر فرضیہ (H_0) نیز متبادل فرضیے (H_2) درج کریں۔ فرضیے کو ایک دعوے کے طور پر جانچیں اور عقل سلیم سے فیصلہ کریں کہ آیا یہ بات ایسی ہے کہ اس پر کام کیا جاسکتا ہے۔ اس کے لیے مسئلے کے ساتھ مفروضے (Assumption) کو پیش نظر رکھیں اور صفر فرضیہ (Null Hypothesis) وضع کریں اور اس کے ساتھ تقابل کریں۔ یہ بھی کہ کیا کوئی متبادل فرضیہ (Alternate Hypothesis) بھی قائم ہوسکتا ہے؟ متبادل فرضیہ صفر فرضیے کے بالکل برعکس ہوتا ہے۔

-2 ایک اصول تصور کریں یعنی اہمیت کی سطح (Level of Significance) معلوم کریں، جس پر فرضیہ جانچا جاسکتا ہو۔ اگر امکانی طور پر فرضیے کے نتائج نصف سے بہتر ہوں تو گویا صفر فرضیہ درست نہیں۔

-3 اگر شماریاتی سروے یا اعداد و شمار/ کوائف سے متعلق تحقیق کی جارہی ہو تو چند نمونے لے کر ایک پیشگی مطالعہ/ پائلٹ سٹڈی کریں اور نتائج کی اوسط معلوم کریں۔

-4 فیصلہ کریں کہ فرضیہ امکانی طور پر ثابت ہوسکتا ہے۔ اس کے لیے شماریاتی تحقیق میں صفر فرضیہ درست ہوسکتا ہے، اگر نمونے کا اوسط 5 ٪ سے کم ہو۔ یہ احتمالی قدر (Probability Value/ P-Value) کہلاتی ہے۔ یہ صفر سے 1 کے درمیان ہوتی ہے، منفی نہیں ہوسکتی۔ اس کا تقابل اعتماد کی سطح (Level of Confidence) کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اگر صفر فرضیہ مسترد ہوتا ہے تو اعتماد کی سطح پیدا ہوتی ہے۔ اگر احتمالی قدر 5 ٪ سے کم ہو تو اعتماد کی سطح آتی ہے۔ صفر فرضیہ مسترد ہونے ہی پر فرضیہ درست ہوسکتا ہے۔

وسائل

(الف) تحقیق وسائل: اس ادارے میں ہوں۔ باہر کے کتب خانوں اور افراد کے پاس کم جانا پڑے۔

(ب) تحقیق کار کی اہلیت: اس ادارے کی حدود میں رہتا ہو۔ اخراجات اور وقت برداشت کرسکتا ہو۔ کام کرنے کی اہلیت موجود ہو۔

5-رہنمائے تحقیقی تجویز

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کی مجلس BASAR نے اپریل 2011ء میں کچھ ایسی ہی وضع (Format) کا حکم دیا۔ یونیورسٹی کے پاکستانی زبانوں کے شعبے میں آنے کے بعد میں نے جنوری 2013ء میں پی ایچ ڈی سطح کے کورس کے لیے رہنمائے تحقیقی تجویز کے اُصول دیے جو ذیل میں درج ہیں:

1۔ عنوان / موضوع (Topic)

☆ عنوان 20 الفاظ (70 حروف) سے زیادہ نہ ہو۔
☆ تحقیقی مسئلے / سوال کو مختصراً ظاہر کرے۔
☆ یہ جملے کی صورت میں نہیں، تعریف (Definition) کی صورت میں ہو۔
☆ اگر عنوان اُردو میں درج ہو تو نیچے انگریزی ترجمہ بھی دیا گیا ہو۔

2۔ تحقیقی مقصد (Purpose, Aims and Objectives)

☆ بیان کریں کہ آپ یہ تحقیق کیوں کرنا چاہتے ہیں؟ کس محسوس دشواری (Felt Difficulty) کی وجہ سے؟ اور اس کا ماخذ کیا ہے؟ اس سے آپ / زبان یا ادبیات / ادارے / معاشرے کو کیا حاصل ہوگا؟ اس کی اہمیت (Significance) اور جواز (Justification) کیا ہے؟

3۔ تحقیقی مسئلہ یا سوال اور بیان مسئلہ (Problem/Reseach Question and Statement of the Problem)

وہ بنیادی سوال جس کا حل طلب کرنا مقصود ہے؟ یعنی آپ کیا معلوم کرنا چاہتے ہیں اور کیوں؟ کوشش کریں کہ مسئلہ سوالیہ اور علمی انداز (کیا اگر......تو کیا......جب وغیرہ) میں جملے کی صورت میں لکھا جائے۔

4۔ سابقہ / متعلقہ تحقیقات / ادبیات کا جائزہ (Review of Related Literature)

☆ بیان کریں کہ اس موضوع پر اس سے پہلے کس نے کیا لکھا؟ اس کا طریق کار کیا تھا؟ اس کے نتائج کیا تھے؟ اس کی حدود اور ان حدود سے باہر کیا کچھ تھا؟ یعنی سابقہ اور متعلقہ تحقیقی رپورٹوں، مقالوں، مضمونوں، کتابوں کا نچوڑ / خلاصہ جو اس سے پہلے سامنے آئے۔
☆ لفظ "کتابیات" ہرگز درج نہ کریں۔
☆ ان تمام ماخذوں کا کلی نتیجہ کیا نکلا؟ کیا کچھ کرنا باقی ہے؟ (کوشش کریں کہ تحقیقی مجلات / جرائد کے مقالوں کا حوالہ زیادہ ہو)
☆ زیادہ سے زیادہ 250 الفاظ میں، متعلقہ حوالوں کے ساتھ۔ اصل مقالے میں یہ دوسرا باب ہوگا۔

5۔ نظریاتی احاطہ (Theoretical Framework)

☆ آپ کس فلسفے / نظریے یا مفروضے کے تحت کام کر رہے ہیں؟ (یعنی تحقیقی عمارت کس نظری بنیاد پر استوار ہوگی کہ اگر وہ ہو تو یہ تحقیق انجام پا سکتی ہے)؛

1۔ وجودیاتی(Ontological)......اثباتیت / ترجمانیت / تنقیدی

2۔ علمیاتی(Epistemological) ......　"　"　"

3۔ طریقیاتی(Methodological)......　"　"　"

(یعنی حقیقت کی نوعیت، نظریے کا کردار، جانچ، تحقیق کا کردار اور انسانیت کے فروغ کی نوعیت کی روشنی میں مفروضہ (Assumption) طے کرنا ہوگا۔)

6۔ نوعِ تحقیق(Research Kind)

☆ یہ تحقیق کی کون سی قسم اور ذیلی قسم ہے؟ نیز کیا یہ بنیادی، اطلاقی، مقداری یا تقابلی ہے؟

1۔ تاریخی، دستاویزاتی(Historical, Documentary)

2۔ بیانیہ، سروے(Descriptive, Survey)

3۔ مشاہداتی، تجرباتی(Observational, Experimental)

7۔ مفروضہ (Assumption)

☆ تحقیق بنیاد یا مسلمات یعنی جن امور پر تکیہ کرکے تحقیق انجام دی جائے گی۔

8۔ فرضیے(Hypotheses)یا قابلِ تحقیق جوابات

فرضیہ اوّل [H_1]

☆ وہ معلوم تحقیقی جواب جس کو ثابت یا رد کرنے کے لیے کوائف جمع کیے جائیں گے۔

فرضیہ دوم [H_2]

☆ اگر اس فرضیے کے ساتھ منسلک کوئی اور یا ذیلی فرضیہ یا فرضیے ہوں تو انھیں بھی درج کریں۔

فرضیاتی تحقیقی سوالات(Hypothetical Research Questions)

☆ اس فرضیے میں کون کون سے سوالات کے جوابات تلاش کیے جائیں جن سے فرضیہ پوری طرح ثابت ہوگا۔

صفر فرضیہ[Null Hypothesis (H_0)]

☆ آپ کے اصلی فرضیے کا برعکس فرضیہ کیا ہے، جس کے استرداد کی صورت ہر حال میں لازم ہے تاکہ اس کی روشنی میں آپ کا فرضیہ آگے بڑھ سکے۔

9۔ تحقیقی ڈیزائن یا ارادہ (Research Design)

☆ حسبِ نوعِ تحقیق طریقِ کار کیا ہوگا؟

(الف) تحقیقی آبادی یا کل دائرۂ کار(Research Population)

(ب) حدودِ تحقیق(Research Limitations)

(ج) تحدیدِ تحقیق (Research Delimitation)

☆ منتخب کردہ حد بندی اور اس کی وجہ / استدلال بیان کریں۔

(و) متغیرات (Variables)

☆ آزاد (Independent) اور پابند (Dependent)، مخلوط یا مطلق غیر جانبدار (Compound/Absolute) متغیرات کیا ہیں جو تحقیق پر اثر انداز ہو سکتے ہیں اور ان پر کیسے قابو پایا جائے گا؟ (خاص طور پر بیانیہ اور تجرباتی تحقیق میں)

(ر) اصطلاحات (Terms)

☆ وہ خاص الفاظ، اصطلاحات، فقرے یا جملے جو اس تحقیق کو بیان کرنے کے لیے آپ کی طرف سے خاص ہوں گے۔

(س) نمونہ بندی (Sampling and its Method)

☆ قسم = اتفاقیہ (Random)، امکانی (Probablic)، تنظیمی (Systematic) یا دیگر؟

☆ اُصول = 5 یا 10 کا قانون (Rule of 5 or 10) یا ابہام کا قانون (Rule of Thumb)

(ص) طریق حصول کوائف (Data Collection Process)

☆ کون سے تحقیقی آلات (Instruments) استعمال ہوں گے؟ اقتباسات، نوٹ، سوال نامے، انٹرویو، آرا، نکات، سافٹ ویئر اور ان کی حدود وغیرہ۔

☆ ان کی وقعت (Validity) اور وثوق یا اعتبار (Reliability) کا پیمانہ کیا ہوگا؟ (خاص طور پر سروے اور شماریاتی جائزوں میں)۔

(ط) طریق تجزیہ کوائف (Data Analysis Method)

☆ تقابلی، استدلالی، شماریاتی..... اگر شماریاتی نہیں تو کیوں؟ اگر تقابلی ہے تو دلائل دینے کا طریق کیا ہو گا؟

(ع) تحقیقی معیار میکنزم (Research Quality Mechanism)

☆ غیر جانبداری کس طرح سے ثابت ہوگی؟ ذاتی تعصبات کیسے دور ہوں گے؟ اگر کچھ مواد دوسری زبانوں میں ہے تو تحقیقی وقعت اور وثوق کیسے آئیں گے؟

10۔ مطالعاتی میقات (Study Time Table)

☆ مدت مطالعہ..

مراحل 1۔ .... 2۔ .... 3۔ ....

سفری اخراجات اگر ہیں تو کس قدر؟

اگر ماخذ ملک سے باہر ہیں تو حصول کیونکر ہوگا؟ اور کتنے وقت میں؟

11۔ شرکائے مطالعہ (Participants of the Study)

☆ مزید کن کن افراد اور ماہرین سے مدد حاصل کی جائے گی؟

☆ اگر تحقیق میں دوسری زبانیں اور علوم زیرِ مطالعہ آئیں گے تو یہ مسئلہ کس طرح سے حل کیا جائے گا؟

12۔ اخلاقی امور(Ethical Considerations)

☆ اقتباسات کے علاوہ کہیں سے مواد نقل نہ کرنے، حوالہ جات دینے، کسی کی سماجی حیثیت کی تحقیر نہ کرنے، اخلاقیات کو ملحوظ رکھنے، عبارت میں جمع متکلم کا صیغہ استعمال نہ کرنے، کلی فیصلے نہ دینے، عجز کا اقرار کرنے وغیرہ جیسے امور کا اعلان۔

13۔ ماخذ/حوالہ جات(Sources)

☆ شعبہ/جامعہ کے اساتذہ، ماہرین اور کتب خانے کے علاوہ اور کون سے ذرائع سے کوائف جمع کیے جائیں گے۔

☆ دستاویزات/مقالات/مضامین/رسائل/کتابیں/ویب سائٹس وغیرہ کی امکانی فہرست کیا ہے؟

14۔ ضمیمے (Appendices)

☆ امکانی طور پر کون کون سی دستاویزات ضمیموں میں درج ہوں گی؟

15۔ امکانی حاصلات(Possible Findings)

☆ آراء اور اعداد و شمار کی روشنی میں

16۔ ابواب بندی(Chapterization)

☆ مفصل ابواب کے ساتھ مطالعاتی متن کی ابواب بندی کا استدلال کہ اپنے ابواب کیوں بنائے گئے؟

6- تحقیقی اقدامات یا مراحل

خاکے یا تجویز کی منظوری کے بعد تحقیق کار کام کا آغاز کرنے کے لیے ہر باب کے لیے الگ فائل بناتا ہے اور ہر روز تھوڑا تھوڑا کام کر کے اس فائل میں شامل کرتا رہتا ہے۔ ابتدا میں کام بے ترتیب اور حسب موقع ہوگا۔ کبھی کوئی ماخذ سامنے آئے گا اور کبھی کوئی۔ تاہم وہ اپنے کام کرنے کا ٹائم ٹیبل بنالیتا ہے۔ کوشش ہوتی ہے کہ تحقیقی کام اسی ٹائم ٹیبل کے مطابق انجام دے۔ سارا مواد یک جا کرنے کے بعد تحقیق کار متن کی فائلوں کو الگ الگ مرتب کرنا شروع کرتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ کس بات سے آغاز کرکے کس بات پر اختتام کرنا ہے۔ باقی کون سی باتیں، نکات یا امور ہیں اور انھیں ہر دو کے درمیان کس انداز سے مرتب کرنا ہے۔

مرتب کردہ فائلیں، ابواب وغیرہ صاف تحریر میں دیے یا ٹائپ یا کمپوز کرائے جاتے ہیں۔ ان کی پروف خوانی پورے انہماک سے کی جاتی ہے۔ حوالے درست انداز سے درج ہوتے ہیں۔ ہیئت اور وضع کا خیال رکھا جاتا ہے اور مکمل تصحیح کے بعد ایک بار پھر پوری تحقیقی رپورٹ کو از سرِ نو دیکھا جاتا اور ضروری اصلاح کی جاتی ہے۔

حتمی مقالہ یا تحقیقی رپورٹ پیش کرنے سے پہلے اس کی ہیئت، وضع، اسلوب، طرز، صحت، درستی،

پروف وغیرہ ہر لحاظ سے اطمینان کر لیا جاتا ہے۔ اپنے ذاتی احساسات یا ریمارک صرف پیش لفظ میں درج کیے جاتے ہیں۔ یاد رہے کہ تحقیقی مقالہ ادبی شاہکار نہیں، یہ صرف تحقیقی کاوشوں کی ایک رپورٹ ہے، جس کا مطالعہ دوسرے کریں گے اور وقعت کا جائزہ لیں گے۔ اس وقت محقق کا موجود نہیں ہوگا۔

عمومی مراحل

ہمارے نزدیک تحقیقی مراحل یا اقدامات آٹھ ہیں لیکن کئی مصنفین نے گیارہ تک بیان کیے ہیں۔

واٹسن (Watson)

1- نوٹ لینا۔ اپنے مطالعاتی اقتباسات اور کوائف درج کرنا۔
2- تسوید۔ مسودہ نگاری یا مقالہ نگاری۔
3- نظر ثانی۔ مسودے کی بار بار کاٹ چھانٹ کرنا۔

لنڈا (Linda)

1- موضوع کا انتخاب۔
2- تحقیق تلاش کرنا یعنی مطالعہ کرنا اور نوٹ لینا۔
3- تسوید یا مسودہ نگاری۔
4- نظر ثانی، جس میں موضوع کی وضاحت کی جاتی ہے۔

راجنن (Rajannan)

1- اچھا موضوع تلاش کرنا۔
2- مواد تلاش کرنا۔
3- مواد کو ترتیب دینا۔
4- اپنی دریافتوں کو پیش کرنا۔

راتھ (Roth)

1- موضوع کا انتخاب کرنا۔
2- معلومات جمع کرنا جو تحقیق کی پہلی منزل ہے یعنی مواد کی فراہمی۔
3- مواد کو پرکھنا یا تجزیہ۔
4- مواد کو ترتیب دینا۔
5- تسوید اور نظر ثانی۔ حقائق کی تلاش، تجزیہ اور ترتیب۔

ڈاکٹر گیان چند

1- موضوع کی تلاش۔
2- خاکے کی تیاری۔

3- مواد کی فراہمی۔

4- مطالعہ اور نوٹ لینا۔

5- مواد کی پرکھ یا تجزیہ۔

6- مقالے کی تسوید۔

7- سندی تحقیق کی آخری منزلیں

نیناز کی(Ninazski)

اپنی ویب سائٹ پر نیناز کی نے مندرجہ ذیل اقدامات/ مراحل تجویز کیے ہیں:

1- مسئلے کی تلاش اور علاقے کا تعین۔

2- متعلقہ ادبیات کا جائزہ/ سروے۔

3- اصل مسئلے کا واضح اور مخصوص انداز میں بیان۔

4- قابلِ تحقیق فرضیے کی تشکیل اور بنیادی تصورات اور متغیرات واضح کرنا

5- زیرِ کار مفروضوں کا ذکر جو نتائج کی توجیہ میں کارفرما ہوں گے

6- تحقیقی ڈیزائن وضع کرنا جس کا داخلی و خارجی وثوق زیادہ سے زیادہ ہو

(الف) معمول/ مقصود کا انتخاب

(ب) متعلقہ متغیرات پر قابو

(ج) نتائج کے جائزے کا معیار مقرر کرنا

(د) منتخب اور تقرر کرنا

7- کوائف کے حصول کے طریق کار کی وضاحت

8- کوائف کے تجزیے کا طریق کار متعین کرنا

9- تحقیقی منصوبے پر کام کرنا

10- حاصلات کا جائزہ لینا اور نتائج اخذ کرنا

پارسنز(Parsons)

1- موضوع کا انتخاب۔

2- ابتدائی مطالعہ اور حد بندی۔

3- نوٹ لینا۔

4- نوٹ ترتیب دینا۔

5- پہلی تسوید یا پہلا مسودہ لکھنا۔

6- نگران کو دکھانا۔

7- مقالے کی تدوین۔

8- آخری مبیضہ۔
9- ایک بار پھر چیک کرنا۔
10- جلد بندی۔
11- زبانی امتحان۔

ایک اور مرحلہ تحقیقی رپورٹ لکھنا ہمارے مجوزہ اقدامات کے نزدیک ہو جاتا ہے۔

مجوزہ اقدامات

1- محسوس دشواری اور مسئلے کی تلاش۔ کوئی بھی مسئلہ کسی دشواری کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اپنا تحقیقی خیال یعنی مسئلہ یا تحقیقی سوال وضع کریں۔
2- سابقہ ادبیات کا جائزہ۔ یعنی سابقہ تجربات، ماضی کے نتائج اور کوائف میں سے مسئلے کی توثیق اور نظریہ تلاش کریں۔
3- تحقیقی ڈیزائن یعنی لائحہ عمل اور حدود کا تعین۔
4- فرضیات کی تشکیل اور مفروضات کا تعین۔ آپ کے جملے میں "اگر" اور "تب" کے الفاظ ضرور ہوں۔
5- حصول کوائف (ہر قسم کے ماخذ، سروے یا پیمائش سے)۔
6- تجزیہ کوائف۔ (داخلی، خارجی شہادتوں، پیمانوں اور استدلال سے)۔ معیاری اور مقداری۔
7- نتائج و سفارشات۔ معلوم نتائج کے ساتھ ان کا موازنہ کریں اور نامعلوم کے سلسلے میں سفارشات دیں۔
8- تحقیق نگاری۔ (مقالہ نگاری، رپورٹ نگاری)۔
9- تحقیقی طریق کار کا تعین۔ فرضیے جانچنے کی منطق یا پیمائش کا طریق کار اور تجزیے کی تکنیک طے کریں۔ کوائف کے حصول کا طریقہ وضع کریں۔

(علاوہ ازیں مقالے پر نگران کا جائزہ، نظر ثانی، حتمی صورت، کمپوزنگ، پروف خوانی، جلد بندی، مقالہ داخل کرنا، زبانی امتحان وغیرہ بھی کئی مابعد مراحل ہیں۔)

خصوصی مراحل

1- اپنی صلاحیتوں کا جائزہ لینا (خود سے سوال کہ کیا مجھ میں تحقیق کار کی خوبیاں موجود ہیں؟)۔
2- دوسرے سینئر طلبہ، اساتذہ، محققین سے پوچھنا (یہ معلوم کریں کہ کس قسم کی تحقیق مناسب رہے گی؟)۔

3- کوئی چھوٹی سی تحقیق کر کے موضوع/عنوان/مسئلہ تلاش کرنا (مشاہدے، مشورے اور مطالعے سے مسئلے کی حدود کا مکمل فہم حاصل کرنا)۔

4- خوب مطالعہ کر کے سابقہ معلومات/کوائف، کتب/مقالات/تحقیقات کو جاننا (ان سے فرضیوں کی تشکیل میں مدد لینا۔ اہم ماخذوں کی کتابیات تیار کرنا)۔

5- اپنی بصیرت سے کام لیتے ہوئے ماخذوں/افراد/ماہرین سے بنیادی نتائج حاصل کرنا (تحقیقی منصوبہ تیار کرنے کے لیے اور جاننے کے لیے کہ کیا کچھ ہو چکا ہے اور کیا کچھ کرنا باقی ہے؟)۔

6- مخصوص ڈیزائن کے مطابق طریق کار کا تعین کرنا (کام کی مقدار کا اندازہ لگانا اور کتنا وقت صرف ہوگا؟ تحقیقی ڈیزائن وضع کرنے کے لیے)۔

7- اپنی تحقیقی تجویز تیار کرنا (ادارے/یونیورسٹی کی ہیئت کے مطابق)۔

8- کام کرنے کا ٹائم ٹیبل/شیڈول بنانا اور آغاز کرنا (آرام اور اتفاقی امور کا وقت منہا کر کے)۔

9- از خود ضروری آلات/نوٹس تیار کرنا (مطالعہ، سروے، سوالنامے وغیرہ)۔

10- مسلسل کام کر کے کوائف/معلومات کی گروہ بندی مع حوالہ جات کرنا (متعلقہ فائلوں میں جمع کرنا)۔

11- مختلف پہلوؤں سے مسودہ نگاری۔ ابتدائی طور پر الگ الگ ابواب لکھنا (پھر اس میں اضافے کرتے رہنا اور مجموعی جائزہ لینا)۔

12- بار بار الٹ پلٹ کر نظر ثانی/نظر ثالث/تدوین (املا، رموز اوقاف اور اسلوبی ہیئت کے حوالے سے)۔

13- نگران یا رہنما کے مشورہ اور حتمی مسودہ کی تیاری (دوبارہ یا زائد کام کر کے نیز خلاصہ تیار کرنا)۔

14- مابعد اقدامات (مقالہ داخل کرنا۔ زبانی دفاع/امتحان دینا وغیرہ)۔

15- اشاعت کی تیاری (کتابی صورت یا ویب سائٹ پر پیش کرنا)۔

7- مقالے کی ہیئت یا وضع (Format)

ایک تحقیقی مقالے کی قرطاسِ طرز اور وضع متعلقہ ادارہ، یونیورسٹی یا تحقیقی جریدہ ہی مقرر کرتا ہے اور تحقیق کار اسی کی پیروی کرتا ہے مگر عام طور پر حسب ذیل وضع تجویز کی جاتی ہے۔

ابتدائیہ

ابتدائیہ میں سرورق، پیش لفظ، اعترافات، تشکر، فہرست وغیرہ کے غیر رسمی حصے شامل ہوتے ہیں۔

سرورق

1- عنوان: مختصر مگر علاقے، زبان اور موضوع کے لحاظ سے واضح۔
2- تحقیق کار کا نام: (رول نمبر اگر درکار ہو)
3- ڈگری کا نام: (جس کے لیے مقالہ داخل کیا گیا ہو: ایم فل، پی ایچ ڈی)
4- شعبہ کا نام: اُردو
5- ادارے/یونیورسٹی کا نام: یونیورسٹی،
6- تاریخ تکمیل/داخلہ: (یونیورسٹی میں مقالہ داخل کرنے کی تاریخ)

پیش لفظ/اعترافات/اظہارِ تشکر

ذاتی امور، احساسات، ان افراد اور اداروں کے نام جن سے مدد لی گئی یا جن کا کام شامل کیا گیا۔ تشکر وغیرہ کے کلمات۔

فہرست

مقالے کے تمام حصوں کی فہرست اور مقالے میں ان کے مقام، صفحہ نمبر کا ذکر۔

1- حصے/مندرجات/ابواب
2- جداول
3- ماخذ، کتابیات
4- ضمیمے

حصہ اول: تحقیقی بنیاد یا ڈیزائن

پہلے حصے میں اصل تحقیقی متن سے پہلے تک کے تمام امور شامل ہوتے ہیں۔ عام طور پر یہ تین چار ابواب پر مشتمل ہوتا ہے۔ جس میں عنوان کا تعارف اور تحقیقی ڈیزائن سے متعلق ایک دو ابواب اور پس منظری تحقیق اور ادبیات کے جائزے سے متعلق باب شامل ہوتے ہیں۔

تعارف (پہلا و تیسرا باب)

1- مقاصد تحقیق (یہ تحقیق کیوں؟)، محسوس دشواریاں کیا ہیں (Felt Difficulties)
2- مسئلہ یا تحقیقی سوال/سمت کا بیان (Statement of the Problem)

3- فرضیہ یا تحقیقی جواب (معقول اور سادہ بیان میں) (Hypothesis)

4- اہمیت وجواز مسئلہ: اس سے موجودہ معلومات اور رویوں میں کیا تبدیلی ہوگی (Significance)

5- مخصوص اصطلاحات (تشریح اور توضیح جن کو خاص طور پر مقالے میں استعمال کیا گیا) (Terminology)

6- مفروضے/مسلمات (جنھیں بنیاد بنایا گیا) (Assumptions)

7- تحدید (نئی حد بندی وقت یا موضوع کے لحاظ سے) (Limitations, Delimitations)

8- طریق کار (تحقیق کی قسم، ڈیزائن اور تحقیقی عرصہ جو اس مقالے کے لیے درکار تھا) (Procedure/Methods)

9- آلات وماخذات کا جائزہ (اہمیت اور سند) (Instruments, Sources)

10- مخصوص اصطلاحات کی فہرست (Specific Terminology) (جو آپ نے وضع کیں)

11- ابواب بندی کی منطق (ابواب کو خاص ترتیب کیوں دی ہے؟ اس کا جواز اور استدلال کیا ہے؟)

دستاویزی اور تاریخی تحقیق پر مشتمل مقالات میں ابواب بندی کی منطق بروئے کار لانا پڑتی ہے یعنی دستاویزی تحقیق کا متن کس انداز اور ترتیب سے پیش کیا جائے؟ اُصولی طور پر تحقیقی متن ایک ہی باب پر مشتمل ہونا چاہیے۔ مگر دستاویزی تحقیق میں مختلف پہلوؤں پر زیادہ مواد ہونے کے باعث اس کے کئی ذیلی ابواب بنانے پر کوئی پابندی نہیں۔

عام طور پر گریجویٹ سطح تک کے مقالوں میں تاریخی/سن وار ترتیب کو ترجیح دی جاتی ہے، ڈاکٹریٹ کی سطح کے مقالوں میں اصولی ونظری مباحث، موضوع اور تاریخی اور تقابلی جائزوں پر مشتمل تمام ترتیبیں شامل ہوتی ہیں۔

بعض موضوعات کی نوعیت اس طرز کی ہوتی ہے کہ انھیں کئی طریقوں سے بیک وقت پیش کرنا ضروری ہوتا ہے مثلاً اگر لغات یا قواعد پر کام کر رہے ہوں تو اس کے لیے کیے گئے کاموں کا اصولی جائزہ بھی درکار ہوگا، تاریخی جائزہ بھی مقصود ہوگا اور تقابلی جائزہ پر بھی۔ موضوع وار جائزہ بھی چاہیے ہوگا اور مقام/جماعت/ادارہ کے لحاظ سے جائزہ لینا بھی ضروری ہوگا۔ ضروری ہے کہ ابواب بندی کرتے ہوئے ان امور کو بھی ملحوظ رکھا جائے۔ یوں پانچ ذیلی ابواب بھی بن سکتے ہیں۔ تحقیقی تجویز میں یہ منطق ابواب/فہرست سے پہلے درج کی جائے۔

ڈاکٹر گیان چند نے کئی موضوعات کے خاکے تجویز کیے ہیں لیکن ان میں سے اکثر تاریخ وار/عہد وار/سن وار ہی ملحوظ رکھے گئے ہیں۔ تحقیقی مسئلے اور موضوع میں بھی اس پر بحث کی گئی ہے۔ دراصل زبانوں میں تحقیق کو ابھی تک تاریخ، دستاویز یا ماضی کا جائزہ سمجھا گیا۔ یہ بات عام طور پر قابل فہم نہیں ہوتی کہ ماضی کے مواد/کوائف سے حالیہ تقابل اور تجزیے بھی کیے جاسکتے ہیں جیسا کہ لسانیات میں اکثر ہوسکتا ہے۔ چنانچہ

ایسے مقالوں میں کوشش ہوتی ہے کہ تقابلی یا موضوع وار ابواب بنائے جائیں۔ شخصی کوائف کے حوالے سے عموماً موضوع وار ترتیب ہی مناسب ہوتی ہے۔ ایک عمدہ دستاویزاتی مقالہ وہی قرار دیا جاسکتا ہے، جس میں عہد وار کے ساتھ ساتھ تقابلی اور تجزیاتی ابواب بھی دیے گئے ہوں اور ان کی وضاحت تعارف میں کردی گئی ہے۔

ڈاکٹر گیان چند کے خیال میں ترتیب زمانی میں عموماً سہولت رہتی ہے لیکن ہر قسم کے موضوعات میں یہ ممکن نہیں۔ اکثر میں صنف وار یا موضوع وار تقسیم کرنا ہوگی۔ بیشتر صورتوں میں صنف وار اور تاریخی ترتیب کو سمونا ہوتا ہے۔ یعنی پہلے صنف یا موضوع کو علیحدہ باب دیے گئے، اس کے بعد ایک قسم کے موضوع یا صنف کی تخلیقات پر تاریخی ترتیب سے بحث کی گئی مثلاً اُردو کی ترقی میں مستشرقین کی خدمات پر لکھنا ہو تو محض تاریخی تذکرہ کافی نہیں بلکہ موضوعات کے گروہ یا زمرے بنا کر جائزہ لینا ہوگا۔ لہٰذا قواعد نویسی، لغات نویسی، لسانیات، ادبی تذکرے، ادبی تراجم وغیرہ کے باب میں خدمات اور ہر میدان کے کام کرنے والوں کو تاریخی ترتیب سے لیا جائے گا۔

اگر اُردو میں انگریزی تراجم کے حوالے سے مقالہ لکھنا ہو تو ڈراموں کے ترجمے، قدیم نظموں کے ترجمے، بعد کی شاعری کے تراجم، ناول، افسانے کے تراجم، تحقیق وتنقید کے تراجم وغیرہ کے عنوانات قائم کرنا ہوں گے۔ کسی محقق پر مقالہ لکھنا ہو تو مختلف پہلوؤں پر ان کی تحقیق پر مختلف ابواب دینا ہوں گے۔

پھر اُصول تدوین متن، تحقیقی مقالے، تنقیدی تحریریں، لسانی وتنقیدی معرکے، شاعری وغیرہ کے تحت لکھنا ہوگا۔ ایک عنوان کی تحریروں کا تاریخی ترتیب سے جائزہ لیا جائے گا۔ اس طرح محض زمانی ترتیب ایسا مجرب نسخہ نہیں جو ہر مرض کی دوا ہو۔ تاریخی وتقابلی اور موضوعاتی ترتیب وغیرہ کی اہمیت برابر ہے۔ انھیں حسب ضرورت استعمال کیا جائے گا۔ تاہم غیر ضروری اور پس منظری ابواب تحریر کرنے سے گریز کیا جائے۔ صنف کا تعارفی یا معلوماتی باب ہرگز نہ دیا جائے۔

دوسرا باب: متعلقہ ادبیات کا جائزہ

اس مقالے سے ماقبل انجام دی گئی تحقیق، تحقیقی مقالے، مضامین، کتب اور دیگر متعلقہ تحقیقی ادبیات کا جائزہ جن کی مدد سے فرضیے وضع ہوئے۔ یعنی موجودہ تحقیق کا جواز سابقہ تحقیقات کی روشنی میں پیش کیا جائے گا۔ دوسروں نے یہ مسئلہ حل کرنے کی کوشش کس طرح کی ہے اور کہاں کہاں ناکام یا محدود رہے۔ آپ کس طرح آگے بڑھے۔ تمام تو نہیں لیکن تمام اہم تحقیقی کاموں کا ذکر ضروری ہے۔ خاص طور پر زمانہ حال کے کاموں کا ذکر لازم ہے۔

حصہ دوم: تحقیقی متن

یہ حصہ متعدد ابواب پر مشتمل ہوسکتا ہے۔ لیکن اشاریہ، کتابیات یا متن کی تدوین میں ابواب بندی نہیں ہوگی اور نہ وہ اس میں شامل ہوں گے۔ ان کی اپنی صورتیں ہوسکتی ہیں۔ تقابلی شخصیت کے احوال سے

زیادہ، رجحانات اور رویوں، پس منظر وغیرہ پر دو تین ابواب دیے جائیں گے۔ اس مقصد کے لیے ابواب بندی کی منطق بروئے کار لائی جائے گی۔

یہ حصہ جب تحقیق جریدے کے لیے لکھے گئے مقالے میں ہوگا تو بے حد مختصر ہوگا۔ صرف ضروری کوائف اس حصے میں شامل ہوتے ہیں اور ان کی گروہ بندی ابواب کی صورت میں وقوع پذیر ہوتی ہے۔

ادبی تحقیق کے لیے ابواب بندی:

1- صنفی، تاریخی اور تہذیبی موضوعات

2- تحریکات، رجحانات یا رویوں کا جائزہ

تاریخی تحقیق میں رویوں سے قبل کے دور پر ایک باب بھی ہوگا۔

بیانیہ تحقیق میں سروے کی تکنیک استعمال ہوگی۔

3- تقابلی جائزہ (ادبی، شخصی، موضوعاتی)

تقابل کی بنیادی کسوٹی (Criteria) متعین کرنا ہوں گے۔

پھر ہر متغیرے (Variable) کے لیے الگ باب۔

بعد ازاں مشترک اور غیر مشترک پہلوؤں پر ابواب ہوں گے۔

لسانیاتی تحقیق (Linguistic Research) کی ابواب بندی:

شاید کوئی فونیات، صوتیات وغیرہ کے حوالے سے اُردو زبان پر بھی تحقیق کرے۔

لغوی لسانی تحقیق (Philological/Lexicological) کی ابواب بندی:

بنیادی پہلوؤں کی وضاحت پر ایک باب شروع میں ہوگا۔

تقابلی تحقیق (Comparative Related Studies) کی ابواب بندی:

1- متعلقہ علم کی فکری حدود کا بیان ضروری ہے۔

2- اُردو کا اس سے تعلق واضح کرنا ضروری ہے۔

3- متن کے تیسرے باب سے علمی جائزے لیے جائیں گے۔

4- کسی بھی ڈیزائن کے مطابق ابواب ہو سکتے ہیں۔

یاد رہے کہ ان ابواب میں تحقیق کار اپنا دعویٰ کسی نظریے کی صورت میں پیش کر رہا ہوتا ہے اور اس کے لیے متعلقہ کوائف بطور دلیل یا ثبوت شامل کرتا چلا جاتا ہے۔ اسی سے تحقیق کار کے فرضیے ثابت یا رد ہوتے ہیں۔ اسی سے نتائج نکلتے ہیں اور مزید تحقیق کی راہیں نکلتی ہیں۔

حصہ سوم: خلاصہ، نتائج، سفارشات

تحقیقی متن کے علاوہ دیگر تمام تحقیقی امور اس حصے میں شامل کیے جاتے ہیں یعنی تحقیق کا خلاصہ، اس

سے برآمد ہونے والے نتائج اور ان نتائج پر مبنی مزید تحقیق یا کاموں کے لیے سفارشات کا اندراج کیا جاتا ہے۔(متن کے دوران میں جن عنوانات پر مزید تحقیق کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی)۔

1- خلاصہ (تمام حصوں کا تقریباً تین سے پانچ جملے فی صفحہ)
2- اہم نتائج (تحقیق کے نتیجے میں ملنے والی نئی معلومات)
3- ماحصل/لب لباب یا فیصلے اور فرضیوں کی توثیق۔
4- مزید تحقیقی مقالات/سفارشات

خلاصہ کاری (Abstraction)

تجویز یا مقالے کا خلاصہ یا تلخیص (Abstract) کرنا بھی ایک اہم کام ہے، جس کے لیے مہارت درکار ہے اور مہارت تکنیک استعمال کرنے سے اور مشق کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ ہر تجویز، مقالے یا مضمون کا خلاصہ درکار ہوتا ہے، جس کی روشنی میں باقی مطالعہ کیا جاتا ہے۔

مقالے کا ہر باب کئی صفحات پر مبنی ہوتا ہے۔ ان میں سے اندازاً ہر صفحے/ نکتے یا پہلو کا خلاصہ کیا جانا مقصود ہوتا ہے۔ تجویز کا خلاصہ اہم نکات کے بیان کے لحاظ سے ایک سے زیادہ پیرے/ نصف صفحے سے زیادہ نہ ہو۔ باب کا خلاصہ فی صفحہ تین چار سطور یا فی پیرا دو سطور سے زیادہ نہ ہو۔ لب لباب یا نچوڑ بتائیں کہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ یا یوں سمجھیں کہ ہر پیرے کی ایک آدھ جملے میں سرخی جمانا چاہتے ہیں، جو خود وضاحتی (Self-explanatory) ہو۔ تمام صفحات/ پیراگراف کے خلاصے جمع کر لیں تو ایک دو پیرے بن جائیں گے جو بہر صورت ایک صفحے سے کم ہوں۔ انھیں باب کے آخر میں درج کیا جائے گا۔

تجویز کا خلاصہ، ابواب کا خلاصہ یوں جمع کیے جائیں کہ یہ سب ملا کر مقالے کی تلخیص بن جائے۔ اسے "خلاصہ، نتائج اور سفارشات" کے باب کے شروع میں دیا جاتا ہے۔ اس کے آغاز و انجام میں کچھ ایسے تعارفی جملے دیے جائیں گے جن سے قاری ایک نظر میں جان لے کہ تحقیق کا مقصد، طریق کار اور نتائج کیا ہیں۔ بعض اوقات یہی خلاصے قابلِ اشاعت ہوتے ہیں۔ اس میں فرضیے اور تحقیقی جوابات آ جانے چاہئیں۔ عام طور پر تجویز کیا جاتا ہے کہ خلاصہ دو سو الفاظ سے زیادہ نہ ہو۔ تین ساڑھے تین سو الفاظ یا ڈیڑھ صفحہ ہی بہترین خلاصہ کہلاتا ہے۔ اس میں منطقی اہمیت اور مقاصد پر توجہ رہے گویا یہ خلاصہ آپ کے تحقیقی کام کی طرف متوجہ کرانے کا سبب بن سکتا ہے۔ زبانوں کی تحقیق کرنے والے کوشش کریں کہ خلاصہ اُردو اور انگریزی میں بھی دیا جائے تاکہ عالمی سطح پر اثرات مرتب ہو سکیں۔

مقالے کے آخر میں یہ خلاصہ عموماً پانسو الفاظ سے بڑھ جاتا ہے یعنی دو صفحات میں مکمل ہو پاتا ہے۔ لیکن تین چار صفحات میں خلاصہ ضرورت سے زیادہ ہوتا ہے۔

بعض یونیورسٹیاں مقالے کی تلخیص الگ جلد میں طلب کرتی ہیں۔ ایسی صورت میں بھی مقالے کے ساتھ تلخیص رہنے دی جاتی ہے بلکہ اسے بوجوہ قائم رکھنا چاہیے۔

حصہ چہارم: ماخذ و کتابیات

وہ تمام ماخذ جن کی مدد سے تحقیقی متن وجود میں آتا ہے، انھیں اس حصے میں درج کیا جاتا ہے۔ اس اندراج کے لیے کوئی خاص قرطاسِ طرز (Style Sheet) یا وضع استعمال کی جاتی ہے۔ یہ عام طور پر ادارے یا یونیورسٹی یا تحقیقی جریدے کی طرف سے مقرر ہوتا ہے۔

-1 شخصی ماخذ: وہ افراد جن سے آرا حاصل کی گئیں۔

-2 غیر شخصی ماخذ:

الف: غیر مطبوعہ

-1 قلمی نسخے/مسودے/مخطوطات

-2 مسلیں/دستاویزات/خطوط

-3 ڈائری/روزنامچے

-4 متفرق کاغذات

ب: مطبوعہ

-1 کتبِ حوالہ، لغات، قاموس وغیرہ

-2 عمومی کتب: (الف) اردو (ب) فارسی (ج) عربی

(د) فرانسیسی یا دیگر زبانوں میں

-3 رسائل: (الف) روزنامے (ب) ہفت روزے

(ج) ماہنامے (د) سہ ماہی (ہ) دیگر

حصہ پنجم: ضمیمے

یہ حصہ باب چہارم پر اور کتابیات حصہ پنجم پر بھی ہو سکتے ہیں۔

اس میں ایسی تمام دستاویزات کی نقول دی جاتی ہیں، جو متن میں زیرِ بحث آئی ہوں اور بطور ثبوت انھیں منسلک کرنا ضروری ہو۔

8-مقالے کی وضع

(Dissertation Format)

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کی مجلس BASAR نے اپریل 2011ء میں ایسی وضع (Format) کا حکم دیا۔ جنوری 2013ء میں پی ایچ ڈی سطح کے کورس کے لیے اُصول دیے جو ذیل میں ہیں:

☆ مقالے کی ضخامت دہری سطر (Double Space) میں ٹائپ کیے گئے کم سے کم 200 اور زیادہ سے زیادہ ..... صفحات ہوگی جو سمسٹر کی تکمیل سے ایک ماہ

پہلے سادہ جلد میں چار نقول کی صورت میں داخل کرنا ہوگا۔

☆ جامعہ کی طے شدہ سٹائل شیٹ، سائز، حجم کے علاوہ مندرجہ ذیل ابواب لازم ہیں:

1۔ پہلا حصہ یا باب تعارف..........

☆ تحقیقی تجویز کے 16 نکات (ماسوائے نمبر 4) کے مع تشکر اور اعترافات

2۔ دوسرا حصہ یا باب سابقہ/متعلقہ تحقیقات/ادبیات کا جائزہ

☆ یعنی تحقیقی تجویز کا نمبر 4..... مفصل اور بطور علیحدہ باب درج کریں۔

3۔ تیسرا حصہ یا باب/ذیلی ابواب مطالعاتی متن..........

☆ حسب ضرورت اسے دو یا تین ابواب میں بدلا جا سکتا ہے مگر ابواب بندی کا استدلال تحقیقی تجویز اور مقالے کے پہلے باب میں دینا لازم ہے۔ اگر مقالے میں ابواب کی تعداد اور ترتیب تجویز سے مختلف ہے تو اس کی وجہ بیان کریں۔

4۔ چوتھا حصہ یا باب محاکمہ..........

(الف) خلاصہ (Abstract)

☆ تمام ابواب کا 250 الفاظ میں اُردو/انگریزی میں خلاصہ۔ سوال، جواب، طریق کار اور نتائج سمیت

(ب) حاصلات (Findings)

(ج) نتائج (Results)

(د) ماحصل/لب لباب (Conclusions)

(ر) سفارشات (Recommendations)

☆ صرف وہ سفارشات جو مقالے میں مطالعے یا تحدید کے نتیجے میں برآمد ہوئی ہوں۔

5۔ پانچواں حصہ یا باب ماخذ (Sources)

☆ دستاویزات، رپورٹیں، مقالات، مضامین، کتابیں، کتابچے، پمفلٹ، سمعی بصری ریکارڈ، ویب سائٹس وغیرہ۔

☆ لفظ "کتابیات" ہرگز درج نہ کریں۔

6۔ چھٹا حصہ یا باب تعلیقات (End Notes) اور ضمیمے (Appendices)

☆ مفصل معلومات، فہرستیں، اہم دستاویزات جن کا دوران مطالعہ مزید توضیحات کے حوالے سے لگانا ضروری ہے۔

9- وضع کا خود جائزہ

ہیئت یا وضع (Format) کے دو معانی ملحوظ رکھے جانے چاہئیں۔ ایک یہ کہ مقالے میں الفاظ کی نشست و برخاست، رموز اوقاف، سطر بندی، صفحہ بندی کس انداز میں ہو اور دوسرے یہ کہ اس کے مختلف حصے کیا ہوں۔ اگرچہ مختلف جامعات اور شعبوں میں مقالے کی وضع مختلف طرح سے مقرر ہوتی ہے اور تحقیق کار کو اس کی پابندی کرنا ہوتی ہے لیکن علم تحقیق کی رُو سے تحقیقی مقالے کی پیش کش کی ایک متفقہ وضع کچھ یوں ہونی چاہیے اور اس کی جائزہ فہرست (Check List) حسب ذیل ہوگی، جس کی روشنی میں مقالے کو پیش کرنے سے پہلے خود جانچنا چاہیے:

پہلا ورق/صفحہ : عنوان

پہلا ورق آپ کے عنوان، مسئلے، دعوے کی سطور یا بیان سے متعلق ہوتا ہے، جس میں تحقیق کار اور تحقیق کروانے والے اور ان کا نام بھی شامل ہوتا ہے۔ (دوسرے صفحے پر خلاصہ دینا ضروری نہیں) اس صفحے کا جائزہ یوں لیا جاسکتا ہے:

1- خیال رہے کہ کیا عنوان میں تمام بنیادی اور کلیدی الفاظ آگئے ہیں؟

2- کیا شعبہ /جامعہ /ادارہ کے تقاضے پورے ہوگئے ہیں؟

پیش لفظ/دیباچہ

اندرونی صفحات میں پیش لفظ یا دیباچہ دیا جاتا ہے۔ اس میں ذاتی انداز میں اعترافات، شکریے، تسلیمات اور احتساب وغیرہ کا ذکر ہوتا ہے۔

اس کا جائزہ یوں لیا جاسکتا ہے:

1- یہ لازمی حصہ نہیں لیکن اگر دیا جائے تو کیا اس میں تمام ضروری باتیں جو ذاتی حوالے سے ہوں، اظہار تشکر، اعتراف، تسلیمات وغیرہ موجود ہیں؟

2- کیا تمام عبارت عجز کے ساتھ ہے اور فخریہ کلمات سے پاک ہے؟

3- (بلاوجہ دقتوں کا ذکر نہ کیا جائے۔ دقتیں مقالہ نگاری کا حصہ ہیں۔)

فہرست

فہرست میں تمام مندرجات اور ان کے متعلقہ صفحات کا اندراج ہوتا ہے۔ عام طور پر یہ سب سے آخر میں تیار ہوتی ہے۔ اس کی تیاری کے بعد حسب ذیل طریقے سے اس کا جائزہ لیا جاسکتا ہے۔

1- کیا یہ حصہ پیش لفظ کے بعد درج ہے؟

2- کیا تمام مشمولات /ابواب ترتیب وار درج ہوئے ہیں؟

3- کیا مشمولات کے صفحہ نمبر درج ہیں؟

4- کیا ضمیموں، جدولوں، تصاویر وغیرہ کی فہرست شامل رہے؟

پہلا باب: تعارف

تحقیقی ڈیزائن کا اظہار، جس میں مسئلہ، بیان مسئلہ، مقصد تحقیق، وسعت تحقیق، مفروضے، فرضیے، تحدید یا حد بندی، طریق تحقیق شامل ہوں۔ ۔

1- کیا یہ پس منظری باب یا تمہید ہے۔
2- تحقیق کا مقصد اور مدعا ایک دو پیراگراف کی صورت میں تعارفی انداز میں ہو، نیز کیا اس میں محسوس مشکلات اور تحقیقی سوالات ظاہر ہیں؟
3- کیا مسئلے کا بیان مخصوص انداز میں درج ہے؟
4- کیا تحقیق کی وسعت، اہمیت، دائرہ کار اور تحدید کا ذکر ہے؟
5- کیا ان مفروضوں (Assumptions) کا ذکر ہے جو بطور مسلمات تحقیق سے وابستہ ہیں؟
6- کیا ان کے بعد فرضیوں (Hypotheses) کا بیان تحقیقی سوالات کے انداز میں ہے؟ کیا اس میں اگر، تو، جب، تب کے الفاظ شامل ہیں؟
7- کیا ان اصطلاحات اور لفظیات کے مخصوص معنی کا ذکر ہے، جن میں آپ نے تحقیقی مقالے کی رپورٹ پیش کی ہے؟
8- کیا ابواب بندی کی منطق بیان کر دی گئی ہے؟

دوسرا باب: سابقہ ادبیات / تحقیقات کا جائزہ

1- کیا اس باب کا مقصد بیان کیا گیا ہے۔ اگر منتخب مطالعہ کیا گیا ہے تو کیوں؟
2- کیا سابقہ تحقیقات کا خلاصہ تاریخ وار یا موضوع وار مجموعی طور پر درج ہے؟
3- کیا بنیادی نکات، قوانین اور تصورات کا ذکر آ گیا ہے؟
4- کیا حل طلب مسائل، نمایاں مشکلات اور امکانی حل، جواب طلب سوالات وغیرہ کا ذکر کر دیا گیا ہے؟
5- کیا تحقیق کے تمام پہلوؤں کا ذکر ہو گیا ہے؟
6- کیا وہ نکات سامنے آ گئے ہیں جو مزید تحقیق اور فرضیوں کی تشکیل کے لیے اکساتے ہیں؟
7- کیا باب کا خلاصہ آخر میں درج کیا گیا ہے؟

تیسرا باب: تحقیقی طریق کار

اس باب کو پہلے باب کا حصہ بھی بنایا جا سکتا ہے۔ یوں چوتھا باب تیسرا باب بن جائے گا۔

1- کیا موضوع کا تعارف اس کے پس منظر سمیت کرا دیا گیا؟
2- کیا تحقیقی ڈیزائن اور اس کے آلات، طریق کار اور تمام قدم بہ قدم مرحلوں کا ذکر ہے؟ خاص طور پر متغیرات کو قابو میں رکھنے کے طریقوں کا بیان ہے؟
3- کیا کوائف کی موزونیت، وثوق اور صحت جانچنے کے معیارات کا ذکر کیا گیا ہے؟
4- کوائف کا تجزیہ کس طرح سے کیا جائے گا؟ کیا جدول اور گراف بنانے کے طریقوں کا ذکر ہے؟
5- اگر کوئی پائلٹ سٹڈی کرنی ہے یا کی گئی ہے تو کیا اس کا مفصل ذکر کر دیا گیا ہے؟
6- کیا بیانیہ میں تجرباتی تحقیق میں آبادی اور نمونہ بندی کے طریقے بیان کر دیے گئے ہیں؟
7- کیا آلات تحقیق (Tools) کی موزونیت اور مناسبت کا ذکر کر دیا گیا ہے؟
8- کیا پیمانوں کی وضاحت کر دی گئی ہے؟
9- کیا باب کا خلاصہ۔ آخر میں دیا گیا ہے؟

چوتھا اور دیگر ابواب: تحقیقی متن

1- کیا یہ حصہ ایک سے زیادہ ابواب کا متقاضی ہے تو ابواب بندی کی بنیاد کیا ہے؟ کیا یہ منطق پہلے باب میں بتا دی گئی ہے؟
2- کیا تمام ابواب اسی منطقی ترتیب کے ساتھ ہیں جن پر ان کی بنیاد رکھی گئی ہے۔
3- کیا کوائف بنیادی ماخذوں سے تھے یا ثانوی یا مخلوط قسم کے ماخذوں سے تھے؟
4- کیا ماخذوں پر تنقید و تبصرہ، تجزیہ اور تقطیع کی گئی ہے؟
5- کیا خارجی اور داخلی تنقید استعمال کی گئی ہے؟
6- طرز استدلال کیا ہے اور کیوں کر استعمال ہوا ہے؟
7- کیا غیر ضروری عبارتیں، اقتباسات خارج کر دیے گئے ہیں؟
8- کیا تمام ضروری حوالے شامل ہو گئے ہیں؟
9- کیا سوال نامہ، انٹرویو وغیرہ معروضی اور جانچ کے قابل تھے؟ کیا انھیں پہلے ہی جانچ لیا گیا ہے اور کیا ہر تصور کے لیے علیحدہ سوال موجود ہے؟
10- کیا حوالہ / حاشیہ نگاری کا ایک ہی طریقہ یا وضع ہے؟
11- کیا ضمیموں جدولوں کا حوالہ شامل ہے؟
12- کیا باب کا خلاصہ آخر میں دیا گیا ہے؟

آخری باب: نتائج، خلاصہ، سفارشات

1- کیا باب کا تعارف دیا گیا ہے؟
2- کیا فرضیے یا تحقیقی سوالات سے متعلق تحقیق کے نتائج الگ سے بیان کر دیے گئے ہیں؟
3- کیا ان نتائج کے باہمی تعلق کے علاوہ چند اور نتائج بھی برآمد ہوئے اور وہ درج کر دیے گئے ہیں؟
4- کیا اعداد و شمار، شماریات یا تجزیہ ایک ہی انداز یا پیرامیٹر سے دیے گئے ہیں؟ اور کیا انھیں جانچ لیا گیا تھا؟
5- کیا اضافی کوائف / معلومات کے حصول سے نتائج پر کوئی فرق پڑا ہے؟
6- کیا فرضیے ثابت ہوئے ہیں یا فرضیے کے خلاف نتائج برآمد ہوئے ہیں؟ یا جزوی اثبات ہوا ہے؟
7- کیا نتائج سے واضح مفہوم نکالا گیا ہے؟
8- کیا حاصلات اور نتائج کی متبادل تشریحات بھی ہیں اور کر دی گئی ہیں؟
9- کیا یہ واضح ہو جاتا ہے کہ تحقیق کتنی کامیاب رہی اور کتنی مزید تحقیق درکار ہے؟ اور کیا اس کی سفارش کر دی گئی ہے؟
10- کیا تحقیق کا خلاصہ درج کر دیا گیا ہے؟

ملحقات، تعلیقات، ضمیمے، اشاریہ وغیرہ

1- کیا کتابیات مناسب وضع میں درج ہے؟
2- کیا تمام حواشی، تعلیقات اور ضروری ضمیمے وغیرہ مناسب ترتیب اور توازن کے ساتھ شامل ہیں؟

اضافی نکات

1- کیا تحریر مناسب اور متعین الفاظ و اصطلاحات میں بیان ہوئی ہے؟
2- کیا تمام جملے / بیانات واضح ہیں؟ کہیں الجھاؤ تو پیدا نہیں ہوتا؟
3- کہیں بے جا اختصار سے کام تو نہیں لیا گیا؟
4- کہیں بے جا، شخصی اور ذاتی تنقید تو نہیں کی گئی؟
5- کہیں صفات کا غیر ضروری استعمال تو نہیں ہوا؟
6- کیا شعبے / ادارے / جامعہ کے طریق کار یا وضع کے مطابق مقالہ ٹائپ / کمپوز کرایا گیا ہے؟
7- کیا پروف درست طور پر پڑھ لیے گئے ہیں۔ کیا املا، اور رموز اوقاف کے تقاضے

پورے کر لیے گئے ہیں؟

8- آخری مگر پہلی بھی بات یہ ہے کہ کیا اس طرح کے دیگر مقالات کی وضع دیکھ لی گئی ہے اور یا نگران / صدر شعبہ کے ساتھ گفتگو کر لی گئی ہے؟

10- طریقِ تحقیق کا انتخاب

اُردو اور پاکستانی زبانوں میں ادبی تحقیق کے لیے کئی طریق ہائے تحقیق انفرادی یا امتزاجی طور پر منتخب کیے جا سکتے ہیں۔ اس کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ تحقیق کی نوعیت کیا ہے۔ مثلاً تدوین کے لیے تنقید، شواہد، استدلال، تشریح کا انداز درکار ہوتا ہے۔ یہ تاریخی طریق کا حصہ ہے۔ مطالعۂ احوال کے لیے، احوال، تقابل تجزیے کا انداز اختیار کیا جا سکتا ہے۔ آراء جمع کر کے کسی نتیجے پر پہنچنے کے لیے بیانیہ طریق بہتر ہوتا ہے۔ تجرباتی اور اقدامی تحقیق کے سائنسی طریقے استعمال کیا جاتا ہے۔ ان تمام یا چند طریقوں کو ملا کر امتزاجی طریقہ بھی اختیار کیا جاتا ہے۔

(الف) تاریخی طریق کا استعمال

ماضی کو معروضی طور پر صحت اور درستی کے ساتھ معلوم کرنے کے لیے یہ طریق تحقیق استعمال کیا جاتا ہے۔ متن کی تدوین، تصحیح وغیرہ بھی اسی کے ذیل میں آتی ہے۔ ادنیٰ و اعلیٰ متنی تنقید اس کا ایک حصہ ہے۔ ان میں بھی فرضیہ قائم کیا جا سکتا ہے۔ اس تحقیق میں بنیادی، ثانوی، ثلاثی ماخذ استعمالات جن کا خارجی اور داخلی شہادتوں سے جائزہ لیا جاتا ہے اور تنقید، شواہد استدلال، شماریات اور تشریح کی مدد سے مقالے کا مواد جمع کیا جاتا ہے۔ اس کے اقدامات بھی مسئلے کے بیان، مقاصد کے تعین، فرضیے کی تشکیل، کوائف کی جمع آوری اور تجزیہ اور نتائج کے اخذ کرنے، سفارشات دینے ہی کے حوالے سے وضع ہوتے ہیں۔ زیادہ تر کام لفظ و معنی، رائے اور دلائل سے متعلق ہوتا ہے۔ زبانی روایات اور بالواسطہ ذرائع کی جانچ پرکھ اس میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ میک کلاغ (Mc Cullagh) کے نزدیک فرضیے کی تشریحات بھی ایک اقدام ہے۔ تاریخی طریق میں وہ فرضیے کی تشکیل کے لیے سات نکات تحریر کرتا ہے کہ دیگر فرضیوں کی نسبت:

1- فرضیے کا پہلا بیان ہی فرضیہ ہوتا ہے۔ دوسرا جملہ اس کی تشریح ہوتا ہے۔
2- فرضیے کی ذیل میں بہت سے تشریحی بیانات موجود ہونے چاہئیں۔
3- فرضیے میں کوائف / تشریحات کی قوت موجود ہو۔
4- فرضیے میں حل پیش کرنے کی قوت موجود ہو۔
5- فرضیہ عبوری نہ ہو۔
6- ان پر عمومی مسلمات کا زیادہ اثر نہ ہو۔
7- یہ دوسرے فرضیوں سے برتر ہو۔

اس لحاظ سے وہ امکانات کو ملحوظ رکھنے اور منطقی استدلال کو استعمال میں لانے کی ہدایت دیتا ہے۔
تاریخی تحقیق میں اس کی بے حد اہمیت ہے۔

(ب) بیانیہ طریق

حقائق، آراء اور خصوصیات پر تحقیق کرنے کے لیے کسی مخصوص علاقے، آبادی، حدود کی نمونہ سازی کو استعمال میں لایا جاتا ہے۔ اس میں تقابل اور تعلق کی پیمائش کی جاتی ہے۔ اصول تلاش کر کے امکانات کی پیش گوئی کی جا سکتی ہے۔ تاریخ اور تجرباتی تحقیق سے یہ مختلف طریق کار ہے۔ اس میں مقاصد کا بیان واضح ہونا چاہیے۔ کوائف کے حصول کا طریقہ اور آلات موزوں ہوں یعنی سوالنامہ یا انٹرویو یا دونوں کا امتزاج؟ دیگر آلات کے مشاہدات بھی شامل کیے جا سکتے ہیں۔ ہر قسم کی ترقیاتی تحقیق بھی اسی کا حصہ ہو سکتی ہے۔

متغیرات کو قابو میں رکھنا بھی ضروری اقدام ہے۔ نمونہ بندی کا خیال رکھنا دوسرا بڑا اقدام ہے۔
مطالعہ احوال میں دستاویزی طریقہ بھی مستعمل ہوتا ہے اور بیانیہ طریق بھی۔ تجزیہ اور ارتباط اس کے لیے اہم اقدامات ہیں۔ دیگر تقابلی اور موازناتی قسم کی تحقیقوں کے لیے بھی بیانیہ طریق کو استعمال کیا جا سکتا ہے۔

بیانیہ تحقیق میں نتائج کو بار بار سروے کرنے ہی سے بہتر اور واثق نتائج برآمد ہوں گے۔ سروے کے نتائج کو کمپیوٹر کے سافٹ ویئر مثلاً SPSS کی مدد شماریاتی نتائج میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ مرکز فضیلت برائے اُردو اطلاعیات میں ایسا ایک سروے خواندگی کے سلسلے میں NCHD کی طرف سے لایا گیا تھا جس کے اُردو سوال و جواب کے نتائج مرتب کیے گئے تھے۔

(ج) تجرباتی یا سائنسی طریق

اس طریق میں دو گروہوں پر ایک ہی قسم کی چیز آزمانا مقصود ہوتا ہے جیسے مطالعہ کا اثر یا دیگر ٹیسٹ۔ دونوں کے باہمی تقابل سے نتائج اخذ کیے جاتے ہیں۔ متغیرات کو پوری طرح قابو میں رکھنے ہی سے صحیح نتائج سامنے آ سکتے ہیں۔ پیمائش کی غلطی کو قابو رکھنا بھی ایک اہم اقدام ہے۔ تجرباتی منصوبہ تیار کرنا ہی اس کی کامیابی کی دلیل ہے۔ نتائج کو بار بار آزمانے سے بہتر نتائج برآمد ہوں گے۔ اس لیے سائنسی طریق میں نتائج زیادہ واثق ہوتے ہیں۔

اُردو اور پاکستانی زبانوں میں ادبی تحقیق میں سائنسی طریق نفسیاتی، سماجی اور ثقافتی مطالعوں کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے، جیسے کسی خاص صنف ادب کا کسی خاص عمر، علاقے، جنس، نسل وغیرہ پر اثرات یا مطالعاتی طریقے یا رویوں میں تبدیلی وغیرہ۔ کسی خاص علاقے، زبان یا نسل اور عمر کے لوگوں کا کوئی خاص صوتیہ ادا کرنے / نہ کر سکنے پر تحقیق۔

سائنسی طریق بنیادی طور پر فطرت یا فطرتی امور کے مطالعے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس کی بنیاد وسیع تر مشاہدات پر رکھی جاتی ہے۔ استقرائی طریقے سے شواہد جمع کیے جاتے ہیں، ان کی بنا پر فرضیے وضع

ہوتے اور جانچے جاتے ہیں۔ اس جانچ سے حاصل شدہ نتائج سے استخراجی طریقے سے سفارشات اور پیش گوئیاں برآمد ہوتی ہیں۔

مزید تحقیق سے فرضیوں کی تصدیق اور نظریہ سازی کی جاتی ہے۔ اگر فرضیے کی بار بار تصدیق نہ ہو تو نئے فرضیے وضع کر کے نئی تحقیق انجام دی جاتی ہے لیکن اس سے سابقہ انجام دی گئی تحقیق باطل قرار نہیں پاتی کہ اس کے نتائج ہماری توقع کے مطابق نہ تھے۔ چنانچہ ادبی نتائج بہر حال اور بہر صورت اپنے فرضیے کے حق میں استوار نہیں کیے جاتے۔

11- فارم برائے ممتحن

(نیز تحقیق کار کی خود جانچ کے لیے)

جائزے کے لیے فارم جو تحقیق کار اور جائزہ کار دونوں کے لیے یکساں مفید ہے۔

ممتحن کا نام: ....

عنوان مقالہ: ....

مقالہ نگار کا نام: ....

سطح برائے ڈگری: ....

کل نمبر: 200 حاصل کردہ نمبر ....

(یہ جائزہ کم از کم 42.5% یعنی کل 85 نمبروں کے حصول پر مقالے کو قابل قبول ٹھہراتا ہے)

نمبر شمار	خواص برائے جائزہ	غیر متعلق (0)	کمزور (1)	درمیانہ (2)	اچھا (3)	عمدہ (4)	بے مثل (5)	رائے
1	عنوان کتنا واضح اور مختصر ہے؟ یہ پیچیدہ تو نہیں؟ کیا تحقیقی مقاصد واضح ہیں؟							
2	مسئلہ یا تحقیقی سوال کس قدر واضح بیان کیا گیا ہے؟ کیا یہ ضرورت پر مبنی ہے؟							
3	تحقیقی حدود اور تحدید کہاں تک بیان کی گئی ہیں اور کیا یہ مسئلے کے مطابق ہیں؟							

4	کیا مفروضے قابل فہم ہیں؟ کہیں یہ عمومی مسلمات تو نہیں؟							
5	کیا تحقیقی اصطلاحات کی صراحت کر دی گئی ہے؟							
6	کیا فرضیے یا تحقیقی سوال جواب تک واضح اور قابل جانچ ہیں؟							
7	کیا فرضیے متعلقہ ادبیات کے مطالعے سے وضع ہوئے نظر آتے ہیں؟							
8	کیا سابقہ تحقیق و ادبیات کا جائزہ مختصر اور موثر طور پر لیا گیا ہے؟ کوئی اہم تحقیق نظر انداز تو نہیں کی گئی؟							
9	کیا تحقیقی طریق کار موزوں ہے؟ کیا اس سے انحراف تو نہیں ہوا؟							
10	کیا تحقیقی آبادی اور نمونہ کاری کو واضح کیا گیا ہے؟ کیا تحقیق میں اسی کا احاطہ کرنا چاہیے؟							
11	کیا اثر انداز متغیرات کو قابو میں رکھا گیا ہے؟ اس کے لیے کون سا طریقہ وضع کیا گیا ہے؟							
12	کیا کوائف حاصل کرنے کا طریقہ واضح ہے؟							
13	کیا کوائف یا معلومات واثق اور معتبر ہوں گی؟							

14	کیا کوائف یا معلومات کا موثر تجزیے کا انداز اپنایا گیا؟							
15	کیا مقالے کے جملے سادہ اور تحقیقی زبان میں ہیں اور مفہوم واضح کرتے ہیں؟							
16	کیا غیر ضروری جملوں، حشو و زوائد سے گریز ہے؟							
17	رموز اوقاف کا کس قدر خیال رکھا گیا ہے؟ کیا کسی دستور العمل کی پیروی کی گئی ہے؟							
18	کیا حوالے صحیح طریقے سے دیے گئے ہیں کیا قرطاس طرز یا وضع کی پیروی کی گئی ہے؟							
19	کیا اقتباسات کم سے کم اور مختصر ہوں گے یا ہیں؟ اور زیادہ تر بات اپنے الفاظ میں ہوگی یا ہے؟							
20	کیا عبارت واضح ہے اور مقالہ نگار وہی لکھے گا یا لکھ رہا ہے جو وہ کہنا چاہتا ہے؟							
21	کیا غیر شخصی اور معروضی انداز اختیار کیا جائے گا							
22	کیا جداول، خاکے، اعداد و شمار کے لیے ضمیمے الگ اور درست طریقے سے دیے ہیں یا دیے جائیں گے؟							
23	کیا تحقیق کے بنیادی نکتے کو سامنے رکھا ہے؟							
24	کتابیات کس حد تک موزوں اور یکساں طریقے پر دی گئی ہے؟ کیا غیر ضروری اندراجات تو شامل نہیں؟							

25	کیا نتائج اور سفارشات تحقیق پر مبنی ہیں، غیر ضروری تو نہیں دیے گئے؟							
26	کیا مقالے کی ضخامت موضوع کے مطابق موزوں ہے یعنی غیر ضروری مواد نہیں ہے؟							
27	ٹائپ اور کتابت کی غلطیاں کس حد تک موجود ہیں؟							
28	کیا غیر ضروری مواد شامل تو نہیں کیا گیا؟ غیر ضروری مواد کی روک تھام کا کون سا طریقہ تجویز کیا گیا ہے؟							
29	کہیں محض تنقیدی جملوں کا سہارا لے کر تو تحقیق انجام نہیں دی گئی؟ کیا زبان کا اسلوب پہلے سے طے کر لیا گیا ہے؟							
30	کیا ضروری ماخذوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ کیا ثانوی ماخذوں سے گریز اور ماخذوں پر تنقید موجود ہے؟ کیا سابقہ تحقیقات اور اس تحقیق کے ماخذ اور کتابیات موزوں ہیں؟							

تحقیق کی موضوعی قدر پیمائی کے لیے مجموعی رائے کے 50 نمبر ہیں۔ یہاں تیس خانوں میں دی گئی آراء پر ایک طرح سے کلی حکم ہے۔ 30 خانوں میں کم از کم 60 اور مجموعی رائے کے کم از کم 25 نمبر ملا کر 85 نمبر حاصل کرنے پر تجویز یا مقالہ منظور کیا جا سکتا ہے۔

حتمی رائے: (الف) منظور/ ہدایات کے مطابق دوبارہ تحریر کیا جائے/ نامنظور:

(ب) مقالے کا کتنا حصہ قابلِ اشاعت ہے؟..............................

دستخط..............................

چودھواں باب

تحقیقی ذرائع کا استعمال

ماخذ و منابع (Sources) ہی دستاویزی، لائبریری یا ادبی تحقیق کی بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کا مطالعہ، جائزہ، کوائف کا حصول، کوائف کا تجزیہ، ماخذوں کی جانچ پرکھ اور کتب خانے کا استعمال اور اس کے طریق کار کو سمجھ کر ہی تحقیق کے لیے بنیادی سواد جمع کیا جا سکتا ہے۔

1- مطالعہ و حصولِ کوائف

مطالعہ، مطالعہ اور صرف مطالعہ ہی ادبی تحقیق کی وہ بنیادی شرط ہے جس کے لیے کوئی مختصر راہ نہیں۔ وسیع تر مطالعہ ہی کسی تحقیق کار کو کسی تحقیقی موضوع کی طرف لا سکتا ہے اور اس کی تحقیقی کاوش کو وقیع بنا سکتا ہے۔ مطالعہ کس قدر ہونا چاہیے اور کس طرح سے کرنا چاہیے؟ یہ ایک الگ موضوع ہے۔ تاہم ایک تحقیق کار کو کس حد تک صاحبِ مطالعہ ہونا چاہیے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک عام پڑھا لکھا شخص (Learned) اسے کہا جا سکتا ہے جو سال میں کم سے کم پانچ سو کتابیں اور زندگی بھر میں کم از کم پندرہ ہزار کتابیں پڑھ چکا ہو۔ ایک تحقیق کار کو اس سے کئی گنا زیادہ مطالعے کی ضرورت ہوتی ہے۔

متعلقہ ادبیات کے مطالعے اور دستاویزی یا تاریخی تحقیق میں سواد یا کوائف کے حصول کے ماخذ، ذرائع اور وسائل بیانیہ اور تجرباتی تحقیق کے وسائل سے مختلف ہوتے ہیں۔ تاریخی تحقیق میں ہمارا واسطہ کتب، رسائل، مخطوطات، دستاویزات، آوازوں، تصویروں اور نقوش وغیرہ سے پڑتا ہے اور بیانیہ تحقیق میں ان کے اعداد و شمار سے متعلق کوائف اور بیانات وغیرہ سے۔

ہر دو کے وسائل اور ذرائع، آلات اور طریقے مختلف ہوں گے۔ تجرباتی تحقیق میں اعداد و شمار مشاہدوں اور تجربوں سے حاصل ہوتے ہیں اور بیانیہ تحقیق میں سوالناموں، انٹرویو اور ایسے ہی مختلف تحقیقی آلات کے ذریعے سے حاصل ہوتے ہیں۔

ذیل میں ادبی اور لسانی پہلو سے دستاویزی اور تاریخی تحقیق کے ذرائع اور وسائل پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ دستاویزی تحقیق کے ماخذوں کے حصول کے لیے بہترین ماڈل 1971ء میں یونیسکو نے UNISIST کے نام سے پیش کیا ہے۔

2- تحقیق میں تنقید

تحقیقی کام کے لیے تحریری مواد کا خوب مطالعہ کرنا اور اس میں سے ضروری مواد کو استعمال کرنا نہایت ضروری ہے۔ ایک مسئلے پر تحریری مواد ہزاروں کتابوں یا مضامین پر مشتمل ہوسکتا ہے لیکن ان کا مطالعہ اور ان میں سے بہتر مواد کا حصول بہت مشکل اور وقت طلب کام ہوتا ہے۔ کوائف، مواد اور ماخذوں کے مطالعے کے علاوہ عالمانہ بصیرت اور انتقاد کے اظہار کے لیے اصول تنقید کو تحقیق میں استعمال کرنے کے تقاضے تفصیل سے جاننا ضروری ہیں۔ ایسے بہتر مطالعے کے مختلف طریقہ ہائے کار حسب ذیل ہیں:

1- کسی تحریری مواد کے مطالعے سے پہلے اس کے متعلق معلوم کیا جائے کہ وہ تحقیق کی ضروریات کس حد تک پوری کرتا ہے۔ آیا یہ مواد تازہ ہے یا بہت پرانا ہے۔ اس پر ہم پیچھے بحث کر چکے ہیں۔ مقالہ یا کتاب کے حاصل کرنے کے بعد تمام صفحات یک بارگی پڑھنے کی بجائے سرسری انداز میں اپنی ضرورت کے مواد پر نظر ڈالنی چاہیے تاکہ دوبارہ مطالعے کے لیے صرف ضروری مواد سے استفادہ کیا جاسکے۔ بصورت دیگر کوئی بھی تحقیق کار اتنا زیادہ وقت نہیں دے سکتا کہ وہ ساری کتاب یا مقالے یا مضامین کا صفحہ بہ صفحہ مطالعہ کرسکے۔ اگر مقالے یا کتاب میں اشاریہ دیا گیا ہو تو اس کی مدد سے پڑھنا تحقیق میں زیادہ مفید ہوتا ہے۔

2- کتب حوالہ جات سے متعلق معلومات ہونی چاہئیں تاکہ مطالعے کے دوران میں کسی قسم کے بیان یا الفاظ کی توضیح یا تصدیق حاصل کی جاسکے۔

3- مطلوبہ پیراگراف / باب غور سے پڑھیں اور مصنف کے خیالات تک پہنچنے کی کوشش کریں۔ دورانِ مطالعہ میں مصنف سے غائبانہ تنقیدی گفتگو کریں۔ اس کی باتوں اور فیصلوں پر اعتراض کریں۔ اس دوران میں کسی قسم کی تحریر نوٹ نہ کریں اور نہ ذہن کسی اور طرف لے جائیں کیوں کہ بہت سی چیزیں ایک وقت میں نہیں ہوسکتیں۔ لہٰذا ایک کام کو ایک ہی وقت میں کریں۔ مطالعے کے لیے یکسوئی نہایت ضروری ہے۔

4- تحریر کو بار بار اور مکمل سمجھ کر پڑھیں۔ ایسا نہ ہو کہ آپ کو کسی لفظ کے معنی نہ آئیں اور آپ محض قیاسات کا سہارا لے رہے ہوں یا اس لفظ کے مخصوص کے بجائے عمومی معنی سمجھ رہے ہوں یا کوئی خاص رویہ، سطح یا تعصب توسّل (mediate) کررہا ہو۔ ظاہر ہے اس سے آپ کے ذہن میں مختلف معانی بیٹھ جائیں گے اور آپ اصل مقصد سے دور ہو جائیں گے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کی عادت تھی کہ کسی مسودے کو کتنے ہی انہماک سے کیوں نہ دیکھ رہے ہوں اگر انھیں کسی لفظ کی املا یا اس کے معنی پر ذرا سا بھی شک گزرتا تو فوراً اٹھتے اور شیلف میں پڑا ہوا لغت اٹھا کر جب تک تسلی نہ کر لیتے آگے نہ بڑھتے۔ اس سلسلے میں بعض اوقات انھیں ایک سے زیادہ لغات بھی دیکھنا پڑتے مگر وہ مکمل اعتماد حاصل کیے بغیر آگے نہ چلتے تھے۔ ایک بہترین تحقیق

کار وہ ہوتا ہے جو اپنا مطالعہ مکمل اعتماد کے ساتھ جاری رکھ سکے اور متعلقہ تحریر کو اسی طرح سمجھ رہا ہو جس طرح ایک مصنف اپنا مطلب بیان کرنا چاہتا ہے۔ مصنف سے سوال کرتے رہنا اور سمجھنے کی کوشش کرنا مفید ہوتا ہے۔

5- تنقیدی مطالعے کی عادت ڈالیں۔ مگر کیونکر؟ کسی بیان یا حوالے کو پڑھنے کے فوراً بعد اسے رد یا قبول نہ کریں۔ یہ سوال کریں کہ اس بیان میں کیا خامی ہے یا کون سے دلائل اس کے خلاف یا حمایت میں ہیں۔ یعنی تحریر کا تنقیدی مطالعہ اس کی اہمیت سے آگاہ کرتا ہے۔ ایسا مطالعہ اپنا فرضیہ ذہن میں رکھ کر کریں۔

6- صحت مندانہ مطالعے کے اصول سامنے رکھیں۔ کم روشنی، نیند یا تھکاوٹ کے وقت پڑھنے سے احتراز کیا جائے۔ تحقیقی کام کے لیے کام کرنے کے اوقات کا تعین کیا جائے۔ وقت کی پابندی کی جائے۔ اچھی خوراک، آرام، جسمانی اور ذہنی صحت کا خیال بھی رکھنا چاہیے۔ مطالعہ بیٹھ کر کرنا چاہیے، لیٹ کر یا اوندھے موتھ ہو کر مطالعہ نہیں کرنا چاہیے۔

ڈاکٹر گیان چند نے بھی مطالعہ کے چند اصول بیان کیے ہیں، جنھیں یہاں بیان کرنا ضروری ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "کتابوں کو تیزی سے پڑھنے کی عادت ڈالیے۔ کہتے ہیں کہ مشق سے یہ صلاحیت پیدا کی جا سکتی ہے۔ آنکھ کو تیزی سے سطر کے اوپر ایک سرے سے دوسری طرف بڑھایئے۔ تحقیقی ماخذ کی کتاب کوئی ناول تو نہیں کہ پورے کا پورا سطر بہ سطر پڑھا جائے۔ اس میں اپنے کام کا تھوڑا سا مغز ملے گا۔ کم کتابیں ایسی ہوتی ہیں جن کا بڑا حصہ کسی موضوع کے لیے مفید ہو۔ اگر ایسا ہو تو گویا آپ کے موضوع پر پہلے سے کسی نے کافی کام کیا ہوا ہے۔ زیادہ تر اُمید یہ ہے کہ ہر کتاب میں تھوڑا، بہت مفید مطلب مواد جستہ جستہ بکھرا ہوا ہوگا۔ ایسی مہارت بہم پہنچائی ہے کہ اپنی مفید مطلب عبارت کی ایک نظر میں گرفت کی جا سکے۔ تحقیق ہی میں نہیں، تنقید کرنی ہو، کسی کے کام پر رائے دینی ہو، کوئی رسالہ پڑھنا ہو تو تیزی سے جستہ جستہ پڑھیے۔ ممتحنوں کو مشق ہوتی ہے کہ امتحان کی کاپی کو دس پانچ منٹ میں دیکھ لیتے ہیں۔ صفحے پر جستہ جستہ، ہر پیراگراف کی ابتدا میں اور کہیں کہیں یہاں وہاں نظر ڈالنے سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ امتحان دینے والے نے کیا کیا لکھا ہے، اسے کتنا آتا ہے اور کیا نہیں آتا۔ بالعموم سرسری خوانی پر ہی ممتحن کو اندازہ ہوتا ہے۔ تحقیقی ماخذ کو بھی اسی سرسری خوانی سے دیکھیے۔ جہاں مفید مطلب عبارت ہو، اسے غور سے پڑھیے۔
>
> کتابیں ہوں یا رسالے، سب کو اسی طرح جستہ جستہ، منتخب پڑھنا ہوتا ہے۔ عمر محدود ہے۔ روزانہ زندگی میں پڑھنے کے علاوہ طرح طرح کے کام اور تقاضے بھی

ہیں۔ مگر وہاں دنیا کو نمٹانا ہوتا ہے۔ پڑھنے لکھنے کے لیے بے انتہا وقت نہیں ہوتا۔ اگر رسالوں کے تمام صفحات پورے کے پورے پڑھے جائیں تو پورا مہینہ نئے رسالوں کو پڑھنے ہی میں ختم ہو جائے۔ میں پی ایچ ڈی کے مقالے کو بطور ممتحن پڑھتا ہوں تو یکسوئی اور ارتکازِ نظر سے دو دن شاذ تین دن میں دیکھ لیتا ہوں۔ رپورٹ لکھتا ہوں تو سب کہتے ہیں کہ کتنی تفصیل سے جزیاتی مطالعہ کیا ہے۔ کتاب تحقیق کا فن کی تصنیف کے لیے تحقیق کے موضوع پر کئی درجن انگریزی کتابیں دیکھیں، نوٹ لیے۔ رفتار یہ تھی کہ صرف دن میں پڑھ کر اوسطاً دو کتابیں روزانہ دیکھ لیتا تھا۔ بعد میں کتابوں میں نیا مواد کم ملتا تھا اس لیے ایک دن میں تین کتابوں پر سے بھی گزر لیتا تھا۔ یہ مسلّم کہ اپنے موضوع کے لیے بعض کتابیں اتنی بنیادی اور مفید ہوتی ہیں کہ ان سے بہت کثرت سے استفادہ کرنا ہوتا ہے اور کئی دن تک مطالعہ کرنا ہوتا ہے۔ پھر بھی جہاں تک میری رائے کا سوال ہے، کسی بھی تحقیق میں کسی ایک کتاب کو دیکھنے اور نوٹ لینے میں چار دن سے زیادہ نہیں لگانے چاہئیں۔"

یہ محض ایک رائے سہی لیکن مطالعہ کے لیے کوئی نہ کوئی راہ ضرور سجھاتی ہے۔ سیموئیل جانسن کا قول ہے کہ ایک آدمی ایک کتاب لکھنے کے لیے آدھی سے زیادہ لائبریری الٹ دے گا، اتنے زیادہ مآخذ کو دیکھا جائے تو کام واقعی قابلِ قدر ہوگا۔ محدود وقت میں، تیزی سے، زیادہ سے زیادہ کتب، رسائل، مقالے دیکھنے اور سونگھ کر مواد ڈھونڈ لینے کی مشق کرنی چاہیے۔ چنانچہ ضرورت ہے کہ بنیادی مقالے، کتب اور رسائل کا مطالعہ کیا جائے۔ کیونکہ اکثر مقالے، کتب، رسائل انھی بنیادی ماخذوں کو دہرا رہے ہوتے ہیں۔

مطالعہ کی رفتار کا ایک عام اندازے کا ذکر ہم کر چکے ہیں کہ روزانہ ڈیڑھ ڈیڑھ سو صفحات کی دو کتابیں یا کل تین سو صفحات زیرِ مطالعہ آ جانے چاہئیں۔ اس حوالے سے سال بھر میں پانچ چھ سو کتابیں یعنی ستر اسی ہزار صفحات دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس سے کم مطالعہ تحقیق کار کے لیے موزوں رفتار نہیں۔ ایک معروف صحافی ستار طاہر کتاب کا صفحہ ڈیڑھ سے دو سیکنڈ میں پڑھا کرتے تھے۔ رات بھر میں تو وہ چار پانچ کتابیں پڑھ لیا کرتے تھے جو اوسطاً تین تین چار چار سو صفحات کی ہوتی تھیں۔ وہ ان سے اخذ و استفادہ بھی کر لیتے تھے اور نوٹ بھی کر لیتے تھے۔

اکثر کتابوں میں ابواب کے عنوان سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ کس باب کو دیکھنا چاہیے اور کس باب کو پورے کا پورا چھوڑ دینا چاہیے۔ ہر باب میں ذیلی عنوانات یا مختلف اجزا کی تقسیم کو دیکھ کر فوراً طے کیا جا سکتا ہے کہ اس میں کون سا پیراگراف دیکھنا چاہیے۔ رسالوں کے مضامین کتاب کے باب کی طرح ہوتے ہیں۔ رسالے کی فہرست مضامین سے اپنے کام کا مضمون اور پھر اس مضمون میں اپنی پسند کے اجزا تلاش کیے جا سکتے ہیں۔

تحقیق کا یہ اصول یاد رہے کہ ابتدا میں اس وقت تک انجام دی گئی بہترین تحقیق سے آگہی حاصل ہو

یعنی سابقہ تحقیقاتی ادبیات کا مطالعہ کیا گیا ہو۔ اس مطالعے کے پہلے قدم کے طور پر اپنے موضوع پر سب سے اچھی کتاب کے مطالعے سے آغاز کریں۔ پھر اس کے ماخذوں میں سے اہم کتب کا مطالعہ کریں۔ راتھ کی ہدایت ہے کہ ادبی تحقیق میں پہلے اولین مواد دیکھیں اور اس میں بھی جس کتاب سے سب سے زیادہ معلومات ملنے کی امید ہو پہلے وہ دیکھیں۔ فرض کریں کسی کو اُردو میں قصۂ چہار درویش کے بارے میں تحقیق کرنی ہے۔ اس کے بارے میں سب سے زیادہ معلومات کتاب اُردو کی نثری داستانیں طبع سوم میں ہیں لیکن اولین مواد کو پہلے دیکھا جائے تو اُردو فارسی میں چہار درویش کے نسخوں کو پڑھنا اور مقابلہ کرنا ہوگا۔ یہ جاننے کے لیے کہ اس قصے کے کون کون سے نسخے اور ترجمے ہیں اور ان کی اضافی اہمیت کیا ہے، اس کتاب سے پوری معلومات مل جائیں گی۔ اس کے بعد اولین ماخذ یعنی متون کو دیکھا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر گیان چند کے نزدیک ادبی تحقیق میں مضمون کا زمانہ تحریر اتنا اہم نہیں جتنا اس کے مواد کا معیار۔ یہ ضروری نہیں کہ پہلے سب سے نئی تحریریں کو پڑھیں، بعد میں پیچھے جائیں۔ ضروری یہ ہے کہ مختلف تحریروں کو بادی النظر میں دیکھ کر طے کریں کہ کون سی سب سے زیادہ جامع اور بھرپور ہے۔ پہلے اسے پڑھیں، بعد میں اس سے کمتر درجے کی تحقیق کو۔ اس بات کا خاصا امکان ہے کہ بعد کی تحقیق زیادہ مفصل ہو۔ اگر کسی نے ہمارے موضوع یا اس کے ایک جزو یا اس سے مماثل موضوع پر تحقیق کی ہے تو ضرور پہلے اس نئی کتاب کو دیکھیں کہ اس نے تمام پرانے مواد یا ادبیات کا احاطہ کرلیا ہوگا۔ اگر آپ کے موضوع سے اتنی قریب کوئی کتاب نہ ہو (اور اچھا ہے کہ نہ ہوتا کہ آپ کے لیے گنجائش رہے) تو پرانے بنیادی مواد یا ادبیات سے کیوں کر مفر ہوگا۔

مطالعے کا آغاز کرنے کے لیے اساتذہ، نگران اور دیگر اہلِ علم سے مشورہ بھی ضروری ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی، خلیل الرحمان داؤدی، مشفق خواجہ، ڈاکٹر جمیل جالبی جیسے لوگوں تک ہر ایک کی رسائی تو ممکن نہیں لیکن اپنے نگران اور صدرِ شعبہ سے تو مشورہ ہوسکتا ہے۔

3- کوائف کے مآخذ

دستاویزی تحقیق پر اس ڈسپلن میں بہت کم توجہ دی جاسکتی ہے۔ اس کی وجہ اس کے ماخذ ہیں۔ دستاویزی کوائف یا مواد عام طور پر بنیادی، ثانوی یا ثلاثی، خارجی یا داخلی ماخذوں سے حاصل کیا جاتا ہے۔ ذیل میں ان کی تشریح کی جارہی ہے۔ ان ماخذوں کو ہم کسی سائنسی پیمانے پر پرکھنے کے بہت کم اصول بناسکے ہیں۔ عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ دستاویزی یا تاریخی طریقے کی کوئی معروضی بنیاد نہیں۔ یہ ہم عصر مسائل پر بہت کم اثر انداز ہوتی ہے مثلاً صنف، نسلیت یا قومیت وغیرہ۔ لیکن ان موضوعات کو پس منظر اور سابقات کے تناظر ہی میں دیکھا جاسکتا ہے۔ اس لیے اس کے ماخذوں کو بھی معروضی بنیاد پر جانچا جائے گا۔ انھی بنیادوں پر دستاویزی ماخذوں کی مندرجہ ذیل اقسام پیش کی جاتی ہیں:

(الف) بنیادی مآخذ (Primary Sources)

وہ تمام اساسی شواہد یا دستاویزات مخطوطے، کتابیں، تصانیف، مسودے، ڈائریاں، خطوط، حوالہ

جاتی کتب، لغات، قاموس، تصاویر، ویب سائٹس وغیرہ بنیادی ماخذ کہلاتے ہیں جن پر تحقیقی کام انجام دیا جا رہا ہو یا جو تحقیق کی بنیاد ہوں یا بنیادی معلومات ان سے اخذ کی جاتی ہوں نیز ان سے پہلے وہ معلومات کسی اور جگہ سے حاصل نہ ہو سکیں۔ بنیادی ماخذ کسی تحقیق کے جواز اور اعتبار کے لیے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں، اس لیے ان کی تعیین اور تلاش خاصا مشکل اور محنت طلب کام ہے۔ بقول ایس ایم شاہد:

> ''چوں کہ آپ ماضی کے واقعات و حالات و معاملات کا خود سے مشاہدہ نہیں کر سکتے، اس لیے آپ ابتدائی ذرائع کی مدد سے اپنے مسئلے سے متعلق بہترین شہادتوں کو اکٹھا کرنے کی کوشش کرتے ہیں مثلاً:
> 1۔ ماضی کے بارے میں آنکھوں دیکھی اور کانوں سنی شہادتیں۔
> 2۔ وہ اصل معروضات جن کو ماضی میں استعمال کیا گیا ہو اور جن کا معائنہ براہ راست ہو سکتا ہو''۔

مواد / کوائف کی اقسام کا اطلاق زیادہ تر ایک انفرادی ادیب پر تحقیق کے سلسلے میں ہوتا ہے۔ ابتدائی مواد زیر تحقیق ادیب کی جملہ تخلیقات اور دوسری تحریروں مثلاً مسودوں، ڈائری، خطوط وغیرہ پر مشتمل ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ تاریخی دستاویزات، قانونی دستاویزات، طبی ریکارڈ، تعلیمی ریکارڈ، ملازمت کا ریکارڈ، ٹیپ ریکارڈ وغیرہ بھی ابتدائی ماخذ ہیں۔ بقیہ مواد ثانوی یا ثلاثی ہوتا ہے۔

یونیسکو کے UNISIST ماڈل میں ابتدائی ماخذ سے مواد اصل نتائج پیش کرنے والا مواد جو اہلِ علم اور تحقیق کار تحقیق کرتے ہیں مثلاً تجزیے، مقالے، رپورٹس، کارروائیاں، ذاتی و سرکاری دستاویزات، معیارات وغیرہ۔ علاوہ ازیں تراجم، فیصلے، برقیاتی کوائف وغیرہ۔

(ب) ثانوی مآخذ (Secondary Sources)

وہ تمام مواد، کتابیں، مقالات، کیسٹ، نقشے، آلات، ویب سائٹیں وغیرہ جن کے ذریعے بنیادی ماخذوں پر کام کیا جا رہا ہو یا جو بنیادی ماخذوں کا حوالہ دے رہی ہوں یا ان کی مدد سے بنیادی ماخذوں سے تقابل یا نشان دہی ہوتی ہو اور ان کی حیثیت امدادی مواد کی ہو۔

تحقیق کار اپنے مسئلے سے متعلق علمی کاوشوں کا جائزہ لینے کے لیے بھی ثانوی ماخذوں کو استعمال میں لا سکتا ہے۔ ان سے اپنی تحقیق کے لیے پس منظر بھی تیار کر سکتا ہے اور ان سے مسئلے سے متعلق عمومی خاکہ بھی تیار ہو سکتا ہے۔ اگر تحقیق کے دوران میں یہ پتا چل جائے کہ کسی ابتدائی ماخذ سے حاصل کردہ نئی معلومات سے اپنے تحقیقی خاکے میں تبدیلی لانا پڑے گی تو ایسا کرنا بہت ضروری ہے۔

ہر مقالے کے لحاظ سے بنیادی اور ثانوی ماخذوں کا تعین مختلف ہوگا، مثلاً اگر کوئی علامہ اقبال کے خطوط پر کام کر رہا ہو تو ان خطوط کی نقول، جوابی خطوط یا ان پر پہلی بار کسی کتاب، رسالے میں ان کا تذکرہ بنیادی ماخذ ٹھہرے گا اور ان پر انتقاد، تشریح یا بحث ثانوی ماخذ قرار پائے گی لیکن اگر کوئی ان خطوط کا متن مرتب کرنے لگے گا تو یہ تمام ماخذ ثانوی ہوں گے اور صرف اصل خطوط ہی بنیادی ماخذ قرار پائیں گے جو مصنف کے

ہاتھ سے لکھے ہوئے اصل یا ان کی عکسی نقول ہوں۔ یونیسکو کے UNISIST کے حوالے سے ثانوی ماخذ میں وہ مواد شامل ہے جو بنیادی ماخذ کے مواد کو پیش کرتا ہے۔ مثلاً کتابیات، خلاصے، اشاریے، مصنفین کے احوال، کیٹلاگ وغیرہ۔ علاوہ ازیں لغات، معجم (تھیسارس) وغیرہ بھی ثانوی ماخذ ہیں۔ سروے لٹریچر بھی اس میں شامل ہے۔

(ج) ثلاثی مآخذ (Tertiary Sources)

ثانوی ماخذ کے علاوہ کئی ثلاثی ماخذ بھی ہوتے ہیں جو روزمرہ مضامین، آرٹیکل، رپورٹوں مقالوں اور مباحث کی صورت میں اکثر شائع ہوتے رہتے ہیں جیسے اخباری، سیاسی اور عمومی صحافیانہ مضامین، درسی کتب وغیرہ۔ مطالعے کی حد تک ان سے استفادہ کیا جاسکتا ہے لیکن تحقیقی حوالے سے ان پر انحصار یا استناد نہیں کیا جاسکتا۔ یونیسکو کے UNISIST کے حوالے سے ثلاثی ماخذ میں بنیادی اور ثانوی ماخذوں سے تیار کردہ مضامین، درسی کتب، انسائیکلو پیڈیا، قاموس، مونوگراف، جائزے، تبصرے، ڈائریکٹریاں، فہارس، نیوز لیٹر، اخبارات، پراپیگنڈہ لٹریچر، پاپولر کتابیں، کمپیوٹر پیشکشیں وغیرہ شامل ہیں۔ گویا لائبریری کے بنیادی مآخذ تحقیق کے ثلاثی ماخذ ہوتے ہیں۔ ان میں انٹرنیٹ، ویب سائٹیں وغیرہ بھی شامل کر لی جائیں۔ زیادہ تر مواد ثلاثی ماخذ ہی ہوتا ہے۔

بنیادی، ثانوی اور ثلاثی ماخذوں کی نوعیت اضافی ہوتی ہے یعنی مختلف تحقیق میں یہ مختلف قسم کی نوعیت اختیار کر جاتے ہیں۔ ایک ہی چیز ایک قسم کی تحقیق میں بنیادی اور دوسری تحقیق میں ثانوی حیثیت اختیار کر جائے گی۔ مثلاً اگر ہم کسی کتاب کے مختلف ایڈیشنوں کا تقابل کریں گے تو مختلف مطبوعہ ایڈیشن بنیادی ماخذ قرار پائیں گے لیکن اگر ہم متنی صحت پر بات کر رہے ہوں یعنی اصل مسودے کے ساتھ ان کا تقابل کر رہے ہوں تو یہ تمام ایڈیشن ثانوی اور مصنف کے ہاتھ کا مسودہ بنیادی ماخذ کی حیثیت اختیار کر جائے گا۔ اسی طرح اگر ہم کسی مصنف کی تاریخ پیدائش کا سرسری سا حوالہ دیں گے تو میٹرک کی سند کو بنیادی ماخذ ٹھہرائیں گے لیکن اگر تاریخ پیدائش پر تحقیق کر رہے ہوں تو ہوسکتا ہے کہ میٹرک کی سند ثانوی ماخذ ٹھہرے اور بلدیہ کا ریکارڈ اور رجسٹر پیدائش بنیادی ماخذ قرار پائے۔

4۔ مآخذی مواد کا تجزیہ

گیراغان (Garraghan) دستاویزی تجزیے کو چھ نکات میں بیان کرتا ہے:

-1 ماخذ کب وجود میں آیا (تاریخ)؟
-2 کہاں پایا گیا (مقام)؟
-3 کس نے وضع کیا (تخلیق کار)؟
-4 کس مواد سے بنا (ساخت)؟
-5 کس نوعیت میں بنا (سالمیت)؟

6- شواہد کی قدر کیا ہے (معتبری)؟

پہلے چاروں اعلیٰ تنقید اور آخری دو نکات داخلی تجزیہ کہلاتے ہیں۔ مآخذی مواد زبانی، تحریری، تعلقی، تجزیاتی ہر طرح کا ہو سکتا ہے۔ تحریری دستاویزی مواد کی زیادہ تر دستیابی پرانے آثار، ریکارڈ، کتب خانوں، کتابوں، رسالوں، ویب سائیٹوں، مخطوطوں وغیرہ سے ہوتی ہے۔ ایسے دستاویزی مواد کے حصول کا ایک اہم ذریعہ آرکائیوز یعنی وہ خصوصی کتب خانے اور ذخیرہ گاہیں جہاں قدیم ریکارڈ محفوظ رکھا جاتا ہے۔

کسی دستاویز کے تجزیے میں حائل امور عموماً مندرجہ ذیل ہوتے ہیں:

1- وقت کی تنگی اور وسائل کی کمی۔
2- مطلوبہ کوائف موجود نہیں۔
3- دستاویز کا مالک اس تک رسائی نہیں دیتا۔
4- دستاویز کی اشاعت (جنسی یا جرائم کی بنیاد پر) نہیں ہو سکتی۔
5- دستاویز کی اشاعت (عمومی سماجی رویے کی بنا پر) سخت ردِ عمل پیدا کرے گی۔
6- کوائف کا مطالعہ (تحریر کی بنا پر) مشکل ہے۔
7- دستاویز تباہ ہو چکی ہے (جل چکی، پھٹ گئی یا دیمک کھا گئی ہے)۔
8- دستاویز میں بعض مخففات اور رموز استعمال ہوئے ہیں۔
9- دستاویز کا سیاق و سباق اور تناظر معلوم نہیں۔

کسی ادبی مؤرخ اور محقق کا پہلا کام یہ ہے کہ وہ مطلوبہ مواد جمع کرے۔ کسی بھی ایسے مطالعے میں وہ انسانی مصروفیات اور واقعات سے متعلق انتہائی وسیع ذخیرۂ معلومات کی جانچ پڑتال کرتے ہوئے ان ذرائع کا انتخاب کرتے ہیں جو کسی تحقیقی سوال، فرضیے یا مسئلے کے حل کے لیے مناسب ہو سکتے ہیں۔ اگرچہ کوئی اپنی تحقیق کا آغاز ثانوی یا ثلاثی ماخذوں کی جانچ پڑتال سے کر سکتا ہے، لیکن اس کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ ابتدائی ماخذوں کو حاصل کیا جائے۔ اس لیے اسے چاہیے کہ مواد حاصل کرنے کے دونوں ماخذوں سے اچھی طرح واقفیت اور انھیں حاصل کرنے کے ماخذوں کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کرے۔

ان ماخذوں کی اہمیت سے انکار نہیں۔ زمانہ ماضی کے لوگوں کے افکار و معروضات کے بارے میں شہادتوں سے آپ ماضی کے بارے میں کچھ نتائج اخذ کر سکتے ہیں۔ ان کے بغیر آپ کے لیے تاریخی تحقیق کو آگے بڑھانا تقریباً ناممکن ہوتا ہے اور ان کے بغیر تاریخ محض ایک کہانی ہوگی جس کی کوئی افادیت نہیں ہو سکتی۔ ابتدائی ماخذوں کو تاریخی تحقیق میں بنیادی مواد کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔

بعض اوقات ثانوی ماخذوں کو استعمال میں لانا بھی ضروری ہوتا ہے مثلاً:

1- ایسے شخص سے حاصل کی گئی معلومات جس نے واقعات و حالات کا براہِ راست مشاہدہ نہ کیا ہو۔
2- واقعات و حالات کے بارے میں مخصوص معلومات جو اخباروں انسائیکلو پیڈیا، تحقیق کے جریدوں اور دوسرے حوالہ جاتی ماخذوں میں موجود ہوتی ہیں۔ بعض اوقات ثانوی ماخذ ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں

موجود معلومات اور ابتدائی ماخذوں میں موجود معلومات کے درمیان کئی دوسرے ذرائع حائل ہوتے ہیں جن کی وجہ سے ثانوی ماخذوں کی صداقت اور زیادہ مشکوک ہو جاتی ہے۔ ثانوی ماخذوں کی ٹھوس جماعت بندی ایک مشکل کام ہے کیوں کہ بعض اوقات ایک ہی رپورٹ یا دستاویز میں مصنف کا اپنا براہ راست مشاہدہ اور دوسروں کے مشاہدات بھی شامل ہوتے ہیں۔ بعض صورتوں میں کسی مواد کو آپ ابتدائی مواد بھی کہہ سکتے ہیں اور ثانوی بھی، اس کا دارومدار اس بات پر ہوگا کہ آپ اسے کس طرح سے استعمال میں لا رہے ہیں۔

محققین جب مواد اور آثار کی جانچ پرکھ کرتے ہیں تو وہ بہت سے فیصلے کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ذیل میں وڈی (Woody) کی بیان کردہ چند تجاویز پیش کی جاتی ہیں:

1- ''بعد والے زمانے کے تصورات کو تلاش کرنے کے لیے پہلے دور کے ماخذ کو نہ پڑھیں یعنی زمانی شعور بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اگر تحقیق کے مسئلے کا زمانہ عہد مغلیہ سے متعلق ہے تو عہد مغلیہ کے بارے میں تاریخی دستاویزات کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ (اگر انگریزی دور ہے تو مغلیہ عہد کا مطالعہ بے کار ہوگا۔)

2- کسی مصنف کے قابل اعتبار ہونے کی جانچ پرکھ صرف اس ایک معیار پر نہ کریں کہ وہ بعض واقعات کا علم نہیں رکھتا کیوں کہ اس نے ان کو بیان نہیں کیا یا یہ کہنا کہ چوں کہ فلاں مصنف نے واقعات کو بیان نہیں کیا اس لیے وہ رونما ہی نہیں ہوئے۔ دستاویزات کے تقابلی مطالعے سے اس امر کی مزید جانچ پرکھ کی جاسکتی ہے اور زیادہ قابل اعتبار نتیجہ نکالا جاسکتا ہے۔

3- کسی دستاویز کو کم معیاری خیال کرنا یا اس کو زیادہ معیاری اور قابل قدر سمجھنا، یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ حقیقت میں جو مقام کسی دستاویز کو حاصل ہے، اس کو اسی لحاظ سے دیکھنا چاہیے۔ اس بارے میں افراط و تفریط درست نہیں۔ کسی واقعے کو اس کے اصل زمانے سے پہلے رونما ہوتے ہوئے خیال کرنا یا اس کو بعد والے دور سے متعلق سمجھنا بھی اچھا نہیں۔ زمانے کا تعین کرتے وقت احتیاط کا دامن نہ چھوڑنا چاہیے۔

4- کوئی ایک درست اور صحیح ماخذ کسی خیال (idea) کے وجود کو ثابت کرسکتا ہے لیکن دوسرے براہ راست، باصلاحیت اور آزاد گواہوں کی ضرورت ہوتی ہے جو واقعات یا معروضی حقائق کی اصلیت کو ثابت کرسکیں۔

5- ماخذ میں ایک جیسی غلطیوں کا پایا جانا بتاتا ہے کہ انھوں نے ایک دوسرے پر انحصار کیا یا انھوں نے ایک مشترک دستاویز سے استفادہ کیا ہے، ورنہ ایک جیسی اغلاط ان میں نہ پائی جاتیں۔

6- اگر کسی خاص نکتے کے بارے میں گواہ متضاد بیانات دیتے ہوں تو ممکن ہے کہ ان

میں سے ایک صحیح کہتا ہو اور دوسرا غلط اور یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں غلط کہتے ہوں۔
7۔ اگر براہ راست، باصلاحیت اور آزاد گواہ ایک ہی اہم حقیقت اور اس سے متعلق بہت سے معاملات کو رپورٹ کر رہے ہوں اور ان کی بیان کی ہوئی علت (cause) بھی ایک ہو تو ان کے اتفاق رائے کی وجہ سے اس رپورٹ کو قبول کیا جا سکتا ہے۔
8۔ اگر ممکن ہو تو سرکاری شہادت کا...... خواہ زبانی ہو یا تحریری...... غیر سرکاری شہادت کے ساتھ مقابلہ کر لینا چاہیے کیوں کہ ان دونوں میں سے کوئی ایک کافی نہیں ہوتی۔
9۔ ایسا ممکن ہے کہ ایک ماخذ چند نکات کے بارے میں قابل اعتماد اور اہلیت والی شہادت پیش کرے لیکن دوسرے نکات کے بارے میں اس کی پیش کی گئی شہادت میں کوئی وزن نہ ہو"۔

دستاویزی تجزیے کے چار اصول بیان کیے جاتے ہیں:

1- استناد (Authenticity)

(اغلاط، تحریر کی عدم یکسانیت، مختلف ورژن، اسلوب، خط تحریر، غلط مالک کے پاس، مشتبہ تحریر، مشابہ دستاویز، بے حد صاف یا بہت خراب اور تباہ دستاویز)

2- صحت اور ساکھ (Credibility)

(شواہد کی تحریف، لکھنے والے کا اعتبار، کوائف کی صحت، سیاسی و سماجی وابستگیاں وغیرہ)

3- نمائندہ دستاویز (Representative)

(تحقیقی مقاصد کے لیے درکار، نمونے کی دستاویز، کسی خاص نکتے کی فراہمی)

4- معانی (Meaning)

(دستاویز واضح اور قابل فہم ہے، معنی کا سیاق و سباق)

ڈاکٹر گیان چند لکھتے ہیں:

"کسی زبان کے ادب کا جتنا مواد موجود ہے۔ اس سے کہیں زیادہ ضائع ہو چکا ہے۔ کسی ادیب کی جملہ نگارشات موجود نہیں ہیں۔ غالب روزانہ کسی کاغذ پر کچھ نہ کچھ لکھتے ہوں گے۔ ان میں سے کتنی چیزیں محفوظ ہیں۔ ہمارے بڑے شاعروں اور نثر نگاروں نے اپنی تخلیقات کو ایک بار یا کئی بار ہاتھ سے لکھا ہو گا تب طباعت کے لیے دیا ہو گا۔ کس کے پہلے، دوسرے اور آخری مسودے محفوظ ہیں۔ سترھویں، اٹھارھویں صدی میں اُردو کے کتنے زیادہ شعرا رہے ہوں گے۔ ان میں سے معدودے چندہی کی تخلیقات باقی ہیں۔ میری طرح ہر اہل قلم تصور کر سکتا ہے کہ اس نے اپنی حیات رفتہ میں کتنے اوراق (ادبی ہی نہیں، غیر ادبی بھی) سیاہ کیے ہوں گے، کتنے خطوط لکھے ہوں

گے۔ کتنے نوٹ لیے ہوں گے۔ ان میں سے اب کتنے محفوظ رہے ہیں"۔

تحقیق کار کو دستاویز کا ثقافتی تناظر اور سماجی ماحول کا جائزہ بھی لینا چاہیے۔ جیسے یہ عمومی ثقافت کا حصہ تھا کہ رجسٹر پیدائش میں کوئی بھی تاریخ اور کوئی بھی نام لکھوا دیا جاتا تھا۔ معاشی اور سیاسی امور اور تاریخ، ماحول اور اثرات کو بھی ملحوظ رکھا جائے۔ دستاویز اور اس کے تخلیق کار کے درمیان مقاصد کو بھی دیکھا جائے۔ دستاویز کا تجزیہ اس کے معیاری اور مقداری، کیفیتی اور کوائفی ہر دو انداز سے کیا جانا چاہیے۔

اثباتیت پسندوں کے نزدیک دستاویز ایک حقیقت ہوتی ہے جو تشریح سے ماورا ہوتی ہے۔ دوسروں کے نزدیک دستاویز علمی ضرورت پورا کرتی ہے۔ اس لیے ان کا جائزہ اور تجزیہ کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اس تجزیے کے لیے گہرا ادراک اور بصیرت درکار ہوتی ہے۔ لیکن تحقیق کار کو دستاویز کا مطالعہ محض معروضی انداز میں کرنا چاہیے اور داخلی خارجی شواہد ملحوظ رکھنے چاہئیں۔ داخلی اور خارجی مواد یا شہادت کا تعلق کسی زیر مطالعہ متن سے ہوتا ہے۔ داخلی مواد کسی مصنف کی نگارشات کے مشمولات ہیں خواہ وہ بنیادی ماخذ سے حاصل ہوں یا ثانوی ماخذ سے۔ اس کا استناد اسی کے متن کے اندر سے برآمد ہوگا۔ اس لیے داخلی ماخذ پر داخلی تنقید کے ذریعے اس کی ماہیت کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ بنیادی ماخذوں کی اصلیت یا نوادر کا جائزہ لینے کے لیے خارجی تنقید بھی استعمال کی جاتی ہے۔ جس میں املا، طرز تحریر، کاغذ، روشنائی وغیرہ کی جانچ شامل ہے۔

داخلی شہادت کی ایک مثال ڈاکٹر وحید قریشی نے مثنوی چندر بدن مہیار کے مصنف کے حوالے سے پیش کی ہے اور متن کی زبان سے اندازہ لگایا ہے کہ اس کا مصنف سیف اللہ پنجاب کا رہنے والا تھا کیونکہ دکنی اُردو کی نسبت اس کی زبان صاف ہے اور اس میں فارسی ترکیبوں اور بندشوں کی بھرمار ہے۔ مصرعوں کا دروبست پنجابی ہے۔ بقیہ سب خارجی مواد ہے۔ اسی طرح اقبال کا میونسپل رجسٹر کا اندراج، تعلیمی ریکارڈ وغیرہ ابتدائی ریکارڈ ہوتے ہوئے بھی خارجی مواد ہیں، داخلی نہیں۔

ادبی تحریروں کے علاوہ بعض اوقات غیر ادبی تحریروں میں بھی ادیبوں کے بارے میں مفید معلومات مل جاتی ہیں۔ انھیں بھی خارجی ماخذ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس کی ایک مثال: خلیل الرحمان داؤدی نے قصۂ اگر گل کے مصنف کا نام اس کی طباعت (1967ء) کے بعد مشفق خواجہ کے مرتب تذکرہ خوش معرکۂ زیبا (سعادت خاں ناصر) سے معلوم کیا کہ قصۂ اگر گل بھی اسی مصنف کی تصنیف ہے۔

5- مآخذی مواد کی اقسام

مطبوعہ و غیر مطبوعہ

مآخذی مواد کو ذیل کی قسموں میں بانٹا جا سکتا ہے۔

1- کتابیں۔ جن کی دو قسمیں ہیں:

(i) مطبوعہ (ii) قلمی یا خطی (مخطوطے)

اخبارات، کتابچے، جرائد کے مضامین وغیرہ بھی زبان و ادب کے بارے میں مختلف قسم کی

معلومات فراہم کرتے ہیں۔ سوالات یہ پیدا ہوتے ہیں کہ:

(الف) کیا یہ مواد اسی مصنف نے تخلیق یا تصنیف کیا ہے جسے اس کا کریڈٹ دیا جارہا ہے۔

(ب) کیا یہ مصنف کی کاوش کا اصل مسودہ ہے یا اس کی درست نقل ہے۔

(ج) اس مسودہ کے لیے معلومات کو کن ذرائع سے حاصل کیا گیا تھا اور مصنف کا ان پر کس قدر بھروسا تھا یعنی آپ اس وقت تک سوال کرتے چلے جاتے ہیں جب تک آپ کو اس بات کا مکمل اطمینان نہیں ہو جاتا کہ یہ مسودہ کب، کہاں اور کس نے تحریر کیا تھا۔

مصنف، تصنیف کی تاریخ اور جگہ کا تعین کرنا مورخین کا ایک عام طریق کار ہے۔ بعض دستاویزات پر مصنف کا نام تحریر نہیں ہوتا اور کسی دوسرے جعلی نام (Pseudonym) سے تصنیف کو چھاپ دیا جاتا ہے یا کسی ایسے شخص کے نام سے کتاب منسوب ہوتی ہے جس نے اس دستاویز کو تحریر ہی نہیں کیا ہوتا۔ جیسے علامہ اقبال کے نام سے بعض تاریخی درسی کتب شائع ہوئیں۔ مولوی عبدالحق، مولانا غلام رسول مہر یا حکیم سعید کے نام سے کئی لوگوں نے کام کر کے دیا۔ بعض ادارے ایسی رپورٹیں چھاپتے رہتے ہیں جن میں رپورٹ لکھنے والے کا نام درج نہیں ہوتا۔ ہوسکتا ہے کہ کسی رپورٹ پر کمیٹی کے تین اراکین کے دستخط موجود ہوں مگر رپورٹ صرف ایک ہی رکن نے لکھی ہو یا پھر کسی ماتحت نے تیار کی ہو جیسا کہ پاکستانی دفتروں میں عام طور پر ہوتا ہے۔

مصنف کا تعین کرنے کے لیے بعض اوقات انتہائی اچھے کھوجیوں کی طرح کام کرنا پڑتا ہے مثلاً گمنام اور بغیر تاریخ کے دستاویزات کے بارے میں درست معلومات کا تعین کرنا، غلط بیانیوں کو کھوج نکالنا، سرقے کا پتا چلانا، ایسی شقوں کا پتا چلانا جن کی نشان وہی درست طور پر نہ کی گئی ہو، یعنی شقوں کے بارے میں کھوج کے دوران میں آپ کو ان کا بڑے غور سے معائنہ کرنا پڑتا ہے اور مناسب سوالوں کا جواب یا علمی، قومی، خاندانی یا علاقائی افتخار کے باعث ریکارڈ یا آثار کو ترتیب نہیں دیا گیا۔

1- غیر مطبوعہ یا خطی ماخذ میں ادبی مخطوطات کے علاوہ مسودے، ڈائریاں، میونسپل رجسٹر، سکول رجسٹر وغیرہ بھی شامل ہیں۔

2- جریدے۔ ان میں رسالوں کے علاوہ اخبارات بھی شامل ہیں۔

3- دیگر کاغذات۔ ان میں دوسری چیزوں کے علاوہ کسی مصنف کے منتشر کاغذات، خطوط، تاریخی دستاویزیں، قانونی دستاویزیں بشمول مقدمے کی مسل، وصیت نامے، زائچے، درس گاہوں میں داخلے اور امتحان کے فارم، ملازمت سے متعلق ریکارڈ، پاسپورٹ، راشن کارڈ، گاڑی چلانے کا لائسنس وغیرہ شامل ہیں۔

4- بصری مواد یعنی فلم، ٹیلی وژن وغیرہ۔ مثلاً دستاویزی فلم، ٹی وی ڈرامے، مذاکرے اور گفتگو۔ دراصل انھیں بصری، سمعی مواد کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ رابرٹ راس کے مطابق فلم ریڈیو، فوٹو البم کو گرافیات یا ترسیمات (Graphics) کہتے ہیں۔

-5 مائیکروفلم۔ جس کے مواد کو خرد ترسیمیات (Micro Graphics) کہا جاتا ہے۔ اس میں زیراکس اور دوسری عکاسی فہرست شامل کریں۔

-6 سمعی مواد۔ ریکارڈ یعنی کیسٹ (Cassette)، ریڈیو کے ادبی پروگرام یعنی تقریریں، مباحثے وغیرہ۔

-7 لوحیں، قبروں کے تعویذ، دیواروں پر لوحیں، مقبروں کے گنبد، دروازوں پر نقوش۔

-8 ملاقات (انٹرویو)۔

-9 مراسلت کے ذریعے استفسار، سوالنامے۔

-10 ای میل، ویب سائٹ، سی ڈی کے ذریعے حاصل ہونے والا مواد۔

-11 بیاض یا کشکول اگلے زمانے میں باذوق حضرات ایک بیاض رکھتے تھے جس میں دوسرے شعرا کے پسندیدہ اشعار لکھ لیتے تھے۔ ایسی کچھ بیاضیں کتب خانوں میں بھی محفوظ ہوگئی ہیں۔

باقیات اور آثار (Records, Remains, Relics)

ادبی مؤرخین کا زیادہ تر انحصار ان دستاویزات پر ہوتا ہے جو اس لیے محفوظ کی گئی ہوتی ہیں کہ معلومات کو دوسروں تک پہنچایا جاسکے۔ ماضی کے خیالات و تصورات، حالات و واقعات کے بارے میں مختلف قسم کے ریکارڈ تحریری، تصویری یا میکانکی صورتوں میں موجود ہوتے ہیں مثلاً:

دستاویزی ریکارڈ (Archives)

دستوری (Legislative)، عدالتی (Judicial) اور انتظامی (Executive) دستاویزات جو وفاقی، صوبائی اور مقامی حکومتیں تیار کرتی ہیں۔ چارٹرز، عدالتی کارروائیاں اور فیصلے، ٹیکس دہندگان کی فہرستیں اور دیگر اہم قسم کی شماریات۔ اس طرح مذہبی اداروں سے متعلق بھی مختلف قسم کے ریکارڈ ہوتے ہیں اور وفاقی و صوبائی نظامت تعلیم، خصوصی کمیشنوں، پیشہ ورانہ تنظیموں، مدرسوں کی انتظامیہ کی طرف سے معلومات کو بھی ریکارڈ کیا جاتا ہے۔ یہ معلومات، اجلاسوں کی رپورٹوں، کمیٹیوں کی رپورٹوں، انتظامی ہدایات، سالانہ رپورٹوں، میزانیوں، وقت ناموں، تنخواہوں کی فہرستوں، حاضریوں کے ریکارڈوں، حادثات کی رپورٹوں اور کھیل کھلاڑیوں کے بارے میں ہوتی ہیں۔ غالب کی پنشن کا مقدمہ اور اقبال کی تاریخ پیدائش پر تحقیق ایسے ہی ماخذوں سے تیار ہوئیں۔ دستاویزات پنجاب (Punjab Archives)، لاہور عجائب گھر، قومی دستاویزات (National Archives) اور مرکز قومی دستاویزات (NDC) میں بھی ایسے ریکارڈ موجود ہیں۔

زبانی روایات (Oral Traditions)

لوک کہانیاں، خاندانی قصے، ناچ، کھیل، رسوم، واقعات و حادثات کی عینی شہادتوں کے بارے

میں بیانات بھی زبانی مواد کی صورت میں بعض لوگوں کے پاس محفوظ ہوتے ہیں۔ ان سے لوک گیت اور لوک کہانیاں مرتب ہوئیں جیسے سائیں نے ہندکو اور زیتون بانو نے پشتو میں جمع کیے یا لوک ورثہ اسلام آباد نے مرتب کرائے۔

تصویری ریکارڈ (Pictorial Records)

تصویریں، متحرک فلمیں، مائیکروفلمیں، مصوروں کی بنائی ہوئی تصویریں، مٹی وغیرہ سے بنی ہوئی اشیاء اور مورتیں وغیرہ بھی کتب خانوں، عجائب گھروں وغیرہ میں پائی جاتی ہیں۔ بصری مواد فلم، ویڈیو، فوٹو البم وغیرہ کے ذریعے سے ملتا ہے۔ ٹیلی وژن سے ادبی پروگرام بہت کثرت اور پابندی سے پیش ہوتے رہتے ہیں۔ اس میں سنجیدہ بحثیں اور ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ غالب، اقبال وغیرہ پر مصور ایڈیشن شائع ہوتے ہیں۔ مرقع اقبال میں ان کی زندگی کی بہت سی جھلکیاں ہیں۔ روزگار فقیر کے آخر میں اقبال کی بکثرت تصویریں اور گروپ فوٹو ہیں۔ آخرالذکر ان کی سوانح کے بارے میں اولین ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اردو ادیبوں کی، بالخصوص قدما کی، جو تصویریں ملتی ہیں وہ ان کی شخصیت کے تعین میں مدد دیتی ہیں۔

ذاتی ریکارڈ (Personal Records)

ڈائریاں، خودنوشت، سوانح حیات، خطوط، وصیت نامے، معاہدے، لیکچر کے نوٹس اور تقاریر کے مسودے، مضامین اور کتابوں وغیرہ کی صورت میں بھی دستیاب ہوتے ہیں اور ذاتی طور پر بھی لوگوں کے پاس موجود ہوتے ہیں۔ بیت الحکمت (ہمدرد) کراچی کے کتب خانے میں مصنفین کے اصل مسودے محفوظ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ادیبوں کے خطوط

ادیبوں کے خطوط کی اہمیت اظہر من الشمس ہے۔ ان میں ایک طرف علمی و ادبی معاملات پر بحث ہوتی ہے اور دوسری طرف ان میں ان کی ذات بے نقاب ہو کر سامنے آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے ادیبوں کے خطوط محفوظ رکھے جانے لگے ہیں۔ ہندوستان میں اس قسم کے ذخیرے انجمن ترقی اردو نیز خدا بخش لائبریری پٹنہ میں ہیں۔ تاریخی دستاویزات زیادہ تر آرکائیوز میں ملتی ہیں۔ تاریخی دستاویز سے مراد محض فرمان شاہی نہیں بلکہ وہ تمام پرانے کاغذات ہیں جنھیں آرکائیوز میں محفوظ رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ اگر زیر تحقیق کوئی والی ملک، امیر، سردار یا بڑا سرکاری عہدہ دار ہو تو اس کی سوانح کے لیے ان دستاویزات سے بہت مدد ملے گی۔ نیشنل آرکائیوز اسلام آباد، پنجاب آرکائیوز لاہور وغیرہ۔ لاہور، کراچی اور پشاور کے عجائب گھروں میں ایسے ذخائر موجود ہیں۔ غالب اور اقبال کے خطوط پر کام ہو چکا ہے۔ اسی طرح فیض، مولوی عبدالحق وغیرہ کے خطوط بھی شائع ہوئے ہیں۔

ذاتی خطوط کی تحقیقی اہمیت کے حوالے سے پہلا سوال یہ اٹھتا ہے کہ یہ خطوط ماضی کے بارے میں ہر دو شخصیات (کاتب و مکتوب الیہ) کے بارے میں اور خط لکھے جانے کے اوقات کے بارے میں کس طرح

سے تحقیق کا دریچہ کھولتے ہیں۔ نیز یہ کہ ملنے والے خطوط کی اصلیت کیوں کر جانچی جاسکتی ہے۔

خط مواصلت کی ایک قدیم قسم ہے۔ یہ عموماً انتہائی نجی یا ذاتی، شوخ، جذباتی، موضوعی، واقعاتی اور مفصل امور کے حامل ہوتے ہیں۔ بعض ادیبوں نے خود ہی اپنے خطوط شائع بھی کروائے جو ترمیم واضافے اور تدوین کے عمل سے بھی گزرے۔ ان کی اصلیت کے بارے میں پتا چلانا یعنی اصل مخطوطوں کو جانچنا بھی حق تنقید کے حوالے سے قابل توجہ ہے۔ ایسے ذاتی خطوط کا مطالعہ ایسا آسان کام بھی نہیں کہ محض ان کی عبارت دیکھ کر، واقعات اور سنین جان کر ہم کوئی نتیجہ اخذ کرلیں۔ خطوط بھی ''متن'' کی ایک قسم ہوتے ہیں اور ان کی بھی مختلف تشریحات کی جاسکتی ہیں۔ ترمیم واضافے کی ایک مثال غبار خاطر از ابوالکلام آزاد اور کاروان خیال سے دی جاسکتی ہے۔ ایسی بیسیوں مثالیں سامنے ہیں، لب لباب یہ ہے کہ مضمر اور ظاہر عندیوں کا کوئی تقابل کیا جائے تو خطوط کی تحقیقی اہمیت واضح ہوگی۔

تحقیق میں بنیادی، ثانوی اور ثلاثی ماخذوں پر بحث جاری رہتی ہے۔ ایک ہی دستاویز کبھی بنیادی اور کبھی ثانوی قرار پاتی ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ جب کوئی دستاویز بنیادی قرار دی جاتی ہے تو کس بنا پر؟ فلوریڈا یونیورسٹی کے پروفیسر رابرٹ اے ہیچ (Hatch) اس پر سوال اٹھاتے ہیں کہ ہم اسے کس بنا پر بنیادی ماخذ قرار دے رہے ہیں؟ کیا محض پہلی دستاویز ہونے کی بنا پر یا راست ثبوت کے طور پر؟ لیکن شاید اس مخصوص واقعے کی بنا پر جس کے لیے شواہد جمع کیے جارہے ہیں؟ ہمیں صرف اس خط کی صحت، سند، افادیت اور معتبری سے تعلق ہوتا ہے۔ اس میں مکتوب نگار کا مقام اور مرتبہ بھی ملحوظ رکھا جانا چاہیے۔ ہر غیر مطبوعہ مراسلہ یا خط قابل توجہ نہیں ہوتا۔ وقت کے ساتھ ان کی اہمیت بدلتی رہتی ہے...... معما صرف یہ ہے کہ ان خطوط سے کئی کھانچے ابھرتے ہیں اور انھیں پر کرنے کے لیے کئی اور شواہد درکار ہوتے ہیں۔ خاص طور پر معنویاتی یعنی مکتوب نگار نے کس لفظ سے کون سے معنی مراد لیے تھے اور اس کے عمومی معنی کیا ہیں؟ ان کے مابین فرق ہی ان کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے۔ متن، سیاق وسباق اور تحت متن یعنی بین السطور معانی۔

خطوط کو جانچنے کے لیے سب سے پہلے ان کے اصل ہونے کا جائزہ لینا اہم ہے۔ کینتھ ایلیر اینڈل ایک امریکی ڈیلر ہے جو خطوط، ڈائریاں اور دستاویز کی خرید وفروخت کا کام کرتا ہے، اس کے نزدیک جعل سازی کی سب سے بڑی پہچان سیاہی، کاغذ اور ڈاک ٹکٹ یا مہریں ہیں، جو اپنے زمانے کی قید میں ہوتے ہیں۔ مگر بعض اوقات ان سے بھی معلوم نہیں ہوتا (حتی کہ مصنف کے طرز تحریر سے بھی نہیں)۔

بعد ازاں سب سے پہلے تو خطوط کے متن سے تعارف ہوتی ہے۔ اس سے کچھ اخذ کرنا ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک ماہر سٹیون سٹوے (stowe) کی کتاب قابل توجہ ہے۔ اس نے خطوط اور ڈائریوں سے اخذ واستفادے کی حدود متعین کی ہیں۔ اس کے نزدیک:

جہاں تک خطوط (اور ڈائریوں) کی تاریخی اہمیت کا سوال ہے، اس کے نزدیک یہ مصنف کی براہ راست تخلیق ہونے کے باعث کچھ شواہد رکھتے ہیں۔ اس سے مصنف کی شخصیت کے خطوط بھی واضح ہوتے ہیں۔ ان سے ہمیں ماضی اور ہمارے حال کے مابین فرق کا پتا چلتا ہے۔ زبان کی تبدیلیوں سے آگاہ ہوتے

ہیں۔ذات، سماج، تعلقات، کام، اور اقدار کی نوعیت کا علم ہوتا ہے۔مگر یہ سب اتنا سادہ نہیں کہ آپ انھیں بادی النظر جانچ لیں۔ یہ انتہائی "نجی" نوعیت کے ہوتے ہیں (حتیٰ کہ ان کے معنی بھی)۔ان میں مصنف کا انتہائی نجی اور ذاتی نقطۂ نظر موجود ہوتا ہے۔(اس لیے ان کے متن کو مختلف سمجھنا ضروری ہے) خط عام قارئین کے لیے نہیں ہوتا بلکہ ایک مخصوص قاری کے لیے ہوتا ہے۔ان میں ذاتی اور سرکاری، غیر رسمی اور رسمی ہر قسم کے خطوط کے لیے یہی قاعدہ ہے۔اس میں ذاتی دلچسپی، ثقافت، اقدار، تعلیم وغیرہ کے امور شامل ہوتے ہیں۔ان میں ذاتی نکات اختلاف رائے ہوتے ہیں۔وہ کچھ چھپا رہے ہوتے ہیں اور کچھ بتا رہے ہوتے ہیں۔(بتانے کی اہمیت بین السطور (sub-text) جائزے کے حوالے سے بڑھ جاتی ہے)۔ذاتی خطوط مصنف کی توڑی مروڑی رائے بھی ہو سکتی ہے۔ہم ان کی یہ ذاتی رائے عوامی کرنا چاہتے ہیں۔(ان کی ذاتی تحریر کو ادبی تحریر قرار دینے پر منصر ہوتے ہیں) دنیا کو دیکھنے کا ان کا اپنا نقطۂ نظر ہوتا ہے جو بعض اوقات ان کی عوامی/ادبی تحریروں میں نظر نہیں آتا۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ ان خطوط کی خصوصیات ذاتی متن کی حیثیت سے کیا ہوتی ہیں؟ ان کی طبعی (کاغذ، سیاہی، طرز تحریر) حیثیت سے ماورا کچھ اور خصوصیات بھی ہوتی ہیں لیکن یہ طبعی اور مادی خصوصیات بھی ہمیں مصنف کی شخصیت اور دور کا پتا دیتی ہیں کہ وہ کیسا قلم، کاغذ، نب، سیاہی استعمال کرتے تھے اور خطوط کو کس طرح سے تہ کرتے تھے۔مگر سب سے بڑی بات سنین اور تواریخ کی ہے۔(خاص طور پر ہجری)۔خطوط کی تاریخ مراسلت اور تاریخ وصولی کا تقابل کرنا اکثر نظر انداز ہو جاتا ہے۔اسی میں خطوط کی تاریخی اہمیت پوشیدہ ہے۔

تیسرا نکتہ خطوط میں موجود کردار اور بیان کردہ نکات کا پلاٹ ہیں۔مکتوب نگار خود کو اور اپنے مکتوب الیہ یا دیگر کرداروں کا تعارف نہیں کروا رہے ہوتے۔کیونکہ ان کے لاشعور میں کسی اور مکتوب الیہ یا قاری کا تصور نہیں ہوتا بلکہ چند کرداروں کو وہ ان کے لقب، عرف یا اپنے دیے گئے نام سے پکار رہے ہوتے ہیں۔

چوتھا نکتہ واقعات، تعلقات اور ذات کو نجی انداز میں بیان کرنے کا ہے۔مکتوب الیہ ہر بات کو اپنے عدسے سے بڑا یا چھوٹا کرتا ہے۔اس کا انحصار واقعات کی ذاتی اہمیت، تعلقات کی نوعیت اور اپنے تاثرات پر ہوتی ہے۔یہاں مکتوب الیہ بھی اہمیت رکھتا ہے۔مصنف ایک ہی واقعہ کو مختلف مکتوب الیہان کو مختلف انداز سے لکھ سکتا ہے۔اس لیے محض ایک آدھ خط سے کوئی شہادت برآمد نہیں ہوتی تا آنکہ اس سے متعلق تمام یا زیادہ تر خطوط کو نہ دیکھ لیا جائے۔

پانچواں نکتہ غیر رسمی (Informal) زبان استعمال کرنے کا ہے، جسے عام طور پر بازاری یا سلینگ کا نام دیا جاتا ہے، ذاتی خطوط میں ان کا استعمال عام ہے۔چنانچہ معنی کا تعین کرنے کے لیے سلینگ کے دور کو ملحوظ رکھنا ضروری ہوتا ہے۔

چھٹا نکتہ ادبی روایات کے عدم تسلسل کا ہے۔انتخاب لفظی، اسلوب کاری اور لسانیاتی جھول ذاتی خطوط کا خاصہ ہوتے ہیں۔اس لیے مکتوب نگار اکثر انھیں توڑ مروڑ کر استعمال کر رہا ہوتا ہے۔وہ

کسی طے شدہ ہیئت سے انحراف ضروری سمجھتا ہے۔ اپنے مقصود و منتہا اور دلائل، موڈ اور انداز کو ترجیح دیتا ہے۔ آسانی اس کے پیش نظر ہوتی ہے مگر اپنے بیان یا ورژن کی حد تک۔ اس لیے کبھی وہ لکھتے لکھتے کسی گزشتہ بات کو پھر سے بیان کرنے لگتا ہے اور کبھی اس کے آخری منطقی نتیجے یا خواہش کو شروع ہی میں لکھ دیتا ہے۔ خطوط میں اکثر معذرت خواہانہ اور غیر رسمی رویہ ہوتا ہے اس لیے اسے کسی ادبی روایت کے تحت پرکھنا بے سود ہے۔

ساتواں نکتہ رسمی، دفتری اور سرکاری خطوط کا ہے، جن کا ایک لگا بندھا طریقہ ہیئت اور روایت ہوتی ہے۔ یہ طرز ہر دور میں بدلتا رہتا ہے، چنانچہ کسی ایسے خط کو اسی دور کی روایت میں دیکھنا ہوتا ہے۔

آٹھواں نکتہ سیاق وسباق (context) کی تعبیر کا ہے۔ یہ بہت مشکل کام ہے۔ خاص طور پر کسی عہد کی سیاسی، سماجی، ثقافتی، ادبی اور لسانی روایات کو بیک وقت ملحوظ رکھنا۔ یہ تحریر کے بین السطور میں جھانکنے سے بھی بڑھ کر ایک کام ہے۔ چنانچہ ایسے کئی وسیع تر ماخذ کھنگالنے اور تقابل کرنے کی ضرورت درپیش ہوتی ہے۔

اُردو اور پاکستانی زبانوں کی تدوین میں ان میں سے بیشتر امور کو ملحوظ رکھنے کا کام آج بھی جاری ہے۔ خط پڑھنا، لفظ شناسی، ابہام، تقابل یا موازنہ، ذات، اخفا، انا، نجی حیثیت، لسانی و سماجی، سیاسی و ثقافتی پس منظر بہت سے امور ملحوظ رکھے جاتے ہیں لیکن یہ اسی روایت کا تسلسل ہے، جس میں مکتوب نگار کے ظاہری مقصود کو پیش نظر رکھا جاتا ہے اور شاذ ہی اس کے مضمر مقصود پر توجہ دی جاتی ہے۔ تدوین کی بات دوسری ہے مگر خطوط کی دستاویزی حیثیت پر تحقیقی کام کرنے والوں کو یہ دونوں مقصود (عندیے) ہیں نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔

الواحِ مزارات

مقبروں، سادہ قبروں، گنبدوں، دروازوں اور دیواروں پر نصب لوحوں اور نقش سے بھی کبھی مفید باتیں معلوم ہو جاتی ہیں۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے لاہور کے میانی صاحب کی الواح پر کام کیا تھا۔ بعض ادیبوں کی قبروں کی لوح سے ان کی تاریخ وفات معلوم ہوتی ہے۔ لاہور میں علامہ اقبال کے مقبرے پر بہت کچھ نقش ہے۔ چوں کہ قبریں اور کتبے مرحوم کی وفات کے فوراً بعد بنتے ہیں، اس لیے ان کے کتبے بالعموم معتبر ہوتے ہیں۔

مخطوطات

اُردو اور پاکستانی زبانوں کے ادب سے متعلق فارسی مخطوطات کی تعداد میں متعلقہ فارسی نسخوں کو بھی شامل کر لیا جاتا ہے مثلاً چہار درویش، ہفت سیر، حاتم طائی، شاہنامہ وغیرہ کے مخطوطات وغیرہ اردو لائبریریوں میں ممتاز مقام کے حق دار ہوتے ہیں۔ اردو مخطوطات، یعنی خالص اردو مخطوطات کی تعداد بھی ایک لاکھ سے اوپر ہوگی۔ انجمن ترقی اردو کے پاس ہزاروں مخطوطات جمع ہوئے تھے جو قومی عجائب گھر کراچی کو دے دیے گئے۔ ادارۂ ادبیات اُردو حیدر آباد میں تقریباً پانچ ہزار مخطوطے ہیں جن میں سے بہت سے مطبوعہ فہرستوں

میں ہنوز جگہ نہیں پا سکے۔ اکثر کتب خانوں میں مخطوطات کافی تعداد میں ہیں۔ اس طرح فارسی، عربی، سندھی، پنجابی، پشتو، سرائیکی مخطوطات کی فہرستیں بھی شائع ہوتی رہتی ہیں۔

بعض ذاتی کتب خانوں میں بھی کافی مخطوطات ملتے ہیں۔ کراچی کے قومی عجائب گھر میں انجمن کے مخطوطات سمیت مختلف مخطوطات کا بڑا مجموعہ موجود ہے۔

پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور اور پبلک لائبریری لاہور میں بھی اچھے ذخیرے ہیں۔ لندن میں انڈیا آفس اور برٹش لائبریری (جو پہلے برٹش میوزیم کا جزو تھی) کے مخطوطات تعداد میں بہت ہیں اور ندرت و افادیت میں بھی نہایت بیش بہا ہیں۔ بوڈلین لائبریری آکسفورڈ، اڈنبرا یونیورسٹی لائبریری، پیرس کی نیشنل لائبریری بھی اُردو فارسی مخطوطات کے اچھے مخزن ہیں۔ لاہور عجائب گھر میں بھی بعض ذاتی ذخائر جمع ہوئے ہیں۔

انجمن کے ذخیرے کی پانچ جلدیں پہلے چھپی تھیں۔ چھٹی جلد بھی شائع ہوگئی لیکن اب بھی بہت سے مخطوطات فہرست سازی کے منتظر ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور کے ذخیرے کی کوئی فہرست نہیں چھپی۔ شاہان اودھ کے مخطوطات، سالار جنگ لائبریری اور کتب خانہ آصفیہ کے مخطوطات، مخطوطات شیرانی، مخطوطات شفیع، رضا لائبریری رام پور کے مخطوطات، دیال سنگھ لائبریری لاہور کے مخطوطات کے علاوہ ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد کے مخطوطات، انسٹی آف سندھالوجی (حیدرآباد) کے مخطوطات اور شاہ عبداللطیف بھٹائی کے مخطوطات شائع ہو چکے ہیں۔ مشفق خواجہ تمام پاکستانی مخطوطات کی فہرست بنانا چاہتے تھے لیکن بقول ڈاکٹر گیان چند وہ جس شرح و بسط سے کام کرتے رہے، وہ اس نہج پر اپنی زندگی میں، تھوڑے سے مخطوطات کے بارے ہی میں لکھ سکے۔ اب مخطوطہ شناسی ایک مدفون ہو کر رہ گیا ہے۔

مخصوص کتب خانے

ہمارے یہاں بھی خصوصی اداروں میں ان کے مخصوص مضمون کی کتابیں کافی مقدار میں ہوتی جاتیں مثلاً مقتدرہ قومی زبان میں اصطلاحات، ترجمے سے متعلق، کتب خانہ خاص انجمن ترقی کراچی اور اردو لغت بورڈ کراچی میں قدیم اردو ادب اور مخطوطات، طبیہ کالج میں طب کی، دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء لکھنو میں اسلامیات کی اہم ادیبوں کی کتابیں "بیت الحکمت" ہمدرد کراچی میں لیکن ان خصوصی اداروں سے ہٹ کر کسی ایک مضمون یا شعبے کی عوامی لائبریریاں نہیں۔ ادب کی حد تک لاہور میں اقبال لائبریری، کراچی میں غالب لائبریری، اکوڑہ خٹک میں خوشحال خان خٹک لائبریری وغیرہ ہیں۔ اُردو میں جملہ کتابوں کی تعداد کا علم نہیں۔ مولوی عبدالحق کی قاموس الکتب کی جلد اول مذہبی کتابوں کے لیے مخصوص ہے اور اس میں چالیس ہزار کتابوں کا ذکر ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جملہ مطبوعہ کتابوں کی تعداد کئی لاکھ ہوگی۔ بہت سے بڑے بڑے مرحوم ادیبوں کے ذاتی کتب خانے بعض اداروں کی لائبریری میں آگئے ہیں۔ مثلاً سپرنگر کا کچھ ذخیرہ جرمنی میں ہے۔ ڈاکٹر معین الدین عقیل کا کتب خانہ کیوتو یونیورسٹی جاپان میں ہے۔ محمد حسین آزاد اور محمود شیرانی کی کتابیں پنجاب یونیورسٹی لاہور میں ہیں۔ مولوی عبدالحق کی کتابیں زیادہ تر انجمن ترقی اُردو پاکستان میں اور

کچھ انجمن ترقی اُردو ہند میں ہیں۔ حبیب الرحمن خاں شروانی کا کتب خانہ علی گڑھ میں ہے۔ لالہ سری رام کا کتب خانہ بنارس یونیورسٹی کو دے دیا گیا۔ جناب مسعود حسن رضوی کے کتب خانے کے کچھ اجزا علی گڑھ اور جموں گئے، بیشتر لکھنؤ ہی میں ہیں۔ احسان دانش کا کتب خانہ نیشنل لائبریری اسلام آباد میں ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی کا کتب خانہ جی سی یونیورسٹی لاہور میں ہے۔ راقم نے اپنی پندرہ بیس ہزار کتب کا ذخیرہ مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد کو دے دیا، اس میں بہت سی نادر کتب شامل ہیں۔ اہل علم، اساتذہ، ماہرین، امراء اور کئی زمینداروں نے ذاتی کتب خانے قائم کر رکھے ہوتے ہیں جن میں بہت عمدہ مواد موجود ہوتا ہے۔ جیسے خلیل الرحمان داؤدی، (لاہور)، مشفق خواجہ (کراچی)، سحر انصاری (کراچی)، ڈاکٹر صابر کلوروی (مانسہرہ)، ڈاکٹر وحید قریشی (لاہور)، ڈاکٹر اکرام چغتائی (لاہور)، پروفیسر عبدالجبار شاکر (لاہور)، افضل حق قرشی (لاہور) وغیرہ کے ذاتی کتب خانے، امراء اور زمینداروں کے کتب خانوں میں کتب خانہ گیلانی (اُچ شریف) اور جھنڈیر (وہاڑی) جیسے کتب خانے معروف ہیں۔

تحقیقی مقالات

پاکستانی یونیورسٹیوں میں تحقیقی مقالات کا عشر عشیر ہی شائع ہوتا ہے۔ غیر مطبوعہ مقالوں کو مخطوطات ہی میں شمار کیا جائے گا۔ ان کی جلدیں ان یونیورسٹیوں کی لائبریری میں ہوتی ہیں جہاں سے ڈگری عطا ہوئی۔ انھیں لائبریری سے باہر مستعار نہیں دیا جاتا۔ وہیں جا کر دیکھنا ہوتا ہے۔ معلوم کرنا ہوتا ہے کہ کس یونیورسٹی سے کس موضوع پر ڈگری ملی۔ اس لیے اس کے مقالے کا تعاقب کیوں کر کیا جائے؟ ''کتاب نما'' نئی دہلی اور ''اخبار اُردو'' اسلام آباد میں ایسی بعض فہرستیں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کی مرتبہ ایک مجموعی فہرست بھی ہائر ایجوکیشن کمیشن کی طرف سے شائع ہوئی ہے اور ویب سائٹ پر دی گئی ہے۔

اشاریے

یورپی دنیا کا بھی المیہ یہ ہے کہ لائبریریوں اور ان کی فہرستوں سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہاں کون کون سی کتابیں ہیں، صرف لائبریری آف کانگریس (امریکا) کے متعدد کتب خانوں کی فہرست شائع ہوتی رہتی ہے دیگر کتب خانوں کا علم نہیں ہے۔ اس لیے حوالوں کی کتابوں پر بھروسا نہ کر کے خود جا کر تلاش کرنا چاہیے، اگر مغرب میں یہ حال ہے تو اُردو اور پاکستانی زبانوں کی جو صورت حال ہوگی وہ تصور کی جا سکتی ہے۔ نیشنل لائبریری اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان اور اکادمی ادبیات کی طرف سے پاکستانی مطبوعات کی فہرستیں شائع ہوتی رہتی ہیں لیکن یہ بھی نامکمل ہوتی ہیں۔ چنانچہ بہتر ہے کہ خود تحقیق کار ہی کتب خانوں میں جا کر انھیں دیکھے۔

دیکھا گیا ہے کہ کتب خانوں کا عملہ ادب کا محقق یا ماہر نہیں ہوتا۔ وہ بعض کتابوں کے مصنف یا موضوع کی شناخت میں غلطی کر بیٹھتا ہے۔ ہمارے کتب خانوں میں یہ عام روش ہے کہ ایک موضوع کی کتاب دوسرے موضوع کی کتابوں کے درمیان رکھی ہوئی ہے۔ ایک ہی کتاب کی مختلف کاپیوں کو مختلف موضوعات میں گروہ بند کر دیا جاتا ہے۔ اس لیے تحقیق کار کو کتب کے شیلف پر خود جا کر کتابیں دیکھنا چاہئیں۔

رسالے اور جرائد

رسالے تحقیق کا بیش بہا مواد فراہم کرتے ہیں بلکہ رسالوں کو ایک لحاظ سے فوقیت حاصل ہے کہ کتابوں کا مواد تو سب کے سامنے ہوتا ہے۔ رسالوں، بالخصوص قدیم رسالوں میں نہ جانے کیا کیا بیش بہا معلومات دفن پڑی ہیں، کسے معلوم، ان تک رسائی بہت ضروری ہے۔ انیسویں صدی کے پرچوں کو ہم ایک بار نظر انداز بھی کر دیں لیکن بیسویں صدی کے قدیم پرچوں کا جائزہ لینا مفید ہوگا۔ ظاہر ہے کہ کسی ایک جگہ تمام اہم رسالوں کی مکمل فائل نہیں۔ جستہ جستہ ملیں گی۔ رسالوں کے بڑے بڑے ذخیرے بڑے کتب خانوں میں ہوتے ہیں۔ رسالوں کے اشاریے ہوں تو ان میں دیکھ لینا کافی ہوگا، پوری فائل تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔

مندرجہ ذیل رسائل و جرائد کے چند نامکمل اشاریے شائع ہو چکے ہیں:

''آج کل'' (نئی دہلی)، ''اخبار اُردو'' (اسلام آباد)، ''اُردو نامہ'' (کراچی)، ''اُردوئے معلیٰ (علی گڑھ)، ''اقبال ریویو'' (لاہور)، ''اورینٹل کالج میگزین'' (کالج)، ''برہان'' (دہلی)، ''ابلاغ'' (کلکتہ)، ''تحریر'' (نئی دہلی)، ''تہذیب الاخلاق'' (لکھنو)، ''جامعہ'' (نئی دہلی)، ''خدابخش لائبریری جرنل''، (پٹنہ)، ''دلگداز'' (لکھنو) ''راوی'' (لاہور)، ''زبان'' (منگرول)، ''زبان و ادب'' (پٹنہ)، ''زمانہ'' (کانپور)، ''زمیندار'' (لاہور)، ''ساقی'' (دہلی)، ''سب رس'' (حیدرآباد)، ''سب رس'' (کراچی)، ''سیارہ'' (لاہور)، ''صحیفہ'' (لاہور)، ''صدق'' (لکھنو)، علی گڑھ میگزین (علی گڑھ)، ''غالب نامہ'' (نئی دہلی)، ''فاران'' (کراچی)، ''فکر و نظر'' (اسلام آباد)، ''قومی زبان'' (کراچی)، ''کتاب'' (لاہور)، ''ماہ نو'' (کراچی)، ''مجلہ بدایوں'' (کراچی)، ''مخزن'' (لاہور)، ''معارف'' (اعظم گڑھ)، ''المعارف'' (لاہور)، ''معاصر'' (پٹنہ)، ''معیار'' (پٹنہ)، ''الناظر'' (لکھنو)، ''الندوہ'' (لکھنو)، ''نقوش'' (لاہور)، ''نگار'' (لکھنو)، ''نوائے وقت'' (بمبئی)، ''نیا دور'' (کراچی)، ''نیرنگ خیال'' (لاہور) ''الہلال'' (کلکتہ)، ''ہماری زبان'' (نئی دہلی)، ''ہمایوں'' (لاہور)، ''ہمدرد'' (دہلی)، ''ہندوستانی'' (الہ آباد) وغیرہ۔

اخبارات

رسالوں کی طرح، گو ان سے کم، بعض اوقات روزنامے بھی تحقیق کا معتبر ماخذ ثابت ہوتے ہیں۔ ان میں کسی ادیب کی وفات یا کسی اعزاز وغیرہ کے بارے میں جو خبر درج ہوتی ہے وہ چوں کہ حالیہ ہوتی ہے اس لیے عموماً صحیح ہوتی ہے۔ سنہ وفات کے لیے تو معاصر مگر مستند اخبار کا اندراج ایک پکا ثبوت ہے۔ اس موضوع پر پروفیسر محمد اسلم کی کتاب وفیات پاکستان مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد نے شائع کی ہے۔

اقبال دانائے راز میں عبداللطیف اعظمی لکھتے ہیں کہ اقبال نے اپنے دو خطوط میں اپنے سر کا خطاب پانے کی تاریخ جنوری 1922ء لکھی ہے۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے ''نقوش'' اقبال نمبر 1، میں حیات نامۂ اقبال میں اس کی تاریخ 1923ء لکھی ہے۔ اعظمی صاحب نے نہرو میوزیم میں سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور کی جنوری 1922 کی مائیکروفلم دیکھی۔ اس میں اقبال کا نام نہ تھا۔ لیکن جنوری 1923ء کے پرچے میں تھا۔ اس سے ثابت ہوا کہ اقبال کے خطوط کے علی الرغم خطاب 1923ء میں ملا تھا۔ چند ''اخبارات'' کے اشاریے شائع بھی ہوئے ہیں لیکن یہ بہت کم ہیں۔

ویب سائٹیں

کسی زبان، ادب، ادبی نظریے یا دیگر معلومات کا ایک بڑا ذریعہ اب www یعنی ویب سائٹ ہے۔ کمپیوٹر پر انٹرنیٹ کے ذریعے آپ ہر زبان پر بنیادی معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ اگر اس بارے میں براہ راست معلومات حاصل نہ ہوں تو کسی جاننے والے سے معلوم کریں۔ Google یا msn.com ایکی سائٹ ہے جس پر مطلوبہ لفظ ٹائپ کر کے ویب سائٹوں کے بارے میں معلوم کیا جا سکتا ہے۔ راقم کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کرنے والے ایک تحقیق کار ایک قدیم زبان کے حوالے پر آ کر رُک گئے تھے۔ معلوم ہوا کہ اس کے بارے میں کوئی کتاب نہیں ملی۔ وہ بھارت جا کر ہی کچھ لا سکتے ہیں اور فی الوقت ان کا جانا ممکن نہیں۔ تحقیق کی مدت انھوں نے صرف اس میں ضائع کر دی۔ آخر میں انھیں ویب سائٹوں سے چھ سات کتب پرنٹ کر دیں جو ان کے کام آ گئیں اور تحقیقی مدت میں انھوں نے توسیع کرا لی۔ اصولِ تحقیق کے موضوع پر بعض ویب سائٹوں کے پتے ''کتابیات'' میں دیے گئے ہیں۔

6- کتب خانے کا طریق کار

کتب خانہ یا لائبریری کا وجود عام طور پر نو آموز تحقیق کار کو پریشان کر دیتا ہے۔ اتنی بہت سی کتابوں اور مواد میں وہ اپنا مقصود کیسے تلاش کرے؟ یہ سوال اسے خوفزدہ کیے رکھتا ہے لیکن تحقیق کی راہیں انجانی ہوتی ہیں جن کو جاننے کے لیے جادۂ تحقیق کے ہر راہی کو لائبریری کی منزلیں بھی طے کرنا ہوتی ہیں۔ اس سلسلے میں تحقیق کار کو مختلف اقسام کی لائبریریوں سے واسطہ پڑتا ہے جن میں بچوں، سکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں، عوامی، پیشہ ورانہ، خصوصی اور قومی لائبریریاں زیادہ اہم ہوتی ہیں۔ بہر حال کتب خانہ کسی بھی قسم کا ہو، جب کسی تحقیقی کاوش کے سلسلے میں محقق ایک لائبریری میں داخل ہوتا ہے تو اسے سب سے پہلے کتب خانہ کے متعلق جاننا چاہیے کہ اس کا انتظام کس طرح سے کیا جاتا ہے:

1- آیا اس کتب خانے میں کتب کھلی الماریوں میں ہیں یا بند الماریوں میں؟

2- اس کتب خانے میں کتب نمبر کا کون سا طریقہ رائج ہے؟ آیا ڈیوی ڈیسی مل سسٹم (Dewey Decimal System) یا لائبریری آف کانگریس (Library) of Congress کا نظام یا کوئی اور ہے؟

کتب خانے سے استفادہ

مطلوبہ تحریری مواد یا کتاب کی تلاش کے لیے یا تو متعلقہ شیلف پر جا کر اسے تلاش کیا جاتا ہے یا کارڈ کیٹلاگ سے مدد لی جاتی ہے۔ کارڈ کیٹلاگ ہی سے کتاب کے بارے میں معلوم ہو جاتا ہے کہ مذکورہ کتاب تحقیق کے لیے کار آمد ہے یا نہیں۔ ہر کارڈ میں مندرجہ ذیل معلومات درج ہوتی ہیں:

1- کتاب نمبر

2- مصنف اور اس کا سن پیدائش

3- کتاب کا نام　　4- ایڈیشن
5- مقام اشاعت　　6- ناشر کا نام
7- تاریخ اشاعت　　8- صفحات
9- کتاب کا سائز　　10- کتاب کا سابقہ نام
11- دوسرے عنوانات جس کے تحت کتاب تلاش کی جا سکتی ہے
12- لائبریری آف کانگریس میں اندراج نمبر
13- کارڈ کا ناشر　　14- کارڈ کے خفیہ نمبر کی تاریخ
15- سسٹم کا اندراج نمبر　　16- کارڈ منگوانے کا خفیہ نمبر

ان سے مطلوبہ کتاب کے متعلق بنیادی معلومات فراہم ہو جاتی ہیں جیسا کہ درج ذیل خاکے سے ظاہر ہے۔

491،4390147	اُردو زبان، اصطلاحات (مطالعہ و تدریس)
ع 491 ا	اُردو اصطلاحات سازی
	ڈاکٹر عطش درانی (1952ء......)
	انجمن شرقیہ علمیہ، اسلام آباد
	طبع دوم، 1994ء
	650 ص ص+6 ص ص

کیٹلاگ میں کارڈ لغت کی طرز پر حروف تہجی کے لحاظ سے رکھے جاتے ہیں۔ عام طور پر کتاب کو ڈھونڈنے کے لیے اسے اس کے مصنف کے نام کے تحت یا کتاب کے نام یا اس کے موضوع کے تحت کیٹلاگ میں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ مغربی مصنفوں کے لیے کارڈوں میں مصنف کے نام پر مشتمل حصے میں مصنف کے نام کا آخری لفظ پہلے درج ہوتا ہے لیکن اُردو میں ہم اکثر اوقات نام کی ترتیب کو نہیں بدلتے۔ انجمن یا کسی ادارے کی مطبوعات میں ایڈیٹر کو مصنف کی جگہ پر رکھا جاتا ہے اور خطوط وحدانی میں (ایڈ) (Ed) لکھ دیا جاتا ہے لیکن حکومت یا انجمنوں کی دستاویزات کے لیے حکومت یا انجمن کو بطور مصنف کے پیش کیا جاتا ہے۔ کیٹلاگ کارڈ کے ذریعے سے کتاب نمبر معلوم کر کے متعلقہ شیلف پر سے کتاب تلاش کی جا سکتی ہے۔

ڈیوی ڈیسی مل سسٹم (D.D.S)

یہ اعشاری نظام بھی کہلاتا ہے۔ اس میں کتب کے لیے مختلف عنوانات کے تحت مختلف نمبر مخصوص کیے گئے ہیں جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

000　　عمومی موضوعات، جرائد اور انسائیکلوپیڈیا۔
100　　فلسفہ و نفسیات۔

200 مذہب۔
300 معاشرتی یا عمرانی علوم۔
400 لسانیات۔
500 (ٹھوس) خالص سائنس۔
600 اطلاقی علوم۔
700 آرٹ، تفریح۔
800 ادب۔
900 تاریخ۔

لائبریری آف کانگریس سسٹم

اس میں کتب کی تخصیص حروف تہجی کے لحاظ سے کی گئی ہے مثلاً:

A عام مطبوعات۔
B فلسفہ، مذہب۔
C تاریخ۔
D تاریخ عالم۔
E,F تاریخ امریکا۔
G تاریخ آدم، جغرافیہ۔
H عمرانی علوم۔
J سیاسیات۔
K قانون۔
L تعلیم۔
M موسیقی۔
N فنون عملی۔
P زبان، ادب۔
Q سائنس۔
R ادویات۔
S زراعت۔
T ٹیکنالوجی۔
U ملٹری سائنس۔
V بحری فوج کا علم۔

Z　　　　علم لائبریری، کتابیات۔

اس نظام میں آئی، او، ڈبلیو، ایکس، وائی حروف کو مستقبل کے استعمال کے لیے خالی چھوڑا گیا ہے۔

چنانچہ اس نظام کو سمجھ کر کتب خانے میں سے اپنی ضرورت کی کتاب تلاش کی جا سکتی ہے۔ اس سلسلے میں مختلف ناشرین کی طرف سے شائع شدہ فہرست سے بھی کتاب تلاش کرنے میں مدد لی جا سکتی ہے۔ بعض اوقات تو صرف زبان وادب اور دیگر حوالوں پر علیحدہ کتب کی فہرست ترتیب دی گئی ہوتی ہے۔ ایسی فہرستیں لائبریرین سے طلب کی جا سکتی ہیں۔

رسائل وجرائد

بعض کتب خانوں میں تازہ رسائل واخبارات کے لیے جگہ مخصوص ہوتی ہے۔ پیشہ ورانہ رسائل کے ذریعے ایک عنوان کا مطالعہ مختلف آراء کی شکل میں کیا جا سکتا ہے۔ ان مختلف نظریات وآراء سے تحقیق کار کو صحیح فیصلہ کرنے کا موقع ملتا ہے۔ اب رسائل بھی اتنی تعداد میں شائع ہونے شروع ہو گئے ہیں کہ کسی خاص موضوع پر تمام رسائل کی چھان بین سے وقت کا بڑا ضیاع ہوتا ہے۔ چنانچہ ان پرانے رسائل سے استفادہ کے لیے مختلف اشاریوں پر مشتمل رسائل کا اجراء ہو چکا ہے۔ اگرچہ پاکستانی زبانوں میں ایسے بہت کم اشاریے ملتے ہیں لیکن جو ہیں، ان سے تحقیق کار کو بہت مدد ملتی ہے اور وقت کی بھی بچت ہوتی ہے۔ پرانے رسائل کو علیحدہ شیلف میں رکھا جاتا ہے اور ان کے اشاریے حوالے کی کتب میں رکھے جاتے ہیں۔ باقاعدہ شائع ہونے والے دیگر جرائد اور حوالے کی کتب میں المانکس، سوالنامے، ڈائریکٹری اور ہینڈ بک وغیرہ شامل ہیں۔ ادبی رسائل عموماً کتب خانوں میں یک جا نہیں ملتے۔ اس کے لیے اہلِ علم سے مدد حاصل کی جا سکتی ہے کہ کوئی خاص شمارہ کہاں سے مل سکتا ہے۔

سوانح عمری

جب کسی شخص کے متعلق معلومات کی ضرورت ہوتی ہے تو تحقیق کار حضرات اس کی سوانح عمری کو قابلِ اعتماد ذریعہ معلومات سمجھتے ہیں کیوں کہ اس میں اس شخص کے متعلق تمام معلومات با اعتماد ذرائع سے حاصل کی گئی ہوتی ہیں۔ ایسی معلومات زیادہ تر انسائیکلوپیڈیا میں بھی ہوتی ہیں اور شخصیات کی ڈائریکٹریوں میں بھی ملتی ہیں۔ علاوہ ازیں انفرادی کتابچے اور پمفلٹ بھی ہوتے ہیں۔

کتابیات

کسی خاص موضوع پر مختلف مضامین یا کتب کے مطالعے کے لیے شائع شدہ کتابیات کے کتابچے سے مدد لی جاتی ہے۔ تحقیق کار کو کتابیات کے مطالعے سے وقت اور محنت کی بہت بچت ہوتی ہے کیوں کہ اس حوالہ جاتی کتابچے میں ایک موضوع کے تحت مختلف حوالوں کا اندراج ہوتا ہے۔ مختلف پیشے اور موضوعات حروفِ تہجی کے اعتبار سے تحریر کیے جاتے ہیں اور موضوعات کے تحت مضامین یا کتب کا اندراج بھی حروفِ تہجی کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ اس موضوع پر کتب کی اشاعت کا رواج ہمارے ہاں اتنا زیادہ نہیں ہے لیکن بعض

سرکاری ادارے ان کی اشاعت میں حصہ لیتے ہیں۔ نیشنل بک کونسل / فاؤنڈیشن، مقتدرہ قومی زبان، اکادمی ادبیات اور نیشنل لائبریری اسلام آباد سے ایسی کتابیات شائع ہوتی رہی ہیں۔ کتابیات پر تفصیلات الگ سے دی گئی ہیں۔

تحقیقی مقالات

ایسے تعلیمی اداروں میں جہاں پر تحقیق کا اہتمام ہوتا ہے اساتذہ و طلبہ کے تحقیقی مقالات موجود ہوتے ہیں۔ ان تحقیقی مقالات سے مکمل استفادہ کیا جاتا ہے اور مختلف حوالوں کے لیے ان کا مطالعہ بہت ہی اہم ہوتا ہے۔ ان تحقیقی مقالات کی ایک فہرست تیار ہوتی ہے جس میں مقالے کا نمبر، مصنف اور مقالے کا عنوان درج ہوتا ہے۔ ایسی فہرست لائبریرین سے طلب کی جا سکتی ہے۔ تحقیقی طریق کار کو سمجھنے اور مختلف موضوعات پر تحقیق کرنے کے لیے ان تحقیقی مقالات سے رہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے۔

مائیکروفلم

ایک اچھے اور بڑے کتب خانے میں مائیکروفلم سروس کا اہتمام بھی ہوتا ہے۔ اس کے لیے کتاب خانے میں کسی مناسب جگہ پر پروجیکٹر موجود ہوتا ہے جس میں پرانے رسائل کے مضامین پر مشتمل چھوٹی چھوٹی فلموں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ چوں کہ پرانے رسائل کی حفاظت کرنا مشکل ہوتا ہے، اس لیے ترقی یافتہ ممالک میں ان رسائل کو فلم میں محفوظ کیا جانے لگا ہے۔ کتب خانے میں ان فلموں کے لیے ایک علیحدہ کارڈ کیٹلاگ ہوتا ہے۔ اس کارڈ کیٹلاگ کی مدد سے مطلوبہ فلم استعمال کی جا سکتی ہے۔ عموماً پنجاب یا نیشنل آرکائیوز یا قومی مرکز دستاویزات (NDC) اسلام آباد میں ایسے خاصے ذخائر موجود ہیں۔

مخصوص شیلف

بعض کتب خانوں میں ایسی کتابوں اور رسائل کے لیے ایک خاص شیلف بنا ہوتا ہے جو بہت کم تعداد میں کتب خانے میں ہوتے ہیں یا ان کی ضرورت بہت زیادہ رہتی ہے۔ یہ کتب لائبریرین سے مانگنے پر کچھ وقت کے لیے جاری کی جاتی ہیں۔ بصورت دیگر ایک شخص اگر ان کتب کو جاری کروا لے تو کافی عرصہ کے بعد واپس کرے گا۔ جس سے بہت سے افراد اس کے بروقت مطالعہ سے محروم ہو جائیں گے چنانچہ ان کتب اور رسائل کو لائبریرین کے پاس خاص شیلفوں میں رکھا جاتا ہے۔ عموماً حوالہ جاتی کتب کے خاص شیلف علیحدہ بنا دیے جاتے ہیں۔

مائیکروفش (Microfiche)

کتب خانوں کی خدمات میں مائیکروفش (Microfiche) کا اضافہ ایک نہایت اہم اقدام ہے۔ اس سے کم لاگت اور آسانی سے علمی کام کو دوسروں تک پہنچایا جا سکتا ہے۔ قومی مرکز دستاویزات (NDC) اسلام آباد اور دستاویزاتِ پنجاب، لاہور میں ایسی سہولت موجود ہے۔

آن لائن (On-line)

کمپیوٹر، سی ڈی، ویب سائٹ، انٹرنیٹ وغیرہ کے ذریعے بھی کتب خانوں میں معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔ اس کے لیے کمپیوٹر کا استعمال آنا چاہیے۔ بعض کتب خانوں میں سی ڈی کا ذخیرہ بھی موجود ہوتا ہے۔ اس لیے اب کتب خانوں کو اُردو میں بھی "لائبریری" ہی کہتے ہیں۔

لائبریرین سے امداد

تحقیق کے دوران میں متذکرہ بالا ذرائع سے مکمل استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ اس کے باوجود اگر مواد کی تلاش میں وقت پیش آئے تو لائبریرین سے بھی مدد لی جاسکتی ہے۔ کیوں کہ متعلقہ مواد کی تلاش میں رہنمائی کرنا لائبریرین کا اہم ترین فرض ہے۔ جو کتب اپنی لائبریری میں موجود نہ ہوں، لائبریرین کچھ عرصے کے لیے کسی دوسرے ادارے کی لائبریری سے عاریتاً منگوا کر بھی مہیا کرسکتا ہے۔ کئی لائبریرین خود بھی بڑے محقق اور کتابیات ساز ہوتے ہیں۔ اگر خوش قسمتی سے ایسا کوئی لائبریرین مل جائے تو کافی مدد حاصل ہوجاتی ہے۔

لائبریری کا عمومی استعمال

لائبریری میں کام کرنے کے لیے تحقیق کے طالب علم کو چاہیے کہ اپنے پاس قلم اور "3"x6 یا "3"x4 سائز کے کارڈ رکھے۔ کسی بھی کتاب سے حوالے لینے کے لیے یہ کارڈ استعمال کیے جاسکتے ہیں۔ کارڈ کے اوپری حصے کو بالکل اسی طرح استعمال کیا جاسکتا ہے جیسے کہ لائبریری کا کیٹلاگ کارڈ یعنی مصنف کا نام، کتب کا نام اور لائبریری کا کارڈ مع لائبریری کا نام اور باقی کارڈ پر حوالہ جات مع صفحہ درج کیے جاتے ہیں۔ اگر مصنف کے اصل الفاظ استعمال کرنا ہوں تو انھیں بالکل اسی طرح لکھنا چاہیے جس طرح وہ کتاب میں لکھے گئے ہیں اور سطور کے شروع میں اور آخر میں نشان " " جنھیں واوین (Quotation Marks) کہا جاتا ہے دیئے جائیں۔ اگر اصل الفاظ استعمال نہیں کیے تو واوین کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ کارڈ مقالہ لکھنے اور کتاب نامہ یا کتابیات (Bibliography) بنانے میں بھی کام آتے ہیں۔ ایسا کوئی کارڈ کتابیات یا کتاب نامے (Bibliography) میں شامل نہیں کرنا چاہیے جس کا حوالہ مقالے میں نہیں دیا گیا۔ کتاب نامہ یا کتابیات بناتے وقت کتاب کے عنوان کے نیچے خط کھینچ دیتے ہیں۔ اگر حوالے میں سطور کی تعداد تین یا چار ہو تو مقالہ لکھتے وقت سیدھے تسلسل کے ساتھ ہی ٹائپ کردی جائیں۔ البتہ ان کے شروع اور آخر میں اقتباس کا نشان واوین " " کی صورت میں ضرور دینا چاہیے۔

7- حصولِ مواد کے طریقے

مواد کے حصول کے لیے ڈاکٹر گیان چند نے مفید مشورے دیے ہیں۔ اگر اپنی ذاتی لائبریری ہے تو سب سے پہلے اس سے شروع کریں۔ اگر آپ استاد ہیں تو اپنی درس گاہ کی لائبریری کو بھی اپنی لائبریری کی طرح کھنگالیں۔ اس کے بعد اپنے شہر کے اکثر کتب خانوں کو ایک ایک کرکے اپنا مقام تحقیق بنائیں۔ ظاہر ہے کہ کوئی

تحقیق شروع کرنے سے پہلے اس موضوع پر اب تک کی تحقیق اور اب تک کے معلوم مواد کو دیکھ لینا ضروری ہے۔اس لیے لائبریری میں کارڈ فائل دیکھیں۔اگر رجسٹر ہے تو اسے دیکھیں اور جو کتابیں آپ کے موضوع سے متعلق ہیں اُن کے نمبر لکھ لیں۔ان کے آس پاس کی کتابوں کو دیکھیں کیوں کہ وہ بھی مماثل موضوع ہی کی ہوں گی۔پہلے دستیاب مواد کی فہرست بنالیں۔اس سے جان پہچان کرلیں، پڑھنا قدرے توقف سے شروع کریں۔

اپنی مرکزی لائبریری اور شہر کی دوسری لائبریریوں میں رسالوں کو دیکھیں۔جن رسالوں کے اشاریے دستیاب ہوں (اور وہ کم سے کم ہیں) ان کے اشاریے دیکھیں۔نہ ہوں تو رسالوں کی ورق گردانی کریں اور اپنے موضوع سے متعلق تمام رسالوں کے مضامین کی فہرست بنالیں جس میں رسالے کا نام سنہ اور مہینہ، کیٹلاگ نمبر، مضمون نگار اور مضمون کا عنوان درج ہو۔اسی طرح تحقیقی وتنقیدی مضامین کے مجموعوں سے اپنے مفید مطلب مضامین کی فہرست بنالیں۔کتابوں اور مضامین کی یہ فہرست آپ کی اولین عارضی کتابیات ہوگی۔اس کے بعد ایک ایک کتاب اور مضمون کو پڑھنا اور نوٹ لینا شروع کریں۔

ڈاکٹر گیان چند کے نزدیک اپنے موضوع سے متعلق سب سے اچھی کتاب کو دیکھیں یعنی ایسی کتاب کو جس میں سب سے زیادہ مواد متوقع ہے۔پرانی کتاب پر نئی کتاب کو ترجیح دیں کیوں کہ نئی کتاب میں پیشتر کتاب کی تحقیق بھی شامل کرلی گئی ہوگی۔اس کے بعد کم اہم کتابیں دیکھ لی جائیں۔جس طرح اُلجھی ہوئی ڈور کی لڑی کی ایک گرہ کے بعد دوسری گرہ کھلتی جاتی ہے۔اسی طرح ہر کتاب کے حوالوں اور کتابیات سے مزید ماخذوں کی نشان دہی ہوتی جائے گی، دوسری کتابوں اور رسالوں کی کڑی سے کڑی مل جائے گی"۔تحقیقی عمل میں کتاب کم اور رسالے، تحقیقی مقالات زیادہ اہم ہوتے ہیں۔

ہر موضوع سے متعلق مواد تلاش کریں، کیوں کہ بعض موضوعات کا مواد پرانے رسالوں اور غیر متوقع یا ذاتی کتب خانوں میں مدفون ہے، وہاں تک پہنچنا ہے اور مطلوبہ مواد حاصل کرنا ہے۔دیگر اہل علم کے ساتھ مختلف لائبریریوں کے بارے میں گفتگو کرتے رہا کریں۔ان تک رسائی کی کوشش کریں اور مواد حاصل کریں۔

اُردو میں حوالہ جاتی مواد کا بہت فقدان ہے۔کتب خانوں کی فہرستیں اور رسالوں کے اشاریوں ہی پر کیا موقوف، کتابوں کی کوئی جامع ڈائریکٹری تک نہیں ہے۔ہمیں اپنے دور میں شائع شدہ کسی کتاب کا سنہ اشاعت جاننا ہو تو ذہن میں اس کے چار پانچ سال ادھر اُدھر یاد تو ہوگا لیکن صحیح سنہ یاد نہ ہوگا۔اگر ہمارے پاس کی لائبریری میں وہ کتاب نہ ہو تو کہاں سے تلاش کریں یا لائبریری میں کتاب کا بعد کا ایڈیشن ہو تو اشاعت اول کی دریافت کیوں کر کریں۔اس لیے غیر رسمی طریقوں سے مواد حاصل کرنا پڑتا ہے۔اس کام کو رسمی بنانا اور مستحکم کرنا ہے۔

پندرھواں باب

کاغذی آلاتِ تحقیق

تحقیقی عمل انجام دینے کے لیے تکنیکی پہلوؤں سے چند آلات کی ضرورت درپیش ہوتی ہے۔ یہاں آلاتِ تحقیق سے ہماری مراد تکنیکی نہیں کاغذی آلات سے ہے یعنی کاغذی پرچیاں (Notes)، انٹرویو کے لیے سوالات، انٹرویو کی دستاویز وغیرہ۔ ہر ایک کی اپنی خاصیتیں اور اپنا طریقِ کار ہے جو ذیل میں درج کیا جا رہا ہے۔

1- نوٹ لینا (Notes Taking)

کسی ماخذ، کتاب یا مضمون سے ضروری مواد لینے کے لیے ہمیں نوٹ (Notes) لینے، لکھنے یا تیار کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ پرچیوں پر نوٹ لینے کے لیے اگر کوئی باقاعدہ اور منظم طریقہ اختیار کیا جائے تو یہ بہتر ہوگا۔ بصورتِ دیگر صرف پڑھنے اور بعد میں نوٹ لینے یا پڑھنے کے ساتھ ساتھ نوٹ لینے سے بعض دفعہ مشکل پیش آتی ہے۔ مطالعے کے لیے یکسوئی کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ متعلقہ معلومات حاصل کرنے کے لیے مذکورہ ماخذ کو سمجھا جا سکے۔ ضروری ہے کہ پہلے ایک بار ماخذ کو دیکھ لیا جائے اور دوسری بار نوٹ لیے جائیں۔ پہلی بار انتقادی مقامات پر مطلوبہ مواد کے نیچے اگر لکیر لگا دی جائے تو دوسری بار مطالعہ کرنے سے وہ تحریری مواد نوٹ کیا جا سکتا ہے لیکن اس سے لائبریری یا دوسرے اداروں کی کتابیں ناقابلِ استعمال ہو جائیں گی۔ چنانچہ اس کے لیے ضروری ہے کہ کاغذ کی چھوٹی چھوٹی پرچیاں مطلوبہ صفحات کے درمیان رکھ دی جائیں اور ان کے اوپر اشارے درج ہوں تاکہ مواد کو تحریر کرنے سے پہلے کاغذ کے ان ٹکڑوں سے مدد لی جائے۔

نوٹ تیار کرنے سے مراد مواد کو ایسی صورت میں درج کرنا ہے جسے بآسانی یاد (Recall) اور مستقبل میں استعمال کیا جا سکے۔ چنانچہ تقاریر، بحث و مباحثہ، ذاتی تنہائی میں سوچ اور مطالعاتی حوالوں کے نوٹ بھی تیار کیے جاتے ہیں لیکن تحقیقی مقالوں میں مطالعاتی نوٹ زیادہ اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ اگر نوٹ لینے میں احتیاط اور باقاعدگی کو ملحوظ نہ رکھا جائے تو بہت سی پڑھی ہوئی چیزیں جلد بھول جاتی ہیں۔

مطالعاتی حوالوں کے متعلق نوٹ (Reading Reference Notes) کی جماعت بندی چار گروہوں میں کی گئی ہے:

1- اقتباس (Quotation): یعنی کسی مصنف کے الفاظ کی ہو بہو نقل جس کو داوین (Quotation)

(Marks) میں درج کیا جاتا ہے۔اس میں ضروری ہے کہ ہر بیان کو صحت کے ساتھ نقل کیا جائے اور حوالے کا صفحہ بھی درج کیا جائے تا کہ رپورٹ میں اقتباس کا صحیح حوالہ دیا جاسکے۔اقتباس کے بارے میں تفصیل پہلے سے درج کی جاچکی ہے۔

2- تشریح (Paraphrase): محقق مصنف کے خیالات کو اپنے الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

3- خلاصہ (Summary): محقق اختصار کے ساتھ مضمون کے اندراجات کو بیان کرتا ہے۔کبھی مصنف کے اور کبھی اپنے الفاظ میں۔

4- جائزہ (Evaluation): محقق اپنے ردعمل کا اظہار بھی کرتا ہے کہ آیا وہ مصنف کے ساتھ اتفاق کرتا ہے یا اختلاف یا پھر وہ مصنف کی رائے میں تشریح کرتا ہے اور تحریر کی قدر و قیمت کا تعین بھی کرتا ہے۔

اندراجات

ایک پرچی پر مندرجہ بالا چار میں سے کئی چیزوں کو بیک وقت بھی درج کیا جاسکتا ہے۔پہلے یہ طے کرلیں کہ نوٹ کس پر لیے جائیں۔انگریزی کی کتابوں میں بالعموم ہدایت ہوتی ہے کہ کارڈوں پر لیے جائیں۔یہ تین سائز کے ہوسکتے ہیں 3x5۔6x4 اور 8x5 انچ۔پارسنس کہتا ہے کہ سب سے بڑے سائز کا کارڈ نہ لو تا کہ ایک کارڈ پر زیادہ مواد نہ لکھنا پڑے۔بارزن کہتا ہے کہ بعض محقق کارڈ پسند کرتے ہیں بعض منتشر اوراق یا پرچیاں، بعض مجلد نوٹ بک۔اس کی ترجیح کارڈ کی ہے۔کہا جاتا ہے کہ نوٹ ایسے کاغذ پر لینے چاہئیں جو پائیدار ہو۔اب کارڈ سے زیادہ پائیدار کون سا کاغذ ہوگا لیکن رچرڈ ڈیلٹک نے بجا طور پر کہا ہے کہ کارڈ کی بجائے اچھا، موٹا، بانڈ پیپر بہتر ہوتا ہے کہ کم جگہ لیتا ہے۔کارڈوں پر چھلے والی فائل کو ترجیح ہے۔اس فائل میں چھید کیے ہوئے اوراق ہوتے ہیں۔ڈاکٹر عبدالستار دلوی کہتے ہیں کہ حوالے جمع کرنے کے لیے مجلد کاپیاں یا رجسٹر مفید نہیں ہوتے، انھیں کھلے کاغذ کے پرزوں یا کارڈوں ہی پر لکھنا چاہیے۔بعض لوگ کارڈوں کو سنبھالنا مشکل کام سمجھتے ہیں اور نوٹ بک ہی میں درج کرتے رہتے ہیں۔

ڈاکٹر گیان چند کے نزدیک کاغذ کے پرزے یا پرچیاں بہتر ہیں لیکن یہ کاغذ موٹا اور عمدہ ہونا چاہیے تا کہ یہ نوٹ کئی سال محفوظ رہ سکیں۔ہزاروں کارڈوں کے لیے سینکڑوں روپے درکار ہوں گے۔

کارڈ کی دوسری خرابی یہ ہے کہ انھیں کسی فائل میں نہیں رکھا جاسکتا۔لائبریری کی کتابوں کے کارڈوں کو بھول جائیں کہ انھیں تار میں پرو کر لمبی ٹرے (Tray) میں پھنسا دیا جاتا ہے۔نوٹ کے کارڈ زیادہ کھلے ہونے چاہئیں۔انھیں رکھنے کے لیے ایک ڈبا درکار ہوتا ہے۔گھر سے لائبریری اور شعبے میں جاتے ہوئے کہاں جوتوں کا سا ڈبا اٹھائے پھریں گے۔کوئی ڈبے سمیت لائبریری میں گھسنے بھی نہ دے گا۔

تیسری قباحت یہ ہے کہ بہت سے کاغذوں کے بنڈل میں انگلیاں کاغذوں کے سرے پلٹ کر یا سرکا کر اپنی ضرورت کا پرزہ تیزی اور آسانی سے نکال سکتی ہیں لیکن ان کارڈوں کو سرکانے میں ہر کارڈ کو پوری طرح سے سرکانا یا پلٹنا پڑے گا اور کافی زیادہ وقت اور محنت درکار ہوگی۔اگر کمپیوٹر پر کام کریں تو زیادہ آسانی ہو

گی۔اب تو جگہ جگہ کمپیوٹر خدمات موجود ہیں۔ایک USB درکار ہے،اس میں ذخیرہ کریں اور اپنے کمپیوٹر پر مائع متن (Fluid Text) کے طور پر محفوظ کریں،انھیں پلٹیں،اشاریہ بندی کریں،ابواب میں درج کریں۔ بہت آسانی ہو جاتی ہے۔

نوٹ لینے کا پرانا طریقہ جو ہمارے ہاں اب بھی رائج ہے یہ ہے کہ ایک فائل یا نوٹ بک میں صفحوں پر مسلسل ایک کتاب کے نوٹ درج کر دیے جاتے ہیں،اس کے آگے دوسری کتاب کے۔علیٰ ہذا القیاس۔یہ طریقہ نہایت پریشان کن ہے۔بہت ہی ماہر اور مشاق محقق ایسا کر سکتا ہے۔مبتدی تحقیق کار کو ایسا نہیں کرنا چاہیے۔اچھے کاغذ کی پرچیاں بنائی جائیں۔فل سکیپ کاغذ کو لمبائی میں موڑ کر تین حصوں میں تقسیم کر لیا جائے یا لمبائی چوڑائی دونوں میں موڑ کر چار پرچیاں بنالی جائیں اور ان پر نوٹ لکھے جائیں۔نوٹ لینے کے لیے مندرجہ ذیل امور ملحوظ رکھیں:

-1 نوٹ لکھنے سے قبل حوالہ جاتی مواد کو ایک نظر پڑھیں۔اس سے اس امر کا فیصلہ آسان ہو جائے گا کہ استعمال کے لیے کون سے مواد کا نوٹ تیار کرنا ہے۔نہایت ہی اہم مواد کے انتخاب کے لیے صلاحیت پیدا کرنی پڑتی ہے۔

-2 "4"x6 سائز کے انڈکس کارڈ کا کاغذ تیار کرنے چاہئیں کیوں کہ ان کو آسانی سے مختلف عنوانات کے تحت رکھا جا سکتا ہے اور ان پر زیادہ اندراجات بھی کیے جا سکتے ہیں۔

-3 ہر کارڈ یا کاغذ کو ایک واضح عنوان کے تحت رکھیں اور کارڈ پر شروع میں عنوان درج کریں۔کارڈ یا کاغذ کے آخر میں مکمل کتابیاتی حوالہ (Bibliographic Citation) درج کریں۔اگر کتاب کا حوالہ ہے تو کال نمبر اور لائبریری کا اندراج بھی کریں۔

-4 ایک کارڈ یا کاغذ پر صرف ایک عنوان درج کریں۔اس سے ان میں تنظیم لچکدار (Flexible) ہو جاتی ہے۔اگر اندراجات زیادہ ہوں تو ایک سے زیادہ کارڈ استعمال کریں اور ان پر نمبر شمار دیں اور ان کارڈوں یا کاغذوں کو ایک ربڑ بینڈ کے ساتھ اکٹھا رکھیں یا لفافے میں ڈال لیں۔

-5 اس بات کا اطمینان کر لیں کہ نوٹ مکمل اور قابلِ فہم ہے۔

-6 خلاصے اور مصنف کی اصلی عبارت کے درمیان فرق کو ملحوظ رکھیں۔مصنف کے بیان اور تنقیدی بیان کے درمیان جو فرق ہے۔اسے ہمیشہ ذہن میں رکھنا چاہیے۔ان کو ہمیشہ الگ رکھیں۔

-7 تیار کردہ نوٹ دوبارہ نقل کرنے کی کوشش نہ کریں،ایسا کرنے سے غلطی اور الجھاؤ (Confusion) کا خطرہ ہوتا ہے۔اس لیے پہلی بار ہی نوٹ لیتے ہوئے احتیاط

سے کام لینا چاہیے۔

8- خالی نوٹ کارڈ یا کاغذ ہر وقت اپنے ساتھ رکھیں تا کہ چلتے پھرتے سوچتے کچھ خیالات کو نوٹ کیا جا سکے۔ اسی طرح کوئی لیکچر یا مباحثہ سنتے وقت نوٹ لیے جا سکتے ہیں۔

9- اپنے نوٹ گم ہونے سے بچائیں۔ جوں ہی نوٹ تیار ہو جائے اسے حفاظت سے رکھ لیں۔ اگر اپنے ساتھ رکھنے کی ضرورت ہو تو فولڈر، فائل یا لفافے میں محفوظ کر کے رکھیں اور فائل یا لفافے پر آپ کا نام اور پتہ درج ہونا چاہیے۔

10- اپنے نوٹوں کی ایک مستقل فائل بنائیں۔ یہ فائل آپ کے دوسرے کورسوں میں بھی کام آسکتی ہے۔ اسی طرح ان کو دوسری رپورٹوں کے لیے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔

11- مائیکروفش پرنٹر اور فوٹوسٹیٹ کی سہولیات اگر موجود نہ ہوں تو کتاب کے متعلقہ صفحات کی فوٹو کاپیاں حاصل کر کے فارغ وقت میں آسانی اور اطمینان سے گھر یا ہاسٹل میں نوٹ تیار کیے جا سکتے ہیں یا کمپیوٹر پر درج کیے جا سکتے ہیں۔

نوٹ پر تبصرے

ہر نوٹ کے ساتھ اپنا تبصرہ بھی درج کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ کارڈ یا پرچی کے اسی طرف ہو گا دوسری طرف نہیں۔ دراصل نوٹ لینا اپنے لیے ہوتا ہے۔ یہ نوٹ آپ کی ملکیت ہیں جس طرح آپ کو سہولت ہو آپ کر سکتے ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند کی رائے یہ ہے کہ اردو میں ایک ایک کتاب کے نام کے اندراج کے لیے الگ سے ماخذی کارڈ/کاغذ بنانے کی ضرورت نہیں۔ ہم الگ سے ایک دو صفحات پر تمام کتابوں اور مضامین کی تفصیل یعنی ناشر کا نام، سنہ اشاعت، شمارہ، لائبریری نمبر وغیرہ لکھ سکتے ہیں۔ اس کے بعد پرزوں پر نوٹ لیتے وقت عنوان میں ماخذ کا مختصر نام یا اشارہ مثلاً محض مصنف کا نام لکھنا کافی ہو گا۔

پارسنس کی تجویز ہے کہ اگر کوئی تحریر گم نام مصنف کی ہے یا کسی فرضی قلمی نام سے ہے اور آپ کو اصل مصنف کا علم ہے تو قلمی نام کے آگے مربع یعنی بڑے بریکٹ میں اصل نام لکھ سکتے ہیں مثلاً ''اردوئے معلیٰ'' میں حسرت موہانی اقبال کے کلام پر ''تنقید ہمدرد'' کے نام سے اعتراض کرتے تھے۔ ''نگار'' میں کوئی ''نرگس'' کے نام سے تھا۔ مشفق خواجہ ''خامہ بگوش'' کے نام سے کالم لکھتے رہے۔ احمد ندیم قاسمی ''امروز'' اخبار میں ''عنقا'' کے نام سے لکھتے تھے۔ ڈاکٹر وحید قریشی ''میر جملہ لاہوری'' کے نام سے کالم لکھتے رہے۔ ہم اسے پہلے حوالے کے نوٹ میں لکھ سکتے ہیں۔

گروہ بندی

تحریر کردہ نوٹ ہمیشہ گروہوں کی صورت میں جمع کرنے چاہئیں۔ ایلٹک اور فیسٹر کہتے ہیں کہ انھوں نے ایک زیر تصنیف کتاب کے موضوعات کو اول 15 گروہوں میں تقسیم کیا اور نمبر دیے۔ پھر ان گروہوں کو ذیلی گروہوں میں اور پھر ذیلی گروہوں کو ذیلی ذیلی گروہوں میں تقسیم کیا۔ ان سب کو نمبر دیے مثلاً 12-3-6-2 سے معلوم ہوتا ہے کہ 12 بڑے گروہ کا نمبر ہے، 3 اس کا ذیلی گروہ ہے، 6 ذیلی گروہ۔ آخری

2 غالباً مزید نوع کا نشان اگر نہیں تو ذیلی گروہ نمبر 6 کے پرزوں کا نمبر شمار ہوگا۔

ان کے بعد گروہوں کو سلسلے وار مرتب کیا جاتا ہے۔ اُردو میں اتنی زیادہ باریکی کی ضرورت نہیں۔ پہلے کام کا خاکہ تیار ہوگا۔ اس کے ابواب ہی بڑے گروہ ہیں۔ پھر ہر باب میں دو تین یا زیادہ ذیلی گروہ بنائے جائیں۔ فرض کریں اگر مقالے میں دس باب ہیں اور ہر باب میں چار ذیلی گروہ ہیں تو تقریباً 40 گروہ ہوئے۔ نوٹ کے ہر پرزے کے اوپر گروہ نمبر مثلاً 3.2 یا 3 ب یا بہتر ہے کہ انگریزی میں 3.2 یا 3B لکھ لیں۔ شناخت کی سہولت کے لیے لفظوں میں اس کا عنوان بھی لکھ لیں۔

1-1 مواد، قسمیں 1-2 مواد، خاکہ 1-3 مواد، کتب 1-4 مواد، رسالے

ذیلی گروہ کے لفظی عنوان سے اسے شناخت کرنے میں آسانی ہوگی۔ یہ ضروری ہے کہ جس ماخذ سے نوٹ لیا جائے اس کی نشان دہی ضرور کر دی جائے۔ ہر پرزے پر ماخذ کی مکمل تفصیل لکھنے کی ضرورت نہیں۔ علیحدہ کتابیات کی فہرست میں کتاب کی جملہ تفصیلات دی ہوئی ہوں گی۔ نوٹ کے پرزے پر کتاب کی مختصر نشان دہی کافی ہے جو مصنف کے نام یا کتاب کے نام ایک جزو سے ہو سکتی ہے۔ انگریزی میں ہدایت ہے کہ ایک خیال (بالعموم ایک دو جملوں کا) ایک ہی کارڈ پر لکھیں۔ نیا خیال نئے کارڈ/کاغذ پر ہو۔ ہمیں اس فضول خرچی کی ضرورت نہیں۔ باب اور اس کا ذیلی گروہ کافی ہیں۔ راتھ لکھتی ہے کہ دو ہزار لفظوں (تقریباً سات صفحے) کے مقالے کے لیے اکثر لوگوں کو 50 کارڈ کافی ہوں گے لیکن کسی دوسرے کو ڈیڑھ سو دو سو۔ نوٹ کی کیفیت اہم ہے، کمیت نہیں۔

ہر نوٹ سے قبل صفحے کا نمبر لکھیں مثلاً ص:20 یا محض 20۔ اس کے آگے ضروری مواد لکھیں۔ جب صفحہ بدل جائے تو ترچھی لکیریں دے کر نئے صفحے کا نمبر لکھ دیں اور اس کے بعد آگے کا مواد۔ ہو سکتا ہے کہ ایک کتاب سے کئی پرچیوں پر نوٹ لیے جائیں اور دوسری کتاب میں مفید مطلب مواد اتنا کم ہو کہ آدھے یا چوتھائی پرچیاں ہی پر ختم ہو جائیں۔ اگلی کتاب یا مضمون کے نوٹ نئی سطر میں لکھیں۔ اگر پرزے میں تھوڑا حصہ ہی بچا ہو تو اسے چھوڑ کر نئے ماخذ کے نوٹ دوسرے پرزے پر لکھ سکتے ہیں۔

مسلسل پڑھتے اور مسلسل نوٹ قلم بند کرتے جائیں اور ان کا کوئی گروہ نہ بنائیں۔ دوسری طرف مختلف پرچوں پر چالیس پچاس گروہوں میں نوٹ لینے میں یہ زحمت ہوتی ہے کہ ماخذ سے نوٹ کے دو جملے ایک پرچے پر اور دوسرے دو تین جملے دوسرے پرچے پر لکھنے ہوتے ہیں۔ لیکن یہ زحمت، یہ آہستہ روی اس لائق ہے کہ اسے برداشت کیا جائے۔ تمام مآخذ کے جملہ نوٹ ایک سلسلے میں لکھے ہوں تو ایک انبار جمع ہو جائے گا۔ بڑے تحقیقی کام میں دو چار ہزار صفحوں کے نوٹ جمع ہو جائیں گے۔ جب مقالے کی تسوید کرنے بیٹھیں گے تو کسی باب، نیز اس کے ذیلی جزو سے متعلق نوٹ کاپی یا فائل میں جگہ جگہ بکھرے ہوں گے۔ انھیں کس طرح ڈھونڈ کر نظر کے سامنے لائیں گے؟ کیا بار بار نوٹوں کے اوراق الٹتے پلٹتے رہیں گے؟ اگر گروہوں اور ذیلی گروہوں کے نوٹ الگ الگ پرچوں پر لکھے ہیں تو انھیں اپنی مطلوبہ ترتیب سے لگا لیں۔ ایسا معلوم ہوگا جیسے آپ کا مقالہ تیار ہو گیا۔

اگر ابواب کے ذیلی گروہوں کے نوٹ الگ الگ کاغذوں پر لکھنا بہت وقت طلب معلوم ہو تو کم سے کم اتنا کریں کہ مختلف ابواب کے نوٹ الگ پرچوں پر لکھیں اور پرچوں پر باب کے عنوان کے نیچے سلسلے کا نمبر شمار لکھتے جائیں اور انھیں الگ فائل یا لفافے میں رکھیں۔ اس طرح آپ کے پاس ہر باب کے نوٹ الگ ہوں گے۔ اس باب کو لکھتے وقت اسی باب کے نوٹوں کو بار بار پڑھ کر استفادہ کرنا ہوگا۔ ذہنی طور پر ترتیب دینا ہوگی اور ایسا ممکن ہے۔ آپ یہ کر سکتے ہیں کہ ایک باب کے مسلسل نوٹوں کی پرچیوں پر ہر ایک یا دو چار جملوں کے برابر بائیں یا دائیں ہاتھ کے حاشیے میں پنسل سے اس ذیلی گروہ کا عنوان لکھ دیں جس کے تحت وہ نوٹ آتے ہیں مثلاً اگر "مواد" سے متعلق نوٹ جیسے پرچیوں پر آئے ہیں تو انھیں پڑھ کر حاشیے میں پنسل سے قسمیں، ماخذ، کتب، رسالے لکھ سکتے ہیں۔ کہیں ایک پیراگراف ایک ہی ذیلی گروہ کے متعلق ہوگا۔ کہیں ایک جملے کے بعد ذیلی گروہ بدلتا جائے گا۔

ذاتی عمل

ایلٹک اور فینسٹر نے کہا ہے کہ کوئی سے دو لوگ ایک طرح کے نوٹ نہیں لکھتے، اس لیے کوئی طریقہ پوری طرح صحیح یا غلط نہیں ہوتا۔ دراصل نوٹ لینا بالکل ذاتی عمل ہے۔ ان میں جو مخففات استعمال کرنا چاہیں کریں کیوں کہ نوٹ تو ایک اشارہ ہیں جنھیں دیکھ کر پوری بات یاد آ جانی چاہیے۔ راتھ نے نوٹ لینے کے سلسلے میں ان خوبیوں کا ذکر کیا ہے:

-1 خوانا پذیری/صفائی (Legibility): صاف لکھیں۔ ایسا نہ ہو کہ ایک ہی ہفتے کے بعد سب کچھ پڑھا ہی نہ جا سکے۔

-2 درستی یا صحت (Accuracy): ماخذ کو صحیح طرح سے پڑھیں اور صحیح لکھیں کیوں کہ لائبریری چھوڑنے کے بعد اپنے نوٹوں ہی پر تکیہ کرنا پڑتا ہے۔ کمپیوٹر میں صحیح ہجوں کے ساتھ درج کریں۔

ڈاکٹر گیان چند کے نزدیک بعض اوقات نوٹ لیتے وقت معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے تمام ضروری نکات لکھ لیے۔ تسوید کے وقت ضرورت ہوتی ہے کہ فلاں نکتہ اور دیکھنا چاہیے یا دوبارہ توثیق کر لی جائے۔ ہینڈرکسن نے لکھا ہے کہ کسی ماخذ تک دوسری تیسری بار واپس جانے میں جو جھنجھلاہٹ ہوتی ہے ویسی کسی اور بات میں نہیں ہوتی۔ ہر بار معلوم ہوتا ہے کہ کچھ ناکافی نقل کیا گیا ہے۔ پھر یہ بھی تو ہے کہ بعض ماخذی کتابیں بعد میں اپنی دسترس میں نہ رہیں۔ کسی دوسرے شہر میں دیکھی ہوں یا وہ اپنے ہی شہر میں دور دراز کی لائبریری میں ہوں یا کسی شخص سے مستعار لے کر دیکھی ہوں اور دوبارہ مانگنا اچھا نہ معلوم ہو۔ یا ان تک رسائی نہ ہو سکے۔ اس لیے نوٹ کو مکمل قابل خواندگی اور صحیح صحیح لکھنا چاہیے۔

عمومی نکات

کچھ باتیں ایسی ہیں جن کا اطلاق ہر قسم کے نوٹوں پر ہوتا ہے:

-1 نوٹ کے ہر پرزے پر ماخذ کا اشارہ ہونا چاہیے اور ہر جملے یا فقرے کے لیے واضح ہو

کہ وہ کس صفحے سے لیا ہے۔ ماخذ کی تفصیل کسی دوسری جگہ یا نوٹ کے پرزے کے اوپر لکھی ہو۔

-2 کسی کتاب یا مضمون سے زیادہ نوٹ نہ لیں جتنے ضروری ہوں اتنے ہی درج کریں۔ جیسے جیسے مواد کا مطالعہ کریں ساتھ ہی ساتھ اس کے نوٹ لیتے جائیں۔ یہ نہ سوچیں کہ پہلے پورا باب یا مضمون پڑھ ڈالیں، بعد میں نوٹ لکھیں گے۔ اس طرح خواہ مخواہ دوگنا وقت لگے گا۔

-3 زیادہ تر مواد لفظ بہ لفظ نقل نہ کریں۔ ماخذ کے مطالب یا نکات کو اپنے الفاظ میں لکھ لیں۔ یہ نہیں کہ جتنا مواد ہے تقریباً اتنا یا اس سے کسی قدر کم کر کے اپنے الفاظ میں لکھ لیا جائے۔ اس کی بجائے نہایت مختصر تلخیص کریں۔ انگریزی اصطلاح میں تشریح (Paraphrase) نہ کریں، اختصار (Precise) لکھیں۔

-4 لفظ بہ لفظ اقتباس بہت کم صورتوں میں نقل کرنا چاہیے۔ ہو بھی تو زیادہ طویل نہ ہو۔ ہاں متن کے نسخوں کو لفظ بہ لفظ ہی نقل کرنا ہوگا۔ اگر عکسی نقل کرالی جائے تو بہتر ہوتا ہے۔

-5 حقائق (Facts) اور رائے میں فرق کریں۔ حقائق کے نوٹ لینے ضروری ہیں۔ کسی کی رائے کو لکھنا ضروری نہیں۔ رائے آپ خود قائم کر سکتے ہیں۔ ہاں کسی نے حقائق کی بنا پر کچھ تحقیقی نتیجے نکالے ہوں تو وہ نتائج بھی لکھ لیں۔

-6 نوٹ لکھنے والے کا خط تحریر صاف ہو۔ املا کے چند اصول آگے بیان کیے گئے ہیں، انھیں بھی ملحوظ رکھیں۔ تیزی سے لکھنے میں بعض اوقات بعض الفاظ بہت شکستہ ہو جاتے ہیں۔ لکھتے وقت تو بآسانی سمجھ میں آتے ہیں، ایک عرصے کے بعد دیکھیں گے تو بعض الفاظ کی صحیح قرأت مشکل ہوگی۔ قدیم زبان کے متن کو نقل کرنے میں خاص احتیاط چاہیے۔ یہ معلوم نہیں ہوتا کہ لفظ کی حد کہاں ہے۔ یعنی ایک لفظ کہاں ختم ہوا ہے اور دوسرا کہاں سے شروع ہوتا ہے مثلاً ایک حرف الف یا ز پچھلے لفظ کے ساتھ جائے گا یا اگلے لفظ کی ابتدا میں۔ خاص طور پر پشتو اور سندھی لکھنے والوں کو خطِ نسخ کی عادت ہوتی ہے۔ انھیں چاہیے کہ وہ اپنے نوٹ خطِ نسخ ہی میں لکھیں۔ اردو خط نستعلیق میں ہے۔ اردو میں مقالہ نگاری کے لیے ٹائپ کار اور کمپوزر اسے خود ہی ڈھال لے گا۔ آپ پروف خوانی احتیاط سے کریں۔

پرچیاں لکھنے یا نوٹ لینے میں حتی الامکان لفظ بہ لفظ نقل نہ کریں لیکن اگر کوئی جملہ، لفظ بہ لفظ نقل ہو جائے تو اس کے دونوں طرف واوین بنا دیں۔ ایسا نہ ہو کہ آپ تسوید کے وقت وہ جملہ اصل مصنف کے الفاظ ہی میں لکھ دیں۔ گیان چند کے نزدیک اقتباس صرف مندرجہ ذیل صورتوں میں لینا چاہیے:

-1 جب کسی متن کا نمونہ دینا ہو۔

2- جب کسی کی تحریر یا خیالات زیر بحث ہوں تو مصنف کے اصل الفاظ لکھنے سے آپ اس کے ساتھ بہت انصاف کر سکیں گے۔

3- کسی نے کوئی اہم نکتہ اتنے شگفتہ، دلچسپ اور مدلل الفاظ میں لکھا ہو کہ اس سے بہتر نہیں لکھا جا سکتا۔ اس صورت میں اسی کے الفاظ لکھ دیں۔

4- کسی مصنف نے کوئی بات، کوئی واقعہ یا اصول اتنے مختصر اور معنی خیز الفاظ میں لکھ دیا ہے کہ اس کی مزید تلخیص ممکن نہیں۔ اتنے ہی طول کے اپنے الفاظ میں لکھنے کے بجائے آپ اسی کے الفاظ میں لکھ دیں اور حوالہ دے دیں۔

5- آپ کو اپنی رائے یا دعوے یا انکشاف کی تائید میں کسی معروف اہل قلم کی رائے مل جاتی ہے تو آپ اس کے صحیح صحیح الفاظ نقل کر دیں تا کہ آپ کی رائے میں وزن پیدا ہو جائے۔ بالخصوص اگر آپ کوئی اختلافی بات لکھ رہے ہوں یا عام پسند کے خلاف کچھ لکھنے والے ہوں اور اندیشہ ہو کہ آپ کی رائے سے شدید ردعمل ہو گا تو کسی بڑے محقق کی آراء سے مدلل سکتی ہے۔

پرچیاں لکھنا یا نوٹ لینا ایک مستقل عمل اور عادت ہے۔ جب تحقیق کار یہ عادت اپنا لیتا ہے تو وہ تحقیق کی دنیا میں قدم رکھ پاتا ہے۔ غفور شاہ قاسم نے پاکستانی ادب، شناخت کی نصف صدی لکھی تو ڈاکٹر رؤف امیر نے ان کے مطالعہ اور نوٹ لینے کے طریقوں کے بارے میں لکھا:

> ''غفور شاہ قاسم کی پچھلے اٹھارہ سال میں ایک ہی تصویر میرے سامنے رہی ہے۔ دائیں بغل میں چار پانچ اُردو اخبار اور بائیں جانب اتنے ہی انگریزی اخبار۔ جیب میں کھلا ہوا بال پوائنٹ جس کی نہ اترنے والی روشنائی اس کے لباس کی شناخت بن چکی ہوتی ہے۔ تمام جیبوں میں حتیٰ کہ نیفے میں بھی کاغذوں کے پرزے جن پر نوٹس لیے ہوئے ہیں۔ ہاتھ میں ایک شاپر اور شاپر میں بھاری بھرکم آٹھ دس کتابیں۔ کتابوں میں کسی خاص موضوع کی کوئی قید نہیں۔ جس کتاب کو پڑھا اس کے ہر صفحے پر دیمک کی طرح نشان بھی لگا دیے''۔

یاد رہے کہ یہ پرچیاں، کارڈ، نوٹ ہی توشۂ تحقیق ہیں۔ اس مرحلے پر جس قدر کام انجام دے لیا جائے گا، مقالہ نگاری کے وقت اتنا ہی کم محنت اور مشکلات سے واسطہ پڑے گا۔ اس مرحلے پر اس سنہری اصول کو یاد رکھنا ضروری ہے کہ نوٹ تیار کرتے وقت ہر ممکن معلومات اور کوائف کو درج کر لیں اور مقالہ نگاری کے وقت ہر ممکن طریقے سے ان سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کریں اور کم سے کم مواد کم سے کم ضخامت کی صورت میں شامل کریں۔

اپنی پرچیاں سنبھال کر رکھیں۔ یہ مقالے میں استعمال ہوں گی۔ خاص طور پر ان معلومات کو محفوظ کرنا ضروری ہوتا ہے۔ بعض بڑے محققین مختلف پرچیوں پر تحقیقی نوٹ لے کر ادھر ادھر ڈال دیتے ہیں یا دوائتی

مقدار میں آتے ہیں کہ ان کے کسی اہم مقالے کی زینت نہیں بن سکتے لیکن ان میں کچھ بڑے کام کی معلومات موجود ہوتی ہیں۔ ایسی ہی چند پرچیاں خلیل الرحمان داؤدی کے سرہانے پڑی تھیں۔ پوچھا تو معلوم ہوا کہ "1857ء سے قبل کی اُردو مطبوعات" پر جو اُن کی نظر سے گزری ہیں، تحقیقی اور تبصراتی نوٹ لیے گئے ہیں۔ انھیں ملا جلا کر اور ترتیب دے کر راقم نے "اُردو نامہ" لاہور میں داؤدی صاحب کا یہ مقالہ 1983ء میں دو قسطوں میں شائع کر دیا۔ انھیں تب خبر ہوئی جب رسالہ انھیں پیش کیا گیا۔ اب وہی مقالہ حوالے کی اہم دستاویز بن گیا ہے۔

2- سوال نامہ (Questionnaire)

بیانیہ تحقیق میں آراء کا سروے کرنے کا ایک اہم ذریعہ یا آلہ (Tool) سوالنامہ ہوتا ہے۔ سوالات زبانی، تحریری بذریعہ ڈاک یعنی ہر طرح سے لیکن صرف نمونہ بندی میں شامل افراد کو بھیجے جا سکتے ہیں۔

اگر تحقیق کار جواب دینے والے افراد سے خود ہی زبانی سوالات کرے اور ان کے جوابات کو نوٹ بھی خود ہی کرے تو اس ذریعہ یا آلہ تحقیق کو جس پر سے سوال پڑھ کر سنائے جائیں گے اور جوابات نوٹ کیے جائیں گے شیڈول انٹرویو کہتے ہیں۔

(الف) شرائط

امکانی اندیشوں اور خطروں کو پہلے سے بھانپ کر ان کا سدباب کر لینا ضروری ہوتا ہے۔ سوال نامہ بنانے کے کام کی ابتدا بھی بعض اندیشوں کے سدباب سے کی جاتی ہے یعنی پہلے ہی سے یہ اندازہ لگایا جاتا ہے کہ آگے کس طرح کے مسائل پیش آ سکتے ہیں۔ اسی اندازے کی روشنی میں پہلے ہی سے ایسے اقدامات کر لیے جاتے ہیں جن سے ان اندیشوں کا سدباب ہو جائے۔

کسی سوالنامے پر جواب دہندوں کا ردعمل حسب ذیل ہو سکتا ہے۔ لہٰذا ان کا جواب پہلے سے سوچ لینا بہتر ہوگا:

-1 "مجھے آپ کا سوال نامہ بھرنے سے کیا ملے گا، آپ میرا وقت استعمال کر کے اپنا فائدہ حاصل کرنا چاہتے ہیں"۔ ایسے افراد کو یہ سمجھانا پڑے گا کہ تحقیق ذاتی فائدے کے لیے نہیں بلکہ معاشرتی واجتماعی فائدے کے لیے کی جا رہی ہے۔ بہتر ہوگا کہ تحقیق کے بارے میں کوئی خبر بھی شائع کرا دی جائے۔

-2 "میں آپ کو معلومات کیوں فراہم کروں؟ کیا خبر آپ یہ معلومات کسی دشمن یا کسی سرکاری محکمے مثلاً انکم ٹیکس کو فراہم کر دیں"۔ ایسے افراد کی سوچ کے پیش نظر ضروری ہوگا کہ سوال نامے میں قطعی ذاتی قسم کے حساس مسائل پر سوالات یا تو نہ رکھے جائیں یا اگر ایسے سوالات رکھنا ضروری ہوں تو جواب دہندہ کا اعتماد حاصل کرنے کا طریقہ وضع کیا جائے۔ ادبی ولسانی موضوعات میں ایسا جواب کئی ادیب اور شاعر اپنی ذاتی رائے کے افشا ہو جانے کے حوالے سے دے سکتے ہیں۔

3- ''میں آپ کی تحقیق کے لیے تختۂ مشق بننے کے لیے تیار نہیں''۔ اس مسئلے کے حل کے لیے سوال نامے کے مقاصد کے بارے میں ایک اچھا سا تعارفی خط تیار کرنا اور بہترین الفاظ میں انھیں سمجھانا مفید ہو سکتا ہے۔

4- ممکن ہے کہ نمونہ بندی کے مطابق کسی ایسے فرد کو سوال نامہ دینا پڑ جائے جو انتہائی مشہور ادیب، شاعر، محقق یا نقاد ہو، یا کسی ادارے کا سربراہ ہو۔ ایسی صورت میں اس سے ملاقات کرنا اور سوال نامہ دینا مشکل ہوگا۔ مسئلے کے حل کے لیے پہلی بات تو یہ ہے کہ تحقیق ایک نہایت معزز قسم کا کام ہے۔ اس کے لیے ضروری رابطے قائم کرنے میں ہچکچانے کا کوئی سوال نہیں۔ تاہم اگر کسی طرح بھی کامیابی ممکن نہ ہو تو پھر نمونہ بندی میں اتنی گنجائش رکھ لینی چاہیے کہ اگر کچھ افراد تعاون نہ کریں تو ان کی جگہ دوسرے افراد کو سوال نامہ دیا جا سکے۔

5- ممکن ہے کہ جوابات دینے والے فطری جواب دینے کی بجائے اپنی شہرت یا اپنے اس امیج کے مطابق جواب دیں جو دوسروں کی نظروں میں ان کا ہے۔ اس مسئلے کے حل کے لیے ضروری ہے کہ تحقیق کا مقصد ان پر اچھی طرح واضح کیا جائے۔

6- یہ بھی ممکن ہے کہ جواب دینے والے پر یہ خوف طاری ہو کہ کہیں اسے بے وقوف نہ سمجھا جائے اور اس خوف کی روشنی میں وہ غیر فطری انداز میں جواب دے۔ اس مسئلے کے حل کے لیے اسے بتانا بہتر ہوگا کہ ''جوابات میں صحیح یا غلط کچھ نہیں ہوگا۔ ہمیں صرف معلومات درکار ہیں، آپ جو بھی جواب دیں گے وہ تحقیق کے مقصد کے پیشِ نظر صحیح ہو گا''۔ یا پھر سوال اس طرح سے ذہانت کے ساتھ تیار کیا جائے کہ اصولی و نظری طور پر غیر متعلق جوابات ممکن نہ ہوں۔

7- ''میرا وقت بہت قیمتی ہے۔ میں اس سوال نامے کو بھرنے میں وقت ضائع نہیں کر سکتا''۔ اس مسئلے کے حل کی غرض سے اسے سمجھانے کے لیے پہلے سے دلائل تیار کرنے ہوں گے کہ آپ کا وقت ضائع نہیں ہوگا اور یہ کہ آپ کا جواب معاشرے کی بہتری کے لیے مفید طور پر استعمال ہوگا۔

8- ''سوالات نہایت مبہم اور غیر واضح ہیں''۔ اس مسئلے کے حل کے لیے سوالات نہایت غیر مبہم اور قطعی طور پر واضح بنائے جائیں۔

(ب) موزونیت (Relevance)

سوال نامے کی موزونیت پر توجہ دینی چاہیے۔ یہ موزونیت تین طرح کی ہو سکتی ہے:۔

(1) تحقیقی مقصدیت

تحقیق کرنے والے کو یہ بات پہلے سے سوچ لینی چاہیے کہ مطالعہ جواب دینے والے کو موزوں اور

بامقصد نظر آئے۔ یہ درست ہے کہ بعض اوقات مطالعے کی نوعیت جوابات دینے والوں کے لیے کافی دقیق اور مشکل ہوتی ہے، اس کے باوجود انھیں ہم خیال بنانے کی کوشش کر کے ان سے معلومات حاصل کرنے کے لیے ان کو مطالعے کا مقصد عام فہم الفاظ میں سمجھانا ضروری ہوگا۔ تحقیق کرنے والا یہ کام اسی وقت کر سکتا ہے جب خود اس کے ذہن میں تمام ضروری دلائل اور تمام ضروری تفصیلات موجود ہوں۔

دیکھنے میں آیا ہے کہ جب جواب دینے والا مطالعے کے مقصد کو مفید تسلیم کر لیتا ہے تو وہ بڑے اچھے جذبے کے ساتھ جوابات دینے میں اپنا وقت لگانے پر تیار ہو جاتا ہے۔ یہ کامیابی اسی طرح ممکن ہے کہ مطالعے کی موزونیت پوری طرح واضح ہو۔

(2) سوالات کی موزونیت

ہر تحقیقی مطالعے کا ایک دائرہ کار ہوتا ہے۔ سوالات اسی دائرے کے اندر ہونے چاہئیں۔ کوئی بھی سوال نہ تو غیر ضروری ہو اور نہ ہی کم ضروری ہو۔ اس کے علاوہ یہ بھی پہلے سے واضح ہونا چاہیے کہ کس سوال کے جوابات کو کس طرح سے استعمال میں لایا جائے گا۔ جب یہ بات واضح ہو گی تو غیر ضروری سوالات کا از خود ازالہ ہو جائے گا۔ دیکھا گیا ہے کہ اگر کسی سوال نامے میں غیر ضروری سوالات ہوتے ہیں تو جواب دینے والے بہت مایوس ہوتے ہیں اور اس صورت میں وہ یا تو سرے سے جواب ہی نہیں دیتے یا نامکمل اور گمراہ کن جواب دیتے ہیں۔ ان کی دلچسپی برقرار رکھنے کے لیے سوال نامے میں صرف وہ سوالات دینے چاہئیں جو مطالعے کے لیے انتہائی ضروری اور اس کے مقصد سے براہ راست متعلق ہوں۔

جواب دہندوں سے تعلق

سوال نامے میں ایسے سوالات نہ ہوں جن سے جواب دینے والوں کی کوئی موزونیت یا نسبت نہ بنتی ہو۔ مثال کے طور پر جس شہر سے کوئی اخبار نہ نکلتا ہو، اس میں کسی مقامی اخبار کی بات کرنا یا جس گاؤں میں ٹیلی وژن پروگرام نظر نہ آتے ہوں اور کسی کے پاس ٹیلی وژن سرے سے ہی نہ ہو وہاں ٹیلی وژن پروگراموں کے بارے میں سوال کرنا یا جہاں کتب خانے نہ ہوں وہاں کتب خانے سے اجراء کی بات کرنا غیر ضروری اور وقت کا زیاں ہوگا۔

(3) امکانی غلطیاں

تحقیقی سوالناموں میں چند مندرجہ ذیل غلطیوں کا امکان ہو سکتا ہے:۔

دونالی سوالات (Double Barrelled Question)

بعض اوقات تحقیق کار ایسا سوال بھی جان بوجھ کر اپنے سوال نامے میں شامل کر لیتا ہے جس کے اندر دوسرا سوال موجود ہوتا ہے۔ دونوں سوالوں کے جوابات الگ الگ نوعیت کے ہو سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک سوال ہو سکتا ہے:

''کیا آپ روزنامہ ''جنگ'' اور اس میں عطاء الحق قاسمی کا کالم پڑھتے ہیں''۔

درحقیقت یہ ایک سوال میں دوسرے سوال کی موجودگی کی مثال ہے۔ ممکن ہے کہ ایک شخص روزنامہ "جنگ" پڑھتا ہو اور قاسمی صاحب کا کالم نہ پڑھتا ہو۔ اس صورت میں ایک سوال کا جواب نفی میں اور دوسرے کا جواب اثبات میں ہوگا۔ سوال نامے کے ضمن میں ایسے سوال کو دوناٹی سوال کہتے ہیں۔ ایک ذمے دار اور ہوشیار تحقیق کار کو ایسے سوالات سے گریز کرنا چاہیے۔ اگر مطالعے کے مقصد کے مطابق "جنگ" اور "عطاء الحق قاسمی" کے کام سے متعلق باہمی معلومات درکار ہوں تو بہتر ہوگا کہ دو الگ الگ سوالات کیے جائیں۔

مبہم سوال

ہر سوال واضح ہو یعنی اس کا واضح جواب ممکن ہو۔ یہ مسئلہ آسانی کے ساتھ حل ہونے والا نہیں۔ چنانچہ خصوصی توجہ صرف کرنے کی ضرورت ہوگی۔ سب سے پہلے تو ایسے الفاظ سے بچنا ہوگا جن کے معانی مختلف مقامات، مختلف حلقوں اور مختلف ذہنوں میں الگ الگ ہو سکتے ہیں۔ اس معاملے میں کچھ الفاظ طے شدہ طور پر مبہم تسلیم کیے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر "اچھا اور برا" ایسے الفاظ ہیں جو مسلمہ طور پر مبہم ہیں اور ان کے معنی مختلف ذہنوں میں مختلف ہوتے ہیں۔ اس طرح "تعلق" کا لفظ بڑے ابہام کا سبب ہو سکتا ہے، مثلاً یہ سوال کہ آپ کون سی علاقائی/ پاکستانی زبان بولنے والوں سے تعلق رکھتے ہیں؟

یہاں جواب دینے والے کے لیے یہ مسئلہ پیدا ہوگا کہ آپ اس کی مادری زبان کی بابت سوال کر رہے ہیں یا صوبائی زبان کے بارے میں یا پھر یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ اس کی دوستیاں، تعلقات وغیرہ کن لوگوں سے ہیں۔ ایسے مسائل کے خاتمے کے لیے ضروری ہے کہ سوالات بالکل واضح اور براہ راست قسم کے ہوں اور ایک ایک لفظ کے بارے میں یہ غور کر لیا جائے کہ اس سے ابہام تو پیدا نہیں ہوگا؟ یہاں اگر مادری زبان کے بارے میں پوچھنا ہو تو براہ راست سوال کیا جائے کہ آپ کے گھر میں بولی جانے والی زبان کون سی ہے؟ اگر تعلقات کے بارے میں پوچھنا ہو تو اس طرح سے سوال کیا جائے۔ کیا آپ کی مادری زبان سے مختلف زبانیں بولنے والے کچھ افراد آپ کے دوستوں میں شامل ہیں؟ صوبائی اور قومی زبان کا نام واضح ہوتا ہے اس لیے اس پر سوال نہ ہو تو بہتر ہے۔

الفاظ کی سطح

صرف ایسے الفاظ استعمال کیے جائیں جو جواب دہندہ کی ذہنی و تعلیمی سطح کے مطابق ہوں۔ یہ الفاظ ضرورت کے عین مطابق ہونے چاہئیں۔ نہ تو الفاظ اتنے زیادہ ہوں کہ ان کے مفہوم تک رسائی میں مشکل پڑ جائے، نہ ہی اتنے کم ہوں کہ انھیں سمجھا نہ جا سکے۔ مدعا یہ کہ جو لفظ نکال کر مطلب پورا ہوتا ہو اسے ہرگز شامل نہ کیا جائے اور جس لفظ کو شامل کیے بغیر مفہوم ادا نہ ہو اسے ہرگز چھوڑا نہ جائے۔

کامیاب سوال نامے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ سوالات میں صرف وہ الفاظ آئیں جن کا ہر جگہ ایک ہی مفہوم سمجھا جائے مثال کے طور پر دھوکا دینے کے لیے "گولی دینا" کراچی یونیورسٹی کے طلبہ کی سمجھ میں تو آ سکتا ہے لیکن کسی اور جگہ کے طلبہ کے لیے اس کے مفہوم کا تعین مشکل ہو سکتا ہے۔ لہٰذا پہلی بات تو یہ ہے کہ مقامی نوعیت کے الفاظ اور محاوروں، سلینگ وغیرہ سے اجتناب برتا جائے۔ ایسی کوشش سے سوال نامہ

جواب دینے والوں کی نظر میں زیادہ بامعنی ہو سکتا ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ مشکل اور دقیق قسم کے الفاظ استعمال نہ کیے جائیں۔ بات سادہ انداز سے پیش ہو۔

موضوعی نوعیت کی تجریدیت

سوال ناموں کی موضوعی نوعیت انھیں مشکل بنا دیتی ہے۔ عام ذہانت رکھنے والے جواب دہندہ کے لیے جواب دینا مشکل ہو جاتا ہے۔ تاثر، احساس، جذبے، تصور کے حوالے سے جواب موضوعی کہلاتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ سوال کہ بتائیے حساسیت کسے کہتے ہیں؟ زیادہ تر جواب دینے والوں کے لیے بہت مشکل ہوگا۔ لہٰذا ایسے سوالات سے گریز بہتر ہے۔ اس کے مقابلے میں سامنے نظر آنے والی اشیائے تحقیق کے بارے میں مقرون (Concrete) سوالات عام فہم ہوں گے۔

ایہام (Suggestion)

سوالات کسی خاص جواب کی ترغیب نہ دیتے ہوں۔ جواب دینے والے کو کسی خاص جواب کے لیے مائل یا مجبور نہ کیا جائے، مثلاً کسی سے یہ پوچھنا مناسب نہ ہوگا کہ آپ جاسوسی ادب تو نہیں پڑھتے نا؟ یہ اس طرح کا سوال ہے جس سے ظاہر کیا جا رہا ہے کہ اگر آپ نے یہ جواب دیا کہ آپ پڑھتے ہیں تو سوال کرنے والے کو تکلیف ہوگی اور یہ جواب اس کی توقع کے خلاف ہوگا۔ یہ ایک غیر جانب دار قسم کا سوال نہیں ہوگا، بلکہ اس میں ایک جواب کسی ایما پر دیا جا رہا ہوگا۔

اسی طرح سوال میں کسی بڑے آدمی کا نام شامل کر دینے سے جوابات کی نوعیت فوری طور پر متاثر ہو جاتی ہے۔ مثلاً آپ منٹو سے تو متفق ہوں گے یا آپ نے تیج بہادر سرمست کے اُردو کلام کا مطالعہ تو کیا ہوگا؟ جیسے سوالات مخصوص جواب کی طرف مائل کر دیتے ہیں۔

اشتعال انگیز اور سنسنی خیز سوالات

سوال نامے میں ایسے سوالات بھی شامل نہیں کرنے چاہئیں جن سے جواب دینے والا اشتعال میں آ جائے یا انتہائی تذلیل کے احساس کا شکار ہو جائے۔ اس صورت میں بھی جوابات کی نوعیت حقیقی اور فطری نہیں رہے گی۔ خاص طور پر مادری زبان کے حوالے سے حساسیت موجود ہوتی ہے۔ اس سوال پر جواب دینے والا اشتعال میں بھی آ سکتا ہے اور ایسی ذلت بھی محسوس کرتا ہے جو تھوڑی دیر کے لیے اس کے اندازِ فکر کو بدل ڈالے۔ اخلاقی امور اور جرائم وغیرہ سے متعلق تحقیقی کاموں میں اس طرح کے سوالات سے اجتناب برتنے کی ضرورت بہ طورِ خاص اہم ہو سکتی ہے۔ ضروری ہو تو ایسے موضوعات پر سوالات احتیاط کے ساتھ بنائے جائیں۔

(ج) قسمیں

سوالات کے دو بڑے گروہ مندرجہ ذیل ہیں:

1- سوالات غایت مقررہ (Close-Ended Questions)

2- سوالات غایت غیر مقررہ (Open-Ended Questions)

پہلی قسم کے سوالات میں ممکنہ جوابات کے لیے خانے بنا دیے جاتے ہیں اور جواب دینے والے کو کسی دائرے میں صحیح کا نشان لگانا ہوتا ہے یا مستطیل کے گرد دائرہ بنانا ہوتا ہے۔ ''ٹائم'' اور ''نیوز ویک'' وغیرہ کے (polls) کے جو نتائج آتے رہتے ہیں، ان کے سوالات اسی نوعیت کے ہوتے ہیں کہ سوال کے ممکنہ جوابات کے چوکھٹے بنا دیے جاتے ہیں اور جواب دینے والے کو ان میں سے کسی ایک کے گرد دائرے یا چوکھٹے میں صحیح کا نشان بنانا ہوتا ہے۔

- O ہاں
- O نہیں
- O معلوم نہیں

ایسے سوالات کا فائدہ یہ ہے کہ جوابات عموماً یکساں معیار کے ہوتے ہیں۔ ان کی درجہ بندی آسان ہوتی ہے اور جواب دینے کے لیے سوال کا مفہوم بالکل واضح ہوتا ہے۔ چونکہ سوالات معروضی (objective) ہوتے ہیں اس لیے جوابات عموماً مکمل ہوتے ہیں، جواب دہندہ کو آسانی ہوتی ہے کیوں کہ اسے ممکنہ جوابات میں سے ایک منتخب کرنا ہوتا ہے اور بعض مشکل صورتوں میں بھی جواب دینا ممکن ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر مطالعے کے بارے میں قطعی جواب دینا عام طور پر آسان نہیں ہوتا لیکن اگر ممکنہ جوابات میں سوال اس طرح آئے کہ کیا آپ ''معاصر''، ''فنون''، ''صحیفہ''، ''قومی زبان'' وغیرہ کا مطالعہ کرتے ہیں تو وہ جواب دینے پر مائل ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اس طرح اسے محض حد اطلاق (Range) بتانا ہوگی۔

سوالات غایت مقررہ کے کچھ نقصانات بھی ہیں مثلاً جواب دینے والا محض اندازہ لگا کر جواب دے سکتا ہے، اگر اس کے مطلب کا ممکن جواب موجود نہ ہوا تو وہ مایوس ہو سکتا ہے۔ کسی سوال کے اتنے ممکنہ جوابات نہ دیے جائیں کہ جواب دینے والا پریشان ہو جائے۔ مثال کے طور پر ایک سوال کے بعد اگر دس ممکنہ جوابات دے دیے جائیں تو جواب دینے والے کے لیے انتخاب مشکل ہوگا۔ اگر کوئی سوال اس کی سمجھ میں نہیں آیا تو جواب سے یہ پتا نہیں چل سکے گا کہ وہ سوال سمجھ نہیں سکا ہے۔ جوابات کی پہلے سے طے شدہ شکل کی وجہ سے جوابات کا تنوع حاصل نہیں ہو سکے گا اور آخری نقصان یہ ہے کہ کوئی جواب دینے والا محض غلطی سے ایک کی بجائے دوسرے چوکھٹے پر نشان لگا سکتا ہے۔ اردو میں ایسے سوالناموں کی مثال مولانا صلاح الدین احمد کے سوالنامے سے دی جاتی ہے جو نیشنل بک کونسل لاہور میں عادات مطالعہ کے سروے کے لیے اختیار کیا۔

سوالات غایت مقررہ کے بعد دوسری طرح کے سوالات وہ ہیں جن کے بعد جواب لکھنے کے لیے جگہ سادہ چھوڑ دی جاتی ہے اور جواب دہندہ اپنے الفاظ میں جو جواب دینا چاہے دے سکتا ہے۔ ایسے سوالات کو سوالات غایت غیر مقررہ کہتے ہیں۔ اردو ادب میں ایسے سوالنامے کی ایک مثال ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے مولانا الطاف حسین حالی سے دی ہے جو اپریل 1906ء میں ''زمانہ'' میں شائع ہوا تھا۔ یہ سیاسی نوعیت کا سوالنامہ تھا۔

اس طرح کے سوالات کے بھی کچھ فائدے اور کچھ نقصانات ہیں:

1۔ **فوائد:** اس طرح کے سوالات اس وقت استعمال کیے جا سکتے ہیں جب کسی سوال کے تمام ممکن جوابات کا علم نہ ہو، ہر جواب دینے والا اپنی پسند کے الفاظ میں جواب دے سکتا ہے اور جس بات کی چاہے وضاحت کر سکتا ہے، جوابات میں ہمہ اقسام کی پیچیدگی بیان ہو سکتی ہے جو چند ممکن جوابات کے قابو میں نہیں آ سکتی۔ مثال کے طور پر پوچھا جا سکتا ہے کہ آپ اردو میں جاسوسی ادب کے مطالعہ کے کیوں مخالف ہیں؟ اس سوال کے جواب میں، جواب دینے والا بہت کچھ کہہ سکتا ہے جسے چند ممکن جوابات میں محدود نہیں کیا جا سکتا۔ اس طرح کے سوالات جواب دینے والے کے ذہن کو کھلنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔

2۔ **نقصانات:** سوالات غایت غیر مقررہ کے نقصانات یہ ہیں کہ ان کے نتیجے میں بہت سے ایسے جوابات بھی مل سکتے ہیں جو قطعی بے کار ہوں، جوابات اتنی مختلف اقسام کے ہو سکتے ہیں کہ ان کی درجہ بندی آسان نہ رہے، ان کے جوابات لکھنے کے لیے ادبی صلاحیت بھی ضروری ہے جو ظاہر ہے کہ ہر فرد میں نہیں ہوتی، کچھ جوابات کا مفہوم متعین کرنا دشوار ہو سکتا ہے، جوابات لکھنے کے لیے زیادہ وقت درکار ہو سکتا ہے اور طویل تر جوابات لکھنے والوں کے لیے زیادہ کاغذ کی بھی ضرورت پڑ سکتی ہے۔

دونوں طرح کے سوالات کے فائدوں اور نقصانات کو دیکھتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ سوالوں کی نوعیت کا تعین مطالعے کا مقصد اور موجود سہولتوں کے پیش نظر کرنا چاہیے۔ بعض ماہرین کا کہنا ہے کہ ایک ہی سوال نامے میں کچھ سوالات ایک طرح کے اور کچھ دوسری طرح کے ہو سکتے ہیں۔ لیکن اس کا انحصار سوالنامے کی مقصدیت پر ہوتا ہے۔

(و) ترتیب

سوالنامے کو ضرورتوں کے لحاظ سے مرتب ہونا چاہیے لیکن اس میں سوالات کی ترتیب کیا رکھی جائے، اس ضمن میں ماہرین نے اپنے تجربات کی روشنی میں تجاویز مرتب کی ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

1۔ جن سوالات کی نوعیت حساس ہو انھیں اور مشکل سوالات کو ابتدا میں نہیں رکھنا چاہیے بلکہ سوال نامے کے دوسرے نصف میں رکھنا چاہیے۔ یہ سوالات آمدنی اور عقائد، نظریات وغیرہ کے بارے میں ہو سکتے ہیں۔ ابتدا میں انھیں رکھنے سے اندیشہ یہ ہے کہ کہیں جواب دینے والا پورے سوال نامے ہی کو پھینک کر کھڑا نہ ہو جائے۔

2۔ جن سوالات کا جواب دینا آسان ہو انھیں ابتدائی حصے میں رکھا جائے۔ ان سے جواب دینے والے کی دلچسپی بڑھ سکتی ہے۔

3۔ جن معلومات کی ضرورت بعد کے سوالات کے لیے ہو انھیں پہلے حاصل کرنا بہتر ہوگا۔ مثلاً اگر کچھ سوالات افرادِ خاندان کے بارے میں آنے والے ہیں تو ان کی تعداد پہلے معلوم کر لیں تاکہ جواب دینے والا مطمئن ہو جائے۔

4۔ سوالات کو منطقی ترتیب میں لکھنا بہتر ہوگا تاکہ جواب دینے والے کو یہ موقع ملے کہ وہ جوابات کو

تاریخی ترتیب سے لکھ سکے، مثلاً اگر اسے اپنی ملازمتوں کی تفصیل بتانا ہے تو وہ پہلی، پھر دوسری، پھر تیسری ملازمت کے بارے میں لکھ سکے۔

5۔ طویل سوالات اگر ضروری ہوں تو ابتدا میں درج نہ ہوں۔

6۔ اگر جوابات کی صداقت جانچنے کے لیے متعدد سوالات شامل کرنا ہیں تو انھیں یکے بعد دیگرے درج نہ کیا جائے بلکہ سوال نامے کے مختلف حصوں میں بکھرا کر درج کیا جائے مثلاً اگر آمدنی کے بارے میں الفاظ بدل کر تین سوالات رکھنا ہیں (اور یہ دیکھنا مقصود ہے کہ جوابات کی نوعیت ایک ہی ہے یا نہیں) تو ایسے سوالات یکے بعد دیگرے نہ آئیں۔

(ر) پیشگی جانچ

سوالنامہ باقاعدہ طور پر زیرِ تحقیق لانے سے پہلے محدود پیمانے پر اس کی آزمایش بھی کی جاتی ہے تاکہ یہ اندازہ لگا لیا جائے کہ کہیں کسی سوال کا مطلب اس سے مختلف تو نہیں لیا جا رہا ہے جو تحقیق کرنے والے کے ذہن میں ہے۔ اس مقصد کے لیے سوالات آزمایشی طور پر مختلف افراد سے (جو اصل نمونہ بندی میں شامل نہ ہوں) پوچھے جاتے ہیں، اور ان کے جوابات کی روشنی میں جہاں ضروری ہو سوالات میں ردوبدل کیا جاتا ہے۔

سوال نامہ خواہ جواب دینے والوں کو سامنے بٹھا کر پُر کروایا جائے یا پھر ان کے پاس ڈاک سے بھیجا جائے، دونوں صورتوں میں اس کے ساتھ ایک مختصر، واضح اور پرکشش قسم کا پیش نامہ ہونا چاہیے۔ اس میں ممکنہ حد تک مطالعے کا مقصد بیان کیا جائے اور یہ تحریر کیا جائے کہ سوال نامہ پر کرنے سے اہم اجتماعی فائدہ حاصل ہوگا۔ دیکھا گیا ہے کہ پیش نامہ جس قدر پرکشش اور دلچسپی پیدا کرنے والا ہوگا، اسی قدر جوابات زیادہ تعداد میں اور مناسب موصول ہوں گے۔ پیش نامہ دراصل آپ کا اپنا تعارف نامہ ہوتا ہے۔

جیسا کہ ذکر ہوا ہے، سوال نامہ سامنے بٹھا کر بھی پُر کروایا جا سکتا ہے، اسے شیڈول انٹرویو کی طرح بھی استعمال کیا جا سکتا ہے یعنی سوال خود پڑھ کر سنایا اور جواب خود درج کیا جا سکتا ہے اور سوال نامے کو ڈاک کے ذریعے بھی بھیجا جا سکتا ہے۔ ڈاک سے بھیجے جانے والے سوال نامے کے ساتھ پیش نامہ خصوصیت کے ساتھ تیار کرنا ایک ضروری و لازمی امر ہے تاکہ ذاتی تعلق قائم ہو سکے۔ کمپیوٹر پر تجزیہ کرنے کے لیے سوالنامہ ایک ہی بار داخل کرنا ہوگا، باقی اعداد و شمار، جوابات، کوائف داخل ہوں گے۔ SPSS کا ایک سافٹ ویئر ایسی سروے تحقیق میں استعمال ہوتا ہے کہ نتائج نکال کر پیش کر دیتا ہے۔ اب یہ اُردو کے لیے بھی زیرِ استعمال ہے۔

3- تحقیقی خطا (Research Error)

اور

امکانِ خطا (Error Possibilities)

اندراج، نتائج محاکمہ سفارشات اور مقالہ نگاری کے وقت یہ دیکھ لینا ضروری ہوتا ہے کہ کہیں کوئی

خطا تو واقع نہیں ہوئی۔ تحقیق کار عام طور پر مندرجہ ذیل خطا کے مرتکب ہوتے ہیں۔

1- منتخب مشاہدہ:

اپنے سابقہ عقائد کی روشنی میں کوئی کوئی مشاہدہ یا کوائف زیر غور رکھنا اور کسی کو نظر انداز کر دینا ایک بہت بڑی خطا ہے۔ کوائف کی نمونہ بندی میں اس خطا کے امکان کو ملحوظ رکھنا بہت ضروری ہوتا ہے۔

2- نادرست مشاہدہ:

جب ہم کوائف کو پڑھنے اور جانچنے میں کوئی غلطی کرتے ہیں یا نقل کرنے میں کوئی بات رہ جاتی ہے یا پھر ہمارے بات سمجھنے میں کوئی خامی پیدا ہوتی ہے۔ اس خطا کے امکان کو نکات کے پہلے سے بنے ہوئے فارم میں معلومات بھرنے سے دور کیا جا سکتا ہے۔ یعنی ہم پہلے سے طے کر لیں کہ کسی ماخذ/کوائف یا مشاہدے سے ہم کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں، صرف اسی کا اندراج کریں۔

3- زائد تعمیم:

یہ بات اکثر ظہور پذیر ہوتی ہے یعنی ہم اپنے نتائج کی بنیاد صرف اپنے کوائف یا نمونوں ہی پر رکھنے کی بجائے پوری وسعت پر ان کا اطلاق کر دیتے ہیں۔ ایسے مطالعات دوسرے علاقوں/حدود/اصناف/افراد/گروہوں پر بار بار کیے جائیں تو تعمیم کا امکان واضح ہوتا ہے۔ ایک ہی نقطۂ نظر رکھنے کے بجائے کسی اور پہلوؤں سے بھی تحقیق انجام دی جائے۔ خاص طور پر نمونہ بندی میں نمائندگی کا اصول زیادہ سے زیادہ معروضی ہونا چاہیے۔ تحقیق کی حدود اور تحدید پر زیادہ سے زیادہ توجہ دی جائے۔

4- بناوٹی معلومات:

خاص طور پر انٹرویو اور سروے کے سوالات کے جوابات بناوٹی طور پر درج کیے جا رہے ہوتے ہیں۔ یہ محض قیاسی اندازوں پر دیے جاتے ہیں۔ "میرے خیال میں............" "ایسا ہو سکتا ہے............" "ممکن ہے............" جیسے جوابات بناوٹی ہوتے ہیں۔ ایسی معلومات نکال دینی چاہئیں۔

5- مابعد حقائق فرضیہ سازی:

اگر ہم یہ سوچیں ہماری تحقیق کے بعد کیا نتیجہ نکل سکتا ہے تو اسے اپنی ذاتی فرضیہ سازی کی طرف دھکیل دیتے ہیں۔ اس کی بجائے اگر ہم یہ سوچیں کہ اس تحقیق سے پہلے کیا نتیجہ نکلا تھا تو بہتر ہے۔ ہماری تحقیق کسی نظریے/تصوری کی روشنی میں آگے بڑھے تو نتیجہ صاف ہو گا ورنہ نہیں تاکہ ہم حاصلات کی روشنی میں پیشگوئی کے قابل ہو سکیں۔

6- غیر منطقی استدلال:

ہمارا ہر استدلال استخراجی یا استقرائی منطق پر پورا اترتا ہو، محض اپنے عقائد اور نقطۂ نظر سے استدلال نہیں ہونا چاہیے اور نہ اتفاقی نتائج نکالنے چاہئیں۔ ایک بات یہ بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ محض منطق صحیح جواب حاصل نہیں کرتی۔ اپنے مفروضات (Assumption) کو اپنے دلائل سے پہلے ذہن میں رکھیں۔ یاد

رہے کہ ہم شریک ہو مزنہیں ہیں۔ نیز اپنا مقالہ ہمیشہ دوسروں کو دکھانے کے بعد حتمی بنائیں۔

7- فہم میں انا کا دخل:

علمی دنیا میں انا کو بہت زیادہ دخل حاصل ہوتا ہے۔ کسی عہدے یا مقام پر پہنچنے کے بعد یہ دخل بہت بڑھ جاتا ہے۔ ''مستند ہے میرا فرمایا ہوا''۔ یہ رویہ غیر علمی اور غیر تحقیقی ہوتا ہے۔ نسل، خاندان، مذہب، قوم، مشیت وغیرہ کے تعصبات اس انا کی تشکیل میں بہت بڑا کردار ادا کرتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ غیر جانبدار رہنے کی کوشش کریں۔ اپنے تعصبات کو دور رکھیں اور پسند ناپسند سے بچیں۔

8- اخذ معلومات کی ناپختہ بندش:

جب ہم یہ سمجھ لیں کہ ہم نے کافی کام کر لیا ہے اور مزید مطالعے کی ضرورت ہے تو وہیں ہم ناپختہ کاری کا اظہار کر رہے ہوتے ہیں۔ خاص طور پر ایسے موضوعات پر جن کے میدان وسیع تر ہوں، اس لیے تحدید پر زیادہ سے زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہر امکانی پہلو پر غور کر لینا ضروری ہوتا ہے۔ اس کے لیے سنجیدہ منصوبہ بندی کی ضرورت لاحق ہے۔ ناقص منصوبہ بندی اور جلد بازی کار خصوصی توجہ کے مستحق ہیں۔

9- اسرار کاری:

جب ہم اپنے مابعد طبیعات یا مافوق الفطرت عناصر کو تحقیقی نتائج اخذ کرنے میں داخل کرتے ہیں تو ہم ان میں سریت (Occult) داخل کر دیتے ہیں۔ روحوں، جنوں، بھوتوں اور پر اسرار قوتوں پر ایمان ہماری تحقیق کو کمزور بنا دیتا ہے۔ نامعلوم عوامل (Unknown factors) کو عام طور پر بھی پر اسراری کی بیماری لاحق ہو جاتی ہے جنھیں ہم ایسے رموز کی وجہ قرار دیتے ہیں۔ اتفاقات، قدرتی امور اور دیگر ایسے جوابات ہمیں اسرار کاری پر مجبور کرتے ہیں۔

امکانِ خطا (Error Possibilities) کی وجوہات

تحقیق اور اس کے نتائج میں غلطی یا خطا کا امکان موجود ہوتا ہے اور اس میں غیر جانبداری اور معروضیت نہ برتنا خطا (Error) کا سب سے بڑا عامل ہوتا ہے۔

خطا کے وقوع پذیر ہونے میں کئی اور عوامل بھی اثر پذیر ہوتے ہیں، جنھیں نینازکی (Nenazski) نے لسانی تحقیق کے طریق کار میں واضح کیا ہے۔ اس کے نزدیک دس سے زیادہ ایسے عوامل کے اثرات پڑنے کا امکان موجود ہوتا ہے، جنھیں ملحوظ رکھنا بہت ضروری ہے۔

1- تقدس مآبی اثر (Halo Effect)

مطالعے کے کسی ایسے جزو کے باطل اثرات پڑنے کا امکان ہوتا ہے جو نتیجے کے حق میں یا خلاف استوار ہو سکتے ہیں۔ اُردو میں تاریخی، مذہبی تحقیق عموماً اس اثر سے نہیں بچ سکی۔ کسی فرد کا تقدس مآبی، نورانی یا محترم ہونا تحقیق کی راہ میں حائل ہوتا ہے جیسے اقبالیات پر تحقیق عمومی طور پر اقبال کی عظمت کے اثر میں رہتی ہے۔ کسی گروہ، فرقے، یا رجحان کا عموی، مقدس، محترم، عقائد و ایمان کا حصہ ہونا مثبت یا منفی اثر ڈال سکتا ہے۔

تحقیق سے پہلے اس قسم کے اثر سے مشاہدات اور کوائف کی تشریح پر بعد میں بھی کئی اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔

2- خطائے شرح بندی (Rating Error)

کسی ادب پارے، واقعے یا مقام کی شرح بندی کرتے ہوئے تین طرح کی خطا وجود میں آ سکتی ہے۔ تنقیدی رائے بھی اس سے مبرا نہیں۔

(1) بالا تر شرح بندی (Over Rating): کسی امر کی تائید میں اپنی انتقادی رائے دینا،

(2) زیریں شرح بندی (Under Rating): کسی امر کی مخالفت میں اپنی رائے دینا،

(3) مرکزی رجحان (Central Tendancy): کسی امر کے اعتدال میں رہنا۔ یہ خطا عموماً اس وقت ہوتی ہے جب کوئی امر تحقیق کار کے لیے نیا معلوم ہوتا ہے اور اس پر تنقیدی آرا موجود نہیں ہوتیں اور وہ خود انتقادی پیمانے لے کر نہیں بیٹھتا۔

3- خارگل اثر (The Hawthrone Effect)

کسی انتخاب یا فن پارے کو الگ کر کے یا علیحدہ کر کے رائے دینا یا کسی سروے میں چند افراد کے خاص گروہ کو منتخب طور پر علیحدہ شمار کر کے رائے معلوم کرنا دیگر سے مختلف اثر ڈالتا یا نتیجہ برآمد کرتا ہے۔ اس سے دونوں طرح کے اثرات سامنے آ سکتے ہیں۔ کسی بھی طرح کا منفی اثر گویا کانٹے کا زخم بھی اور گلاب کی خوشبو بھی یعنی مثبت اور منتخب اشعار، جملوں، عبارتوں، تحریروں، افراد، گروہوں، اشیاء کا تنوع، ندرت، تحقیق میں شرکت، ترسیمی ماحول، خصوصی سلوک اور نئے طرز کا تعامل، ذاتی پسند ناپسند وغیرہ اس خطا کے بڑے عوامل ہیں۔ یہ اثر شکاگو میں اس نام کی ایک برقی کمپنی میں کی گئی تحقیق کا جائزہ لینے سے پڑا۔

4- تجرباتی تعصب اثر (The Experimental Bias Effect) یا خود مکافاتی کہانت (Self-fulfilling Prophecy)

اس اثر کا جائزہ ہارورڈ کے ڈاکٹر رابرٹ روزن تھال کے مقالے میں لیا گیا تھا۔ تحقیق کار اپنی مرضی سے تحقیقی طریقے کا انتخاب کرے گا تو خواہ وہ تجرباتی طریقہ استعمال کر رہا ہو گا لامحالہ اس طریقے کا اثر نتیجے پر تحقیق کار کے ذاتی رجحان یا تعصب کے حق میں جائے گا یعنی تحقیق کار پہلے سے جن نتائج کی پیش گوئی کرنا چاہتا ہے، وہی برآمد ہوں گے۔

اسی لیے وہ خاص تحقیقی طریقہ منتخب کرتا ہے خاص شواہد اور کوائف جمع کرتا ہے۔ اس میں وہ کچھ نہ کچھ نظر انداز کر رہا یا بھول رہا ہوتا ہے یا بعض حقائق، تحریروں، دستاویزات، ادب پاروں، عبارتوں، اقتباسات، اشعار وغیرہ کو پس پشت ڈال رہا ہوتا ہے یا انھیں پوشیدہ رکھ رہا ہوتا ہے یا تجربات میں بعض عوامل اور متغیرات کا مشاہدہ نہیں کر رہا ہوتا یا بعض مفروضوں (Assumptions) کو غیر ضروری طور پر اہمیت دے رہا ہوتا ہے، جیسے کاہن، نجومی اور جادو کے عامل کرتے ہیں یا پھر مذہبی گروہ کی تحقیقی کتابیں ایسی مثالوں سے بھری ہوتی ہیں۔ اس سے نتائج کی غیر جانبداری مشکوک ہو جاتی ہے۔

یہ عمل تاریخی، ادبی اور فرقہ وارانہ تحقیقی کتابوں میں عام طور پر نظر آتا ہے۔

5- جان ہنری اثر (John Henry Effect)

جب انسانوں کو تجرباتی تحقیق میں متغیرہ کے طور پر فریق بنایا جاتا ہے جیسے کسی مطالعے یا ادب پارے کے اثرات کا جائزہ لینے کا تجربہ۔ انھیں "کنٹرول" گروہ کہا جاتا ہے تو وہ خواہ مخواہ زائد کارکردگی دکھانے کے زعم میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس سے "تجرباتی" گروہ کے نتائج کے ساتھ ان کے نتائج کی نسبت (Ratio) متاثر ہوتی ہے۔

6- امرت دھارا اثر (The Placebo Effect)

کوئی جامد یا معتدل، مہیج (Stimulus) جو خود بھی متحرک متغیرہ ہو، خاص طور پر طبی نفسیاتی تجربے میں اور اسے خواہ مخواہ معالجہ یا امرت دھارا سمجھ لیا جائے جبکہ وہ اصل نسخہ نہ ہو مگر اس میں معاون ہو جیسے ادبی مطالعے کے رجحانات میں اخبارات کا مطالعہ بھی مشاہدات میں شامل کر لیا جائے اور زیر تحقیق یا معمول (Subject) فرد اسے بھی مطالعہ ہی سمجھتا ہو اور مشاہداتی نتائج میں اسے شامل کرلے تو اسے غیر ضروری اثرات کا حامل قرار دیا جائے گا یا کوئی کتابی کیڑا یعنی مطالعے کا عادی شخص محض نفسیاتی فرار کے لیے مطالعہ کرتا ہو یا محض دلچسپی کے لیے جیسے جاسوسی ادب کا مطالعہ وغیرہ اور سمجھتا ہو کہ وہ کثیر مطالعہ شخص ہو گیا ہے۔ مثال کے طور پر اگر وڈیو ٹیپ پر کوئی ڈراما یا فلم اس لیے دکھائی جائے کہ اس سے ادبی مطالعہ بڑھ جائے گا جبکہ وہ اصل مطالعے پر کوئی مثبت اثر نہیں ڈالتا، مگر تفہیم کو بہتر کر دیتا ہے۔

7- پس نتائج اثر (The Post Hoc Error)

کسی نتیجے کے بعد اس کی وجہ سے کوئی اور نتیجہ برآمد ہوتا ہو۔ جیسے ادب کی تدریس اُردو کے قارئین کے لیے تقویت اور تحریک کا اثر رکھتی ہے مگر انجینئری کے طلبہ میں اُردو کے قارئین کے لیے ادب سے بیزاری کے نتائج پیدا کرتی ہے۔ یہی صورت دوسری زبانوں کے ادب کی بھی ہے۔

8- گم دقت کی خطا (Error of Misplaced Precision)

کوائف کی جمع آوری بڑی دقت کے ساتھ کی جاتی ہے، لیکن ایک مخصوص تحقیقی ڈیزائن کی چوحدی (Paradigm) اسے محدود رکھتی ہے۔ اس سے نتائج متاثر ہوتے ہیں۔ بعض اوقات ایک ایسا دقیق پہلو موجود ہوتا ہے جو اس احاطے کے اندر نہیں آ سکتا، مگر اثرات رکھتا ہے۔ اسے نظر انداز کرنے سے تحقیق میں خطا لازم ہے۔ جیسے کسی کے ادبی اسلوب (style) کا مطالعہ کرتے ہوئے اس کی نگارشات کے ساتھ اس کے تراجم کو بھی پیش نظر رکھا جائے جبکہ ترجمہ کی مجبوریاں اور اصل مصنف کا اسلوب مترجم پر اثر انداز ہوتے ہیں، مگر علم ترجمہ کا احاطہ یہاں نہیں کیا جا رہا ہوتا، اس لیے اسے اسلوب کے مطالعے میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ یہ دقت نہیں اٹھائی جا رہی یا ہمیں بھول گئی ہے۔ اسے گم دقت کہا جائے گا۔

9- نوعی مطالعۂ احوال سے ہشیار (Beware of Typical Case Study)

عام طور پر احوال و آثار کے مطالعات متعصب اور جانبدارانہ ہوتے ہیں۔ لیکن ایک ہی طرح کے مطالعۂ احوال میں تحقیق کار کے نوٹس اور مندرجات نوعی تعصب کے سایے ڈالتے ہیں۔ جیسے ادیب یقیناً ادیب ہی ہوگا۔ اس کی طرف سے مہیا کیے گئے منتخب شعروں، غزلوں، نظموں، افسانوں، ادب پاروں پر مطالعہ کبھی بھی معروضی اور غیر جانبدارانہ اثر پیدا نہیں کر سکے گا۔ یہاں معروضی نمونہ بندی کے اصول درکار ہوتے ہیں۔

10- آلات کا قانون (The Law of the Instruments)

ادبی تحقیق میں خاص طور پر مصاحبہ (Interview) میں زبانی یا تحریری سوالات اپنی نوعیت میں ایک تعصب یا جانبداری (Bias) رکھتے ہیں۔ یہ بھی معروضی نتائج کے حصول کی راہ میں حائل ہوتے ہیں۔ ذاتی پسند، ناپسند، اپنی رائے اور تعصب، ذاتی ورژن (version) وغیرہ اس کی وجہ ہیں۔

خاص طور پر لسانی یا لسانیاتی تحقیق میں ایسے عوامل سے بچنا بہت ضروری ہوتا ہے۔ ذخیرۂ الفاظ، لغات اور کارپس کا فطری، نمونہ بند، متنوع، حتمی، مکمل اور دلچسپ ہونا ضروری ہوتا ہے۔ نمونہ بندی میں عبارات کے تنوع، صنفی تنوع، کینڈے کے تنوع، عصری تنوع اور عہد وار تنوع کے علاوہ تخلیق کے وقت ادیب کی عمر، تجربہ، تعلیم، جنس، طبقہ، نفسیاتی کیفیات اور حیثیت، عقائد، مذہب، نسل، خاندان، ذات، ذاتی پسند نا پسند اور سیاسی، معاشرتی حالات جیسے متغیرات بھی اگر پیشِ نظر رکھے گئے ہوں تو حاصلات اور نتائج بہتر اور معتبر ہو سکیں گے۔

سولھواں باب

مواد کا اندراج اور تسوید

تحقیقی رپورٹ یا مقالے میں عبارت اور مواد کے اندراج کے کئی طریقے ہیں لیکن سب سے اہم بات اس کا قرطاسِ طرز (Style sheet) ہے، یعنی مقالہ کس تکنیکی انداز میں پیش کیا جائے گا۔ اس میں حوالے اور اقتباسات کس طرح سے دیے جائیں گے۔ ان پر تفاصیل دوسرے ابواب میں دی گئی ہیں لیکن سب سے اہم بات یہ ہے کہ مواد کیوں کر ترتیب دیا جائے، پیرابندی کیسے کی جائے، ذیلی حاشیے یا پاورقی حاشیے کیسے لکھے جائیں اور کون سی بات آخر میں تعلیقہ کے طور پر دی جائے۔

1- مواد کا اندراج

آپ نے اپنے مقالے میں جو بھی مواد دیا ہو، اس کے انتخاب کی جو بھی شرائط ہوں، ان کی ترتیب میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ان میں تحقیق کا مقصد واضح طور پر جھلکتا ہو اور ہر باب کا لب لباب اس باب کے آخر میں نظر آئے۔ ہر دو (آغاز، اختتام) کے درمیان سارا مواد منطقی ترتیب سے (معلوم سے نا معلوم کی طرف) پیش کیا گیا ہو۔ اس کی ایک بنیاد یا اساس ہے اور وہ یہ کہ آپ یہ رپورٹ، مقالہ یا عبارت کسی دوسرے انسانی دماغ تک اس کے مطالعے کے ذریعے پہنچانا چاہتے ہیں اور انسانی ذہن منطقی ترتیب کو پسند کرتا ہے یعنی پہلے عمومی باتیں، پھر خاص باتیں۔ پہلے معلوم اور پھر نامعلوم امور، پہلے آسان کوائف، پھر پیچیدہ اور مشکل کی طرف۔ یہی انداز مقالے میں مواد کے اندراج کا ہوتا ہے۔

بنیادی اُصول

تحقیقی مقالے میں مواد کے اندراجات کے چند اہم اور بنیادی اصول مندرجہ ذیل ہو سکتے ہیں:

1- عبارت کا ہر اندراج مختصر رکھا جائے۔ کم سے کم مگر ضروری الفاظ ہوں۔

2- مقالے میں حقائق درج ہوں۔ ذاتی رائے سے گریز کیا جائے۔

3- کوائف کی توجیہ وتشریح ساتھ ساتھ جاری ہو۔

4- اپنے ماخذ کا حوالہ ضرور دیں۔ حوالہ نگاری کے لیے کوئی ایک اصول یا اسلوب ملحوظ رکھیں یا جو ادارے کی طرف سے مقرر ہو۔

5- اضافی زائد تشریح یا غیر متعلقہ امور تحریر کرنا ضروری ہوں تو حواشی یا تعلیقات میں دیں۔

6- مواد کا اندراج اپنے مقصد کے ذکر کے ساتھ کریں لیکن اپنا دعویٰ (Thesis) نہ دہرائیں۔
7- عبارت یا مواد کا اختتام تمام باتوں یعنی نکات کے خلاصے سے کریں۔
8- ایک باب کے مواد کا تعلق پچھلے اور اگلے باب سے ضرور قائم ہو۔
9- تحریر میں قواعد، املا، رموز و اوقاف کا خاص خیال رکھیں۔
10- اپنا کوئی ذاتی فلسفہ وضع نہ کریں۔ منطقی ترتیب اور جواب ہی آپ کا فلسفہ ہے۔

بنیادی سوالات

اپنے مواد کے اندراج یعنی اپنی نگارش/عبارت کے بعد آپ اس کا ایک بار پھر مطالعہ کریں اور مندرجہ ذیل سوالات کا جواب تلاش کریں۔ یاد رہے کہ کوائف کی جمع آوری کے وقت ہر طرح کی معلومات اور مواد آپ کے لیے ضروری ہے اور مواد کے اندراج کے وقت اکثر مواد غیر ضروری ہے:

جائزے کے لیے بنیادی سوالات حسب ذیل ہیں:

1- کیا میں نے بنیادی ضروری مواد پیش کر دیا ہے؟
2- کیا پیش کردہ مواد منطقی ترتیب سے ہے؟
3- کیا غیر ضروری معلومات اور تفصیلی بحث فراہم کر کے ضخامت میں اضافہ تو نہیں کیا؟
4- کیا میرا بیان کردہ مقصد اس مواد سے واضح ہو رہا ہے؟
5- کیا تمام ضروری نکات بیان ہو گئے ہیں؟
6- کیا حوالہ دینے کا مطلوبہ، طے شدہ یا ضروری طریقہ ہی استعمال کیا گیا ہے؟
7- کیا حوالہ، حاشیہ یا تعلیقہ میں سے کوئی اندراج رہ تو نہیں گیا؟
8- کیا مواد علمی بصیرت اور تنقیدی نقطۂ نظر سے پیش ہوا ہے؟ یعنی عالمانہ انتقاد یا تنقیدی علمیت موجود ہے؟
9- کیا ضروری اقتباسات کے علاوہ کوئی زائد اقتباس تو نہیں دیا؟
10- کیا اقتباسات کم سے کم طوالت میں ہیں؟
11- کیا چوکھٹے، گراف، اشکال، جدولیں مناسب ہیں اور موزوں جگہ پر ہیں؟
12- کیا پیشکش کی زبان سنجیدہ، سادہ اور اصطلاحی و علمی ہے؟

ان تمام سوالات کے لیے جس قسم کے اہتمام کی ضرورت ہے، اسے آگے تفصیل سے واضح کیا گیا ہے۔ اپنے عمومی بیانات کو درج کرتے ہوئے یہ دیکھ لیں کہ آپ نے اسے کس طرح سے ثابت کیا یا تردید کی ہے اور یا کس طرح سے اس کی توضیح یا تشریح کی ہے۔

کتاب اُردو اصطلاحات سازی کے اندراجات کا ایک نمونہ شامل کیا جا رہا ہے کہ کس طرح غیر ضروری باتوں سے گریز کرتے ہوئے ہر حوالے سے صرف متعلقہ امور مختصر طور پر شامل کیے گئے ہیں:

"اردو کی جنم کہانی خاصی دلچسپ، پیچیدہ اور مبہم ہے۔ ماہرین نے اپنے اپنے دلائل اور شواہد سے اتنا کچھ کہا ہے کہ یہ سارا تحقیقی سرمایہ ایک طلسم ہوشربا کی حیثیت اختیار کر گیا

ہے۔ اردو زبان کی تشکیل کس سامری کے چھو منتر سے ہوئی، اس کی بابت کوئی بھی تفصیل سے کچھ نہیں جانتا۔ بعض کے نزدیک اردو لشکری زبان ہے[1]۔ بعض اسے شاہجہان آباد (دہلی) کی پیداوار بتاتے ہیں[2]۔ کوئی امیر تیمور کے حملے کا نتیجہ سمجھتا ہے[3]۔ کوئی اسے کھڑی بولی قرار دیتا ہے[4]۔ کسی کے نزدیک شورسینی پراکرت کی شاخ ہے[5] اور کوئی فارسی کی ملاوٹ سے ظہور پذیر قرار دیتا ہے[6]۔ اسے اپ بھرنش بھی کہا گیا ہے[7] اور کسی سے بالائی دوآبہ اور مغربی روہیل کھنڈ کی زبان بھی قرار دیا ہے[8]۔ کوئی ان پراکرتوں سے بھی پہلے دوآبہ کے بالائی حصے کی کسی بولی سے مشتق قرار دیتا ہے[9]۔ کسی کو پنجابی اور ملتانی کے ساتھ اردو کے قواعد مشترک نظر آتے ہیں[10]۔ کوئی اسے سندھی پر عربی کے اثرات کا نتیجہ سمجھتا ہے[11] اور کوئی دکن میں عربوں اور افغانوں کی فتوحات سے مستحکم قرار دیتا ہے[12]۔ کوئی محض فارسی کی ہندی میں آمیزش کہتا ہے[13]۔ کوئی اسے وادی سندھ کی دراوڑی بولیوں اور یونانی اثرات کا معجون مرکب بتاتا ہے[14] اور کوئی کہتا ہے کہ یہ آزاد اور بھری پری بولی ہے[15]۔ اس کی اپنی آوازیں ہیں، اپنے اصول، اپنا ذخیرۂ الفاظ ہے، جو لفظ اس میں آ گیا، وہ اس کا ہو گیا[16]۔ اس زبان نے کسی بھی علاقے یا بولی سے جنم لیا ہو، یہ بات مسلمہ ہے کہ اس کی پرورش اور ترقی میں مسلمانوں نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ تاریخ ادب کے معروف محقق ڈاکٹر جمیل جالبی کے نزدیک اردو زبان مسلمانوں کے زیر اثر پروان چڑھی، وہ بھی اسے برعظیم پاک و ہند کی تمام زبانوں کی زبان (لسانُ الالسنہ) قرار دیتے ہیں[17]۔ اسی بات کو ہم نے لسانُ الارض کا نام دیا ہے۔

انشاء اللہ خان انشاء سے لے کر ڈاکٹر جمیل جالبی تک ان تمام محققین اور ماہرین لسانیات و تاریخ ادبیات کی تحقیقات اور بیانات کی تفصیل میں جانا تو یہاں ممکن نہیں لیکن ان سب سے جو معلومات حاصل ہوتی ہیں، ان کا لب لباب یہ ہے کہ اردو اس زمین کی، اس دھرتی کی قدیم و جدید زبانوں کا ایک خوبصورت امتزاج ہے۔ اس نے قدیم دراوڑی زبانوں میں جڑیں پکڑی ہیں تو ہند، آریائی زبانوں میں پروان چڑھی ہے۔

سامی اور تورانی زبانوں نے اسے برگ و بار عطا کیے ہیں تو ہند، یورپی زبانوں کی فضا سے بھی اس نے رابطہ جوڑا ہے۔ اردو میں جہاں قدیم سنسکرت، پہلوی اور فارسی کا ذخیرہ الفاظ ہے، وہیں جدید ہندی، فارسی، عربی، ترکی زبانوں کا آمیزہ بھی ہے۔ اس میں پراکرتوں مثلاً پالی، پیشاچی، شورسینی، برج بھاشا، اُپ بھرنش سے لے کر دکھنی زبانوں تلگو، ملیالم، تامل، کرناٹکی، کنتری نیز بنگلہ، آسامی تک اور سندھی، پنجابی، لنڈا، جٹکی، پشتو، ملتانی، بلوچی، براہوی تک کے الفاظ موجود ہیں۔ اس نے یورپی زبانوں مثلاً

یونانی، پرتگالی، ہسپانوی، ولندیزی، فرانسیسی اور انگریزی سے بھی کسبِ فیض کیا ہے"۔

حوالہ جات

1- سید احمد دہلوی، فرہنگِ آصفیہ، نئی دہلی (1987ء) حصہ اول۔ "اردو"۔
2- انشاء اللہ خان انشا، دریائے لطافت، ترجمہ: دتاتریہ کیفی، اورنگ آباد (1935ء)
اور میر امن، باغ و بہار، لاہور، ص:4
3.Gilchrist,L.B.,**HindoostaniPhilology**,London,(1810)P:261
4- مسعود حسین خان، مقدمہ تاریخ زبان اُردو، لاہور (1966ء)، ص:91۔
5- حامد حسن خان، مقدمہ تاریخ زبان اُردو، لاہور، (1966ء) ص:7۔
6- محمد حسین آزاد، آبِ حیات، لاہور، (1957ء) ص:6۔
7- محی الدین قادری زور، ہندوستانی لسانیات، لاہور، (1966ء) ص ص:115,112۔
8.Grierson, G.A., **The Imperial Gazetter of India**, Vol 1, Oxford, (1909), P: 362.
9- ڈاکٹر شوکت سبزواری، اُردو لسانیات، کراچی، (1966ء)، ص:15۔
10- حافظ محمود شیرانی، پنجاب میں اُردو، اسلام آباد، (1988ء) ص:64۔
11- سید سلیمان ندوی، نقوشِ سلیمانی، اعظم گڑھ، (1980ء)، ص:31۔
12- بحوالہ: نصیر الدین ہاشمی، دکن میں اُردو، حیدر آباد دکن، (1926ء)۔
13- وحید الدین سلیم، وضع اصطلاحات، کراچی، (1965ء)، ص:27،
مولوی احمد دین، سرگزشتِ الفاظ، لاہور، (1932ء)، ص:5،
ڈاکٹر عبادت بریلوی، مقدمات عبدالحق، لاہور، (1964ء)، ص:121۔
14- عین الحق فریدکوٹی، اُردو زبان کی قدیم تاریخ، (مارچ 1979ء)، ص ص:311,58 (طبع دوم)
15- ڈاکٹر سہیل بخاری، اُردو کا روپ، (مارچ 1971ء)، ص:13۔
16- انشاء اللہ خان انشاء، محولہ بالا۔
17- ڈاکٹر جمیل جالبی، تاریخ ادب اُردو، جلد اول، لاہور (جولائی 1975ء)، ص:473۔

تحقیقی رپورٹ تیار کرنے کا مرحلہ مقالہ نگاری یا تحقیق نگاری کہلاتا ہے۔ اس کا آغاز تسوید (Drafting) سے ہوتا ہے اور نظرِ ثانی (Revision) اور تدوین (Editing) کے مرحلے سے گزرتا ہوا مطبع پیشکش کے قابل ٹھہرتا ہے۔ مقالہ نگاری اور تصنیف و تالیف دو جداگانہ کام ہیں۔ ہر ایک کا اپنا مقصود اور رخِ نظر ہوتا ہے۔ مقالہ نگار کا کوئی بات کہنے کا مطلب کچھ اور ہوتا ہے اور مصنف کا کچھ اور۔ اکثر تحقیق کار نہیں

جانتے کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں اور چند یہ بھی نہیں جانتے کہ جو کچھ وہ کہنا چاہتے ہیں، وہ کس طرح سے کہیں۔ چنانچہ یہ بات سمجھنے کے لیے کہ انھیں اپنی بات کس طرح سے کہنا ہے، انھیں کم از کم مندرجہ ذیل تکنیکی مرحلوں کو ملحوظ رکھنا ہوگا:

2- مقالہ نگاری کے تکنیکی مراحل

ماقبل تحریر و تسوید

تحقیق کار کو مقالے کی مسودہ نگاری سے قبل اور کوائف کی جمع آوری سے پہلے مندرجہ ذیل امور کا لحاظ رکھنا چاہیے:

1.2.1- اس انتظار میں نہ رہیں کہ جب تک تمام ماخذ کوائف جمع نہ ہو جائیں گے مقالہ نگاری شروع نہ کریں گے۔ ایک معقول حد (تقریباً 66%) تک مواد جمع ہو جائے تو مقالہ لکھنا شروع کر دیں۔

1.2.2- مواد کو ہمیشہ اپنا فرضیہ اور خاکہ سامنے رکھ کر ترتیب دیں۔

1.2.3- اپنے تمام نوٹ پرچیوں کے عنوانات یعنی اپنے تمام نکات، سرخیاں ایک کاغذ پر ترتیب وار لکھ لیں۔

1.2.4- اپنے نکات کی گروہ بندی خاکے کے مطابق اور منطقی (آسان سے مشکل، ابتدا سے آخر اور پہلے سے آخری نکتے کے مطابق) ترتیب دیں۔

1.2.5- اپنے نکات کے عنوانات اسی ترتیب سے کاغذ پر لکھ لیں جس طرح سے ان کی گروہ بندی کی ہے۔

1.2.6- طویل مسل یا مختصر مسل کسی بھی صورت میں مواد اور نوٹ مرتب کریں۔

تحریر و تسوید

مسودہ نگاری یا تسوید مقالے کا پہلا مسودہ تیار کرنے کا نام ہے۔ ضروری ہے کہ تمام ابواب بیک وقت لکھنا شروع کریں۔ ابتدائی طور پر جس باب کا مواد زیادہ موجود ہو اسے تحریر میں لائیں۔ پھر دوسرے ابواب لکھیں۔ پہلا مسودہ ہمیشہ پہلا ہوتا ہے۔ اس پر نظر ثانی کا عمل جاری رکھیں۔ مقالے کو زیادہ سے زیادہ وضاحت کے ساتھ مگر مختصر لکھیں۔

یہ سنہرا اصول یاد رکھیں کہ نوٹ تیار کرتے وقت زیادہ سے زیادہ اور تحریر کے وقت کم سے کم مواد پیش کریں۔ ڈاکٹر جوزف لیوائن نے اپنی ویب سائٹ پر مقالہ نگاری کے لیے تیرہ نکات کی طرف توجہ دلائی ہے:

1- اس حصے کو پہلے لکھیں جس کے بارے میں آپ زیادہ جانتے ہیں یعنی جس باب یا اس کے جزو کے بارے میں سب سے زیادہ مواد جمع ہو گیا ہے، اسے پہلے لکھیں۔

2- اپنی تجویز کو دوبارہ دیکھیں۔ اس کا صیغہ مستقبل (میں یہ کروں گا) (یہ ہوگا وغیرہ) کو صیغہ ماضی میں بدل لیں اور اب اپنے طریق کار کا جائزہ لیں۔

3- اگر کہیں افراد، اداروں اور مقامات کے اصل نام چھپانے ہیں تو ابھی وہ وقت نہیں آیا۔
ان کے اصل نام ہی لکھیں۔

4- نظر ثانی سے پہلے ہر باب کا مسودہ/پروف مختلف قسم/رنگ کے کاغذ پر لیں۔

5- پہلے مسودے میں گراف اور جدولیں ہاتھ سے بنائیں۔

6- ہاتھ سے لکھا ہوا مسودہ صاف، واضح اور خوانا پذیر ہو۔ خوانا پذیری کے لیے ضروری ہے
کہ اپنے مخصوص الفاظ اور اصطلاحوں کی فہرست تیار کرلیں اور ان کے معانی لکھ لیں۔

7- مقالہ لکھنے سے پہلے دوسرے مقالوں کی تحریر و تسوید کا جائزہ لے لیں۔

8- جب بھی جدول شامل کریں، متن میں اس کی تشریح کریں۔

9- ایک سے زیادہ جدولوں کو ایک جیسے الفاظ ہی میں بیان کریں۔

10- ہر باب کی فہرست مندرجات بنائیں۔ اس کی ترتیب کا جائزہ لیں کہ کہیں کوئی نکتہ چھوٹ
تو نہیں گیا۔

11- اپنے نتائج اور حاصلات کو حقیقی اور اصل نکات کی صورت میں پیش کریں۔

12- حاصلِ مقالہ سفارشات ہوتی ہیں۔ اپنی سفارشات کو بار بار پڑھیں اور دیکھیں کہ آپ
کی سفارشات حقیقی اور مبنی بر مقالہ ہیں۔

13- پہلا باب/ابواب سب سے آخر میں لکھیں جس میں رسمیاتِ تحقیق حتمی صورت میں بیان
کی جاتی ہیں۔ گویا دراصل پہلا باب دوبارہ لکھیں۔

نظرِ ثانی

1- نیا سواد ملنے پر مقالے میں اس کی متعلقہ جگہیں تلاش کریں اور اپنے مسودے کو پڑھ کر استدلال کے مطابق شامل کریں۔

2- مسودے کو تنقیدی نظر سے دیکھیں اور بار بار مختلف مقامات پر سوالیہ نشانات لگائیں اور خود سے پوچھیں "یہاں کیا کروں؟"، "یہاں دلائل موجود نہیں!"، "یہاں مزید مواد/کوائف درکار ہیں!"۔

نظرِ ثالث یا تدوین

1- اپنے طور پر مسودہ مکمل کرنے کے بعد چند روز کے لیے چھوڑ دیں اور کچھ عرصہ بعد

اسے پھر دیکھیں۔

2- جب دوسری بار نظر ثانی کرنے لگیں تو پہلے یہ دیکھیں کہ مسودہ خاکہ کی ترتیب کے مطابق ہے یا نہیں۔ اس کے مطابق ضروری تبدیلیاں کریں۔

3- اگر استدلال اور مواد کا تقاضا ہو تو خاکے میں بھی جزوی تبدیلی کی جا سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی نئے پہلو سے کوائف ملے ہوں۔

4- ایسے مقامات کی نشان دہی کریں جہاں بات واضح نہیں ہوئی۔

5- ایسے مقامات کی نشاندہی کریں جہاں استدلال کمزور ہے۔

6- ایسے مقامات کی نشاندہی کریں جہاں مزید شواہد درکار ہیں۔

7- دیکھیں کیا ہر جملہ اور پیراگراف آپ کے دعوے (Thesis) سے متعلق ہے یا نہیں۔

8- کیا ترتیب اور تنظیم موزوں نظر آتی ہے؟

9- کیا آپ نے مقالہ بتانے، سمجھانے اور حقائق سامنے لانے کے انداز میں تحریر کیا ہے؟

10- کیا آپ کی بصیرت اور دقت نظری بھی مقالے میں نظر آ رہی ہے؟

11- کہیں غیر ضروری مواد اور طویل عبارتیں تو اس مقصد میں حائل نہیں ہیں؟ وہ کون سی عبارتیں ہیں جن کے بغیر بھی گزارا ہو سکتا ہے؟

12- زبان و بیان کو اور کتنا بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ الفاظ و اصطلاحات کی یکسانی، جملوں کی واضح اور بامعنی انداز میں پیشکش۔

نظر ثانی یا دہرائی کا عمل ایک سے زیادہ بار بھی ہو سکتا ہے۔ Revise کرنے کے لیے "نظر ثانی" کے علاوہ کوئی موزوں لفظ نہیں۔ عام طور تیسری یا چوتھی بار دہرانے کو نظر ثالث یا نظر چہارم نہیں کہتے بلکہ اسے بھی نظر ثانی ہی قرار دیتے ہیں۔

دہرانے تہرانے کا یہ عمل جتنی بار بھی کیا جائے یہ تسوید اور مبیضہ کی تیاری کا درمیانی پل ہی ہوگا۔ اسے تدوین بھی اس لحاظ سے کہتے ہیں کہ اس مرحلے پر غیر ضروری مواد کی کاٹ چھانٹ ہوتی ہے۔

3- پیرا نگاری

پیرا نگاری کے اصول

مقالہ نگاری میں سب سے مشکل مرحلہ کسی باب کی ساری عبارت کو پیراگرافوں کی صورت میں درج کرنا ہے۔ پیراگراف دراصل قاری کو ٹھہرنے، توقف کرنے اور سکون و اطمینان کے لیے وجود میں لائے جاتے ہیں۔ پہلا پیراگراف لکھنا تو اور بھی مشکل کام ہے۔ عبارت کو چند پیراگرافوں میں تبدیل کرنے کی ایک بنیادی منطق موجود ہے۔ عام طور پر پیراگراف بیان کے ایک نکتے کی وضاحت کا نام ہوتا ہے۔ اس کی وضاحت درج ذیل ہے:

میلبورن یونیورسٹی کے ڈاکٹر مارٹن ڈیوس کے نزدیک پیراگراف تحریر کی اینٹیں ہیں اور تحریر میں منطقی توڑ یا فاصل کا کام دیتے ہیں، مطالعے میں مدد فراہم کرتے ہیں اور خیال افروزی کرتے ہیں۔ پیراگراف تصور کی اکائی کو بیان کرتا ہے۔ ہر پیرے میں صرف ایک نیا خیال ہونا چاہیے۔ پیرے کی ساری عبارت مربوط اور وحدت کا اظہار ہوتی ہے۔ ڈاکٹر صدیق شبلی نے اس موضوع پر تفصیل سے لکھا ہے جس کا خلاصہ یوں ہے:

''پیراگراف کا مفہوم کم و بیش ہر پڑھا لکھا شخص سمجھتا ہے لیکن تدوین کار کو اس سے کہیں زیادہ جاننے کی ضرورت ہے۔ ایک عام آدمی کو پیراگراف کی ماہیئت اور نوعیت جاننے کی ضرورت نہیں، اس کا کام اس کے بغیر بھی چل جاتا ہے۔ ایک تخلیقی اہل قلم بھی ان کا نظری علم نہیں رکھتا مگر مدیر کے لیے ان مسائل پر نظر رکھنا ضروری ہے''۔

وہ اُسلوب کے اعتبار سے پیراگراف کی چار اقسام بتاتے ہیں۔ ایک بیانیہ جو عام طور پر واقعات اور کہانیوں کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ دوسرے توصیفیہ جن میں کوائف تفصیلات وغیرہ بیان کی جاتی ہیں۔ تیسرے توضیحی اور ان میں ایک نکتے کی وضاحت کی جاتی ہے، اس کے لیے مثالیں لائی جاتی ہیں، موازنہ کیا جاتا ہے، علت و معلول کی نشاندہی کی جاتی ہے، اشیاء کی درجہ بندیوں کا بیان ہوتا ہے۔ چوتھی قسم کا پیراگراف ترغیبی ہوتا ہے جس کا مقصد پڑھنے والے کو دلائل کے ذریعے قائل کرنا ہوتا ہے۔ اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''اپنے مقام کے اعتبار سے پیراگراف کی تین قسمیں قرار دی گئی ہیں۔ ایک تمہیدی، دوسرے وسطی اور تیسرے اختتامی...... تمہیدی پیراگراف یعنی ہر باب کا پہلا پیرا، جس میں موضوع کو متعارف کرایا جاتا ہے اور اس کے حدود کا تعین کیا جاتا ہے، یہ کام ایک ہی پیراگراف میں مکمل ہو جانا چاہیے۔ موضوع کی اگر دشواری مزید ایک پیراگراف کا تقاضا کرے تو کوئی ہرج نہیں، لیکن تمہید اس سے زیادہ نہیں ہونی چاہیے۔ تمہید کے بعد وسطی پیراگراف آتے ہیں۔ ان میں موضوع کی وضاحت کی جاتی ہے۔ وسطی پیراگرافوں کی تعداد کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس کا انحصار باب کی طوالت پر ہے۔ کوئی باب جتنا طویل ہوگا، وسطی پیراگراف اتنے ہی زیادہ ہوں گے۔ اختتامی پیراگراف میں پورے باب کی بحث سمیٹی جاتی ہے یا کم از کم اسے پڑھ کر بات کے مکمل ہونے کا احساس ضرور ہو جاتا ہے اور کوئی تشنگی باقی نہیں رہتی''۔

اُردو میں ابھی اس بارے میں کوئی تحقیق نہیں ملتی کہ معیاری پیراگراف میں کتنی سطریں ہونی چاہئیں۔ انگریزی میں سات سے دس سطور کے پیراگراف کو معیاری قرار دیا گیا ہے۔ اُردو میں چھوٹے بڑے ہر سائز کے پیراگراف بلکہ کئی صفحات پر مبنی پیراگراف مل جاتے ہیں۔ پیراگراف کی طوالت کا انحصار اس خیال پر ہوتا ہے جو اس میں بیان کیا جاتا ہے۔

پیراگراف کی وحدت بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ یہاں وحدت کا مطلب ہے کہ پیراگراف میں جو

ایک خیال بیان کیا گیا ہے، اسے کتاب یا باب کے مرکزی خیال کے تابع ہونا چاہیے۔ اس سلسلے میں معمولی سا انحراف، وحدت کے اس رشتے کو کمزور کر دیتا ہے۔ ہر پیراگراف موضوع کو آگے بڑھانے کا باعث ہو۔ اسی لیے پیراگراف میں ضروری اور غیر ضروری اجزا کا تعین ناگزیر ہے۔

راتھ نے اس موضوع پر تفصیل سے بیان کی ہے۔ پہلا پیراگراف لکھنے کے لیے اس کی تجاویز میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

1- پہلے پیراگراف میں اپنے موضوع کی وضاحت کریں۔
2- موضوع کے بارے میں اپنا موقف اور نقطۂ نظر بیان کریں۔
3- کسی عام مفروضے پر وار کریں۔
4- اپنے موضوع میں کسی تضاد کی نشان دہی کریں۔
5- اپنے موضوع سے متعلق کسی شخصیت کا ذکر کریں۔
6- موضوع کا پس منظر بیان کریں۔
7- کسی مختصر اقتباس سے شروع کریں۔

اس کے مطابق مندرجہ ذیل طریقوں سے بچیں کہ یہ ناپسندیدہ ہیں:

1- اپنے عنوان کو نہ دہرائیں۔
2- غیر سنجیدہ یا ہلکی پھلکی شروعات نہ کریں۔
3- قاری سے سوال نہ پوچھیں۔
4- موضوع کے مرکزی لفظ کی لغوی تعریف نہ کریں۔ اگر لغات کی تعریف دینا ہی ہے تو پہلے ہی جملے میں نہ دے۔
5- ابتدا ہی میں مقالے کا مرکزی دعویٰ (Thesis) پیش نہ کریں۔
6- شروع ہی میں انکشاف نہ کر دیں کہ آپ مقالے میں کیا کہنا چاہتے ہیں۔ یعنی نتائج صرف آخر میں درج کریں۔

ایسا صرف کتابی صورت یا تصنیف و تالیف میں ہوتا ہے۔ وہاں مقالے کا آخری باب پہلا باب ٹھہرتا ہے۔ ڈاکٹر ڈیوس نے پیراگراف لکھنے کے مندرجہ ذیل اصول بتائے ہیں:

1- مثالیں، اعداد و شمار، شواہد استعمال کر کے تصور واضح کریں۔
2- اصطلاحات کی توضیح کریں اور مثالیں دیں۔
3- موازنے، جائزے اور جانچ کو اپنا ہتھیار بنائیں۔

پیراگراف میں مواد

عبارت کے ایک پیراگراف میں صرف ایک تصور یا نکتہ پیش کریں۔ دوسرے تصور یا نکتے کے لیے دوسرا پیراگراف لکھیں۔ ذیلی تصورات یا نکات کے لیے نئے پیرے استعمال کریں۔ ایک پیراگراف کم سے کم

پانچ جملوں اور زیادہ سے زیادہ نصف صفحے تک ہو۔ طویل پیراگراف پڑھنے مشکل ہوتے ہیں۔ پہلے جملے میں عنوان کا ذکر اور اگلے جملوں میں وضاحت درج ہو۔

آخری پیرے میں ساری باتوں یا نکات کا لب لباب یا حاصلِ کلام دیں۔ ایلٹک کچھ بہتر اختتام چاہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ آخری پیرے میں متعلقہ باب کی تحقیق کا خلاصہ اس طرح کریں کہ معلوم نہ ہونے پائے کہ آپ تلخیص دے رہے ہیں۔ چاہیے تو یہ تھا کہ دریافت کی اہمیت بھی روشن کی جاتی لیکن سائنسی تحقیق میں ایسا ممکن ہے، ادبی تحقیق میں اہمیت بتانے کی خاص ضرورت نہیں۔ پیراگراف کی اقسام کے ہوتے ہیں۔ پیراگراف کا مواد اسی قسم پر مبنی ہوگا، جیسے درجہ بندی یا صنف بندی، موازنہ اور تقابل، عمل کا بیان، تعریفات، توضیحات، انتخاب اور پسند، تشریح، جائزہ وغیرہ۔ ان میں سے کسی میں اہمیت بتانے کی ضرورت نہیں۔ پارسنس نے بھی یہی کہا ہے کہ اختتامیہ میں یہ نہ کہیں کہ مقالے میں نہایت اہم دریافتیں پیش کی گئی ہیں۔ احساسِ تفاخر سے کام نہ لیں۔ اپنی تعریف خود نہ کریں۔ مقالے کے نتائج بیان کرتے ہوئے عجز اختیار کریں۔ فخر کرنے سے مقالے میں زور پیدا نہیں ہوتا۔

آپ کا طریقِ تحقیق اور نتائج اپنا بیان آپ ہوں گے۔ اس پر دوسروں کی آراء یعنی معاصر جائزہ (Peer Review) ہی کسی تحقیق کو واثق اور وقیع (Valid) قرار دے سکتا ہے۔ وہ جو کہتے ہیں ع

عطر آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید

آپ کی تحقیق کی عالمانہ شان انھی اندراجات، حوالوں، حواشی، پیراگراف، منطقی ترتیب، استدلال اور نتائج کے اخذ کرنے سے واضح ہوگی۔ کسی کی ذاتی رائے مختلف ہو سکتی ہے۔ کوئی اس تحقیق کو رد بھی کر سکتا ہے۔ لیکن علمی دنیا میں ایک اجتماعی رائے دیکھی جاتی ہے۔ انفرادی آراء مل کر جس رجحان کو ظاہر کریں، وہی مثبت رائے ہوتی ہے۔ کسی نابغہ کی دریافت الگ بات ہے۔

پیرا بندی

پیرا بندی پیرا نگاری سے جدا معاملہ ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ مختلف پیرے کس انداز سے پیش کیے جائیں۔ ایک اصول منطقی ترتیب کا بیان ہوا ہے۔ دوسرا اصول یہ ہے کہ تمام پیروں کی نمبر شماری کر دی جائے۔ بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہر ذیلی یا ضمنی عنوان کو ایک نمبر دیا جائے اور ہر پیرے کو اعشاریے کے بعد اسی نمبر کی توسیع قرار دیا جائے، جیسے:

ذیلی عنوان نمبر: 1
پہلا پیراگراف: 1.1
دوسرا پیراگراف: 1.2
تیسرا پیراگراف: 1.3

مختصر مقالے میں یوں بھی ہو سکتا ہے کہ تمام پیراگراف ایک عددی ترتیب سے دیے جائیں۔ یعنی پہلے پیراگراف کو ایک نمبر اور پھر ہر پیراگراف کو اس سے اگلا نمبر دیا جائے۔

اس پیرا بندی کا فائدہ یہ ہے کہ ان کا حوالہ آسانی سے دیا جا سکتا ہے۔ مواد کے الٹ پھیر اور ترتیب نو کے لیے متعلقہ نمبر کو خارج کر کے باقی پیراگرافوں کو نئے نمبر دیے جا سکتے ہیں۔

عنوان بندی

تدوین کا ایک اہم عنصر عنوان بندی ہے۔ پہلے تو ہر باب کا ایک عنوان رکھا جاتا ہے۔ درسی اور علمی کتب میں ہر باب کئی حصوں میں تقسیم ہوتا ہے۔ ان حصوں کے بھی ذیلی عنوانات ہوتے ہیں۔

عنوان درج کرنے کے لیے ڈاکٹر صدیق شبلی نے مندرجہ ذیل سفارشات دی ہیں:

"باب کا عنوان صفحے کے وسط ہی میں لکھنا بہتر ہے لیکن ذیلی عنوان صفحے کے دائیں بائیں جانب ذرا سا حاشیہ چھوڑ کر لکھا جاتا ہے۔ عنوان جلی حروف میں لکھے جاتے ہیں۔ یہ اس طرح لکھے جائیں کہ عنوان اور جلی عنوان کا فرق قائم رہے۔ نستعلیق میں یہ مسئلہ مختلف نمبروں کے قلم (پوائنٹ) استعمال کر کے حل کیا جا سکتا ہے۔ البتہ ٹائپ میں اس کا حل ذرا مشکل ہے۔ عنوانات اور ذیلی عنوانات پر نمبر لگا کر یہ کام آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً:

باب	6
ذیلی عنوان	6 - 1
دوسرا ذیلی عنوان	"6 - 1 - 1

انگریزی میں پیراگراف شماری کے لیے اعداد و حروف کی مندرجہ ذیل صورتیں عام طور پر استعمال ہو رہی ہیں۔

(1)	انگریزی اعداد	4,3,2,1
(2)	رومن اعداد	IV,III,II,I
(3)	انگریزی اعداد قوسین میں	(3), (2),(1)
(4)	رومن اعداد قوسین میں	(i i),(ii),(i)
(5)	بڑے انگریزی حروف	C,B,A
(6)	چھوٹے انگریزی حروف	c.b.a

ایک دو اس کے علاوہ ہیں مگر ان سب کی بنیاد انگریزی اور رومن اعداد اور انگریزی کے چھوٹے بڑے حروف پر ہے۔

اُردو میں حروف و اعداد کا یہ تنوع موجود نہیں۔ صرف سادہ اعداد 3,2,1 وغیرہ اور حروف الف، ب، ج وغیرہ رائج ہیں۔ انگریزی میں جس طرح رومن ہندسے استعمال ہو رہے ہیں اُردو میں کسی اور قسم کے ہندسے استعمال نہیں ہو سکتے۔

اس مقصد کے لیے اُردو حروف تہجی کا استعمال بھی غور طلب ہے۔ جس کے لیے مندرجہ ذیل طریقے رائج ہیں۔

1- الف سے ے تک اُردو کے تمام مفرد حروف کا استعمال
2- الف سے ے تک مفرد حروف کا استعمال ابجدی ترتیب سے
3- الف سے ے تک صرف انفرادی شکل کے مفرد حروف کا استعمال
4- مرکب حروف کا استعمال

پہلے ہم نمبر دو کو لیتے ہیں۔ اس میں حروف عربی کی ابجدی ترتیب سے اس طرح لکھے جاتے ہیں۔

الف ب ج د ہ و ز ح ط ی ک ل م ن س ع ف
ص ق ر ش ت ث خ ذ ض ظ غ

لیکن اس ترتیب کا یاد رکھنا آسان کام نہیں۔ اس کے علاوہ یہ کہ اس میں کل 28 حروف آتے ہیں۔ نمبر ایک ابجدی ترتیب کے مقابلے میں بہت زیادہ آسان ہے۔ الف سے ے تک حروف کی ترتیب یاد رکھنا مشکل نہیں ہے اور ابجدی الفبا کے مقابلے میں ان کی تعداد بھی زیادہ ہے، لیکن اس ترتیب میں ایک قباحت ہے کہ اُردو میں ہم شکل حروف کافی ہیں اور ان میں امتیاز صرف نقطوں ہی سے قائم رہتا ہے، اس لیے نقطوں کے اِدھر اُدھر ہونے سے حرف کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔

ا ب ج د ر س ص ط ع ف ک ل م ن و ہ ی ے

اس ترتیب میں حروف کی انفرادی شکلیں اختیار کرنے کی وجہ سے غلطیوں کا امکان تو کم ہو جاتا ہے مگر حروف کی یہ تعداد ضرورت کے مقابلے میں ناکافی ہے۔ اس کا حل چوتھی صورت میں موجود ہے۔ تیسری صورت کے مطابق الف سے ی تک پیراگراف شماری کرنے کے بعد پھر الف سے شروع کریں اور اس بار دو دو حروف لیے جائیں۔ مثلاً:

اب، اج، اد، ار، اس .... الخ
با، بج، بد، بر، بس .... الخ
جا، جج، جد، جس .... الخ
دا، دج، دو، دس .... الخ

ہونا تو یہ چاہیے کہ پہلی ذیلی تقسیم حسب ذیل ہو:

الف، ب، ج، د، ر، س، ص، ط، ع، ف، ق، ک، ل، م، ن، و، ہ، ی، ے

جہاں ذیلی اجزا بیس سے زیادہ ہوں، وہاں ہندسے استعمال کیے جائیں، بصورت دیگر اجزاء میں مزید ضمنی تقسیم درکار ہو تو اسے ہندسوں میں درج کیا جائے یعنی:

5, 4, 3, 2, 1

4- مبیضہ مسودہ

مقالہ یا مضمون آخر میں جو روپ لیتا ہے، اسے مبیضہ (Copy Text) کہتے ہیں۔ مبیضہ ہی مقالے کی تکمیل ہے۔ یہاں دہرانے کے عمل اور مبیضہ نگاری کے بارے میں چند الفاظ کہنا نامناسب نہ ہوگا۔ اس عمل میں کئی پہلوؤں کی طرف توجہ کی جاتی ہے، جیسے:

1- حذف و اضافہ۔ پہلے مسودے کی تکمیل کے بعد ہم جب اسے دوبارہ دیکھتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ مسودے کے کچھ حصے حذف کر دیے جائیں اور کچھ مزید مواد کا یہاں وہاں اضافہ کیا جائے۔

2- بہتر ترتیب۔ ترتیب ایسی منطقی ہونی چاہیے کہ ایک باب سے دوسرا باب، ایک ذیلی جزو سے دوسرا ذیلی جزو منطقی طور پر اور زنجیر کی کڑیوں کی طرح مسلسل منسلک ہو گیا ہو۔ دہرانے کے عمل پر غور کریں، کیا موجودہ ترتیب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک خیال کا دوسرے خیال سے ارتقا فطری ہے؟ کیا ترتیب اور بہتر ہو سکتی ہے؟ کیا کوئی بات پہلے تو نہیں آ گئی جسے آخر میں ہونا چاہیے تھا؟ سابقہ نکات نظر ثانی کو پھر سامنے رکھیں اور مسودے کو ان کے لحاظ سے دیکھیں۔

3- توثیق۔ حقائق اور حوالوں کی صحت کے حوالے سے تیسرا مقصود حوالوں اور دوسرے حقائق کی درستی کی ایک بار پھر توثیق ہوتا ہے۔ پہلی بار عموماً حوالوں کو مفصل اور متن کے برابر حاشیے میں لکھ لیا جاتا ہے۔ مبیضہ نگاری کے وقت انھیں پاورقی میں اور مختصر درج کیا جائے گا۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ پہلے مسودے ہی میں حوالے کی تمام ضروری تفصیلات، بالخصوص صفحے کا نمبر وغیرہ لکھ لیا جائے تاکہ مسودہ لکھتے وقت پڑھنے کے ماخذ کی طرف رجوع نہ کرنا پڑے۔

4- تعدد۔ نظر ثانی کا عمل کب اور کتنی بار کیا جائے اس کے بارے میں مختلف آرا ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند لکھتے ہیں کہ پہلی تسوید کے کچھ وقت گزرنے کے بعد ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ ہم اپنے ماخذ، مواد اور استدلال میں کیا کیا حذف و اضافہ و ترمیم کر سکتے ہیں۔ یعنی مسودہ چند روز کے لیے چھوڑ کر پھر دیکھیں۔

بقول راتھو اپنے کسی پرانے مضمون کو پڑھ کر دیکھیں۔ کیا آپ اب بھی اسے اتنا ہی اچھا سمجھتے ہیں جیسا کہ لکھتے وقت سمجھتے تھے۔ غالباً نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ وقت گزرنے کے بعد اب آپ زیادہ معروضی اور غیر جانب دار ہیں۔ آپ زمانی فاصلے سے دیکھ سکتے ہیں۔ اس لیے بہترین یہ ہے کہ مضمون کو لکھ کر کم از کم ہفتہ یا اس سے زیادہ کے لیے رکھ دیں اور بھول جائیں۔ کوئی اور کام کریں۔ اس کے بعد ترمیم کریں اور بار بار کریں۔

اشاعت میں تاخیر سے اس کے مواد اور اسلوب دونوں پر نظر ثانی ہو سکتی ہے۔ نظر ثانی وقفوں وقفوں سے کریں۔ مسودہ اپنے دوستوں کو پڑھنے کو دیں، خاص طور پر انھیں جو آپ کے سخت نقاد ہو سکتے ہیں، مداح نہیں۔ ان سے تنقید کرنے کو کہیں۔ اپنے نگران کو حتمی مسودہ یا مبیضہ ہی دکھائیں۔ اپنے کام پر بھی تفاخر کی نظر نہ ڈالیں۔

تحریر کو بار بار دیکھنے اور مناسب وقت تک انتظار کرنے سے اس میں پختگی آ جاتی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی باریک اور خوشخط لکھتے تھے۔ تحقیق نگاری کے لیے صحافیانہ گھسیٹ مناسب نہیں ہوتی۔ مولانا محمد حسین آزاد کے بارے میں مشہور ہے کہ لاہور کے ایک بک ڈپو میں ایک بار دیکھا گیا کہ وہ ایک پرچے پر کچھ لکھ کر بار بار کاٹ رہے ہیں، پھر لکھ رہے ہیں، کاٹ رہے ہیں۔ کسی نے پوچھا "مولانا کیا لکھ رہے ہیں؟" انھوں نے جواب دیا کہ "دوسرے کمرے سے چپراسی کے ہاتھ ایک کتاب منگوانی ہے۔ رقعے پر خاطر خواہ جملہ نہیں بن رہا ہے"۔

ڈاکٹر گیان چند لکھتے ہیں کہ ان کے پاس اس بیان کا تحریری ماخذ نہیں لیکن ایک مماثل واقعے کے پیش نظر یہ سچ معلوم ہوتا ہے۔ آزاد کے ایک مقرب مولوی خلیل الرحمٰن کا بیان ہے کہ ایک بار آزاد نے انھیں رقعہ بھیجا "عزیز من چوں از چیف کورٹ بہ خانہ روند بر کتب خانۂ آزاد بگذرند۔ والسلام۔ آزاد" یہ وہاں گئے تو دیکھا کہ رقعہ متذکرہ بالا کے پانچ چھ (یا زیادہ ٹھیک یاد نہیں رہا کہ کتنے) مختلف الٹ پھیر کے ساتھ مسودے میز پر پڑے ہوئے ہیں۔

یہ مثالیں تخلیقی تحریروں کی ہیں۔ بار بار ترمیم و تنسیخ تخلیقی ادب میں تو کی جاتی ہے۔ تخلیقی ادیب نظر ثانی میں محض زبان چکاتا ہے، تحقیق کار زبان بھی چکاتا ہے اور اس سے کہیں زیادہ مواد اور کوائف میں حذف و اضافہ، ترمیم و ترتیب نو سرانجام دیتا ہے۔

کمپیوٹر پر یہ عمل بآسانی ممکن ہے۔ وہ مسودے کو کاٹ چھانٹ کر کے اپنے ٹائپ کار کو دے سکتے ہیں۔ وہ صاف ٹائپ کر دے گا۔ اس کے بعد اس پر نظر ثانی کی جا سکتی ہے اور پھر ٹائپ کار مبیضہ تیار کر دے گا۔ کمپیوٹر آنے سے سہولت بڑھ گئی ہے۔ مسودہ ذخیرے میں محفوظ رہتا ہے اور اسے الٹ پلٹ کرنا، تصحیح کرنا، متن کو ایک سے دوسری جگہ لے جانا آسان ہوتا ہے۔

حتمی مسودہ تیار کر کے اپنے نگران کو دکھائیں مگر ابھی اسے حتمی مبیضہ نہ سمجھیں۔ نگران بھی اصلاح کرے گا اور اس کے مطابق ترمیم و اضافہ کرنا ہوگا۔ اس لیے مبیضہ وہی ہوگا جسے امتحان کے لیے پیش کیا جائے گا۔

مسودہ نگران کو دکھانے اور تصحیح کرنے کے اور ایک دو ہفتے رکھنے کے بعد مبیضہ کاری کا مشورہ مناسب ہے۔ یہ مختصر مضمون کے لیے زیادہ ضروری ہے۔ پہلا مسودہ تیار کرنے کے بعد جب ہم مبیضہ نگاری کریں گے تو پہلے باب کو لکھے ہوئے چار چھ مہینے یا اس سے بھی زیادہ گزر چکے ہوں گے۔

ڈاکٹر وحید قریشی مسودے پر ترمیم و تنسیخ بہت کم کرتے تھے مگر خلیل الرحمان داؤدی جا بے جا کاٹ چھانٹ میں لگے رہتے تھے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی مفہوم کی صحت پر زور دیتے اور طے شدہ الفاظ اور جملے تحریر کرتے تھے۔ ڈاکٹر گیان چند ہر مضمون اور کتاب کے مسودے کو ایک بار نقل کرتے تھے لیکن اس نقل میں بہت کچھ ترمیم، حذف و اضافہ، مطالعہ کی ترتیب نو اور زبان کی درستی کرتے تھے۔ نقل کرنے کے فوراً بعد یا بعض اوقات نقل کے دوران ہی میں پھر کوئی ترمیم یا اضافہ کرنا ہوتا ہے تو قینچی سے ورق کاٹ کر اضافہ کرتے، چپیا چپکاتے، اِدھر کا حصہ اُدھر اور اُدھر کا اِدھر کرتے گویا ایک مسودہ دو تین مسودوں کے برابر ہو جاتا ہے۔ ان کا کوئی

مبیضہ ایسا نہیں ہوتا جس میں چپیاں نہ چپکائی گئی ہوں۔ اس لیے ان کی رائے ہے کہ محقق کو مبیضہ کے دوران میں قینچی اور گوند کی لازماً ضرورت ہے۔ وہ تو طابع یا ناشر کو مبیضہ بھیجنے کے بعد اگر اشاعت میں دیر ہو جائے، بار بار مزید ترمیم کے لیے لکھتے تھے۔ ڈاکٹر سلیم اختر اپنے بھدے سے خط کے ساتھ کئی چھوٹی چھوٹی پر چیاں مسودے پر ٹانکتے رہتے تھے۔

مقتدرہ کے قومی انگریزی اُردو لغت کا مسودہ پہلی اشاعت سے قبل چودہ بار ترمیم و نظر ثانی (ثالث.....) سے گزرا تھا اور اب بھی گزر رہا ہے۔ اُردو اصطلاحات سازی کا مسودہ دو بار مقالے کی صورت میں اور تین بار اشاعت کی صورت میں نظر ثانی و ثالث کے مرحلوں سے گزرا۔

عموماً ایک ہی بار میں الفاظ کا املا، جملے کی درستی، کوائف کی صحیح عبارت کی ترتیب، پیراگرافی، نکات کا تعین، اعداد و شمار کا انداز وغیرہ دیکھا جاتا ہے۔ لیکن اگر یہ متعین کر لیا جائے کہ ہر بار نظر دوڑاتے ہوئے چند مخصوص پہلو ہی زیرِ نظر رکھے جائیں گے تو بہتر نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ ہر دو نظر کے درمیان خاصی مدت کا فاصلہ رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ اس سے توجہ از سرِ نو مرکوز کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔

اُردو اصطلاحات سازی
میں تحقیق نگاری

1-وقت کا مسئلہ: روزانہ تھوڑا تھوڑا کام ضرور انجام دیا گیا۔ ایک وقت میں ایک باب لکھا۔ بار بار اپنے سواد کو پڑھ کر لکھا اور لکھ کر پڑھا۔

2-ترتیب کا مسئلہ ابواب کو ترتیب سے لکھا۔ یعنی پہلے سے آخری باب کی طرف۔

3-اختصار: ایک ہی موضوع پر بنیادی بات یا حوالے کو پہلے درج کیا اور اگر دوسرے نے اتفاق کیا تو پھر تکرار سے بچتے ہوئے محض اس کا نام اور حوالہ دیا اور اگر اختلاف کیا ہے تو صرف اختلافی لفظ یا جملے کا حصہ درج کیا۔

4-اقتباس: کوشش کی گئی کہ دوسرے کی بات کو اپنے جملوں کی روانی میں شامل کیا جائے اور اس کا محض حوالہ دیا جائے۔ اقتباسات صرف ناگزیر صورت میں دیے گئے جب صرف مصنف کے الفاظ ہی بات میں وزن اور زور پیدا کر سکتے ہوں۔

5-جملہ بندی: جملوں کو عمومی اور غیر ذمہ دارانہ انداز میں لکھنے سے گریز۔ اہم امور کا اندراج بلا حوالہ درج نہیں کیا گیا۔

جانچ، پرکھ اور تحقیق:

1- یہ ایک بیانیہ طرز کا تاریخی اور تقابلی جائزہ تھا۔

2- دوسروں کے اقوال کو من و عن لینا تو محض کتاب تالیف کرنا ہوا۔ پورے مقالے میں بار بار پیچھے کی طرف جا کر اپنے اور دیگر اہل علم کے حوالوں اور بیانات کا جائزہ لینا، تصحیح کرنا اور نئے زاویے سے لکھنا ضروری ہے۔

3- رجحانات کی مثالیں بہت سی منتخب کرنا اور صرف وہ درج کرنا جو حوالے کا مجموعی تاثر بیان کردیں، بلاوجہ طوالت سے گریز کرنا۔

تقابلی مطالعے کے لیے خاکے وضع کیے۔ مثلاً:

1- اصطلاحی ترکیبی مادے کون کون سے ہیں۔ تا کہ ان سے بننے والے الفاظ کا علم ہو۔
2- اُردو میں ریاضی اور سائنس کی علامات کا تقابل۔ نتیجہ نکالا جائے۔
3- انگریزی اور دیگر یورپی زبانوں میں سائنسی اصطلاحات کا تقابل تا کہ بین الاقوامیت کا علم ہو۔
4- اُردو لغات کی موضوع وار تعداد اور ان کا تقابل انگریزی میں موجود موضوع وار تعداد کے ساتھ۔
5- اُردو لغات میں موجود اصطلاحات کا باہمی تقابل۔
6- مختلف لغات میں ہر اصطلاح کے ترجمے کے حوالے سے۔
7- ان سب سے نکلنے والے نتائج کو پورے مقالے میں ملحوظ رکھنا۔
8- عالمی اصطلاحی اداروں کے مواد کے مطالعہ سے جدید اصطلاحی اصولوں کا تقابل اردو کے ساتھ۔
9- زبان اور اصطلاحات کے گراف اور ترسیمی خاکے بنانا تا کہ مجموعی نقشہ سامنے آئے۔

5- خلاصہ کاری

تجویز یا مقالے کا خلاصہ یا تلخیص کرنا بھی ایک اہم کام ہے، جس کے لیے مہارت درکار ہے اور مہارت تکنیک استعمال کرنے سے اور مشق کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ ہر تجویز، مقالے یا مضمون کا خلاصہ درکار ہوتا ہے، جس کی روشنی میں باقی مطالعہ کیا جاتا ہے۔

تجویز یا ابواب کا خلاصہ

تحقیقی تجویز اور مقالے کا باب کئی صفحات پر مبنی ہوتے ہیں۔ ان میں سے اندازاً ہر صفحے/ نکتے یا پہلو کا خلاصہ کیا جانا مقصود ہوتا ہے۔ تجویز کا خلاصہ اہم نکات کے بیان کے لحاظ سے ایک سے زیادہ پیرے/ نصف صفحے سے زیادہ نہ ہو۔ باب کا خلاصہ فی صفحہ تین سطور یا فی پیرا دو سطور سے زیادہ نہ ہو۔ لُب لباب یا نچوڑ بتائیں کہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ یا یوں سمجھیں کہ ہر پیرے کی ایک آدھ جملے میں سرخی جمانا چاہتے ہیں، جو خود وضاحتی ہو۔ تمام صفحات/ پیراگراف کے خلاصے جمع کرلیں تو ایک دو پیرے بن جائیں گے جو بہر صورت ایک صفحے سے کم ہوں۔ انھیں باب کے آخر میں درج کیا جائے گا۔

مقالے کی تلخیص

تجویز کا خلاصہ، ابواب کا خلاصہ یوں جمع کیے جائیں کہ یہ سب ملا کر مقالے کی تلخیص بن جائے۔ اسے "خلاصہ، نتائج اور سفارشات" کے باب کے شروع میں دیا جاتا ہے۔ اس کے آغاز وانجام میں کچھ ایسے تعارفی جملے دیے جائیں گے جن سے قاری ایک نظر میں جان لے کہ تحقیق کا مقصد، طریق کار اور نتائج کیا ہیں۔ بعض اوقات یہی خلاصے قابلِ اشاعت ہوتے ہیں۔ اس میں فرضیے اور تحقیقی جوابات آ جانے چاہئیں۔ عام طور پر تجویز کیا جاتا ہے کہ خلاصہ دو سو الفاظ سے زیادہ نہ ہو۔

مقالے کے آخر میں یہ خلاصہ پانسو الفاظ سے عموماً بڑھ جاتا ہے یعنی دو صفحات میں مکمل ہو پاتا ہے۔ لیکن تین چار صفحات میں خلاصہ ضرورت سے زیادہ ہوتا ہے۔

بعض یونیورسٹیاں مقالے کی تلخیص الگ جلد میں طلب کرتی ہیں۔ ایسی صورت میں بھی مقالے کے ساتھ تلخیص رہنے دی جاتی ہے۔

6۔ حاشیہ/تعلیقات نگاری

حاشیہ (Footnote) اور تعلیقہ (Endnote) دو اہم اصطلاحیں ہیں، جو حوالہ نگاری (Citation) کے ساتھ مستعمل ہوتی ہیں۔ عموماً پاورقی ہی کو حاشیہ سمجھا جاتا ہے جبکہ پرانے وقتوں میں مواد کے صفحے پر اردگرد کی خالی جگہ یعنی ورق کے سفید حاشیے کے اندر بھی عبارت درج کی جاتی تھی جو کسی اضافی معلومات یا کوائف سے متعلق ہوتی تھی۔ "حاشیے" کی اصطلاح اسی سے ماخوذ ہے۔

حاشیے میں حوالہ اور فوری اضافی معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔ متن میں اقتباس دینے کے بارے میں گفتگو ہو چکی ہے کہ محض ضروری جملے جو دوسرے کے اسلوب میں بیان کرنا لازم نظر آئیں، دیے جائیں اور صرف مطلوبہ حصہ یا سطریں بطور اقتباس شامل کی جائیں۔ اگر اضافی معلومات دینا ہوں تو انھیں حاشیے میں حوالے کے ساتھ دے دیا جائے۔ مزید وضاحت، تشریح یا تبصرہ کرنا ہو تو اسے آخر میں تعلیقہ (Endnote) کی صورت میں دیا جائے۔ حواشی عموماً پاورقی حاشیے (Footnote) میں یا ہر باب کے آخر میں جمع کر دیے جاتے ہیں۔ تعلیقات عموماً مقالے کے آخر میں دی جاتی ہیں۔

حواشی کے بارے میں کہا جاتا ہے:

> "اگر محقق ایسی پیچیدہ بحث سے بچنا چاہتا ہے جس سے عبارت کی روانی میں خلل پیدا ہونے کا اندیشہ ہو لیکن وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ زیر بحث موضوع کے حوالے سے کچھ نظریات اور معلومات کی جانب قاری کی توجہ مبذول کرائے تو وہ اس قسم کی آگہی "حاشیہ" میں دیتا ہے"۔

متنی تحقیق کے حوالے سے یہ کہا جاتا ہے:

> "بعض اوقات کسی مصنف نے اپنی تصنیف کے متن میں مشکل، نامانوس، پیچیدہ،

متروک، اجنبی یا کسی غیر ملکی زبان کے الفاظ استعمال کیے ہوتے ہیں یا پھر کسی مضمون کی اصطلاح کو بغیر اس کے وضع کردہ مفہوم کے استعمال کیا ہوتا ہے تو اس صورت میں اس کی تصنیف کے مترجم یا سہل انگار اس کے معانی حواشی میں درج کر دیتے ہیں تا کہ قاری کو اصل متن پڑھتے وقت دقت کا سامنا نہ کرنا پڑے"۔

متن مرتب کرتے وقت اختلاف نسخہ جات کو بھی حواشی میں دیا جا سکتا ہے اور ان کی وضاحت و تشریح بھی کی جا سکتی ہے یعنی مصنف کے ناقلین کے اختلافات اور مصنف سے فکری اختلافات حواشی میں درج کیے جا سکتے ہیں۔

بعض اوقات یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ نئی تشریحات تفصیل کے ساتھ دی جائیں لیکن یہ متن کا اضافی ضمیمہ بھی نہیں بن سکتیں تو ایسی صورت میں ان کو تعلیقات کی صورت میں دیا جا سکتا ہے۔ تعلیقات کو تشریح، ارجاط، اضافے اور اثبات و انکار کے حوالے سے کئی قسموں میں بانٹا جا سکتا ہے لیکن عام طور پر یہ اقسام ذاتی اپج ہی قرار پاتی ہیں۔ دراصل تعلیقہ ان اضافی معلومات کو کہتے ہیں جو تحقیق کار "تشریح مزید" کے طور پر شامل کرنا چاہتا ہے۔ الفاظ، مقامات، افراد، نگارشات، افکار وغیرہ ایسے میدان ہیں جن پر تشریحی نوٹ تعلیقات کی صورت میں دیے جا سکتے ہیں۔ ان کی زیادہ تر ضرورت متنی تدوین و تحقیق میں پڑتی ہے۔ تعلیقات میں خواہ مخواہ کی اور غیر ضروری معلومات جمع کرنے کا شوق پروان نہ چڑھائیں اور نہ قاری کو کم علم سمجھ کر اضافی معلومات کا بوجھ بڑھائیں۔ عمومی تاریخ تقابلی مطالعات میں ضمیمے یہی کام انجام دیتے ہیں۔

تعلیقات اور ضمیمے کا بنیادی فرق یہ ہے کہ ضمیمے میں وہ فہرستیں اور دستاویزات، عکسی نقول، تصاویر وغیرہ دی جاتی ہیں، جو مقالے کے اندر زیر بحث آئی ہوں لیکن حواشی یا تعلیقات میں اضافی معلومات دی جاتی ہیں جو زیر بحث تو نہیں آئیں لیکن قاری ان کی تفصیلات فوری طور پر معلوم کرنا چاہے تو اسے میسر ہو سکیں۔

حواشی، تعلیقات یا ضمیموں کی تعداد کے بارے میں یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ کتنی ہونی چاہیے لیکن ایک اصول بیان ہو سکتا ہے کہ ان کو متن کی تعداد سے بہت کم رہنا چاہیے یعنی اگر تحقیقی مقالہ ڈیڑھ سو صفحات کا ہے تو حواشی، تعلیقات، ضمیمے وغیرہ ملا کر زیادہ سے زیادہ ایک تہائی (پچاس فی صد) سے نصف (پچھتر فی صد) صفحات تک کی ضخامت میں ہوں تو بہتر ہے۔ ڈاکٹر شاکر اعوان کا ایک اقتباس یہ واضح کر سکتا ہے کہ متن، حاشیہ اور تعلیقہ کا فرق کیسے ملحوظ رکھا جائے۔

> "سپین کے جنوب میں آباد قوم موزش ہونے پر اور اسلامی تہذیب کے ان آثار پر جو ان کے ملک میں موجود ہیں فخر کرتی ہیں اور وہاں بھی ایک نئی ذہنیت پیدا ہو رہی ہے جو تعلیم کے ساتھ ساتھ ترقی کرے گی۔ لوتھر کی مذہبی اصلاحی تحریک نامعلوم طریقوں سے ترقی کر رہی ہے اور تمام یورپ میں عموماً اور سپین میں خصوصاً پادریوں کا اثر کم ہو رہا ہے"۔

1- اس اقتباس کا ماخذ کیا ہے؟

2- علامہ نے یہ بیان کہاں دیا اور کس پس منظر میں دیا؟
3- سپین سے متعلق تاریخی جغرافی معلومات درج کرنا تا کہ مورش قوم کا پس منظر واضح ہو، مورش نسل کا تعارف۔
4- مارٹن لوتھر کی زندگی، تحریکِ اصلاحِ مذہب کے مقاصد اور نتائج۔

پہلی دو صورتیں منابع و مآخذ، باقی دو صورتیں تعلیقہ کے ذیل میں آئیں گی۔ کسی کتاب کے حواشی و تعلیقات لکھتے وقت، درج بالا طریقِ عمل کو بہر حال اپنانا پڑے گا۔ بطور نمونہ علامہ اقبال کے جاوید نامہ کی مناجات کے پہلے نو اشعار لیتے ہیں:

مناجات

1- آدمی اندر جہانِ ہفت رنگ — ہر زماں گرمِ فغاں مانندِ چنگ
2- آرزوئے ہم نفس می سوزدش — نالہ ہائے دلنواز آموزدش
3- لیکن این عالم کہ از آب و گل است — کے تواں گفتن کہ دارائے دل است
4- کوہ و دشت و کوہ و کہ خاموش و کر — آسمان و مہر و مہ خاموش و کر
5- گرچہ بر گردوں ہجومِ اختر است — ہر یکے از دیگرے تنہا تر است
6- ہر یکے مانندِ ما بیچارہ ایست — در فضائے نیلگوں آوارہ ایست
7- کارواں برگِ سفر ناکردہ ساز — بیکراں افلاک و شب ہا دیریاز
8- این جہاں صید است و صیادیم ما — یا اسیرِ رفتہ از یادیم ما
9- زار نالیدم صدائے برنخاست — ہم نفس فرزندِ آدم را کجاست

حواشی و تعلیقات کے تحت عنوان متن ہی میں درج بالا بند کے مشکل الفاظ و مصطلحات کے لغوی و اصطلاحی مفاہیم درج کرنے کے بعد مناجات پر دائرے میں نمبر شمار ایک (1) ڈال کر مناجات کی شرعی حیثیت اور فکرِ اقبال کے شعری و نثری سرمائے سے تفصیلی بحث درج کرنی چاہیے۔ اس ذیل میں جملہ اقتباسات پر نمبرات ڈالتے جانا چاہیے اور ان کا حوالہ فٹ نوٹ میں نمبر وار لکھتے جانا چاہیے۔

شعر نمبر 1، 2 کے حاشیے میں ان شعروں کی مثنوی معنوی کے ابتدائی اشعار:

بشنو از نے چوں حکایت می کند — وز جدائی ہا شکایت می کند۔ الخ

اور مرزا اسد اللہ خان غالب کے دیوانِ اُردو کے پہلے شعر میں:

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا — کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

بیان کی جانے والی مماثلت کا تجزیہ کرنا ہوگا اور دوسرے شعر میں درج ”آرزوئے ہم نفس“ کے حوالے سے جاوید نامہ کی اس ”فغانِ آدمی“ کو مثنوی معنوی کی ”حکایت و شکایتِ نے“ سے ممتاز کرنا ہوگا تا کہ واضح ہو جائے کہ یہ فغاں، مثنوی کی ”باز جوید روزگارِ وصلِ خویش“ کے برعکس عالمِ انسانی میں جہاں ہیں۔ ع

بیکراں افلاک و شعرہا دیریاز

اس "تلاشِ متصل" کا ماحصل ہے جو بقول اقبال ع

توسنِ ادراک انسان کو خرام آموز ہے

اس طرح یہ فغاں، غالب کے نقشِ فریادی کے برعکس، انسان کی تخلیقی قوتوں کو مہمیز کرنے والی شمع جہاں افروز ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ علامہ کا انسان ایک تخلیقی فعالیت ہے۔ ایک صعودی روح جو اپنے عروج و ارتقا میں ایک مرحۂ وجود سے دوسرے میں قدیم رکھتا ہے۔ لترکبن طبقا عن طبق[(2:84)]

یوں یہ بحث اس نکتہ تک جائے گی کہ زمین وآسمان اور اس کے درمیان کے جملہ مظاہر جو ہم دم و بیگانہ از یک دیگر نظر آتے ہیں۔ ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہ کر بھی قائم ہیں اور قائم رہ سکتے ہیں۔ لیکن فروغ انسان تازہ کاری سے ہے۔

فروغِ آدمِ خاکی زتازہ کاری ہاست مہ و ستارہ کنند آنچہ پیش ازیں کردن

یوں یہ بحث جبر و اختیار کے حوالے سے ڈیکارٹ کے فلسفیانہ تصور موقعیت کے خلاف لائبنز (Libiniz) کے فلسفہ کے ایک اہم تصور Preestablished harmony یعنی توافق مقدر یا پیش ثابت ہم آہنگی سے اقتباس کے بعد شعر ونثر اقبال کی مدد سے، ہر گوشہ کائنات میں ع

می کند دیوانہ با دیوانہ رقص

کے مناظر سے راز "ہم آہنگی" کی پردہ کشائی کرنی ہوگی۔ علامہ کے یہ شعر ملاحظہ کیجیے جنھیں فطرت پسندی کا دور کہہ کر فکر اقبال کی بنیادیں گم کردی گئیں:

ہم آہنگی سے ہے محفل جہاں کی
اسی سے ہے بہار اس بوستاں کی
ہیں جذب باہمی سے قائم نظام سارے
پوشیدہ ہے یہ نکتہ تاروں کی زندگی میں
ریاضِ ہستی کے ذرّے ذرّے سے ہے محبت کا جلوہ پیدا
حقیقتِ گل کو تو جو سمجھے تو یہ بھی پیماں ہے رنگ و بو کا
موج در بحر است ہم پہلوئے موج
ہست باہمدم تپیدن خوئے موج
ہر فلک کوکب ندیم کوکب است
ماہِ تاباں سر بہ زانوئے شب است
ہست در ہر گوشہ ویرانہ رقص
می کند دیوانہ با دیوانہ رقص

کئی دوسرے اشعار میں علاوہ نے لائبنز کے توافق مقدر (جذب باہمی) کو عشق، احسن ازل، محبت،

الفت وغیرہ نام دیے ہیں۔ اسی توافقِ مقدر، اسی جذب باہمی کی قوتِ اتصال کے زور پر کائنات کے بیکراں سمندر میں مظاہرِ فطرت (موناد) کا جمہوری قافلہ جو بہ ظاہر نا کردہ ساز، کارواں لگتا ہے مطمئن ہے۔ لیکن انسان کو جس کا موناد زیادہ تر تغیر پذیر اور تاثر پذیر نوعیت کا حامل ہے۔ اپنی پریشانی کے ازالے کے لیے ہے ...... چنانچہ اس نے آدم کو نکال دیا اور باغ عدن کے مشرق کی طرف کروبیوں کو اور چوگرد گھومنے والے شعلہ زن تلوار کو رکھا کہ وہ زندگی کے درخت کی حفاظت کریں اور خود برضا و رغبت نعمتوں کے لینے دینے سے دست بردار ہو کر عرش نشین ہو گیا۔ اسی حوالے سے علامہ نے سوال کیا، ہم صید ہیں یا یہ صید اور ہم صیاد ہیں، اسی کے ساتھ علامہ نے آرزوئے ہم نفس کرتے ہوئے، ''جہان کور دگر'' میں ع

زار نالیدم صدائے برنخاست

کا حسرت انگیز بیان دیتے ہوئے تو سن ادراکِ انسان کی خرام آموزی کے لیے سوال داغا۔ ع

ہم نفس فرزندِ آدم را کجاست

اس عبارت میں ڈیکارٹ کے تصورِ موقیت کا حوالہ آیا ہے جس پر دائرہ میں نمبر 2 لکھا ہے۔ اسے متعلقاتِ حواشی کا عنوان دے کر آخر میں متن ہی میں درج کرنا ہو گا اور عبارتِ متن میں دیے گئے اقتباسات پر لگے نمبرات کو پاورقی میں حوالہ جات کے طور پر جگہ دینی ہو گی۔

اس تفصیل سے یہ بتانا مقصود ہے کہ ''حواشی و تعلیقات'' کسی تصنیف میں اور طرح کا عمل ہے اور ایک ایسے مقالہ و کتاب میں جو کسی کتاب کے حواشی و تعلیقات پر مشتمل ہے کسی اور طرح کا عمل ہے جس کی وضاحت اب تک کسی محقق یا ناقد نے نہیں کی۔

مختصر یہ کہ کسی کتاب کے حصہ متن کے حواشی و تعلیقات لکھتے وقت:

1- حواشی صفحہ کے حصہ متن [حوض] ہی میں لکھے جائیں گے۔

2- جہاں مفصل تعلیقہ چاہیے اسے کتاب کے متن میں (1) دائرہ لگا کر الگ نمبر شمار دیا جائے گا۔ جیسا کہ نمونہ درج بالا میں مناجات۔

3- حواشی میں بھی اگر کوئی ایسی بات آ جائے جو تعلیقہ کا تقاضا کرتی ہو تو کتاب کے متن والے نمبر شمار کا تسلسل دائرے میں قائم رکھنا ہو گا اور متن کے آخر میں متعلقاتِ حواشی کے تحت اس پر تعلیقہ لکھنا ہو گا جیسا کہ نمونہ درج بالا میں تصورِ موقیت۔

4- ہر سہ مراحل میں لیے گئے اقتباس کا حوالہ مسلسل نمبر شمار کے ساتھ متعلقہ صفحہ کے پاورقی میں دینا ہو گا۔ اس کی ذیلی صورتیں ہو سکتی ہیں:

(i) ہر صفحہ پر مسلسل نمبرات مگر دوسرے صفحہ پر الگ سے ایک دو کر کے نمبر شمار دینا۔ اس سے کتاب کے قاری کو بھی الجھن ہوتی ہے اور کاتب کے لیے بھی مشکلات پیدا ہوتی ہیں۔ کمپوزر تو اس کا حلیہ بگاڑ دے گا۔

(ii) پورے باب میں مسلسل حوالہ نمبر دیا جائے اور باب کے آخر میں حوالہ جات درج کیے جائیں۔

(iii) مسلسل حوالہ جات کا نمبر شمار زیادہ بڑھنے کا اندیشہ نہ ہو تو پوری کتاب کے حوالہ جات بھی پا ورقی یا کتاب کے آخر میں باب نمبر کے تحت درج کیے جاسکتے ہیں۔ آج کل کمپیوٹر کمپوزنگ میں یہی طریقہ رائج ہے۔

جیسا کہ تعلیقہ سے متعلق درج بالا آراء سے ثابت ہے کہ تعلیقہ کی حیثیت ضمیمے کی سی ہے تو پھر ضمیمے کے طور پر شامل کتاب، دوسرے لوازم مثلاً کتابیات اور اشاریہ وغیرہ کو بھی تعلیقات ہی میں شمار کیا جانا چاہیے۔

7۔ اخلاقیاتِ تحقیق

تحقیق معروضیت، عدل اور دیانت داری کا نام ہے۔ یہی اس کا اخلاقی پہلو بھی ہے۔ یعنی تحقیق انجام دیتے ہوئے بھی یہی رہنما اصول سامنے رکھے جائیں۔ یہاں اس حوالے سے کچھ مشمولات اختصار کے ساتھ درج کیے جاتے ہیں:

اعترافات

1۔ وہ اہم معلومات جو کسی کتاب یا مضمون سے حاصل ہوں، ان کا اعتراف مقالے کے ابتدائی صفحات / باب میں ضرور کریں۔ غیر اہم یا عمومی اور مسلّمہ معلومات کے اعترافات کی ضرورت نہیں۔ ایسا کیا تو مضمون محض اعترافات کا پشتارہ بن کر رہ جائے گا۔ البتہ بعض اوقات تساہل کی وجہ سے اور کبھی انسانی کمزوری کی وجہ سے معلومات کے ماخذ کو چھپالیا جاتا ہے، یہ مناسب نہیں۔ صحافت اور تصنیف و تالیف کے میدان کی بات اور ہے حوالہ در حوالہ ایک وقیع بات ہے۔ اس سے مقالہ زیادہ معتبر ہو جاتا ہے۔

2۔ وہ معلومات جو کسی سے زبانی گفت گو میں ملی ہوں، انھیں اس شخص کے شکریے کے ساتھ درج کریں اور زبانی روایت کا بھی ذکر کریں۔

3۔ کسی اپنے سے چھوٹے فرد یا کسی دوسرے سے معلومات کے علاوہ کسی دوسری قسم کی مدد لی جائے تو اس کا اعتراف بھی کرنا چاہیے مثلاً کوئی کتاب یا مضمون فراہم کرنا، کہیں سے کسی اقتباس کی نقل، عکسی نقل یا فیکس بھیجنا، شہر میں کسی دور افتادہ لائبریری یا کسی کے ذاتی ذخیرے سے کوئی کتاب لا کر دینا، ای میل بھیجنا وغیرہ۔ ان غیر علمی خدمات کرنے والوں کا شکریہ شروع میں ''اظہار تشکر'' کے طور پر ضرور ادا کریں۔

غیر جانب داری

1۔ اپنے عقائد، فرقے یا گروہ یا علاقے کی بے جا حمایت اور دوسرے فرقے، گروہ یا علاقے کی مخالفت سے پرہیز کریں۔ یہ طریق کار ہماری اس روایت میں عام رہا ہے جس میں اپنے فریقے کو جا و بے جا ثابت کرنے اور تائید میں مواد مہیا کرنے کا انداز موجود تھا۔ تحقیق کے دوران میں اگر اپنے گروہ یا فرقے کے خلاف کوئی معلومات ملیں تو انھیں چھپائیں نہیں۔ اس کا بھی اسی طرح اعلان کریں جیسے اپنے فریق کی تائید کرنے والی معلومات کا۔ اگرچہ یہ بے حد مشکل بات ہے لیکن تحقیق کا اخلاقی تقاضا

بھی ہے۔

2- ادبی و لسانی گروہ بندی میں نہ پڑیں اور نہ اپنے موقف کی بہر حال تائید میں شواہد پیش کریں۔ اپنے موقف کے خلاف بھی شواہد پیش کریں۔ تحقیق سے ایسی ہی غیر جانبداری اور "عدل" کی توقع ہے۔

حوالہ دہی

وہ ماخذ یا کتاب جو تحقیق کار نے خود نہیں دیکھی بلکہ کسی اور ماخذ سے اس کے بارے میں معلومات حاصل ہوئی ہیں تو اسی دیگر ماخذ یعنی واقعی ماخذ ہی کا حوالہ دیں، اصل کتاب کا نہیں جو کسی اور ماخذ میں درج ہے۔ اگر کسی بالواسطہ ماخذ سے نشان دہی پانے کے بعد اصل کتاب خود دیکھ لی ہے تو اصل کتاب کے حوالے کے ساتھ یہ اعتراف ضرور کرلیں کہ آپ کو اس ماخذ کی اطلاع فلاں شخص کی فلاں تحریر سے ملی ہے۔ اس سے تحقیق واثق، وقیع اور معتبر ہو جائے گی اور اگر پہلے کوئی غلطی حوالہ نگاری میں تساہل کے باعث رہ گئی تھی تو اس کا الزام آپ پر نہیں آئے گا۔ جا بجا حوالے دینے سے بھی گریز کریں۔ تحقیقی مقالے اور عام کتاب میں ایک فرق یہ بھی ہوتا ہے کہ مقالے میں کوئی بات سند اور حوالے کے بغیر درج نہیں ہوتی اور کتاب میں صرف زیر بحث آنے پر کسی مصنف یا کتاب کا ذکر لایا جاتا ہے۔ تصنیف و تالیف اپنے کسی مقصود و مطلوب ہدف کی پابند ہوتی ہے۔

اغلاط پر اعتراض

1- اغلاط کی نشان دہی کسی عناد کے تحت نہیں بلکہ محض صحت کی اشاعت کی خاطر کرنی چاہیے۔ اس لیے غیر جذباتی اور اخلاقی انداز میں لکھیں۔

2- احساس تفاخر یا برتری کو دل میں یا تحریر میں نہ آنے دیں۔ خود کو ہمہ دان اور دوسرے کو ہیچ مدان نہ سمجھیں۔

3- اعتراضات میں طنز اور تمسخر نہ ہو۔ ایسا بھی نہ لکھیں "...... سے سہو ہوا/ ......کو مغالطہ ہوا/ ...... نے مبالغہ کیا ہے؟" وغیرہ۔

4- کسی بڑے نام سے مرعوب ہو کر اس کی غلطیوں کی نشان دہی سے نہ رکیں۔ تحقیق میں بے خوفی ضروری ہے، دریدہ دہنی نہیں لیکن چند لمحے توقف کر کے اپنی رائے پر نظر ثانی کریں۔ پھر دوسروں کی آراء اور اپنی رائے کو متقابل انداز سے تحریر کریں۔

اپنی کوتاہیاں

1- اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کے اعتراف میں تامل نہ کریں۔ غلطی کس سے نہیں ہوتی؟

2- اگر کسی نے آپ کی تحقیقی غلطیوں کی نشاندہی کی ہے تو اس کے دشمن نہ ہو جائیں، بلکہ اس کا شکریہ ادا کریں۔ تحقیق کا آخری مقصد ماضی کی تحقیقی اغلاط کی شناخت اور ان کی تصحیح ہی تو ہے۔

3- تحقیقی محنت اور صبر کا تقاضا تو یہ ہے کہ کسی سے بازی لینے کے لیے تحقیق کی تکمیل میں جلدی نہ کریں۔

ناقص اور ادھ پکا کام پیش کرنا اعزاز کی بات نہیں۔ خود راقم کے ساتھ یہ ہو چکا ہے کہ پنجاب یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کے لیے "سید عابد علی عابد" پر کام کرنا منظور ہوا۔ ایک سال کے بعد بہاالدین زکریا یونیورسٹی ملتان سے بھی رؤف شیخ کے لیے یہی موضوع منظور ہوا۔ پھر تین چار برس گزر گئے۔ نگران کا تقاضا تھا کہ جلد ہی کام کر کے بازی لی جائے مگر کچا پکا کام منظور نہ تھا، اس لیے یہ موضوع بعد میں آنے والے کے لیے چھوڑ دیا۔

4- اگر آپ کسی موضوع پر کام کر رہے ہیں اور کسی دوسرے نے اس دوران میں آپ سے پہلے وہی کام مکمل کر دیا تو اس سے ناراض نہ ہوں۔ اسی طرح آپ کے کام کی تکمیل کے بعد کوئی پھر اسی موضوع پر کام کرے تو اس کا شکوہ بھی نہ کریں۔ اس کے لیے تیار رہیں کہ وہ آپ کے کام کی بعض کمیوں کوتاہیوں کی نشان دہی کرے گا اور بعد میں کام کرنے کی وجہ سے آپ ہی کے کام سے بہتر کام پیش کرے۔

8- کاپی رائٹ/حقوقِ نقل

نقل نگاری (Plagiarism) سے ہمیشہ گریز کرنا چاہیے۔ اس کی دو بنیادی وجہیں ہیں۔ اول یہ کہ دوسروں کی باتیں (عیوب و محاسن) اپنے ذمے کیوں لی جائیں، دوم یہ کہ دوسروں کے حقوق (تحریر و تصنیف) غصب نہ کیے جائیں۔ یہی کاپی رائٹ کا خیال رکھنا کہلاتا ہے۔ کاپی رائٹ یا نقل کے حقوق کے حوالے سے بھی چند امور ملحوظ رکھنے چاہئیں، اگرچہ ان کا اطلاق تحقیقی مقالہ پیش کرنے تک تو نہیں ہوتا، صرف عوام میں اشاعت کے وقت انھیں ملحوظ رکھا جاتا ہے، پھر بھی چند امور حسب ذیل ہیں:

کسی بھی کام کو تمام کا تمام نقل نہیں کیا جا سکتا۔ تمام تر اقتباسات ملا کر آٹھویں حصے سے زیادہ مواد نہ ہو۔

اگر مواد اپنے الفاظ میں لیا گیا ہو اور اس میں تبصرہ بھی شامل ہو تو اس پر آٹھویں حصے کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ نئی ترتیب و تدوین آپ کا حق اور ایک نیا کاپی رائٹ ہے۔

حقائق اور مسلمہ معلومات پر کاپی رائٹ کا اطلاق نہیں ہوتا، ترتیب اور پیشکش کے انداز پر ہوتا ہے۔ وہ بھی جزوی پیشکش کی صورت میں نہیں۔

کسی اور تحقیق کار یا مصنف کے تمام نتائج من و عن مگر حوالے کے ساتھ بیان کیے جا سکتے ہیں۔

ایک مدت (مصنف کی عمر + 40 یا 50 سال) کے بعد کسی مصنف کا کاپی رائٹ نہیں رہتا۔ انھیں مصنف کے نام کے حوالے کے ساتھ آٹھویں حصے سے زیادہ مقدار میں لیا جا سکتا ہے مگر ضرورت کے مطابق پھر بھی دوسروں کے "گناہ" و "ثواب" اپنے ذمے لینے کی کوشش نہ کریں۔

کاپی رائٹ کا تعلق مالی منفعت کے ساتھ ہوتا ہے۔ جب تک کوئی شے شائع ہو کر فروخت نہیں ہوتی یا اس کا امکان نہیں ہوتا، کاپی رائٹ کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔

کاپی رائٹ عموماً مصنف/تخلیق کار کا ہوتا ہے لیکن تفویض کار کی صورت میں ادارے اور ناشر کا،

خاص طور پر لغات، قاموس، درسی کتب کے حوالے سے۔

حکومت کے تفویض کردہ کاموں کا کاپی رائٹ حکومت کو حاصل ہوتا ہے۔

کسی سیمینار، کانفرنس میں پیش کردہ تخلیق کا کاپی رائٹ منتظم اور مصنف دونوں کو حاصل ہوتا ہے۔

دوسروں کی نگارشات اور نتائج نقل کرتے وقت بھی کاپی رائٹ کا لحاظ اسی طرح کرنا چاہیے جس طرح اپنے حقوق کا خیال رکھا جاتا ہے۔

سترھواں باب

قرطاسِ تحقیق کی طرزی وضع

اُردو اور پاکستانی زبانوں میں قرطاسِ تحقیق (Research Paper) تیار اور پیش کرنے کے لیے جس طرزی وضع (Style Format) کی ضرورت ہے، اس میں اُردو دانوں کے ہاں بات ابھی تک خلطِ بحث سے آگے نہیں بڑھی۔ جبکہ عالمی سطح پر اس مقصد کے لیے بہت سے اسالیب یا طرزیں (Styles) زیرِ استعمال ہیں۔ اُردو میں اگر طرزی وضع استعمال کرنے کی بات ہوتی بھی ہے تو یہاں ایک بنیادی مغالطہ اور ایک بنیادی استرداد موجود ہے۔

بنیادی مغالطہ : پوری اُردو دنیا میں تحقیقی مقالے صرف ایک طرزی وضع استعمال کریں۔

بنیادی استرداد: مقالہ نگار بہتر جانتا ہے کہ اسے اپنا مقالہ کس طرزی وضع میں پیش کرنا ہے۔

ہر دو باتیں سو فی صد حد تک غلط ہیں۔ انھیں کسی قسم کی ترمیم و اضافے کے ساتھ استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ کوئی قرطاسِ طرز (Style Sheet) تیار ہی نہ کیا جائے اور یہ بھی نہیں کہ مقالہ نگار یا تحقیق کار کے علمی مقام اور مرتبے سے انکار کیا جائے۔

1- حوالہ نگاری

کسی بھی تحقیقی متن کے اندر حوالہ دینے، حواشی کا اندراج کرنے، پہلی بار حوالہ دینے اور مکرر حوالوں اور ماخذوں کے اندراج کے متعدد طریقے ہیں۔ ہماری روایت میں عموماً یہ رہا ہے کہ کتاب کا نام متن کے اندر درج کر دیا جاتا اور بہت ہوا تو اس کے اوپر خط تحقیق دیا جاتا۔ کبھی کبھار مصنف کا نام بھی لکھا ہوتا۔ آخر میں ماخذوں یا کتابوں کی فہرست بطور کتابیات یا کتاب نامہ (Bibliography) شامل نہیں ہوتی تھی۔ اب اگر ایسا ہوتا بھی ہے تو اکثر اوقات حوالہ نگاری (Citation) اور دستاویز کاری (Documentation) اور کتابیات نگاری میں باہمی ربط نہیں ہوتا۔ اکثر کتابوں اور مقالوں میں ایسی کوئی یکسانیت نہیں ملتی۔ آج بھی بڑے بڑے محققین کی نگارشات میں ایسی یکسانیت، مقررہ اصول یا طریق کار موجود نہیں ہوتا۔ کئی جامعات اور ان کے لسانی و ادبی شعبوں میں بھی اسی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی جاتی۔ البتہ اب بعض شعبوں نے اپنے طریق کار مقرر کرنا شروع کیے ہیں، لیکن ابھی تکنیکی اور علمی امور پر توجہ باقی ہے۔

حوالہ نگاری(Citation)، تحشیہ نگاری اور کتابیات نگاری کا کوئی بھی طریقہ استعمال کیا جائے ،ایک سنہری اصول بار بار یاد کرنا ضروری ہے کہ ایک تحقیقی مقالے میں حوالوں کے اندراج کا ایک سا یعنی یکساں طریقہ ہی موجود ہونا چاہیے۔

(الف) مختلف انداز

اُردو اور پاکستانی زبانوں میں حوالہ نگاری کا کوئی ایک طریقہ وضع کرنے کی طرف اگرچہ مقتدرہ قومی زبان کے سیمینار 1986ء میں بھی زور دیا گیا اور اُردو میں فنی تدوین کے نام سے کتاب بھی شائع کی گئی۔ 7 تا 11۔ اگست 2008ء کو باڑہ گلی میں ہائر ایجوکیشن کمیشن پاکستان کے تعاون سے پشاور یونیورسٹی کی عالمی کانفرنس بھی منعقد ہوئی لیکن ابھی تک پاکستانی جامعات میں کوئی ایک متفقہ یا انفرادی طریق کار طے نہیں ہوا۔ البتہ بعض افراد نے انفرادی طور پر کچھ کوششیں ضرور کی ہیں۔ ڈاکٹر صدیق شبلی نے ایک طریق کار کی حمایت کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''حوالے اور کتابیات ماخذ کا اندراج مصنف وار کرنے کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ اس سلسلے میں شکاگو کے Turabian Manual کی پیروی کی جارہی ہے۔ یہ دستور العمل تحقیقی مقالہ نگاری ہی کی رہنمائی کے لیے مرتب کیا گیا ہے۔ دنیا کے اکثر ممالک میں اس کی معیاری حیثیت کو تسلیم کیا گیا ہے۔ عربی، فارسی اور بڑی حد تک اردو میں بھی حوالے اسی کے مطابق دیے جارہے ہیں۔ لوگ اپنے طور پر تو یہ کام کر رہے ہیں لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ حوالہ نگاری کے نظام کو یکساں بنایا جائے۔ یہ کام قومی سطح پر کرنے کا ہے''۔

شکاگو کی طرح اور بھی طرزی وضع (Style Formats) ہیں جن پر دنیا میں عمل ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صابر کلوروی کے نزدیک "MLA قرطاس طرز کی طرز پر ایک سٹائل شیٹ تیار کرنی چاہیے" لیکن یہ کوئی ضروری نہیں کہ پورے ملک میں ایک ہی طرزی وضع اختیار کی جائے۔ ہر شعبہ، ادارہ یا جامعہ اپنا طریق کار بہت غور و خوض کے بعد مقرر کرسکتا ہے۔ دیگر طرزی وضع بھی ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔ ڈاکٹر شبلی کے نزدیک "شعبۂ اُردو کے یونیورسٹی اساتذہ کا اجتماع حوالہ نگاری کے کسی ایک کلی نظام سے اتفاق کر کے یہ خدمت انجام دے سکتا ہے مگر حوالہ نگاری کو معیاری بنانے کے لیے شکاگو یونیورسٹی کے دستور العمل کو قبول کرتے وقت بعض نکات پر توجہ دینا ضروری ہے"۔

ماخذ یا کتابیات کے اندراجات کی ایک تفصیل و ترتیب حسب ذیل ہوسکتی ہے: اس میں مصنف کا نام پہلے درج ہو۔ پھر ترتیب حسب ذیل ہو:

1۔ مصنف کا نام ، 2۔ کتاب / مضمون / باب / مقالے کا نام ، 3۔ مجموعے / رسالے کا نام (اگر ہو)، 4۔ سلسلہ نمبر (اگر ہو) ، جلد / شمارہ، 5۔ ناشر ، 6۔ مقام اشاعت ، 7۔ ایڈیشن اور سال اشاعت ، 8۔ صفحہ نمبر۔

کتابیات کی صورت میں صفحہ نمبر کے اندراج کی ضرورت نہیں البتہ کل صفحات لکھے جاسکتے ہیں۔

پاورقی یا باب کے آخر میں حوالے کی صورت میں صفحہ نمبر لکھنا ضروری ہوگا۔ لغات اور انسائیکلوپیڈیا کا صفحہ نمبر نہیں لکھا جاتا۔ بعض اوقات کتاب کا نام پہلے اور مصنف کا بعد میں درج کرتے ہیں۔ اُردو میں یہ طریقہ بھی مستعمل ہے۔ مقام اشاعت کو بھی بعض اوقات ناشر کے نام سے پہلے لکھ دیا جاتا ہے۔ ان صورتوں میں کتاب کے نام اور مقام اشاعت دونوں کے بعد کولن (:) دیا جاتا ہے۔ مندرجہ بالا نکات کے بعض توجہ طلب امور حسب ذیل ہیں:

مصنفین کے نام

ناموں کے سلسلے میں اگرشکاگو دستور العمل کی سفارشات مغربی ناموں کے لیے تو درست ہیں لیکن خصوصاً اسلامی ناموں کے سلسلے میں ان سے مدد نہیں لی جا سکتی۔ ناموں کے اندراج سے متعلق کئی اداروں نے اپنی اپنی تجاویز مرتب کی ہیں لیکن ان کی معیار بندی نہیں ہو سکی۔ اُردو میں نام اس طرح سے لکھے جا رہے ہیں۔

نظامی، حسن خواجہ	صدیقی، ابواللیث، ڈاکٹر
آزاد محمد حسین	کشفی، ابوالخیر
شبلی نعمانی	شبلی، ڈاکٹر محمد صدیق خاں
سرسید احمد خاں	علامہ اقبال، سر

خاندانی نام، نسبت، تخلص وغیرہ اصل نام سے پہلے لیکن شبلی نعمانی کو نعمانی، شبلی لکھنا زیادتی ہوگی۔ کیونکہ معروف نام تو "شبلی" ہے۔ مرکب نام کو اس طرح سے جدا جدا نہ کیا جائے کہ نام کی معنویت میں فرق آ جائے۔ جیسے احمد دین، غلام مصطفےٰ کے اجزاء کی ترتیب نہ بدلی جائے۔ کوشش کریں کہ ہمارے مرکب نام قائم رہیں یا تخلص اور معروف نام کو اولیت دی جائے۔

کتاب/مقالے کا نام

حوالے میں کتاب اور مقالے کا درست نام جلی/Bold/ثلث ٹائٹ میں لکھنا بہت ضروری ہے۔ مسودے کی صورت میں خط کشیدہ ہو۔ کمپوزر اسے دیکھ کر خط کشیدہ الفاظ کو خود بخود جلی یا Bold کر لے گا۔ کتاب کی صورت میں صرف کتاب کا نام لکھنا کافی نہیں۔ اس کے ایڈیشن کا بھی ذکر کرنا چاہیے۔ پہلے ایڈیشن کی اپنی اہمیت ہوتی ہے۔ بعد کے ایڈیشنوں میں مصنف اضافے بھی کرتا ہے۔ اس لیے طبع اول اور طبع دوم وغیرہ کا بتانا بھی ضروری ہے۔ بعض اوقات ایک کتاب کئی جلدوں میں ہوتی ہے۔ اس صورت میں صرف کتاب کا نام لکھنے سے کام نہیں چلتا۔ اس کی جلد کا نمبر دینا بھی ضروری ہے۔ اگر جلد کا نمبر نہ دیا جائے تو کتاب سے استفادہ مشکل ہو جائے گا۔ اسی طرح بعض کتابیں کسی سلسلے کے تحت چھپتی ہیں۔ سلسلے کی نشان دہی سے ماخذ کی تلاش کا کام آسان ہو جاتا ہے۔ کتاب کے حوالے سے باب کے ذکر کی ضرورت کم پڑتی ہے لیکن اگر کر دیا جائے تو ماخذ تلاش کرنے والے کو سہولت رہتی ہے۔ اگرچہ صفحہ نمبر کے ہوتے ہوئے اس کی چنداں

ضرورت نہیں۔

مجموعے/ رسالے کا نام

مضمون یا مقالے کا حوالہ دیتے وقت مصنف کے نام کے بعد مضمون/ مقالے کا عنوان جلی یا بولڈ (Bold) لکھا جاتا ہے اور اس کے بعد مجموعے یا رسالے کا نام واوین کے اندر یا Italic میں، پھر جلد، شمارہ اور باقی کوائف درج کیے جاتے ہیں۔ رسالے میں مطبوعہ مضمون/ مقالے کا حوالہ جلد اور شمارہ کے بغیر نامکمل رہتا ہے کیوں کہ ان دونوں کی مدد سے مضمون/ مقالے کی تلاش میں آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔ اگرچہ رسالے کا سال اشاعت بھی دیا جاتا ہے لیکن ممکن ہے ایک سال میں اس رسالے کے ایک سے زیادہ شمارے شائع ہوئے ہوں تو تلاش کرنے والے کو اس سال کے تمام شمارے دیکھنے پڑیں گے۔ اگر جلد اور شمارے کا ذکر حوالے میں موجود ہو تو اس کی محنت بچ جائے گی۔

ناشر

ناشر کوئی ادارہ بھی ہو سکتا ہے اور فرد بھی۔ دونوں صورتوں میں اس کا ذکر ضروری ہے۔ بعض حوالوں میں ناشر کا ذکر حذف کر دیا جاتا ہے اور صرف مقام اشاعت دے دیا جاتا ہے مثلاً:

آزاد، محمد حسین، آبِ حیات، طبع یازدہم، لاہور، 1911ء، ص:102۔

مذکورہ بالا حوالہ ناقص ہے کیوں کہ اس میں ناشر کا ذکر نہیں ہے۔ یہ اس طرح لکھا جانا چاہیے:

آزاد، محمد حسین، آبِ حیات، شیخ مبارک علی اینڈ سنز، لاہور، 1911ء، ص:102۔

اسے یوں بھی لکھا جاتا ہے:

آزاد، محمد حسین، آبِ حیات، لاہور: شیخ مبارک علی اینڈ سنز، 1911ء، ص: 102۔

مقامِ اشاعت

بعض بڑی فرموں یا کمپنیوں کے ذیلی دفاتر کئی شہروں میں ہوتے ہیں اور وہ اپنی مطبوعات پر ان تمام شہروں کے نام دے دیتے ہیں۔ مثلاً فیروز سنز کے دفاتر لاہور، راولپنڈی اور کراچی میں ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کا ذکر مقامِ اشاعت کے طور پر کیا جا سکتا ہے۔ عموماً پہلا مقام اشاعت شامل کیا جاتا ہے۔ کہیں کہیں ناشر کتاب میں اس کی صراحت بھی کر دیتے ہیں مثلاً ڈاکٹر ندیم شفیق ملک کی کتاب علامہ اقبال کا خطبہ الٰہ آباد، 1930ء، ایک مطالعہ، فیروز سنز نے شائع کی اور اس کتاب پر لاہور، راولپنڈی اور کراچی بھی تحریر ہے لیکن سالِ اشاعت کے اوپر فیروز سنز، لاہور لکھا ہوا ہے۔ اس صورت میں مقام اشاعت لاہور ہی لکھا جائے گا۔ مقامِ اشاعت ناشر کے نام سے پہلے لکھا جائے تو اس کے بعد کولن (:) دیا جاتا ہے۔

سالِ اشاعت

شکاگو دستور العمل کے مطابق سالِ اشاعت مقامِ اشاعت کے بعد آنا چاہیے، اُردو میں اکثر اسی طرح مستعمل ہے لیکن Durston Anderson and Poole کی کتاب & Thesis

Assignment Writing میں سال اشاعت مصنف کے نام کے فوراً بعد دیا گیا ہے۔ مثلاً اس کا یہ حوالہ دیکھیے:

Guilford, G.P., 1965, **Fundamental Statistics in Psychology (4th ed.)**, New York: McGraw Hill, P:201

اس حوالے میں سال اشاعت مصنف کے نام کے فوراً بعد آیا ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ مصنف کی کہی ہوئی بات / لکھی ہوئی کتاب کے سن وار ترتیب سے درج ہونے سے پتا چل جاتا ہے کہ یہ بات اس نے کب پیش یا شائع کی۔ چنانچہ کتابیات میں ایک مصنف کے مقالے / کتابیں سن وار ترتیب سے درج کی جاتی ہیں۔

صفحہ نمبر

صفحے کا نمبر دینے سے پہلے اس کا مخفف "ص:" ایک سے زیادہ صفحوں کی صورت میں "ص ص:" لکھا جاتا ہے۔ اگر حوالہ ایک صفحے کا ہے تو اس کا نمبر "ص:" لکھ دیا جاتا ہے اور اگر دو تین اکٹھے صفحوں کا ہو تو ان کے درمیان ایک لکیر لگا دی جاتی ہے؛ یا "تا" لکھ دیا جاتا ہے، مثلاً: ص ص:211تا213۔

(ب) شکاگو دستور العمل کے مطابق

شکاگو دستور العمل کے مطابق اُردو حوالوں کی تشکیل کی کچھ مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔ ان میں قوسین زائد امر ہیں۔ نہ دی جائیں تو بہتر ہے۔ متن کے پاورقی حوالوں میں قوسین کا یہ استعمال ہو سکتا ہے۔ البتہ ہر اندراج کے بعد کاما ضرور دینا چاہیے:

1-ایک مصنف کی صورت میں مکمل حوالہ

آزاد، محمد حسین، آب حیات، طبع یازدہم (شیخ مبارک علی لاہور، 1911)، ص:102

2-دو مصنفوں کی صورت میں

نورالٰہی و محمد عمر، ناٹک ساگر، طبع اول (مرکنٹائل پریس، لاہور)، ص:96

3-تین مصنفین ہوں تو

محبّ عارفی، محبوب خزاں و قمر جلیل، تین کتابیں (مکتبہ آرٹی، 1963ء، کراچی)، ص:39

4-تین سے زیادہ مصنفین کی صورت میں

سید وقار عظیم و دیگر، اُردو کی دوسری کتاب (پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، 1981ء)، ص:36

5-جلد کے ساتھ حوالہ

زور، محی الدین قادری، فہرست مخطوطات، جلد دوم (ادارہ ادبیات دکن، حیدرآباد، 1930ء)، ص:92

6-اشاعتی سلسلے کے ساتھ

نذیر نیازی، سید، سوانح حیات حکیم الامت حضرت علامہ اقبال، بسلسلہ علامہ اقبال صد سالہ تقریبات (اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، 1979ء)، ص:120

7- کتاب کا حوالہ باب کے ساتھ

کیفی، پنڈت برجموہن، کیفیہ، طبع چہارم، تیسرا باب (تاج بک ڈپو، لاہور، 1952ء)، ص:34

8- ڈرامے کا حوالہ ایکٹ کے ساتھ

تاج، امتیاز علی، انارکلی، پہلا ایکٹ (دارالاشاعت، لاہور، 1960ء)، ص:12

9- رسالے میں مطبوعہ مضمون کا حوالہ

ہاشمی، نصیرالدین، مقالہ، دکنی مرثیوں کا ایک نایاب مجموعہ (مشمولہ "نوائے ادب" بمبئی، جلد 10، شمارہ، 1959.6)، ص:16

10- انسائیکلوپیڈیا کا حوالہ

سالک، عبدالمجید، آزاد، اُردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد اول (پنجاب یونیورسٹی لاہور، 1970ء) (صفحہ نمبر کا حوالہ نہیں دیا جاتا)۔

11- لغت کا حوالہ

سید احمد دہلوی، فرہنگِ آصفیہ، جلد دوم، طبع مکرر (مرکزی اردو بورڈ، لاہور، 1977ء) (صفحہ نمبر کا حوالہ نہیں دیا جاتا)۔

12- مرتب کا حوالہ

وحید قریشی، ڈاکٹر (مرتب)، اُردو ادب، جلد اول، تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند (پنجاب یونیورسٹی، لاہور 1971ء)، ص:12

13- مضمون نگار کا حوالہ

نسیم، ڈاکٹر الف۔د، خواجہ میر درد کا خاندان، مشمولہ: خواجہ میر درد، مرتبہ: ثاقب صدیقی و انیس احمد (ترقی اردو بیورو، دہلی، 1979ء)، ص:49 و ص:128

14- مقدمہ نگار کا حوالہ

سید مرتضیٰ حسین فاضل، (مقدمہ)، عودِ ہندی، مرزا اسد اللہ خان غالب، طبع اول (مجلس ترقی اردو، لاہور، 1967ء)، ص ص:56 تا 75

15- مترجم کا حوالہ

محمد جہانگیر عالم (مترجم)، علامہ اقبال کا خطبہ الٰہ آباد، مشمولہ، خطباتِ اقبال (دائرہ معارف اقبال، فیصل آباد، 2001)، ص ص 47-85

16- رپورٹ

وزارت تعلیم حکومت پاکستان، نصاب فارسی (قومی ادارہ نصاب و درسی کتب، اسلام آباد، 1975ء)، ص:3

17-......حوالہ اگر یوں دیں تو بہتر ہے
آزاد، محمد حسین، آب حیات، طبع یازدہم، شیخ مبارک علی، لاہور، 1911ء، ص:101

18- اس کے فوری بعد اسی کتاب کا حوالہ جب کہ صفحہ بھی وہی ہو۔
ایضاً (انگریزی میں Ibid)

19- فوری حوالہ صفحے کے اختلاف کے ساتھ
ایضاً، ص:88 (انگریزی میں Ibid, P: 88)

20- تیسری بار حوالہ کے لیے
محولہ بالا (انگریزی میں .Op.cit)

21- اسی کتاب کا حوالہ، کئی دوسرے حوالوں کے بعد۔
آزاد محمد حسین، محولہ بالا، ص:84

22- کسی مصنف کی دوسری کتاب کے بعد (انگریزی میں .Op.cit) اسی مصنف کی پہلی کتاب کا حوالہ۔
آزاد، محمد حسین، آب حیات، ص : 89

مقالے میں حوالے کا اندراج متن کے اندر دینے کے کئی طریقے ہیں۔ بعض کے نزدیک متن میں صرف مصنف کا نام (پورا) دے کر جملے کے آخر میں حوالے کی علامت ( ) اور اس کے اوپر حوالے کا سلسلہ نمبر جیسے پہلے حوالے کے طور پر (1) دیا جائے۔ اگر اقتباس بھی شامل ہو تو اس کے بعد کولن (:) علامت دے کر نئے پیراسے پوٹ چھوڑ کر اقتباس واوین میں دیں۔ یاد رہے کہ حوالہ نمبر واوین سے پہلے ہی درج کر دیا گیا ہے جیسے:

علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں [1] :

".."

بعض کے نزدیک حوالہ نمبر اقتباس کے واوین بند ہونے کے بعد دیا جائے۔ ایک جامعہ میں تو یہ رَوِش طے شدہ ہے۔ یہ غلط ہے۔ لیکن اگر کسی مصنف کی بات (خواہ واوین میں ہو) اپنے جملے کے اندر ہی دی جاری ہو تو حوالہ نمبر واوین کے بعد دیا جائے جیسے:

علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں "شعر العجم میری انہی کاوشوں کا نتیجہ ہے"۔ [1] اس سے ایک اور نکتہ بر آمد ہوتا ہے۔

بعض اوقات جملہ مجہول (Passive) انداز میں یعنی واوین کے بغیر دیا جاتا ہے۔ ایسی صورت میں بھی حوالہ نمبر جملے کے آخر میں دیا جائے، جیسے:

علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں کہ شعر العجم ان کی انہی کاوشوں کا نتیجہ ہے [1]۔ اس سے ایک اور نکتہ بر آمد ہوتا ہے۔

مقالے کے پاورقی میں لائن / لکیر دے کر وہی حوالہ نمبر دینے کے بعد حوالہ کا اندراج مصنف کے اندراج سے لے کر صفحہ نمبر تک کیا جاتا ہے۔

بعض مقالوں میں متن کے اندر ہی کتابیات کے حوالوں کا سلسلہ نمبر اور صفحہ نمبر قوسین میں دے دیا جاتا ہے۔ ایسا مختصر مضامین اور مقالوں میں کیا جاتا ہے، جیسے:

شبلی نعمانی (13 :256) نے لکھا ہے۔

بعض اوقات قوسین میں سن اشاعت بھی دیا جاتا ہے، جیسے:

شبلی نعمانی (1918ء) نے لکھا ہے (256:13)۔

یہ سن عام طور پر طبع اول کا ہوتا ہے۔

2- کتابیات نگاری اور قرطاسِ طرز

کسی بھی مقالے کے آخر میں تمام ماخذوں کے اندراج کو کتابیات یا کتاب نامہ، ماخذ، کتب حوالہ وغیرہ کا نام دیا جاتا ہے۔ انگریزی میں اسے Bibliography، Sources یا References کہتے ہیں۔

کتابیات میں اندراج عموماً مصنف کے نام سے شروع ہوتا ہے۔ بعض اوقات کتابوں کے نام بھی پہلے دیے جاتے ہیں۔ اگر مصنف کا نام نہ ہو تو مرتب کرنے والے ادارے کا نام یا کتاب کا نام دے دیا جاتا ہے۔ اُردو اصطلاحات سازی کی کتابیات میں کتاب کا نام پہلے دینے کی وجہ ظاہر ہے کہ زیادہ تر لغات کے نام ہیں جو اپنے ناموں ہی سے معروف ہوتی ہیں۔ زیر نظر کتاب کی کتابیات میں مصنفین کے ناموں کو اولیت دی گئی ہے۔ کتابیات میں تمام اندراجات کو الفبائی / ابجدی ترتیب سے شامل کیا جاتا ہے۔

بعض انداز اور طرزی وضع اسی ترتیب کو ملحوظ رکھتے ہیں جس میں حوالے متن کے اندر آئے ہوتے ہیں۔ مقالہ مکمل کرنے کے بعد کتابیات کے لحاظ سے اسے ایک بار پھر دیکھ لینا چاہیے۔ اُردو اور پاکستانی زبانوں کے لیے مفصل ذکر ہم کر چکے ہیں۔ مقالہ نگاری کے لیے عالمی سطح پر عموماً چار سے زائد اقسام، طریقے یا طرزی وضع استعمال ہوتی ہیں جن کی تفصیل ذیل میں درج کی جا رہی ہے۔

کتابیات نگاری کے سلسلے میں ایک اور سوال پریشان کرتا ہے کہ کیا تمام حوالہ جات ایک ہی فہرست میں شامل کر دیے جائیں یا انھیں الگ الگ زمروں میں بانٹا جائے۔ مختصر مقالے میں تو ایک ہی کتابیات کی سفارش کی جاتی ہے مگر بڑے تحقیقی یا سندی مقالوں میں ہر زمرے کی الگ الگ فہرست بنائیں۔ مثلاً کتب: اردو، فارسی، عربی، انگریزی، یورپی اور پاکستانی زبانوں وغیرہ سے الگ الگ فہرستیں۔ مقالات بھی اسی طرح زبان وار الگ الگ۔ پمفلٹ، وڈیو، ویب سائٹ، ای میل وغیرہ کی فہرستیں الگ، مخطوطات، دستاویزات کی فہرستیں الگ۔

MLA قرطاسِ طرز

ماڈرن لینگویج ایسوسی ایشن (ایم ایل اے) امریکا کی طرزی وضع یا قرطاسِ طرز میں جو اس کی Handbook کے چوتھے ایڈیشن 1995ء میں دی گئی ہے، مندرجہ ذیل امور بیان ہوئے ہیں:

1- الگ سرورق ٹائپ نہ کریں۔

-2 کاغذ کے چاروں طرف ایک انچ خالی جگہ (Margin) چھوڑیں۔

-3 سطریں دہرے فاصلے (Double Space) سے ٹائپ کریں۔

-4 اوپر دائیں طرف صفحے پر اپنا نام اور صفحہ نمبر ٹائپ کریں۔

-5 اقتباسات کے لیے دس فاصلے (Spaces) چھوڑیں۔

-6 حوالہ قوسین کے اندر دیں۔

-7 کتابیات کا نام "ماخذ" رکھیں۔ کتابیاتی معلومات اس ترتیب کے ساتھ دیں۔
مصنف کا پورا نام، کتاب کے حصے کا نام (اگر ہو)، کتاب کا پورا نام، ایڈیٹر/ایڈیشن، جلد نمبر (عربی ہندسوں میں)، سلسلہ نمبر (اگر ہو)، شہر اشاعت: ناشر کا نام، صفحہ نمبر، اضافی معلومات، لائبریری نمبر (اگر درکار ہو) ٹائیٹل کا ہر لفظ بڑے حرف سے شروع کریں۔

-8 ماخذ میں الٹی پوٹ چھوڑیں۔

-9 صرف خصوصی حالات میں پاورقی اور تعلیقی حوالے دیں۔

ایم ایل اے قرطاسِ طرز میں متن کے اندر حوالے کی صورت میں قوسین میں صفحہ نمبر دیا جاتا ہے اگر آپ نے مصنف اور کتاب کا ذکر متن میں کر دیا ہو، بصورت دیگر ایک یا دونوں چیزیں (مصنف اور کتاب کا نام) بھی قوسین کے اندر دی جاتی ہیں، جیسے:

(13)

(Wilson 13)

(Wilson, **Immigration** 13)

ایم ایل اے قرطاسِ طرز میں کتابیاتی اندراج میں مصنف کا نام، کتاب کا نام اور اشاعتی معلومات دی جاتی ہیں۔ اس میں کتابوں، رسالوں کے ناموں کے نیچے خط کشید کیا جاتا ہے یا مطبوعہ صورت میں جلی (Bold) کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً:

Erikson, Erik H. **Childhood and Society.** 2nd Ed.
Newyork: Norton 1964.

...... اگر کوئی مترجم ہو تو اس کا نام کتاب کے نام کے بعد دیا جاتا ہے۔

...... مضامین اور رسالوں کی صورت میں اندراج یوں ہوتا ہے۔

Swain , Joseph P. "Form and Function of the Chanical Cadenza."
Journal of Musicology 6 (1998): 27-59.

دیگر ماخذ مثلاً کمپیوٹر ای میل، ٹی وی پروگرام وغیرہ کا حوالہ یوں دیا جاتا ہے:۔

-1 مصنف کا نام

-2 مواد کا سرورق/عنوان

3- ڈیٹا بیس کا ٹائیٹل/عنوان
4- اشاعتی معلومات (اگر ہوں)
5- تاریخ اشاعت وغیرہ۔

مثال

Limouze, Henry, "Re: Bach's Improvisations." e-mail to the author 2nd Feb.1995.

Kronke, Donid. "Building the Bridge Between book, Screen". **Los Angeles Times** 30 may 1995.

Times online on-line. Internet.31May 1995.

فلم یا ویڈیو ٹیپ کا حوالہ

1- عنوان، خط کشیدہ
2- ڈائریکٹر (نام)
3- تقسیم کار (نام)
4- سال

ذاتی انٹرویو کا حوالہ

1- انٹرویو دینے والے کا نام
2- انٹرویو کی قسم، ٹیلی فون، ذاتی، مراسلتی وغیرہ
3- تاریخ

APA قرطاسِ طرز

امریکی سائیکالوجی ایسوسی ایشن (اے پی اے) کے قرطاسِ طرز میں مندرجہ ذیل امور کا لحاظ رکھا جاتا ہے:

1- ایک سرورق تیار کریں اور اگلے صفحے پر ایک تلخیص دیں۔
2- کاغذ کے چاروں طرف ایک انچ جگہ چھوڑیں۔
3- زیادہ تر سطریں دہرے فاصلے پر ٹائپ کریں۔ زیادہ خواندہ اقتباس واحد فاصلے پر بھی ٹائپ ہو سکتا ہے۔
4- اوپر دائیں طرف ہر صفحے پر "پیشانی" درج کریں۔
5- اقتباسات پانچ فاصلے چھوڑ کر دیں۔
6- حوالے قوسین میں۔ الفاظ کے پہلے حروف بڑے ہوں (ایم ایل اے انداز میں)
7- محولہ ماخذوں کا عنوان "حوالہ جات" رکھیں اور آخر میں مستعملہ کتابوں کی فہرست کا نام

"کتابیات"

یا "کتاب نامہ" رکھیں۔ عنوان کتاب، ذیلی عنوان اور اسم خاص کا پہلا حرف بڑا رکھیں۔ قوسین میں مصنف کے نام کے بعد تاریخ دیں۔

8- کتابیات میں الٹی پوٹ نہ دیں۔

متن کے اندر اے پی اے کے حوالے اکثر یوں آئیں گے:

مثال نمبر1	Wilson (1983) argues that....
مثال نمبر2	.....(Wilson,1983)
مثال نمبر3	.....(Wilson,1983)
مثال نمبر4	......(Wilson, 1985, P.13
مثال نمبر5	Wilson (1985) claimed....(P.13)
ایک مصنف کے ایک سے زیادہ حوالے	(Wilson, 1984,1985)
ایک سے زیادہ مصنفین کا حوالہ	(Wilson & Smith, 1983) or A recent Study by Wilson & Smith (1983)...
بہت سے مصنفین	(Wilson, Smith of & Jones, 1991)
پہلی بار	(Wilson etal.,1983)

CBE قرطاسِ طرز

کونسل آف بائیوجیکل ایڈیٹرز (سی بی ای) کے قرطاسِ طرز میں مندرجہ ذیل امور کا خیال رکھا جاتا ہے:

1- سرورق، خلاصہ وغیرہ کے لیے الگ الگ صفحہ دیں۔
2- صفحے کے چاروں طرف ایک سے ڈیڑھ انچ تک جگہ چھوڑیں۔
3- ہر سطر دوہرے فاصلے پر ٹائپ کریں۔
4- اوپر دائیں طرف ہر صفحے پر اپنا نام اور صفحہ دیں۔
5- اقتباسات کی پوٹ پانچ فاصلوں پر دیں۔
6- مقالے کے آخر میں کتابیات کا سلسلہ نمبر بطور حوالہ سطر کے اوپر دیں۔
7- کتابیات کا نام "حوالہ جات" رکھیں۔ ماخذ حوالوں کی ترتیب کے ساتھ دیں، (ماخذ ابجدی ترتیب سے بھی دے سکتے ہیں)۔ عنوان کتاب، ذیلی عنوان اور اسم خاص کا پہلا حرف بڑا رکھیں۔ حروف خط کشیدہ یا جلی (Bold) ترچھے (Italic) حروف وغیرہ نہ کریں۔
8- کتابیات میں الٹی پوٹ دیں۔
9- پاورقی اور تعلیقی حواشی (end notes) نہ دیں۔

کتابیات کا اندراج حسب ذیل ہوگا:

مصنف یا ایڈیٹر کا نام، کتاب کا نام، مقام اشاعت، ناشر، سال اشاعت، کل صفحات نمبر۔

شکاگو طرزی وضع

اُردو اور پاکستانی زبانوں میں شکاگو طرزی وضع بہت مقبول ہے۔ یہ طرزی وضع 1906ء میں شکاگو یونیورسٹی کی طرف سے شائع ہوئی۔ 2003ء تک 15 ایڈیشن آ چکے ہیں۔ یہ ایک لچکدار انداز کا حامل ہے اور عموماً MLA یا APA قرطاس کی جھلک نظر آتی ہے۔ آن لائن بھی مہیا ہے۔ یہ قرطاس ترابئین (Turabian) نے طلبہ کی مدد کے لیے تیار کی ہے جو MLA اور APA سے ذرا مختلف ہے اور چھوٹی دستاویزات کے لیے مفید ہے۔ اس کا کچھ ذکر ہم کر چکے ہیں۔ اس کے عمومی اصول حسب ذیل ہیں:

1- الگ سرورق دیں۔

2- صفحے کے چاروں طرف ایک انچ خالی جگہ چھوڑیں۔

3- سطروں میں دہرا فاصلہ دیں۔

4- اوپر دائیں طرف ہر صفحے پر اپنا نام اور صفحہ نمبر دیں۔

5- اقتباسات پانچ فاصلے چھوڑ کر دیں۔

6- مقالے میں حوالہ نمبر سطر کے اوپر دیں۔

7- جب تعلیقات نمبروار دیں تو الگ کتابیات نہ دیں۔ اگر ضرورت ہو تو حسب نمونہ کتابیات دیں۔

8- تعلیقات میں پیرا پوٹ دیں۔ کتابیات میں الٹی پوٹ دیں۔

9- تعلیقات کی بنیادی ہیئت ہی رکھیں۔

یاد رہے کہ شکاگو یونیورسٹی کا طرزی دستور العمل (Manual of Style) بہت مستعمل ہے۔ جس میں ہیئت کے انتخاب کے لیے کئی انداز دیے گئے ہیں۔

متن کے پاورقی میں حوالہ دینے کا بنیادی انداز۔

1.Frederick Nevmann, **Ornamentation and Improvisation in Mozart** (Princeton: Princeton University Press, 1986), 257.

اُردو اور پاکستانی زبانوں میں عموماً قوسین نہیں دیے جاتے اور کتاب کا نام جلی (Bold) کر دیا جاتا ہے۔

مائیکروسافٹ طرزی دستور العمل

مائیکروسافٹ نے ایک **Manual of Style** 1995ء میں شائع کیا تھا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن 1998ء میں اور تیسرا ایڈیشن جون 2004ء میں شائع کیا۔ یہ کمپیوٹر کے ذریعے طرز ہیئت استعمال کرنے کا

معیاری سافٹ ویر ہے۔ اس میں گرامر کے بھی اصول اور ایڈیٹر بھی دیے گئے ہیں۔

تعارف کے بعد صارف کا مواجہ (Interface) ہے، اس کے بعد لے آؤٹ اور عبارت اور صفحے کی وضع کے اصول ہیں۔ اس کے بعد سب سے اہم بات یہ دی گئی ہے کہ مواد عالمی طور پر کیوں کر دیا جائے۔ بعد ازاں بتایا گیا ہے کہ سافٹ ویر تیار کرنے والوں کے لیے مواد کیسے دیا جائے۔ ویب کا مواد کیسے درج کیا جائے۔ قانونی مواد اشاریہ سازی، کلیدی الفاظ، عبارت کا انداز (Tone)، خطاب (Rhetoric) رموز اوقاف، قواعد کے اصول، لغات کا استعمال کیوں کر دیا جائے؟

دیگر طرزی وضع

ان کے علاوہ بھی کئی طرزی وضع یا دساتیر العمل ہیں مثلاً سائنسی مقالات کے لیے امریکی قومی معیار (ANS) جو 1979ء میں شائع ہوا۔ قانون کے لیے **Blue Book** جس کا پندرھواں ایڈیشن 1991ء میں شائع ہوا۔ کیمیا میں ACS وضع، جس کی رہنما کتاب 1986ء میں شائع ہوئی یا طبعیات کے لیے AIP وضع جس کا دستور العمل 1990ء میں شائع ہوا۔ ہارورڈ یونیورسٹی کی وضع (Format) جس میں کتابوں، رسالوں اور ویب سائٹوں کے اندراج کے طریقے درج ہیں۔

کولمبیا یونیورسٹی کی وضع، جو آن لائن اندراج کے لیے موزوں ہے۔ ان کے لیے ایک عالمی معیار 690-950 بھی 1987ء میں وجود میں آیا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن یا حصہ 1997ء میں وجود میں آیا۔ مثالیں:

(الف) مونوگراف (Monographs)

LOMINANDZE, DG. Cyclotron waves in plasma. Translated by AN. Dellis; edited by SM. Hamberger. 1st ed. Oxford : Pergamon Press, 1981. 206 p.
International series in natural philosophy. Translation of: Ciklotronnye volny v plazme. ISBN 0-08-021680-3.

(ب) مونوگراف کا جزو (Monograph)

PARKER, TJ. and HASWELL, WD. A Text-book of zoology. 5th ed., vol 1. revised by WD. Lang. London : Macmillan 1930. Section 12, Phyllum Mollusca, p. 663-782.

(ج) مونوگراف میں حصہ (Contributions)

WRINGLEY, EA. Parish registers and the historian. In STEEL, DJ. National index of parish registers. London : Society of Genealogists, 1968, vol. 1, p. 155-167.

(د) رسالے یا سلسلہ وار یا سیریل (Serials)

Communication equipment manufacturers. Manufacturing an Primary Industries Division, Statistics Canada. Preliminary Edition, 1970- .Ottawa : Statistics Canada, 1971- . Annual census of manufacturers. Text in English and French.ISSN 0700-0758.

(ر) سلسلہ وار یا سیریل میں مضمون

WEAVER, William. The Collectors : command performances. Photography by Robert Emmet Bright. Architectural Digest, December 1985, vol. 42, no. 12, p. 126-133.

Citation Styles (FromWikipedia-7/5/2011)

Citation styles can be broadly divided into styles common to the Humanities and the Sciences, though there is considerable overlap. Some style guides, such as the **Chicago Manual of Style**, are quite flexible and cover both parenthetical and note citation systems. Others, such as **MLA** and **APA** styles, specify formats within the context of a single citation system. These may be referred to as citation formats as well as citation styles.

Humanities

☆ **The Chicago Style** (CMOS) was developed and its guide is **The Chicago Manual of Style.** It is most widely used in history and economics as well as some social sciences. Its derivative is the closely related **Turabian Style** which is designed for student references and is distinguished from the CMOS by omission of quotation marks in reference lists and mandatory access date citation.

☆ **The Columbia Style** was made by Janice R. Walker and Todd Taylor to give detailed guidelines for citing internet sources. Columbia Style offers models for both the humanities and the sciences.

☆ **Evidence Explained:** Citing History Sources from Artifacts to Cyberspace by Elizabeth Shown Mills covers primary sources not included in CMOS, such as censuses, court, land, government, business, and church records. Includes sources in electronic format. Used by genealogists and historians.

☆ **Harvard Referencing** (or author-date system) is a specific kind

of parenthetical referencing. Parenthetical referencing is recommended by both the British Standards Institution and the Modern Language Association. Harvard referencing involves a short author-date reference, e.g., being inserted after the cited text within parentheses and the full reference to the source being listed at the end of the article.

☆ **MLA Style** was developed by the Modern Language Association and is most often used in the arts and the humanities, particularly in English studies, other literary studies, including comparative literature and literary criticism in languages other than English ("foreign languages"), and some interdisciplinary studies, such as cultural studies, drama and theatre, film, and other media, including television. This style of citations and bibliographical format uses parenthetical referencing with author-page (Smith 395) or author title-page (Smith, Contingencies 42) in the case of more than one work by the same author within parentheses in the text, keyed to an alphabetical list of sources on a "Works Cited" page at the end of the paper, as well as notes (footnotes or endnotes).

سوال یہ ہے کہ اُردو اور پاکستانی زبانوں کے لیے ان میں سے کون سی طرزی وضع یا قرطاس استعمال کیا جائے۔ جواب سادہ سا دہی ہے کہ طرزی وضع کوئی بھی استعمال ہو، نئی وضع کی جائے یا کسی جامعہ کی طے شدہ اور مقررہ اصولوں کے مطابق رکھی جائے، پورے مقالے میں اس کی یکسانیت کا پایا جانا ضروری ہے تاکہ قاری کو کسی قسم کی اُلجھن کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ صرف یہ ملحوظ رہے کہ کتاب یا مقالے کا نام جلی یا خط کشیدہ ہو، رسالے کا نام نسخ یا واوین کے اندر یا ترچھے (Italic) حروف میں ہو۔ ہر اندراج کو کامے سے علیحدہ کیا جائے۔ بعض اس کے لیے وقفہ (Full Stop) کی سفارش کرتے ہیں لیکن اُردو میں یہ مناسب نہیں کیونکہ اُردو میں وقفہ چھوٹی لکیر ہوتا ہے نقطہ نہیں ہوتا۔

3- دستاویز کاری

بنیادی بات یہ ہے کہ مقالہ نگاری، تحقیق کاری یا دستاویز کاری ایک قرطاسی اساس رکھتی ہے اور آج تحقیق کے اس میدان کو دستاویز کاری یا دستاویز انجینئری (Document Engineering) قرار دیا جا رہا ہے۔ ادبی تحقیق اور لسانی انجینئری میں یہ بات اور بھی اہمیت اختیار کر جاتی ہے کہ ان میدانوں کی علمی دستاویزات کیوں کر تیار کی جائیں۔ دستاویز کاری قابل ابلاغ مواد کے شواہد پیش کرنے کے طریقے کا نام ہے اور کبھی کبھار ماخذوں کی فہرست کو بھی کہا جاتا ہے اور اب دستاویزات، کتابیات، ماخذات، حوالہ جات، اقتباسات اور ان کی پیش کش کے طرز یا اسلوب کو بھی یہ نام دیا جاتا ہے۔ عام طور پر اسے سائنسی، تکنیکی

(برقیاتی)، قانونی، انتظامی و دفتری اور تاریخی دستاویزات کی انواع میں منقسم سمجھا جاتا ہے۔ ادبی اور لسانی دستاویز کاری عام طور پر آخری نوع "تاریخی دستاویزات" میں شمار ہوتی ہے لیکن اب سائنسی اور برقیاتی میدانوں میں ایسی تحقیق انجام دی جاتی ہے۔

دستاویز کو "ایسا قابلِ ابلاغ مواد (متن، سمعی و بصری مواد، برقیاتی مواد یا ان سب کا آمیزہ) قرار دیا جاتا ہے جو کسی شے، نظام یا عملیے کے خواص بیان کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ بقول بل گیٹ (مائکرو سافٹ) بعض لوگ دستاویز کو کاغذ کا وہ پرزہ کہتے ہیں، جو آپ کو کچھ بتاتا ہے۔ برقیاتی میدان میں یہ وہ کچھ ہے جو ایک کمپیوٹر سے دوسرے کو منتقل ہوتا ہے۔ برقیاتی دستاویز کاغذی دستاویز سے زیادہ کام کرتی ہے۔ کبھی کبھی اسے دستاویز کی انجینئری اور دستاویز کا سافٹ ویئر یا انجینئری دستاویز کاری یا سافٹ ویئر دستاویز کاری کا نام بھی ملتا ہے۔ دستاویزی انجینئری قرطاسی یا کاغذی اور دوسرے کمپیوٹر کے قابلِ خوانی مواد کا نام ہے۔

دستاویز کاری ایک باقاعدہ نظم رکھنے والا میدان (Discipline) ہے اور اس کے ماہر کو دستاویز کار کہا جاتا ہے۔ علمِ اطلاعات (Information Science) کے اس ذیلی میدان میں اس کی باقاعدہ تربیت ہوتی ہے۔ اسے مقالے یا تحریر کو مخصوص دستاویزی اسلوب میں ڈھالنے کی مہارت حاصل ہونی چاہیے۔ وہ کسی بھی حالیہ قرطاسِ کار یا طرز کے معیار کی پیروی کرے لیکن اپنی زیرِ کار دستاویز میں یکسانیت اور ہم آہنگی پیدا کر سکے۔

4- قرطاسِ طرز (Style Sheet)

اردو اور پاکستانی زبانوں کے قرطاسِ تحقیق میں دو طرح کے انداز یا طرز سے وضع ہو سکتے ہیں:۔

(نمبر 1): طلبہ کی تحقیقی رپورٹوں اور مقالوں کے لیے، جو ڈگری کے حصول کے لیے پیش کیے جائیں۔

(نمبر 2): ماہر تحقیق کاروں کی دستاویزات کے لیے جو تحقیقی جرائد میں شائع ہوں۔

ہم جانتے ہیں کہ "قرطاسِ طرز (Style Sheet) ایک قسم کی تصریح کا نام ہے کہ کسی طرح کی کوئی دستاویز ہمیشہ کس طرح سے قاری کے لیے پیش کی جائے۔ یہ ایسی یکسانیت مہیا کرتی ہے جو پیش کاری کی ہدایات کو دستاویز کے مواد سے اس طور الگ پیش کرے کہ نہ صرف مواد کا پورا ابلاغ ہو سکے بلکہ وہ دوبارہ ماخذ بن سکے۔"

پوری دستاویز میں یکساں کاری (Unification) اپنائی جانی چاہیے۔ اس کے لیے تحقیق کار اور پھر تدوین کار کے لیے لازم ہے کہ وہ اس متن کو اصولِ تحقیق کے مطابق ڈھال دے تا کہ مقالہ ایک "ساختہ دستاویز (Structured Document) لگے تا کہ قلم برداشتہ۔ اس کے انھی ضابطوں کا نام قرطاسِ طرز ہے اور ہر بار وہی قرطاسِ طرز استعمال میں لایا جانا چاہیے۔

یہ بات نوٹ رہے کہ قرطاسِ طرز انفرادی نہیں ہوتا۔ یہ ہمیشہ کسی ادارے کی طرف سے طے کیا

جاتا ہے اور اس کے ارکان اس کے پابند ہوتے ہیں۔ دنیا میں بہت سے ادارے اپنا اپنا رہنمائے طرز شائع کرتے رہتے ہیں۔ ان میں انھی کی پیروی کی جاتی ہے۔

یہ سب اپنا اپنا انداز رکھتے ہیں مگر ان سب میں مندرجہ ذیل امور مشترک ہیں جو ہم اساسی اصولوں کے تحت سامنے رکھ سکتے ہیں:

1- ہر علمی ادارے، یونیورسٹی، انجمن یا تحقیقی جریدے کے قرطاسِ تحقیق کا اپنا قرطاسِ طرز ہے، ان میں ایک طرزی وضع برقرار رکھی جاتی ہے۔

2- یہ طرزی وضع اس ادارے، یونیورسٹی، انجمن، جریدے کے تمام زبانوں، شعبوں اور مضامین میں یکساں ہوتی ہے۔

3- تمام تحقیق کار اور مقالہ نگار اس ادارے، یونیورسٹی، انجمن یا جریدے کو اپنی نگارشات اسی معیاری طرز ہیئت میں ڈھال کر پیش کرتے ہیں۔

4- ہر ادارے، یونیورسٹی، انجمن یا جریدے کا دستاویز کار تمام تحریروں/ مقالوں کی تدوینِ نو کرتا اور ان میں یکساں کاری پیدا کرتا ہے۔

یہ وضع مضمون یا میدان کی بنیاد پر نہیں ہو سکتا۔ اس حوالے سے "اُردو" اور پاکستانی زبانوں کے لیے کسی الگ قرطاس طرز کی سفارش نہیں کی جاسکتی، جو "فارسی"، "عربی"، "سندھی"، "پشتو" یا کسی بھی اسلامی/ پاکستانی زبان سے اس خاص ادارے، یونیورسٹی، انجمن یا جریدے کی طرزی وضع سے مختلف ہو۔

5-ذاتی طرز

کسی مقالہ نگار کی ذاتی وضع یا طرز کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ مصنف ادارے یا ایڈیٹر کی رائے کا پابند ہے۔ اس کی نگارشات کی تدوینِ نو کی جاسکتی ہے اور وہ اس تدوینِ نو کو ماننے یا اس پر عمل پیرا ہونے کا پابند ہوگا۔ گویا مقالہ نگار کسی دوسرے ادارے، یونیورسٹی، انجمن یا جریدے کو تحریر یا دستاویز پیش کرنے کے لیے کسی دوسری طرزی وضع یا قرطاسِ طرز کا پابند ہوگا۔ یوں وہ متعدد اداروں کے لیے متنوع طرزوں میں اپنے مقالات شائع کرائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا اپنا کوئی خاص انداز پیش کش نہیں ہوگا۔ البتہ جب وہ اپنے مقالات یک جا کتابی صورت میں شائع کرنے لگے تو ایک بار پھر اپنے اشاعتی ادارے کے طرز میں وہ تمام تحریریں پیش کرے گا۔

اُردو میں قرطاسِ طرز پیش کرنے کے لیے کئی تجاویز پیش ہوتی رہی ہیں۔ مقتدرہ قومی زبان اور ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے مشترکہ پلیٹ فارم سے **اُردو میں فنی تدوین** کے نام سے شائع کردہ کتاب میں ایک سفارش کی گئی ہے۔ ایک سفارش ڈاکٹر معین الدین عقیل نے اپنی کتاب **اُردو تحقیق** میں پیش کی ہے۔ اسی طرح ایک سفارش راقم نے **جدید رسمیاتِ تحقیق** سے شائع کرنا شروع کی ہے۔ ہائر ایجوکیشن کمیشن کی طرف سے معیار بندی کی ایک کوشش باڑہ گلی کی عالمی کانفرنس (7 تا 11 اگست 2001ء) میں پیش کی گئی۔ یہاں کسی بھی طرح کی کسی حتمی سفارش کی پیروی کرنے کی بجائے چند بنیادی

اصولوں کی طرزی وضع کا معیار پیش کرنے پر اکتفا کیا جا رہا ہے لیکن مندرجہ ذیل سفارش کے ساتھ:

6-ادارہ جاتی طرزی وضع

کسی بھی ادارے، یونیورسٹی، انجمن، تحقیقی جریدے کا ایک یکساں (اپنی تمام پیش کشوں اور مطبوعات میں) تحقیقی اشاعتی طرز مخصوص طرزی وضع کے ساتھ موجود ہو اور اس میں سرِ مو انحراف نہ پایا جائے۔

عام ہدایات/اصول

1۔ مصنف، اس کے کام اور اشاعتی معلومات کے تمام عناصر الگ الگ مگر ایک ہی طرح سے نظر آئیں، انھیں کاما (وقفے) کے ذریعے جدا کیا جائے۔ اگر کولن کی علامت (:) دی جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ بعد میں آنے والی معلومات کا اصل مقام پہلے ہے۔ مصنف، کتاب اور ناشر کے نام ہمیشہ انھی حروف اور املا میں لکھے جائیں، جن میں اشاعت ہوئی ہے۔ ان کی اصلاح نہ کی جائے۔

2۔ کتابوں/مضمونوں/مقالوں/رپورٹوں کے نام جلی یا خط کشیدہ ہوں۔

3۔ رسائل کے نام واوین میں یا ترچھے حروف میں لکھے جائیں۔

4۔ مشرح ماخذ تعلیقات کے صورت میں درج کیے جائیں۔ پاورقی حوالے کتابیات میں شامل نہ ہوں۔

5۔ ایڈیٹر/مدیر/مترجم/مرتب/مدوّن کا نام ہمیشہ کتاب یا مضمون اور رسالے کے نام کے بعد دیا جائے۔

6۔ ناشر کا نام مقام اشاعت سے پہلے دینے کی طرز بھی قائم کی جا سکتی ہے، ایسی صورت میں کولن (:) کی بجائے کامے (،) کی علامت درج ہوگی۔

7-مائیکروسافٹ رہنمائے طرز

مائیکروسافٹ رہنمائے طرز اس دستور العمل کے تیسرے ایڈیشن (جون 2004ء) میں زیادہ وسعت کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ یہ ان لوگوں کے لیے مفید ہے جو دستاویز کی تیاری کمپیوٹر کے ذریعے کرتے ہیں۔ اس میں مطلوبہ معلومات ڈال دی جاتی ہیں اور یہ سافٹ ویر انھیں خود بخود قرطاسِ طرز کے مطابق ڈھال دیتا ہے۔ یہ برقیاتی اور کتابی دونوں صورتوں میں موجود ہے۔ اس میں معیاری انگریزی اور طرز کی رہنمائی بھی ملتی ہے۔ اصطلاحات کا بیان بھی ہے۔

اس کے ابواب مندرجہ ذیل ہیں:

1- مواجہٗ صارف کی دستاویز کاری (بنیادی اصول اور تکنیکیں)

2- مواد کی وضع کاری اور لے آؤٹ (حوالے، سرخیاں، حواشی، صفحہ بندی، جدولیں، نوٹس)

3- عالمی مواد (پسند، مقامات، نام، فانٹ وغیرہ)

4- مواد برائے سافٹ ویر تیار کنندگان (ضابطے کی وضعیں اور طرز، منطقیں)

5- ویب مواد (ویب کی عنوانات، تشر تحسیں، عناصر، اسالیب)

6- اشاریہ سازی وکلیدی الفاظ

7- انداز اور بیان (انداز تحریر اور قاری، غیر جانبدار ابلاغ، متوازیت، بشری تقلیب اور مزاح)

8- قابل رسائی مواد (ضمیمے، ویب صفحے، تحریریں، گراف، ڈیزائن، اصطلاحات، مآخذ)

9- عام اسلوبی مسائل (طریق کار، تاریخیں، پیمائشیں، اعداد، حفظ مراتب، اہم نام، کتابیات وغیرہ)

10- قواعدی عناصر (افعال، افراد، جمع اسما، سابقے، لاحقے وغیرہ)

11- رموز اوقاف (تمام ضروری رموز اوقاف اور علامتیں)

12- تکنیکی اصطلاحات اور لغات

یہ دستاویزی طرز عالمی وضع کو تقابلی طور پر سامنے رکھتا ہے۔ اس لیے کسی بھی طرز تحقیق میں وضع طے کر لینے کے بعد اس کا طرز قابلِ استعمال بنایا جاسکتا ہے۔

8-طرزِ قرطاسِ تحقیق (Style of Research Paper)

تحقیقی رپورٹیں/ مقالے/ کتابیں (اداروں یا یونیورسٹیوں کے لیے)

1- سرورق/ پرنٹ لائن
ہمیشہ یکساں ٹائپ، فانٹ، ہندسوں/ اعداد میں موجود ہو۔

2- سرخیاں
متن میں تین گنا بڑا پوائنٹ/ مخصوص فانٹ استعمال ہو۔

3- متن
1۔ عمومی متن (نستعلیق یا نسخ میں ہو تو اس کے اندر مذکور کتابیں، مقالوں، اور مضامین کے نام جلی (Bold) یا خط کشیدہ ہوں۔ رسالوں کے نام واوین" "کے اندر یا ترچھے (Italic) حروف میں ہوں۔
2۔ نستعلیق صورت میں رسالے کا نام نسخ میں بھی ہوسکتا ہے۔
3۔ تصویریں ہمیشہ بائیں صفحہ پر اور خاکے ہمیشہ دائیں صفحہ پر ہوں۔

4- پیرابندی
1۔ ہر پیرا کا الگ الگ نمبر دیا جاسکتا ہے۔
2۔ ہر پیرا پوٹ کے ساتھ دیا جائے۔

5- پاورقی حوالے
1۔ اگر پاورقی حوالے دیے جارہے ہوں تو متن کے نیچے لکیر ڈال کر یا اس کے بغیر لیکن متن سے دو پوائنٹ کم فانٹ میں ہوں۔
2۔ اگر ہر باب یا کتاب/ مقالے کے آخر میں ہوں تو متن کے خاتمے کے بعد فوراً یا اگلے صفحے سے لیکن دو پوائنٹ کم فانٹ میں ہوں۔

5۔ تحشیہ/تعلیقات
1۔ اگر پاورقی ہوں تو دو پوائنٹ کم لیکن حوالوں سے الگ قوسین میں ہوں۔
2۔ اگر ہر باب کے بعد یا کتاب کے آخر میں ہوں تو متن کے پوائنٹ سائز میں دیے جائیں۔

5۔ ہندسے اور اعداد
اعداد ہمیشہ ہندسوں میں دیے جائیں۔ لفظوں میں لکھنا ناگزیر ہو تو ان کے بعد قوسین کے اندر ہوں۔

6۔ صفحات نمبر
ہمیشہ ہندسوں میں درج ہوں، خواہ صفحے کے اوپر یا نیچے، دائیں یا بائیں طرف ہوں لیکن متن کے پوائنٹ سے جدا نظر آئیں۔

7۔ ماخذ/کتاب نامہ
کتابیات یا مجموعی ماخذ تحشیہ یا تعلیقات کے بعد کتاب کے آخر میں ہمیشہ ایک ہی نام "ماخذ" / "کتاب نامہ" / "کتابیات" اور معیاری اسلوب (ہیئت) وغیرہ میں لیکن ضمیموں اور اشاریوں سے پہلے درج ہو۔

8۔ ضمیمے
1۔ ابتدائی فہرست میں اندراج ہو۔
2۔ کتابیات کے بعد آئیں۔

9۔ اشاریے
1۔ بڑی کتاب میں مختلف انواع (اسماء، مقامات، حوالہ جات، موضوعات یا تصورات) کے حوالے الگ الگ اشاریے دو یا تین کالمی ہوں۔
2۔ چھوٹی کتاب (150 صفحات تک) میں یہ تمام اشاریے ایک ہی اشاریے کی صورت میں ہوں۔

حوالہ جات (متن کے اندر یا باہر)

عمومی کتب/مضامین:
دیگر مصنفین کا نام
[مزید دو مصنفین تک]
کتاب کا نام
[جلی یا خط کشیدہ]

مصنف کا نام ، [کاما]
[اگر مصنف نہ ہو تو مرتب ادارے کا نام]
"مضمون یا باب کا نام" ، [کاما]
[واوین میں باب یا مضمون کا نام اگر ان کا حوالہ آنا ہو]

(مرتب/مترجم)
[الفاظ قوسین میں]
مترجم یا مرتب کا نام ،
[اگر ہوں] [کاما]

طبع/ایڈیشن نمبر ،
شہر اشاعت : ناشر

[اگر ہو تو]	[کاما]	ملک کا نام بھی۔ اگر ایک نام کئی ملکوں میں ہو]	[کولن]	[اگر ایک سے زیادہ ناشر ہوں تو پہلا نام]
،	تاریخ اشاعت	،	ص	
[کاما]	[عموماً سن لیکن مہینے کا نام بھی، اگر ایک سال میں کئی اشاعتیں ہوں]	[کاما]	[دوبار ص ص اگر ایک سے زیادہ صفحات کا حوالہ ہو]	
:	صفحات نمبر	دیگر اصل حوالہ		
[کولن]	[جن کا حوالہ دیا گیا ہے]	[اگر یہ حوالہ کسی اور جگہ آیا ہو]		

نمونہ:

شاہ ولی اللہ دہلوی، ''دو مکتوب چہار دہم''، **نادر مکتوباتِ شاہ ولی اللہ**، نسیم احمد فریدی (مترجم)، لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۱۶۸ھ، جلد دوم، ص ص: ۲۱۵ تا ۲۱۷، **فہرست کتب حضرت مرتضیٰ حسن چاند پوری** (قلمی)، جلد ا، ص: ۳۵، (مخزونہ کتب خانہ مرتضیٰ حسن چاند پوری)

عمومی امور

عمومی جریدی مضامین:

مصنف کا نام، مضمون/ مقالے کا نام، ''رسالے کا نام''، مقامِ اشاعت: ناشر، جلد نمبر، شمارہ نمبر، صفحہ نمبر

عمومی برقیاتی / ویب وغیرہ:

'' [فلم/ ویڈیو/ ویب سائٹ/ سی ڈی کا نام جلی یا خط کشیدہ]

عنوان، مصنف/ مدیر/ مرتب/ صداکار یا ڈائریکٹر کا نام، ناشر یا تقسیم کار کا نام، پتا، سالِ اشاعت / سالِ ترسیل

عمومی انٹرویو/ ملاقاتیں:

تاریخ		مقام	،	نوعیت/ انٹرویو		انٹرویو دینے والے کا نام
[تاریخ، سن		[شہر کا نام]		[بالشافہ یا تحریری]		[ایک سے زیادہ نام ہو تو دو مزید نام وغیرہ]

نمونہ:

انٹرویو ڈاکٹر وحید قریشی، بالشافہ، لاہور، ۱۲ اگست ۲۰۰۸ء

دوسری اور تیسری بار حوالہ (اسی صفحے پر)

1۔ پہلا اندراج، **ایضاً**، ص: صفحہ نمبر

2۔ انگریزی میں ایضاً کے لیے **Ibid**

اگر پیچھے کا کوئی حوالہ کسی اور حوالے کے بعد ہو

1۔ مصنف اور کتاب، محولہ بالا، ص: صفحہ نمبر

2۔ انگریزی میں محولہ بالا کے لیے **Op.cit**

اگر اسی مصنف کی دوسری کتاب کا حوالہ ہو

1۔ مصنف اور کتاب، **ایضاً**، ص: صفحہ نمبر

2۔ انگریزی میں ایضاً کے لیے **Ibid**

اگر اسی مصنف کی دوسری کتاب کا حوالہ کسی اور حوالے کے بعد آئے

مصنف، کتاب، محولہ بالا، ص: صفحہ نمبر

متن کے اندر (حوالہ)

☆ مضمون یا کتاب کا نام (جلی یا خط کشیدہ)۔

☆ رسالے کا نام واوین میں یا ترچھے حروف میں۔

☆ اگر متن مختصر ہو (50 صفحات سے کم مقالہ/رپورٹ) تو پاورقی حوالے کی بجائے متن ہی میں مصنف یا کتاب کے نام کے بعد قوسین کے اندر سالِ اشاعت اور کولن کے بعد صفحہ نمبر۔

متن کے اندر (اقتباس)

☆ ایک سطری اقتباس متن کے اندر مسلسل لیکن واوین کے ساتھ اور حوالہ نمبر یا حوالہ آخری واوین کے بعد۔

☆ زائد سطری اقتباس متن سے علیحدہ۔

☆ سن اشاعت اور صفحہ نمبر متن ہی میں قوسین کے اندر کولن (:) دے کر (اگر مقالہ یا رپورٹ چھوٹی ہو یعنی 50 صفحات سے کم) اور پاورقی حوالے نہ دیے جا رہے ہوں۔ اگر صرف حوالہ مصنف کے نام سے متن کے اندر آ رہا ہو تو بھی یہی انداز۔

ماخذ/کتابیات

1۔ مختصر ماخذ یا کتابیات کی صورت میں یک جا فہرست ہو۔

2۔ طویل کتابیات کی صورت میں کتب، رسائل، برقیاتی حوالوں، انٹرویو، قلمی نسخوں،

مقالات کی فہرستیں الگ الگ اور زبان وار بنائی جائیں۔

3۔ کتابیات مصنفین کے نام سے الفبائی ترتیب میں مرتب کی جائے۔(نوٹ: کتابوں کے ناموں سے بھی الفبائی ترتیب سے کتابیات مرتب کی جاسکتی ہے، ایسی صورت میں کتاب کے نام کے بعد کولن اور پھر مصنف کا نام آئے گا) مصنف وار کتابیات میں نام الٹنا لازم نہیں، نام کا معروف لفظ یا الفاظ پہلے لکھ کر نام الٹایا جاسکتا ہے۔

4۔ نام الٹنے کی صورت میں باقی نام کاے کے بعد پورا درج کیا جائے۔ایک ہی فہرست میں دونوں طریقے (پورا معروف نام اور الٹ نام) شامل ہوسکتے ہیں۔شرط صرف معروف نام پہلے ہونے کی ہے۔

تحقیقی رسالوں/ جرائد کے لیے

مقالہ نگار کے لیے ہدایات

1۔ ہمیشہ متعلقہ رسالے/ جریدے کے قرطاس طرز کا مطالعہ کریں اور اپنا مقالہ اسی کے مطابق تیار کر کے اور ایک سطر چھوڑ کر کمپوز کرا کے، برقیاتی اور کاغذی صورت میں، پروف پڑھنے اور نگارشات کو حتمی صورت دینے کے بعد بھیجیں۔متن کے بار بار نئے ورژن نہ بھیجیں۔کاغذی دستاویز کی تین نقول بھیجیں۔

2۔ مقالے کا خلاصہ اُردو یا انگریزی میں الگ سے تحریر کریں (سو سے ڈیڑھ سو الفاظ میں تعارف)

3۔ مقالہ پہلی بار شائع ہونے کے لیے بھیجا جا رہا ہو۔ایک وقت میں زیادہ تحقیقی جریدوں میں مقالہ نہ بھیجا جائے۔

4۔ مدیر کی رائے کا احترام کریں۔اسے آپ کے مقالے کی تدوین یا اشاعت کرنے نہ کرنے کا پورا پورا حق ہے۔اس سے اختلاف نہیں کیا جاسکتا۔

5۔ اپنے مقالے میں اس موضوع پر اس سے پہلے کیے گئے آخری کاموں کے نتائج، اس موضوع پر مزید کام کا جواز اور اپنے کام کا نتیجہ مع مزید تحقیق کی سفارشات ضرور درج کریں۔

6۔ مقالہ کم سے کم ضخامت میں پیش کریں۔

7۔ ہوسکے تو جریدے کے صفحات سائز، ٹائپ اور پوائنٹ میں کمپوز کرا کے بھیجیں۔

مدیر جریدہ کے لیے ہدایات

1۔ مقالہ موصول ہونے کے بعد جائزہ لیں:

(الف) مقالہ جریدے کی پالیسی کے مطابق ہے۔

(ب) مقالے سے کوئی مثبت نتیجہ برآمد ہوتا ہے اور علمی روایت آگے بڑھتی ہے۔

(ج) مقالہ آپ کی طرزی وضع کی قرطاس کے مطابق نہ ہو تو مصنف کو دوبارہ یہ کام کرنے کے لیے بھیج دیں۔

(و) طرزی وضع کے مطابق موصولہ مقالہ ادارتی مجلس کے ان ارکان کو رائے کے لیے بھیجیں جو اس مخصوص میدان میں تخصص رکھتے ہوں۔

(ر) ادارتی مجلس کی رائے حتمی اور آخری ہوگی۔

(س) قابلِ اشاعت، نا قابلِ اشاعت یا تبدیلی درکار ہونے کی صورت میں مصنف کو فوری طور پر آگاہ کریں۔

2۔ منتخب مقالات کی فنی تدوین اپنے جریدے کی پالیسی اور طرزی وضع کے مطابق کریں۔

3۔ یہ سارا عمل تین ماہ کے اندر مکمل ہو۔

عمومی ہدایات

1۔ مقالے کا عنوان جملے کی صورت میں اور مسئلے اور اس کے حل کو بیان کرتا ہو۔

2۔ عنوان کی کمپوزنگ اُردو میں 24 سے 32 پوائنٹ تک اور انگریزی میں 16 تا 18 پوائنٹ تک۔

3۔ مصنف کا نام عنوان سے اوپر دائیں طرف چار پوائنٹ کم سائز میں۔

4۔ مصنف کے نام پر ستارہ (☆) اور اس کے حیثیت، مقام، پتے کا اندراج اسی پاورقی میں ستارے کے نشان کے ساتھ متن سے کم پوائنٹ سائز میں۔

5۔ ذیلی سرخ سطر کے عین درمیان عنوان سے کم پوائنٹ سائز (اردو میں 18 تا 22 پوائنٹ) میں۔

6۔ مزید ذیلی یا بغلی سرخی دائیں طرف علیحدہ سطر میں درمیان ذیلی سرخی سے کم پوائنٹ سائز (اردو میں 16 تا 18 پوائنٹ میں)

7۔ متن کے لیے موزوں سائز پوائنٹ (اُردو میں 14 تا 16 پوائنٹ)

8۔ ذیلی سرخی کے بعد مزید ذیل در ذیل انواع واقسام کی سرخیاں متن پوائنٹ سائز ہی میں لیکن جلی نسخ یا دوسرے فانٹ میں۔

9۔ اعداد ہمیشہ ہندسوں میں (تمام اردو میں یا تمام انگریزی ہندسوں میں)۔ اعشاریہ کے لیے انگریزی کی طرح نقطے کی بجائے ہمزہ کے ساتھ درج کریں۔ سن مکمل درج کریں۔

10۔ حوالہ جات یا ماخذ کی صرف ایک فہرست مقالے کے آخر میں۔

11۔ اگر یہ فہرست صرف کتابیات کی صورت میں ہو تو حوالے کی باقی معلومات، سالِ اشاعت، جلد نمبر، شمارہ نمبر، صفحہ نمبر وغیرہ متن کے اندر قوسین میں درج ہوں۔ کتابیاتی فہرست کا اندراج نمبر اس سے پہلے درج کیا گیا ہو۔

12۔ رموزِ اوقاف، املا مقتدرہ کی سفارشات کے مطابق ہوں۔ اگر ان سفارشات کا اگلا ورژن آئے تو اس کا ذکر قرطاسِ تحقیق میں ہو۔

13۔ اُردو متن کے اندر دوسری زبانوں کے الفاظ کا املا انھی حروف میں بھی درج کیا جائے۔ اگر یہ غیر ملکی الفاظ اُردو میں مستعمل نہ ہوں تو انھیں واوین یا ترچھے حروف میں درج کیا جائے۔

14۔ مرکب اضافی کے الفاظ توڑ کر دوسری سطر میں نہ لے جائیں۔

15۔ اگر کسی خاص لفظ یا جملے پر تاکید یا زور درکار ہو تو اسے واحد واوین میں درج کریں، اگر رسالوں کے نام ترچھے حروف میں دیے جا رہے ہیں اور اسے ترچھے حروف میں درج کریں، اگر رسالوں کے نام واوین میں درج ہو رہے ہوں۔ اگر انھیں نسخ میں دیا جائے تو مناسب ہے۔

16۔ تصویریں اور خاکے ہمیشہ سکین اور صاف عکسی نقول کر کے بھیجے جائیں۔

17۔ برقیاتی صورت میں اگر کمپوزنگ ''ان پیج'' یا کسی خاص برقیاتی فانٹ میں دی جائے تو متعلقہ برقیاتی فانٹ کا ذکر کر دیا جائے اور اگر خدشہ ہو کہ ایڈیٹر کے پاس برقیاتی فانٹ نہ ہوگا تو متعلقہ فانٹ بھی ساتھ بھیجا جائے۔ تصویریں، خاکے فوٹوشاپ جیسے سافٹ ویئر میں نہ بنائی جائیں۔ کوشش کریں کہ ہر شے Word سافٹ ویئر میں تیار ہو۔

ہدایات برائے متن

1۔ متن صرف موضوع کے متعلقہ نکات بیان کر رہا ہو۔

2۔ کسی قوم، ذات، وطن، ملک جغرافیے، مذہب، فرقے، پیشے، نسل، فرد، ادارے وغیرہ کے بارے میں تضحیک وتذلیل کا کوئی لفظ یا جملہ موجود نہ ہو۔

3۔ اجنبی اور نئے الفاظ واصطلاحات کو مع انگریزی مترادفات مقالے سے پہلے فہرست کی صورت میں درج کر دیا جائے۔

4۔ کسی شے/فرد کے بارے میں رائے دیتے وقت حتمی الفاظ استعمال نہ کریں۔

5۔ اگر یونانی یا چینی حروف یا الفاظ یا سائنسی علامتیں استعمال کی جا رہی ہوں اور خدشہ ہو کہ ایڈیٹر کے پاس اس کی پیشکش کا اہتمام نہ ہوگا تو یہ انھیں تصویری صورت میں بھیجیں۔

6۔ اگر کسی جملے کو نامکمل چھوڑنا مقصود ہو تو اس کے بعد تین نقطے یا فل سٹاپ دیں۔

7۔ خاص اصطلاحات کے اُردو تراجم جریدے کی طرف سے مقرر ہوں یعنی معیاری فہرست دی جائے۔ مثلاً:

Data	کے لیے	''کوائف''	(ترجمہ)
Disk	کے لیے	''ڈسک''	(تارید)
Internet	کے لیے	''انٹرنیٹ''	(")
Reference	کے لیے	''حوالہ''	(طے شدہ)
Paper	کے لیے	''مضمون''	(")
Research Paper	کے لیے	''تحقیقی مقالہ''	(")

8۔ جدولیں اور تصویریں متن میں متعلقہ جگہ ہی پر شامل کریں۔

9۔ انگریزی اور رومن ماخذوں کے حوالے کے لیے MLA Style Sheet یا APA Style

Manual Chicago یا Sheet میں سے کسی ایک طرزی وضع کے اصول استعمال کریں۔

ان سفارشات کی روشنی میں ہر ادارہ، یونیورسٹی، انجمن یا تحقیقی جریدہ اپنا طرزی وضع یا قرطاسِ طرز تیار کرے اور اسے باقاعدہ اور مسلسل شائع کرتا رہے۔ کئی ادارے مل کر بھی ایک طرزی وضع پر متفق ہو سکتے ہیں۔ ادبی گروہ کا قرطاسِ طرز پر عبور لازم ہے۔ مختلف اداروں کے حوالے دینے کے مختلف طرزوں کی تفاصیل پیچھے ملاحظہ ہوں۔

ایک جامعہ نے اپنے اُردو کے شعبے میں تحقیقی جریدے کے مقالہ نگاروں کے لیے ہدایات دیں، جو اگلے چوکھٹوں میں درج ہیں۔

اس انداز میں بڑی بریکٹ [ ] کا استعمال صوابدیدی ہے، اگرچہ مناسب نہیں۔ اسی طرح انگریزی یا کسی دوسری زبان سے کتابوں کا اندراج اسی زبان میں نہ ہونا غلط ہوگا۔ کتاب فرانسیسی یا چینی میں ہو تو اندراج بھی اسی رسم الخط میں ہوگا، جس میں کتاب شائع ہوئی ہے۔ متن کے اندر اس کا ذکر اُردو میں بھی کیا جا سکتا ہے۔

رسالے یا اخبار کی تحریر کے گرد واوین بھی غلط بات ہے۔ تحریر کے عنوان کو جلی (Bold) ہونا چاہیے، واوین صرف رسالے یا اخبار کے اپنے نام کے گرد ہونے چاہئیں۔

ریکارڈ یا انٹرنیٹ کے ذخیرے کے انگریزی حوالے کے آگے تاریخ بھی انگریزی ہی میں ہونی چاہیے۔ اُردو ذخیرے اور اُردو انٹرنیٹ کے حوالے کا اس میں کوئی تذکرہ نہیں۔

مقالہ ارسال کرتے ہوئے درج ذیل اصولوں کو ملحوظ رکھا جائے، جو آج کی ترقی یافتہ علمی دنیا میں بالعموم رائج ہیں اور جن پر "معیار" عمل کرے گا:

(1) صفحہ اوّل کی پیشانی پر تین سطروں کی جگہ کو خالی رکھ کر درمیان میں عنوان تحریر کیا جائے اور نیچے مزید 3 سطریں چھوڑ کر مقالے کا خلاصہ انگریزی زبان میں زیادہ سے زیادہ 200 لفظوں میں تحریر کیا جائے۔ عنوان اور انگریزی خلاصے کے درمیانی فاصلے میں بائیں جانب کنارے پر مقالہ نگار کا نام تحریر ہونا چاہیے۔

(2) کاغذ کی جسامت A4 ہو، لیکن متن کا مسطر 19×11 س۔م۔ میں رکھا جائے۔ حروف کی جسامت 12 پوائنٹ ہو۔ مقالہ کاغذ کی ایک ہی جانب لکھا جائے۔

(3) اگر کسی تصنیف پر تبصراتی مقالہ (Review Article) تحریر کیا گیا ہے تو اس میں تصنیف کا مکمل عنوان، مصنف کا نام، ناشر، شہر، سن اشاعت، صفحات کی تعداد ضرور درج کی جائے۔

(4) متن میں حوالوں کا اندراج یا مآخذ کا حوالہ اگر بین السطور دیا جائے تو حوالے کے لیے مصنف کے نام کا آخری جزو، سنِ اشاعت اور صفحہ نمبر، جو جہاں ضروری ہو، درج کیا جائے۔ اگر اسی حوالے کو دوبارہ دینا ہو تو اسی صورت میں درج کیا جائے۔ بین السطور حوالہ درج کرتے ہوئے "ایضاً" اور "تصنیف مذکور" سے گریز کیا جائے۔ مثالیں درج ذیل ہیں۔

[اقبال، 1924ء، 35]

[قریشی، 1967ء، الف، 62-63] یہاں الف اس لیے ہے کہ اس مصنف کا کوئی اور ماخذ بھی اسی سال چھپا ہے اور اس کا حوالہ بھی فہرستِ اسنادِ محولہ یا کتابیات میں شامل ہے۔

[داؤدی، 2008ء، باب چہارم]

[عبداللہ، 1961ء، 103، فاروقی، 1935ء، 17]

(5) حاشیے میں بھی مآخذ کا حوالہ درج بالا مثالوں کے مطابق ہی ہونا چاہیے، لیکن ضرورتاً ''ایضاً'' یا ''تصنیفِ مذکور'' بھی تحریر کیے جائیں۔

(6) مقالہ چاہے مختصر ہی ہو لیکن آخر میں تمام مآخذ یا حوالوں کی فہرست ''فہرستِ اسنادِ محولہ'' (یا کتابیات) شامل کی جائے۔ اس کا اصول یہ ہونا چاہیے:

(الف) اگر کتابوں کا اندراج کرنا ہو تو:

احمد ظہور الدین 1990ء ''پاکستان میں فارسی ادب'' جلد پنجم، لاہور، ادارہ تحقیقات پاکستان،

خانم، ارشد، ڈاکٹر، 2008ء ''علامہ اقبال کے تصوراتِ فنِ لطیف''، ملتان، شعبہ اُردو، بہاالدین زکریا یونیورسٹی

شواب، ریمنڈ (Schwab, Raymond)، 1984ء، The Oriental Renaissance: Europe's Re-discovery of India and the East, 1680-1880 نیویارک، کولمبیا یونیورسٹی پریس

(ب) اگر مجموعۂ مقالات کا اندراج کرنا ہو تو:

عبدالرحمٰن، سید صباح الدین، 1977ء ''جدید فکرِ اسلامی کی تشکیل میں تصوف کا حصہ'' مشمولہ: ''فکرِ اسلامی کی تشکیلِ جدید'' مرتبہ ضیا الحسن فاروقی اور مشیر الحق، نئی دہلی، مکتبۂ جامعہ، ص ص 159-172

ہائمن، آرتھر (Hyman' Arther)، 1966ء Jewish Philosophy in the Islamic World مشمولہ: History of Islamic Philosophy مرتبہ: سید حسین نصر اور اولیور لیمن (Oliver Liman) حصۂ اوّل، لندن، روٹلج، ص ص 677-695

(ج) اگر مجلّہ، جریدے یا رسالے کے مقالہ کا اندراج کرنا ہو تو:

نیر، ناصر عباس، 2008ء ''جدیدیت کی فکری اساس'' مشمولہ: ''بازیافت'' شمارہ 11۔ جولائی تا دسمبر، ص ص 153-180

(د) اگر ترجمے کا اندراج کرنا ہو تو:

سعید، ایڈورڈ (Said, Edward)، 1981ء ''اسلام اور مغربی ذرائع'' (Covering Islam) مترجم: جاوید ظہیر، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان

(ہ) اگر اخبار کی کسی تحریر کا اندراج کرنا ہو تو:

قریشی، سلیم الدین 2008ء، (23 مئی) ''ہم نے کیا کھویا کیا پایا'' مشمولہ: ''جنگ'' (کراچی) ص 7

(و) اگر ریکارڈ یا ذخیرے کا حوالہ درج کرنا ہو تو:

Descriptive Catalogue of Quaid-e-Azam بحوالہ F.262/100 Papers جلد 3، ص 48، (26 جولائی 1940ء)

(ز) اگر انٹرنیٹ، آن لائن دستاویز کا اندراج کرنا ہو تو:

Social Watch. http:// www. chaszue. apc. org/ socwatch/ udex.htua (مورخہ: 15۔ جنوری 2009ء)

9-مابعد اشاعت ذمہ داری

تحقیقی مقالے کی اشاعت کے بعد خواہ وہ نجی طور پر شائع ہو یا تحقیقی مرکز یا جریدے میں، ہر تحقیق کار، مدیر جریدہ اور منتظم ادارہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ اگلے برسوں میں اس اشاعت کے اثرات (Impact) کا جائزہ لے اور یہ جائزہ بھی مسلسل شائع ہو۔ اگلے کاموں/اشاعتوں میں اس کا تذکرہ ہو سکتا ہے۔ تحقیقی جریدے کے مدیر کا کام یہ ہے اور خاص طور پر اُردو اور پاکستانی زبانوں میں کی گئی تحقیق کے حوالے سے اثرات کا مطالعہ (Impact Study) خود ہی کرنا پڑے گا۔ اثری مطالعے پر بحث اکیسویں باب میں کی جا رہی ہے۔

عالمی سطح پر اثری عامل (Impact Factor) کا مطالعہ ISI جیسا ادارہ کرتا ہے۔ یہ ادارہ انسٹی ٹیوٹ فار سائنٹیفک انفارمیشن کے نام سے 1960ء سے کام کر رہا ہے۔ یہ سالانہ رپورٹ شائع کرتا ہے اور معلوم کرتا ہے کہ کسی تحقیقی جریدے اور اس میں شائع ہونے والے مقالات کا حوالہ کس حد تک دوسرے تحقیقی مقالوں میں آیا اور ان کے اثرات کس حد تک پڑے۔ اس ادارے میں اپنے اثرات بڑھانے کا طریقہ یہی ہے کہ اپنے تحقیقی مقالوں کے اثرات کا اشاریہ مرتب کر کے پیش کیا جاتا ہے۔ اس اثری مطالعے سے تحقیق کار اور مدیر کسی تحقیقی مقالے اور جریدے کے تحقیقی مقام اور علمی جائزے کا اندازہ لگا سکتا ہے، اسے آگے بڑھا سکتا ہے یا آئندہ کے لیے پس پشت ڈال سکتا ہے۔

مدیر ''جریدہ'' کی یہ اداراتی ذمہ داری ہے کہ وہ اُردو کے دس بیس چیدہ جرائد میں شائع ہونے والے مقالات میں اپنے جریدے کے حوالے تلاش کرے اور انھیں اپنے جریدے کی آئندہ اشاعت میں اشاریے کے طور پر شائع کرے۔ محض اسی سے تحقیق/تحقیقی مقالے/جریدے کے ''وقیع'' ہونے کا ثبوت پیش ہو سکے گا۔ وگرنہ بزعم خویش ہر موضوع اور ہر تحقیق کار ''وقیع'' ہے اور یہی غیر سائنسی رویہ بے جواب اُردو کے تحقیق کاروں میں نہیں ہونا چاہیے۔ محض اپنے مقالوں کا اشاریہ شائع کرنا اثری عامل نہیں کہلا سکتا۔ اس لیے اُردو جریدے اس قسم کی فضول کوششوں میں مبتلا ہیں۔

10- پاکستان میں نام نگاری

انگریزی نام تو اسی اصول کے تحت دیے جائیں کہ آخری لفظ پہلے دیں اور کامے کے بعد نام کے باقی الفاظ درج کریں لیکن پاکستانی ناموں کے سلسلے میں ذرا سی الجھن درپیش ہوتی ہے۔ پاکستانی نام عموماً مرکب ہوتے ہیں۔ انگریزوں کے برعکس ہر فرد کے تین تین نام نہیں ہوتے۔ ''محمد'' کا لفظ عموماً تبرکاً یا نسبتی طور پر شامل کیا جاتا ہے۔ باقی نام مرکب ہوتے ہیں۔ جیسے ''عبداللہ''، ''غلام حسین''، ''کنیز فاطمہ''۔ کسی کسی کے نام کے ساتھ خاندانی یا نسبتی اور علاقائی حوالہ بھی ہوتا ہے۔ جیسے ''راجا''، ''چودھری''، ''درانی''، ''مودودی''، ''نعمانی''، ''دہلوی''۔ اسی طرح کہیں کہیں تخلص بھی شامل ہوتا ہے جیسے ''آزاد''، ''شبلی'' وغیرہ۔ اس لیے پاکستانی ناموں کا اندراج کرتے ہوئے سفارش کی جاتی ہے کہ اس میں انگریزی کے طور پر آخری لفظ کو ہر نام کے سلسلے میں پہلے نہ لکھا جائے بلکہ مندرجہ ذیل اصولوں کو ملحوظ رکھا جائے:

1- مرکب نام من وعن دیے جائیں، جیسے:
عبداللہ، غلام حسین، نوازش علی، اکبر سجاد

2- القابات وغیرہ آخر میں کر دیے جائیں، جیسے:
ڈاکٹر سید عبداللہ کو عبداللہ، سید، ڈاکٹر یا ''عبداللہ، ڈاکٹر سید''

3- ادیبوں کے معروف نام یا تخلص کو پہلے درج کیا جائے، جیسے:
ابوالکلام آزاد کو آزاد، ابوالکلام
ابوالاعلیٰ مودودی کو ''مودودی، ابوالاعلیٰ''
''سرسید'' اور ''شبلی نعمانی'' کو ''سرسید'' اور ''شبلی نعمانی'' ہی درج کیا جائے۔
ڈاکٹر محمد صدیق خان شبلی کو ''شبلی، محمد صدیق خان، ڈاکٹر'' یا ''شبلی، ڈاکٹر محمد صدیق خان''۔
متن میں اشخاص کے نام کے لیے ڈاکٹر گیان چند نے حسبِ ذیل اصول دیے ہیں:
''اشخاص کے ناموں کو (عرف، لقب، کنیت، تخلص) خط کشیدہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ متن میں خط کشیدگی بدنما معلوم ہوتی ہے، اس لیے جہاں زیادہ ضرورت ہو، صرف وہیں کی جائے، انگریزی کتابوں میں خط کشیدگی کے موقع پر ترچھے حروف (Italics) کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اشخاص کے ناموں کو سب سے معروف طریقے سے لکھیے خواہ وہ نام ہو (مالک رام) یا عائلی نام (چکبست) یا کنیت (ابوالکلام) یا لقب (مجدد الف ثانی) یا خطاب (محسن الملک) تخلص یا نسبت (ملیح آبادی، رومی)۔ نام کو اجنبی طریقے سے نہ لکھیے، چکبست کو برج نراین، جمال الدین افغانی کو محض جمال الدین، جگر کو منشی علی سکندر لکھا جائے تو ذہن فوراً گرفت نہ کر سکے گا''۔ (یعنی معروف نام کو اہمیت حاصل ہے)۔

ہمارے یہاں ناموں کے ساتھ کئی تعظیمی سابقے ولاحقے لگائے جاتے ہیں۔ ایم ایل اے سٹائل شیٹ اور ہینڈ بک دونوں میں ہدایت ہے کہ ناموں کے ساتھ کوئی سابقہ نہ لگایا جائے خواہ شخص زندہ ہو کہ فوت شدہ۔ اگر کسی شخص پر وار یعنی تنقید یا اعتراض کرنا ہے تو اس وقت اس کے نام کے ساتھ تعظیمی القاب لگادیں۔

متن میں کسی شخص کے نام کے ساتھ تعظیمی سابقے یا القاب لگانا تحقیق کار کی صوابدید پر منحصر ہے تاہم اردو کی تحقیقی تحریروں میں یہ قاعدہ اپنایا جاسکتا ہے کہ مرحومین کے نام کے ساتھ کوئی تعظیمی لقب نہ لگایا جائے، زندوں کے نام کے ساتھ بھی حتی الامکان پرہیز کیا جائے۔ ہماری زبان میں تعظیم کی خاطر واحد شخص کے لیے ضمیر وفعل کو جمع کے طور پر لاتے ہیں۔ جیسے "شبلی نعمانی لکھتے ہیں"۔ اتنی تعظیم ہی کافی ہے۔

جہاں فعل سے تعظیم ظاہر نہ ہو وہاں زیادہ بزرگ ناموں کے ساتھ القاب کا اضافہ کر سکتے ہیں، مثلاً علامہ اقبال، منشی پریم چند، آنند نراین ملا، مولانا آزاد، مولانا مودودی، علامہ فکری۔ ہاں جو القاب بعض ناموں کا اس طرح جزو بن گئے ہیں کہ انھیں حذف کر دیا جائے تو شخص کی پہچان بھی مشکل ہو جائے وہاں القاب کو ضرور برقرار رکھیں مثلاً سرسید، قاری سرفراز حسین، ملا واحدی، قاضی عبدالودود، علامہ اقبال وغیرہ۔

انبیاء اولیا اور بزرگانِ دین کے ناموں کے ساتھ حسب عقیدہ احترامی القاب استعمال کر سکتے ہیں کہ یہ ایک مسلّمہ معاشرتی چلن ہے۔ مندرجہ بالا اصول ادیبوں، انسانوں، عالموں اور دیگر معروف افراد کے ناموں کے لیے ہے، دینی معاملات جدا ہیں۔ ان کا احترام اسی طرح کرنا واجب ہے، جیسے جاری ہے۔

اٹھارھواں باب

اُسلوبِ مقالہ و اندازِ بیان

مقالے کی تحریر، اس کا اندازِ بیان اور اُسلوب کے خاطر خواہ تکنیکی تقاضے موجود ہیں۔ مقالہ نگاری ایک مخصوص تحقیقی اور علمی اندازِ تحریر یا اُسلوب کی حامل ہوتی ہے۔ تکنیکی طور پر اس کی پیشکش کا پہلو تحقیقی طرز کہلاتا ہے۔ اس کے لیے مخصوص وضع (Format) یا قرطاس (Sheet) استعمال کیا جاتا ہے۔ مواد کا اندراج، حوالہ اور اقتباس مخصوص انداز میں دیے جاتے ہیں لیکن جملے اور عبارتیں بھی ایک مخصوص وضع کی حامل ہوتی ہیں۔ اس لیے اسے اُسلوب کہا جاتا ہے۔

1- تحقیقی زبان اور اُسلوب

تحقیق نگاری عام تحریر و تسوید سے یکسر جدا اندازِ تحریر یا اُسلوبِ تحریر کی حامل ہوتی ہے۔ اس کے اپنے مخصوص الفاظ، جملے اور طرزِ عبارت ہوتی ہے۔ یہ ایک متفق علیہ امر ہے کہ تحقیقی اسلوب حقیقت پسندانہ اور معروضی ہو۔ تحقیقی مقالہ ایک رپورٹ ہوتی ہے، تخلیقی نگارش یا ادبی تحریر نہیں۔ اسے زیادہ سے زیادہ غیر جانبدار اور اثباتی ہونا چاہیے، موضوعی اور صنفی نہیں ہونا چاہیے۔ قاضی عبدالودود سے ڈاکٹر گیان چند تک بھی صحیح اس سے متفق ہیں۔ زیادہ تر مسئلہ تحقیق میں تنقیدی زبان کے استعمال اور صفات و قیود کو بے محابا دنے سے پیدا ہوتا ہے۔ اپنی رائے جا بجا ٹھونسنے اور دوسروں کی نفی کرنے سے تحقیقی اسلوب وضع نہیں ہو پاتا۔ تحقیق کی یہ زبان اور اُسلوب کیسا ہو، اس سلسلے میں البتہ اختلاف پایا جاتا ہے۔

اندازِ تحریر (Writing Tone) یا محضر (Discourse) ایک اور اہم موضوع ہے جس کا مطالعہ اور آگہی تحقیق نگاری سے قبل ضروری ہے۔ اندازِ تحریر کسی مصنف کے اس رویے کا نام ہے جو وہ اپنے قارئین کے ساتھ روا رکھتا ہے۔ اس میں قارئین کے مقام کو بنیادی اہمیت حاصل ہے یعنی کیا مصنف قارئین کو اپنے سے بلند تر سمجھتا ہے یا کمتر؟ مقصود صرف یہ ہے کہ کیا وہ اپنا پیغام ان تک پہنچا سکتا ہے۔ ایک انداز (Tone) واعظانہ (Rhetoric) کہلاتا ہے۔ اس میں مقرر خود کو بلند تر مقام پر فائز سمجھ کر قارئین سے خطاب کرتا ہے اور تلقین کا انداز اختیار کرتا ہے۔ بس یوں سمجھیں کہ اندازِ بیان اپنے سامعین یا قارئین ہی کو ملحوظ رکھ کر اختیار کیا جاتا ہے۔ تحقیق کار کا لسانی کینڈا (Langauge Genre) ہی اس انداز کا تعین کرتا ہے۔ یعنی وہ کس صنف

میں اپنی تقریر یا تحریر پیش کر رہا ہے؟ یہاں ہماری مراد تحقیقی رپورٹ لکھنے سے ہے۔ گویا تحقیق کار کا انداز بیان بھی محقق کا اور لسانی کینڈا تحقیقی زبان کا ہوگا۔ یہ رسمی، غیر جانبدار، غیر ذاتی تحریکی اور تشویقی ہوتا ہے۔

یہ کسی نہ کسی طرزی وضع میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس کا مخصوص محضر (Discourse) ہوتا ہے۔ محضر مصنف اور قارئین/مقرر اور سامعین کے باہمی مکالے کو کہتے ہیں۔ اس کے اپنے ضابطے (Codes) اور رموز ہوتے ہیں جو کسی خاص جمعیت یا سماجی گروہ میں جنم لیتے ہیں، جیسے ادبی محضر، قانونی محضر، سائنسی محضر وغیرہ۔ اس کی اپنی روایات اور اصطلاحات ہوتی ہیں۔ گویا محضر (Discourse) کسی زبان، سماج اور ادارے کے باہمی ربط کا نام ہے۔ یہ غور و فکر کی پیشکش کا رسمی انداز (Formal Tone) ہوتا ہے۔ ساختیات (Structuralism) میں معنی کی تلاش کے حوالے سے محضر کو اہمیت حاصل ہے۔

قاضی عبدالودود لکھتے ہیں:

"محقق کو خطابات سے احتراز واجب ہے اور استعارہ و تشبیہ کا استعمال صرف توضیح کے لیے کرنا چاہیے، آرائش گفتار کی غرض سے نہیں۔ اسماء کے ساتھ صفات بھی اسی وقت لانی چاہئیں جب کوئی صفت، لکھنے والے کی اصل رائے کو ظاہر کرتی ہو۔ تناقض و تضاد اور ضعف استدلال سے بچنا چاہیے اور مبالغہ کو تحقیق کے لیے سم قاتل سمجھنا چاہیے۔ تحقیق کا مطمح نظر یہ ہونا چاہیے کہ کم سے کم الفاظ میں پڑھنے والے پر اپنا مافی الضمیر ظاہر کردے۔ یہ غلط نہ ہو لیکن اسلوب بیان ایسا ہو کہ شبہے کی گنجائش نہ رہے۔"

قابلِ تقلید اسالیب

یہ سوال بہت اہم ہے کہ تحقیق میں زبان اور اسلوب کے حوالے سے کس تحریر کو معیاری اور قابلِ تقلید قرار دیا جائے؟ ہماری ماضی کی تحقیق میں اس کے نمونے یقیناً موجود ہیں مگر مربوط اور منظم طریقے سے اس کے اصول و ضوابط مرتب کرنے کی شاید کوئی شعوری کوشش نہیں کی گئی۔ البتہ حالیہ چند برسوں میں رسمیات مقالہ نگاری پر باقاعدہ مقالات تحریر کیے گئے اور زبان و اسلوب، حوالہ جات، اقتباسات اور کتابیات وغیرہ کے اصول و ضوابط جدید سائنٹفک اصولوں کی روشنی میں مرتب کیے جا رہے ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند نے تو زبان اور بیان کے عنوان سے ایک الگ باب مخصوص کیا ہے اور اس پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ فاضل محقق نے غالباً پہلی بار اس موضوع پر مشرقی محققین مثلاً قاضی عبدالودود، رشید حسن خان، عبدالرزاق قریشی، پروفیسر محمد حسن اور مولانا کلب عابد کے علاوہ مغربی محققین مثلاً پارسنس، راس، جارج واٹسن، میک کیرو اور رچرڈ ایلٹک کی آراء درج کی ہیں اور پھر اپنا نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔

دو آراء ملاحظہ ہوں:

(الف) رشید حسن خان:

"تحقیق کی زبان کو امکان کی حد تک آرائش اور مبالغے سے پاک ہونا چاہیے اور صفاتی الفاظ کے استعمال میں بہت زیادہ احتیاط کرنا چاہیے۔ اُردو میں تنقید جس طرح انشا

پردازی کا آرایش کدہ بن کر رہ گئی ہے وہ عبرت حاصل کرنے کے لیے کافی ہے اور تحقیق کو اس حادثے کا نشانہ نہیں بننے دینا چاہیے......"

(ب) عبدالرزاق قریشی:

"تحقیقی مقالہ چوں کہ واقعات وحقائق پر مبنی ہوتا ہے اس لیے اس میں لفاظی یا افسانہ طرازی، خطابات یا شاعرانہ رنگین بیانی سے کام نہیں لینا چاہیے۔ یہ باتیں مقالے کی عظمت کو کم کرتی ہیں"۔

ڈاکٹر گیان چند کے افکار کا خلاصہ یہ بھی ہے کہ تحقیقی تحریر کے الفاظ کو مصنف کا عندیہ بے کم وکاست بیان کرنا چاہیے۔ اسے اپنی ذات، تعصبات اور دلچسپیوں کو الگ تھلگ رکھنا چاہیے اور بہر صورت معروضیت اور غیر جانبداری کے تقاضوں کو پورا کرنا چاہیے۔ اس عمل میں ذاتی پسند و ناپسند، شخصی تعلقات، سماجی و ادبی مسلّمات کی پروا کیے بغیر صورت حال خواہ کیسی ہی کیوں نہ ہو اور تحقیقی نتائج جو رخ اختیار کر رہے ہیں ان نتائج کا برملا اظہار علمی دنیا کے سامنے جرأت اور دیانت کے ساتھ کرنا چاہیے۔ اسی میں تحقیق کی شان اور محقق کی آن پوشیدہ ہے۔ اسی لیے رشید حسن خان تحقیق کے عمل کو بت گری کی بجائے بت شکنی قرار دیتے ہیں۔

اہم خواص

تحقیقی اسلوب کی چند مثالیں اس کے خواص معلوم کرنے کے لیے تبصرے کے ساتھ پیش ہیں:

صفات کے استعمال میں یہ اندیشہ رہتا ہے کہ موصوف کو کچھ بڑھا چڑھا کر پیش کر دیا جائے۔ خود قاضی صاحب نے رسالہ "تحریر" سے ذیل کی دو مثالیں دی ہیں:

(الف) لکھنو سے چند میل کے فاصلے پر علما و فضلا کا ایک بہت بڑا مرکز کاکوری رہا ہے۔ لکھتے ہیں: "بہت بڑا، محض برائے آرایش ہے۔"

(ب) "تحریر" کے اسی شمارے میں ساحر کاکوروی کے مشہور اور قابل شاگردوں کے جو نام دیے ہیں ان میں سے کئی کے نام دے کر قاضی صاحب نے دعوی کیا کہ انھیں مشہور نہیں کہا جاسکتا۔

حافظ محمود شیرانی پنجاب میں اردو میں لکھتے ہیں: "قاضی محمود گجراتی متوفی 920ھ ہندی کے زبردست شاعر تھے۔" یہاں "زبردست" کی ضرورت نہیں۔ ہندی ادب کی تاریخوں میں ان کا نام بھی نہیں ملتا۔ محض "شاعر" کہنا کافی تھا۔

دراصل صفت کے استعمال پر ہر جگہ پابندی نہیں لگائی جاسکتی۔ صرف یہ خیال رکھنا چاہیے کہ اس سے عندیے میں کچھ کمی بیشی تو نہیں ہوگئی۔

تناقض وتضاد شاعری میں جائز ہے۔ ہم "ٹھنڈی گرمیاں" اور "آدھی رات کا سورج" کہہ سکتے ہیں لیکن علمی تحریروں میں اس کی گنجایش نہیں۔ قاضی صاحب نے آبِ حیات سے دو مثالیں دی ہیں۔

آزاد نے مرزا مظہر جانِ جاناں کے احوال میں لکھا ہے:

''قائل صبیح و ملیح بود، کوئی شخص بیک وقت صبیح و ملیح نہیں ہو سکتا اور یہ اس کا محل نہیں کہ ملیح خوب صورت کے معنی میں آسکے۔''

دوسری مثال یہ ہے کہ آبِ حیات میں دبیر کے حال میں درج ہے۔ ''خاندان کے بارے میں نہ یقین ہے نہ شک، اگر یقین نہیں تو شک ہونا لازم ہے''۔

عموماً تحقیقی تحریروں میں تضاد کی مثالیں کم ہی ہوتی ہے۔ یہ وہیں ہو سکتا ہے جہاں کوئی کسی دریافت یا دعوے کو نہ تو قبول کر سکے اور نہ بہتر طریقے پر رد کر سکے۔

یہ بات صحیح ہے کہ مبالغہ تحقیق کے لیے قاتل ہے۔ صفات کے استعمال کی مندرجہ سابق تمام مثالیں مبالغے کی بھی مثال ہیں۔

آں جہانی ڈاکٹر گیان چند جین اُردو کے انھی گنے چنے چند محققین میں سے ہیں جن کا سیدھا سادہ اور دوستانہ پیرایہ اظہار ان کی کتابوں اور مقالوں کو خوانا پذیر بنا دیتا ہے۔ تاہم ایسے انداز سے دقیق علمی نکات اپنے تکنیکی نکات سے بھی محروم ہو جاتے ہیں۔ دوسری طرف انتہائی تکنیکی اسلوب بھی ابلاغ کی راہ میں رکاوٹ بھی بن جاتے ہیں۔ اس کی ایک مثال ڈاکٹر وحید قریشی نے قاضی عبدالودود کے حوالے سے یوں دی ہے:

> ''قاضی عبدالودود کے ہاں چند بنیادی قباحتیں ہیں۔ مثلاً یہ کہ تحقیق کی عبارت کو پڑھنے کے قابل ہونا چاہیے اور دوسرے کے لیے قابل فہم ہونا چاہیے۔ وہ اس کے لیے چار کلیے بناتے تھے۔
>
> مخففات اس قدر استعمال کرتے تھے کہ نتیجۃً محقق کو ڈھونڈنا پڑتا تھا کہ یہ پپ، اب، تپ وغیرہ کس کے مخفف ہیں۔ اس طرح وہ مختلف کلیدیں دے کر بات کو گنجلک بنا دیتے تھے۔ شروع شروع میں وہ استخراجی نتائج بھی نکالتے تھے۔ جہاں اس کا حل دیکھتے تو کہتے تھے کہ کہیں اور بیان کر آیا ہوں یا یہ کہتے تھے کہ یہ میرا مسلک نہیں ہے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ پڑھنے والے کے لیے گورکھ دھندا چھوڑ جاتے تھے۔ دوسرا یہ کہ ان کے انتقال سے دس سال پہلے کے مرحلہ میں ان کے لکھے ہوئے مضامین نکال کر دیکھ لیں، انھوں نے جس قدر اقتباسات دیے ہیں اگر آپ انھیں اٹھا کر اصل کتابوں میں واپس رکھ دیں تو مضمون کی جگہ خالی صفحات ہی رہ جاتے ہیں''۔
>
> قاضی عبدالودود نے تو یہ بھی کہا ہے:
>
> ''بعض موضوعات ایسے ہیں کہ ان پر آزادی سے کچھ لکھنا ضرر رساں ہو سکتا ہے، اگر اس کے لیے آمادہ نہیں تو ایسے موضوع پر قلم اٹھانا نامناسب ہے۔ کسی محقق کے لیے یہ نہایت نازیبا بات ہے کہ اسے خود راست گفتاری سے باز رکھے۔''

قاضی عبدالودود نے اپنے اسی مضمون میں تحقیق کی زبان کے حوالے سے کچھ اس انداز میں لکھا

ہے:

''محقق کو خطابت سے احتراز واجب ہے اور استعارہ تشبیہ کا استعمال صرف توضیح کے لیے کرنا چاہیے۔ آرائش گفتار کی غرض سے نہیں۔ اسماء کے ساتھ صفات اسی وقت لانا چاہئیں جب کوئی صفت لکھنے والے کی اصل رائے کو ظاہر کرتی ہو۔ تناقض و تضاد اور ضعفِ استدلال سے بچنا چاہیے اور مبالغے کو محقق کے لیے سمِ قاتل سمجھنا چاہیے۔ محقق کا مطمحِ نظر یہ ہونا چاہیے کہ کم سے کم الفاظ میں پڑھنے والے پر مافی الضمیر ظاہر کردے۔''

ڈاکٹر انوار احمد لکھتے ہیں:

''اُردو تحقیق میں ہر بزرگ کی ریاضت اور رتبے کے احترام کے باوجود میں یہ عرض کروں گا کہ مولانا امتیاز علی عرشی کے اسلوب کی پیروی سے جہاں تک ممکن ہو، ادبی تحقیق کے طالب علموں کو بچنا چاہیے۔ مجلس ترقی ادب لاہور نے مقالاتِ عرشی کے عنوان سے جو کتاب شائع کی ہے اس میں سے دو مقالات ''زرنوجی کا نظام تعلیم و تعلم'' اور ''مولانا آصفی اور ان کی شاعری'' کے بارے میں تبصرے کی جسارت کروں گا۔ اول الذکر مضمون کے تین اوراق کے بعد کہیں جا کر یہ پتا چلتا ہے کہ ''زرنوجی'' کسی عالم کا نام ہے جو تعلیم کے بارے میں ایک رسالے کے مصنف ہیں۔ دوسرے محمد حسین آزاد کے انداز کو انھوں نے اس طرح سے اپنایا ہے:

''کوئی علم اور کسی طرح کی صنعت ہو، اس کی تاریخ ترقی میں سے اسلامی عہد کا حذف بامِ علم کی سیڑھی کا اہم زینہ توڑ دیتا ہے''

دوسرے مضمون کا پیرایہ بھی یہی ہے البتہ اس میں مانوس الفاظ اور کلمات اور رقت کی کثرت ہے۔ 'کم مایہ اپنی روشن طبع سے کامیاب ہو جاتے ہیں...... یہ اہل فضل کی جراحت دل پر نمک پاشی کا کام کرتا ہے ابتدا صبر کرتے ہیں لیکن تابہ کے۔ آخر کار ناقدر شناسی، سفلہ پروری اور جوہر کشی کی شکایت کا آغاز ہوتا ہے...... یہ غرور نہیں خود داری ہے، حسد نہیں رشک ہے''۔

ڈاکٹر نثار احمد قریشی لکھتے ہیں:

''محقق زیرِ تحقیق شخصیت کا ایک طرح سے وکیل صفائی بن گیا اور زیرِ بحث شخصیت سے محقق کی بجائے قصیدہ نگار کا تعلق پیدا کر کے اپنے ممدوح میں سارے جہان کی خصوصیات ڈالنا ضروری سمجھا، چنانچہ آج بھی تحقیق میں ایسے غیر معروضی اور جانبدار جملے جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔ مثلاً:

''وہ اُردو کے عظیم ڈرامہ نگار تھے۔ انھوں نے اُردو ڈرامہ نویسی کو اپنے عروج پر

پہنچا دیا تھا۔ یہ فن ان کے ساتھ ہی دفن ہو گیا۔ ان کے پایہ کا کوئی اُردو ڈرامہ نویس پیدا نہیں ہو سکے گا''

یا

''یہ طے شدہ امر ہے کہ فلاں صاحب وہ فنکار تھے جو کسی غیر ملکی زبان، ادیب یا مفکر سے قطعاً متاثر نہیں ہوئے''۔

اس طرح کے جملوں سے تخلیقی نثر کے تقاضے شاید کسی حد تک پورے ہوتے ہوں مگر تحقیقی نثر یقیناً شرمندہ رہے گی۔

اوپر بیان کردہ چند مثالوں کا مقصد سارے کے سارے قدیم تحقیقی سرمائے کو ہدف تنقید ٹھہرانا نہیں۔ تحقیق کی ایسی جان دار اور توانا روایت جس نے نہایت قد آور اور قابل فخر محققین پیدا کیے ان کے کارناموں کو کسی طور بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، تاہم ان مثالوں سے اس نکتے کی جانب متوجہ کرنا مقصود تھا کہ کسی بھی تحقیقی کارنامے میں زبان اور اسلوب بیان کی اہمیت بنیادی اور اساسی ہوتی ہے اور اسے نظر انداز کرنے سے تحقیق اپنے مقام ومرتبے سے گر جاتی ہے۔

اس وقت تک بیان کردہ تحقیق کے مزاج، معروضیت اور منطقیت سے اس نقطۂ نظر کو تقویت حاصل ہوئی ہے کہ تحقیق کی زبان میں گویا رنگینی اور شگفتگی کا کوئی عمل دخل نہیں۔ تخلیق کار تو صنائع لفظی ومعنوی، علامتی اظہار، جذباتی طرز استدلال اور ابہام وغیرہ کے استعمال سے تحریر کو پرکشش بنا سکتا ہے مگر تحقیق کار کو حقائق کی تنی رسی پر چوں کہ احتیاط کے ساتھ چلنا ہے لہٰذا اسے شگفتگی اور رنگینی کو فراموش کرنا ہوگا۔ تحقیق کار کو اس امر کو بھی ملحوظ رکھنا ہے کہ اس کا منشا چوں کہ حقائق رسائی ہے لہٰذا اسے محتاط ہونا ہوگا کہ اس کے اظہار اور ابلاغ میں کوئی فاصلہ نہ رہے اور اس کا نقطۂ نظر قاری کے ذہن تک کسی جھٹکے کے بغیر منتقل ہو۔

اس دیکھ بھال کے باوجود وہ شگفتگی کو بھی برقرار رکھتا ہے تو یہی وہ پل صراط ہے جہاں سے بھرپور مشق ومہارت کے بغیر گزرنا مشکل ہے۔ تحقیقی مقالہ میں شگفتگی کے وکیل اور غیر شخصی لہجے کے مؤید یہ کہتے ہیں کہ تحقیقی مقالہ بہر طور پڑھنے کے لیے لکھا جاتا ہے اور تحقیقی تحریر اس انداز کی ہونی چاہیے کہ لوگ اسے پڑھنے پر راغب ہوں۔ ان کے نزدیک بعض تحقیقی مضامین میں چند معلومات ہوتی ہیں اور تھوڑی سی کوشش سے انھیں اس قابل بنایا جاسکتا ہے کہ زیادہ قارئین اس کا مطالعہ کریں۔

تحقیق میں اسلوب عالمانہ اور بھاری بھرکم ہونے کے ساتھ ساتھ سلیس اور شگفتہ بھی ہو۔ اس کا فیصلہ گیان چند نے بھرپور بحث وتمحیص کے بعد یوں کیا ہے کہ مقالے میں جہاں حقائق کی بات ہو اور اخذ نتائج کا مرحلہ ہو وہاں تو رنگینی وعبارت آرائی کی گنجائش قطعاً نہیں۔ اگر اسلوب بیان پرکشش ہو جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ تحقیق میں ایسی روشن مثالیں بھی موجود ہیں جہاں محققین نے تحقیقی اسلوب کی پیروی کے ساتھ ساتھ شگفتگی وشادابی کو بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔

سنگ مور نے کہا تھا کہ تحقیقی مقالہ اس بے تکلف انداز میں لکھیں جیسے قارئین آپ کے سامنے بیٹھے

ہیں۔اس کے برعکس پارسنس نے کہا کہ مقالہ پرتکلف اسلوب میں لکھیں، ایسے نہیں جیسے بات چیت کر رہے ہیں۔راس کی نصیحت بھی یہی ہے کہ بات چیت کا انداز پیدا نہ ہونے دیں۔کینیڈا کا ایک مضمون نگار ہال پینی کہتا ہے کہ قاری کی مصنف سے براہ راست تفہیم ہونی چاہیے۔مقالے کا بالواسطہ اور معروضی اسلوب قاری کو سرد کر دے گا۔اسے محظوظ کریں۔چنانچہ چند نکات یوں سامنے آتے ہیں:

1- راس: میں، ہم، یہ مصنف یا راقم (This Writer) وغیرہ جیسے الفاظ کے استعمال سے بچیں۔
(واضح ہو کہ انگریزی فقرہ The Writer اردو کے راقم کا مترادف ہے)۔

2- پارسنس: شخصی ضمیروں سے بچیں۔

3- واٹسن: تحقیقی مقالے میں "میں" کا استعمال نہایت شاذ ہو اور "ہم" کا کم سے کم۔

4- عبدالستار دلوی: ضمائر متکلم کا (میں، ہم، میرا، ہمارا وغیرہ) استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ان کے استعمال سے مقالے کی غیر انفرادیت اور امتیاز ختم ہو جاتا ہے۔

غیر شخصی انداز

مقالے کا اسلوب غیر انفرادی اور غیر شخصی ہونا چاہیے مگر سوال یہ ہے کہ کیوں؟ مصنف اور قاری کے درمیان ذاتی تعلق یا شخصی رشتے کی گرمی پیدا ہو جائے تو کیا ہرج ہے۔ہم ایک بات دوسرے کو سمجھا/بتا رہے ہیں۔بس یہی انداز گفتگو ہونا چاہیے۔ہال پینی نے بجا کہا تھا کہ معروضی اسلوب قاری کو سرد کر دیتا ہے۔

ایلفک اور فیسٹر کہتے ہیں کہ یہ ظاہر کرنے میں کیا ہرج ہے کہ مضمون کسی انسان نے لکھا ہے۔سائنس میں 'مئیں' لکھنا جرم ہے لیکن ادبی تحقیق میں نہیں۔اگلے وقتوں کے لوگ اسے مذموم سمجھتے تھے۔" یہاں ایک بات ضرور پیش نظر رہے کہ تحقیق یا تحقیقی مقالہ بہر حال تصنیف نہیں جسے واقعتاً قاری کے لیے لکھا جاتا ہے۔تحقیقی مقالہ اہل علم کے مطلوبہ علمی اضافے کے لیے وجود میں آتا ہے۔بس آپ یہ اضافہ کس طرح سے بتانا چاہتے ہیں؟ وہی تحقیقی اسلوب ہوگا۔

دوسری تحریروں کی طرح تحقیقی مقالے میں بھی کچھ باتیں ضمیر متکلم کے ساتھ لکھنے کی مجبوری آجاتی ہے۔"راقم الحروف" اور "راقم السطور" کتنے مصنوعی اظہار سہی کیا "میں" کی جگہ "ہم" لکھنا ایسا ہے جیسے کسی کمپنی یا انجمن کی طرف سے بول رہے ہوں حالاں کہ اپنا ذاتی خیال پیش کیا جاتا ہے۔ایک شخص کی رائے کو بہتوں کی یعنی ایک گروہ کی رائے بنا کر پیش کرنا تحقیقی دھوکا دہی بھی سمجھی جاتی ہے۔اگر یہ کہنا ہے کہ "فلاں" بات مجھے ڈاکٹر وحید قریشی نے بتائی تھی اور اس موقع پر مجھے کی بجائے "ہمیں بتائی تھی" کا استعمال کریں تو یہ غلط ہوگا۔اگر "مجھے" کا لفظ بھی استعمال نہ کریں تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔اپنے لیے "ہم" جیسا شاہانہ لفظ استعمال کرنا اُردو کی خاکساری کے منافی ہے اور اگر یہ کہیں کہ "راقم کو بتائی تھی" یوں بھی لکھا جا سکتا ہے "تحقیق کار کو بتائی تھی" البتہ جہاں قارئین کو ساتھ لے کر چلنا ہو یعنی آپ اور قاری مل کر فیصلہ کر رہے ہیں وہاں لفظ "ہم"، "ہم دیکھتے ہیں"، "ہم پڑھ چکے ہیں" وغیرہ لکھا جا سکتا ہے۔تاہم یہ اضافی باتیں ہیں۔

خلاصہ بحث

اس مطالعے اور اُردو کے چند نامور محققین کے مقالات کے جستہ جستہ مطالعے کے بعد جو چند باتیں حاصل ہوئی ہیں ان کا ایک خلاصہ حسب ذیل ہے:

1- تحقیق کی زبان کو واضح، غیر مبہم اور براہ راست ہونا چاہیے۔ اس کی وضاحت یوں ہو سکتی ہے کہ جملے مثبت ہوں اور منفی نہ ہوں یعنی نہ، نہیں، مت جیسے الفاظ نہ ہی آئیں تو بہتر ہے۔

2- نامانوس یا نیم مانوس اصطلاحات کی فرہنگ یا توضیح مقالے یا کتاب میں شامل ہونی چاہیے۔ اس فہرست میں اپنے وہ الفاظ و اصطلاحات بھی شامل کریں جن میں یہ رپورٹ پیش کی جارہی ہو۔

3- مخففات کو استعمال کرنا ناگزیر ہو تو اسکی فہرست ابتداء میں دے دی جائے، اس کے لیے معروف طریق کار ہی کی پیروی کی جائے نہ کہ اپنی ایسی اختراعی صلاحیت کا اظہار کیا جائے، جو نجی یا شخصی ہو۔ یعنی جذباتی اور موضوعی تحریروں سے اجتناب کیا جائے۔

4- عبارت کو طویل اقتباسات، جملہ ہائے معترضہ اور حوالوں کے انبار سے بچانا چاہیے۔ خلاصہ یا ملخص بہت ہوتا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی لکھتے ہیں:

"اقتباسات کی دو سطریں جہاں کام دے سکتی ہیں وہاں آس پاس کے غیر ضروری عبارتوں کو اقتباس میں شامل کر لیا جاتا ہے اور یہیں سے گڑبڑ ہوتی ہے کہ ایک چیز کو ثابت کرنے کے لیے جہاں دو جملوں سے کام چل سکتا ہے وہاں لکھنے والے نے دو یا چار صفحوں کو اپنی بنیاد بنالیا"۔ ڈاکٹر اکبر حیدری کے مقالوں میں یہی نقص عام ملتا ہے کہ وہ جا بجا حوالے و حواشی دے رہے ہوتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر وحید قریشی "انھیں یہ احساس نہیں ہوتا کہ کوئی مقالہ کب کباڑیے کی دکان بن کر رہ گیا ہے"۔ سید عابد علی عابد اُصولِ انتقاد ادبیات میں یہی "کمال" دکھاتے ہیں۔

5- بہت ضروری ہو تو اپنے لیے ضمیر متکلم کا صیغہ استعمال کرنا چاہیے، وگرنہ ہم یا راقم السطور کی تکرار تحقیقی مقالے میں سوانحی رنگ پیدا کر دیتی ہے۔ میں، میرا وغیرہ ضمائر سرے سے استعمال نہ ہی ہوں تو بہتر ہے مثلاً "ہم نے فیصلہ کیا،، کی بجائے "فیصلہ کیا گیا،، جیسے جملے استعمال میں لائے جائیں۔ اگر کہیں اپنی ذاتی مثال یا حوالے سے بات کرنا ہو تو "راقم" کا لفظ استعمال کیا جاسکتا ہے۔

6- کلی تنقیدی اور تجزیاتی انداز ہونا چاہیے، اعداد و شمار، کوائف اور تجزیات کی بات ہو۔ خطابت کو استدلال کی جگہ نہیں لینی چاہیے۔

7- حتی الامکان اپنی فضیلت کو منوانے، اس میدان کے کسی اور متخصص کی تضحیک کرنے یا چونکانے کے آرزو مند الفاظ استعمال کرنے سے گریز کرنا چاہیے۔ حکم یا ادعا سے گریز کرنا چاہیے۔

8- عمومی، تعمیمی اور رسمی توصیف کے مظہر، مبتذل ہو جانے والے کلمات کے استعمال سے پرہیز کرنا چاہیے۔(No Sweeping Remarks)۔

9- عبارت میں غیر ضروری بھرتی اور مقالے کو ایک خاص حجم تک پہنچانے کی مصنوعی کوشش بھی نہیں کرنی چاہیے، آلنگ تو کہتا ہے کہ جو کچھ آپ کو کہنا ہے کہیں اور جب کہہ چکیں تو پھر والسلام۔

"Say what you have to say and when you have said it, quit"

10- مقالے کو خوانا پذیر/پڑھے جانے کے قابل ہونا چاہیے، پڑھنے والے کو اذیت میں مبتلا نہیں کرنا چاہیے یا اس کے ذخیرۂ الفاظ یا استعدادِ علمی کو سفا کی کے ساتھ نہیں آزمانا چاہیے اس لیے اگر نئے الفاظ اور اصطلاحات دی جائیں تو ان کا مفہوم الگ سے واضح کر دیا جائے۔ قاضی عبدالودود کی قباحتوں کا ذکر ہو چکا ہے۔ ایسی مثالیں کثرت سے مل جاتی ہیں۔ اس کے لیے تحریر کا تسلسل اور روانی بنیادی حیثیت رکھتے ہیں جو بات پہلے کہنا ہو اسے پہلے کہیں، پھر ان باتوں پر منحصر اگلی باتیں پیش کریں۔

2- اُسلوبیاتی نگارش

تحقیقی رپورٹ یا مقالہ لکھنا صرف تکنیکی زبان ہی کے پہلو سے نہیں، حسبِ اسلوب لکھنے کے حوالے سے کیوں اور کیسے مختلف ہے، اس پر ڈاکٹر گیان چند نے تفصیل سے لکھا ہے۔ ان کے نزدیک:

"تسوید کی منزل پر محقق کے ذہن کو بھی اسی تخلیقی کرب سے دوچار ہونا پڑتا ہے جس سے تخلیق کار کو۔ یہ بات نہیں کیوں کہ تحقیق غیر جذباتی عمل ہے، اس لیے محقق جب چاہے، معمار کے دیوار تعمیر کرنے کی طرح، یکا یک مقالہ لکھنے بیٹھ جائے، کبھی بھی اٹھ جائے اور پھر لکھنے لگ جائے۔ ایسا نہیں ہوتا۔ چوں کہ تحقیق ادب کی شاخ ہے اور تحقیقی نگارش ادبیات کا جزو ہوتی ہے، اس لیے اسے سپردِ قلم کرنے کے لیے بھی اسی طرح تحریک کی ضرورت ہوتی ہے، موڈ بنانا ہوتا ہے جیسے تخلیق کاری کے لیے۔

ڈیوڈ اسٹرن برگ نے ایک انگریزی کتاب لکھی ہے جس کے عجیب سے عنوان کا ترجمہ ہے "کس طرح ڈاکٹری مقالے کو مکمل کیا جائے اور اس کے باوجود زندہ رہا جائے" اس میں اس نے ریسرچ سکالر کے لیے ایک اصطلاح ABD استعمال کی ہے جو شاید امریکی درسگاہوں میں رائج ہوگی۔ یہ مخفف ہے All But

Dissertation کا۔ یعنی ایسا شخص جس کے لیے تحقیقی مقالہ ہی سب کچھ ہے یا جس پر ہمہ وقت مقالے کا بھوت اور بوجھ سوار رہتا ہے۔ کتاب میں اس نے بتایا ہے کہ امریکا میں کس طرح تحقیقی مقالہ نگار پریشان رہتا ہے۔ ان میں سے کوئی کہتا ہے کہ یہ مقالہ میری زندگی تباہ کر رہا ہے، کوئی کہتا ہے کہ یہ "بوریڈم" ہے۔ کوئی چلاتا ہے کہ کسی طرح اس کے چنگل سے چھوٹ جاؤں تو ساری عمر مقالہ لکھنے کا نام نہ لوں گا۔ ہندوستان میں ریسرچ سکالروں کو اس طرح خستہ حال یا پریشان نہیں دیکھا۔ اگر تحقیق کار کو اپنے موضوع میں دلچسپی ہے تو وہ اس سے کبھی اجیرن نہ ہو گا"۔

ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

"گویا لکھنے سے پہلے آپ نے چار کام کیے:

1- آپ نے اپنے موضوع سے پوری واقفیت حاصل کر لی۔ (کوائف جمع کر لیے)
2- آپ نے غور و فکر کے بعد اپنا نقطۂ نظر متعین کر لیا۔ (سکالرشپ یا عالمانہ انتقاد)
3- آپ نے اس نقطۂ نظر کی وضاحت کے لیے حوالے جمع اور مرتب کر لیے۔ (نوٹ، حوالے)
4- اور آپ اس موضوع میں اتنے محو و منہمک ہو گئے کہ آپ کے وجود میں اس کے اظہار کی بے چینی پیدا ہو گئی۔" (تخلیقی عمل)

آخری کیفیت تسوید سے پہلے کی نفسیاتی کیفیت ہے۔ اسی مضمون میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے ایک اور کام کی بات کہی ہے:

"جب آپ ایک چیز لکھ رہے ہوں تو پھر اس عرصے میں دوسری چیز نہ لکھیں بلکہ اٹھتے بیٹھتے اور سوتے جاگتے اپنے موضوع کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا ہنر سیکھیں۔
تحقیق بڑی حاسد داشتہ ہے۔ وہ کسی دوسری محبوبہ کی شرکت برداشت نہیں کر سکتی یعنی یہ پسند نہیں کرتی کہ جو وقت اسے دیا جا رہا ہے اس میں مخل ہو کر کوئی دوسرا اس وقت میں حصہ دار ہو جائے"۔

بعض اوقات انہماک، دلچسپی، توجہ اور تسلسل کے باوجود لکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ واٹسن نے کہا ہے کہ سارے مواد کے باوجود طبیعت باقاعدہ مضمون لکھنے پر راغب نہ ہو تو جو مواد آپ کے پاس ہے، اس کے بارے میں اپنے نگران کے نام ایک خط تحریر کریں۔ اس سے طبیعت کھل جائے گی۔ لنڈا کے نزدیک اگر لکھنے کا بہاؤ اور معیارِ حرکت (Momentum) کم ہو جائے تو پیچھے جو کچھ لکھا ہے، اس کی بازخوانی سے طبیعت کھل جائے گی اور روانی پیدا ہو جائے گی۔ ایک نشست ختم کرنے سے پہلے اگلی نشست کے لیے کچھ خیالات قلم بند کر لیں

تا کہ اگلے دن آسانی سے آغاز ہو سکے۔

تحقیقی تحریر میں ان مشکلات کو تحریر کی طرح [illegible] ایک مزید دقت کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مقالہ نگار [illegible] بہت سی کتابوں کو دیکھنا ہوتا ہے [illegible] ہی وہ قلم اٹھا سکتا ہے۔ لیکن اس میں بھی [illegible] ہوتے ہیں، اقتباسات نقل کرنا ہوتے ہیں۔ [illegible] بہتر یہ ہے کہ لکھنے سے پہلے نہ صرف ان [illegible] سے وہ نکات صفحے پر درج کر دیے جائیں۔ اگر [illegible] لکھتا ہے تو باب کے اجزا کی ترتیب مقرر کر لی جائے [illegible] سمجھیں کہ نکات سے تحریر اور تحریر سے توسیع اور [illegible]

3- حدودِ نگارش

انگریزی کے ایک مضمون نگار ہیز کا کہنا ہے [illegible] ہے۔ اس کے اس قول کے مبالغے سے قطع نظر یہ بات صحیح ہے [illegible] ہے۔ جب ایک بار قلم چل پڑتا ہے تو شروع میں آہستہ [illegible]

لکھنے کے گُر

لکھنے کا بنیادی گُر یہی ہے کہ لکھا جائے۔ آج کے [illegible] اگلے دن کی تحریر کے لیے کچھ نکات لکھ چھوڑیں۔ ڈاکٹر گیان چند [illegible]

> "ایک دن کے کام کا خاتمہ کسی موضوع، فصل یا جزو کے [illegible] جگہ بیچ میں کام چھوڑیں کہ اگلے دن طبیعت [illegible] ہو جائے۔ انسان کا جی چاہتا ہے کہ طبیعت رواں پر [illegible] کر کے پھر قلم روکا جائے لیکن فردا کی تحریر کے [illegible] مقام پر [illegible] ضرور لکھیں۔ اگلے دن [illegible] لکھ سکیں گے۔ پہلے دن کے [illegible] اور طبیعت [illegible] آسانی سے رواں ہو جائے [illegible] اگلے دن کی تحریر [illegible]"

اس سلسلے میں [illegible]

"[illegible]
[illegible]"

1- وقت یہ ہے کہ اگر ایک دفعہ بہت انتشار کے ساتھ لکھ دیا جائے تو دوبارہ ترتیب دینا بہت مشکل ہوتا ہے۔ پہلے ذہنی ترتیب دے لیں، تب لکھیں۔ ظاہر ہے، نظم وضبط کا خیال رکھا جائے گا تو بہت تیزی سے نہیں لکھا جاسکتا۔ تحقیقی مقالہ انشائیہ نہیں ہے کہ برجستہ لکھ ڈالا۔

2- تھکا ہوا ذہن مہتم بالشان موضوع کو بددلی کے ساتھ، سپاٹ طریقے سے، مختصراً لکھ کر نمٹا دے گا۔ اس میں خیالات درماندہ سے ہوں گے۔ اگر اگلے دن تازہ دم ہو کر لکھیں گے تو اس موضوع کو تفصیل سے چمکا کر، جان ڈال سکیں گے"۔

کئی ماہرین اس بات پر زور دیتے ہیں کہ مقالے کی تسوید سے پہلے اس کا دعویٰ (Thesis) یعنی ادعائی بیان، بنیادی دعویٰ یا مسئلہ تیار کریں۔ مقالے میں اس دعوے کے دلائل شرح کے ساتھ دیں۔ راتھ کہتی ہے کہ مواد کو دیکھنے اور ترتیب دینے کے بعد ہی دعویٰ تیار کیا جاسکتا ہے۔ دعوے سے مقالے میں وحدت پیدا ہوتی ہے۔ دعویٰ سوال کی شکل میں نہ ہو، مشمولات کی طرف اشارہ کرنے والا بھی نہ ہو جس کے سہارے بقیہ مشمولات کو انڈیل دیا جائے۔ راتھ کے نزدیک اگر یہ مسئلہ ہے تو تحقیقی سوال کی شکل ہی میں ہوگا۔ اگر یہ مثبت دعویٰ ہے تو مشمولات کی طرف اشارہ ضرور کرے گا۔ اگر آپ شروع میں مسئلہ واضح کر چکے ہیں تو فرضیہ پورے مقالے میں آپ کے ساتھ ساتھ چلتا رہے گا۔ دعویٰ قابلِ قبول فرضیہ ہی تو ہے۔

بیٹ سن کے مطابق شکاگو کا رونالڈ کرین (Ronald Crane) ہمارے دور کا بڑا محقق نقاد تھا۔ وہ کہتا تھا کہ ادبی تحقیقی مقالے کو محض ایک مختصر ما قبل دعوے (Proposition) میں سمو دینے کی صلاحیت ہونی چاہیے۔ ہم اسے Hypothesis قرار دیتے ہیں۔ اس پر بیٹ سن تنقید کرتا ہے کہ ایک تنقیدی یا تحقیقی کام میں منطقی وحدت لازمی نہیں، محض بیانیہ وحدت کافی ہے۔ جدید تحقیق کے ماہرین مقالے میں فرضیے کی وحدت لازم قرار دیتے ہیں۔

ڈاکٹر عندلیب شادانی نے لکھا تھا کہ ادھر کئی سال سے مقالوں کا حجم بڑھتا جا رہا ہے۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مقالے کی اہمیت اس کی ضخامت میں ہے۔ چھے چھے سو صفحوں کے مقالوں کے مواد کو بآسانی تین ساڑھے تین سو صفحات میں سمیٹا جاسکتا ہے اور وہ بھی اس طرح کہ کوئی اہم بات چھوٹنے نہ پائے اور مقالے کی اہمیت اور قدر و قیمت کو کوئی نقصان نہ ہو۔ ڈاکٹر عبدالستار دلوی نے بھی مقالے کے حجم کو محدود رکھنے پر زور دیا ہے۔ اصول یہ ہے کہ تحقیق کرتے ہوئے ہر نکتہ، ہر بات، ہر چیز شامل کریں اور مقالہ لکھتے ہوئے زیادہ سے زیادہ مواد خارج یا مختصر کریں۔ بار بار نظر ثانی کرتے ہوئے صرف کسی مواد کی وضاحت میں تحریریں اور اقتباسات شامل کریں اور عموماً سارے مسودے کو مختصر سے مختصر کرتے چلے جائیں۔ ایم اے کی سطح کا مقالہ ایک ڈیڑھ سو، ایم فل دو ڈھائی سو اور پی ایچ ڈی کا تین ساڑھے تین سو صفحات (اوسطاً 300 الفاظ فی صفحہ) سے کسی صورت زیادہ نہ ہونے پائے۔

کیا لکھیں اور کیا نہ لکھیں

تحقیق کار کا سب سے بڑا مسئلہ ہی یہ ہوتا ہے۔ کہ وہ کیا شامل کرے، کیا لکھے اور کیا نہ شامل کرے۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کے شعبہ انگریزی کے اساتذہ نے مقالے کی پیش کش کے بارے میں ایک مختصر رسالہ لکھا تھا جس میں لکھا تھا کہ ایجاز مقالے کا اہم ترین وصف ہے۔ پروفیسر لیوکاس نے ایجاز پر زور دیتے ہوئے کہا تھا:

''ایک اچھا مصنف صرف یہی نہیں جانتا کہ اسے کیا لکھنا چاہیے بلکہ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اسے کیا نہیں لکھنا چاہیے''۔

واٹسن نے اسی بات کو اور زیادہ زور دے کر لکھا ہے کہ موضوع پر مصنف کی گرفت یا کا عبور اس بات سے دیکھا جاتا ہے کہ اس نے کیا کیا شامل نہیں کیا۔ چنانچہ اس کے لیے:

1- بہت بڑا اور وسیع موضوع نہ لیں۔
2- تذکرہ نما موضوعات نہ لیں۔
3- سیاسی اور سماجی پس منظر سے بچیں۔
4- کسی صنف کے جائزے میں اس صنف کی تخلیقات کے نمونے نہایت مختصر دیں۔
5- ادیبوں کی مفصل سوانح نہ دیں۔
6- براہ راست اقتباسات کم دیں۔
7- آپ کے موضوع پر آپ سے پہلے جنھوں نے لکھا ہے ان سب کی تحریروں کا خلاصہ دیں۔ اہم مصنفوں کی رائے اور نقطۂ نظر اہم ہیں۔ غیر اہم مصنفوں کو نظر انداز کر سکتے ہیں۔
8- تحقیقی مقالے میں کسی ادیب یا تخلیق کے تنقیدی جائزے میں زیادہ نہ پھیلیں۔
9- آخر میں اختتامیہ جائزہ لیں تو یہ نہیں کہ جو کچھ اس سے پہلے متن کتاب میں لکھا گیا ہے اس سب کی تلخیص کر دی جائے۔ تکرار سے بہتر یہ ہے کہ کوئی نئی بات کہی جائے۔
10- کتابیات اور اشاریے کو بہت مفصل نہ کریں۔ غیر اہم اندراجات کو نظر انداز کر سکتے ہیں۔ اعلام یعنی ناموں میں داستان کے کرداروں کو نہیں لینا چاہیے، محض شخصیات یا اشخاص، عنوان کافی ہے۔ کیا چیز حذف کی جا سکتی ہے کیا مختصر کی جا سکتی ہے، اس کے بارے میں لکھنے والا ہی فیصلہ کر سکتا ہے۔ کوئی قطعی اصول وضع نہیں کیا جا سکتا۔

بہت سے حوالوں سے جب ایک ہی تصور پر بحث کی جا رہی ہو تو تمام اقتباسات کم سے کم کر کے صرف تصور کی حمایت اور مخالفت یا نئے نکات والے جملے لیں اور انھیں منطقی ترتیب میں پرو لیں بلکہ کوشش کریں کہ انھیں اپنے جملوں میں مختصر کر لیں۔

عبارت کی زبان

اس بحث کے لب لباب کے طور پر کہا جا سکتا ہے کہ

1- صنف یا گروہ بندی اور تقابل کی زبان ہو۔
2- عملیے اور تعریف و توضیح کی زبان ہو۔
3- بیان اور انتخاب و پسند کی زبان ہو۔
4- تشریح اور جائزے کی زبان ہو۔
5- اختصار اور جامعیت کی زبان ہو۔

اس نکات کی تشریح اس طرح کی جا سکتی ہے کہ عبارت میں رموز اوقاف، صحت املا، صحت قواعد کے ساتھ ساتھ مندرجہ ذیل پہلو ملحوظ رکھے جائیں:

صنف یا گروہ اور تقابل

صنف یا گروہ کی زبان میں اس قسم کے الفاظ/ اصطلاحیں/ محاورے موجود ہوتے ہیں:

.... کی ایک قسم/ نوع ہے۔
.... پر منقسم ہے/ پر تقسیم کیا جاتا ہے۔
.... میں شمار ہوتا ہے۔
.... سے متعلق ہے۔
.... کا ایک حصہ/ جزو ہے۔
.... سے متعلق/ منسوب ہے۔

تقابل کے لیے عام طور پر مندرجہ ذیل جملے استعمال ہوتے ہیں:

.... کی مانند/ طرح/ مشابہ/ مانند ہے۔
.... دوسری طرف/ علی الرغم۔
.... دونوں ....
.... تاہم ....
.... لیکن ....
.... بمقابلہ/ بموازنہ ....
.... جہاں تک .... کا تعلق ہے
.... سے مختلف ہے۔

عملیے اور تعریف وتوضیح

عملیہ بیان کرنے کے لیے عام طور پر مندرجہ ذیل اقسام کے جملے وجود میں آتے ہیں:

پہلا/دوسرا/آخری

حال ہی میں.............

شروع/آغاز میں.............

سابقہ طور پر/پہلے ہی.............

اس سے قبل/پہلے.............

بعدازاں/اس کے بعد.............

تب.............

جب.............

بالآخر.............

اس کے تحت.............

تشریح اور توضیح کرتے ہوئے عموماً مندرجہ ذیل جملے وجود میں آتے ہیں:

.............کی ایک قسم ہے۔

اس کی وضاحت/صراحت/توضیح یوں کی جاسکتی ہے کہ.............

.............کی طرح/مشابہ/مانند ہے۔

بیان اور انتخاب وپسند

بیانیہ جملے کچھ یوں ہو سکتے ہیں:

.............سے برتر/بڑھ کر ہے۔

.............سے کمتر/نیچے ہے۔

.............کا مقصد.............

علاوہ ازیں/اس کے علاوہ/اس کے بعد/اس کے ساتھ ساتھ

انتخاب اور پسند کے جملے کچھ یوں ہو سکتے ہیں:

میری/ہماری رائے/دانست/خیال میں.............

مجھے/ہمیں یقین ہے.............

میرے فہم کے مطابق.............

جہاں تک میری سمجھ کا تعلق ہے مجھے.............

.............کو ترجیح دیتا ہوں۔

تشریح اور جائزہ

تشریح کے لیے عام طور پر مندرجہ ذیل جملے نظر آتے ہیں:

کیونکہ..................

اس لیے..................

تاوقتیکہ..................

پس..................

..................کے نتیجے کے طور پر..................

چنانچہ..................

..................کے باعث..................

..................کا نتیجہ یہ ہے..................

اگر..................تب..................

جائزے کے لیے عام طور پر مندرجہ ذیل جملے استعمال ہوتے ہیں:

تجویز/خیال/سازش/مشورہ یہ ہے..................

اختصار اور جامعیت

اختصار کے لیے عام طور پر کوئی جملہ نہیں ملتا۔ بس حشو و زوائد سے پاک ہو۔

جامعیت کے لیے ضروری ہے کہ تمام نکات شامل ہو گئے ہوں اور کسی اور طرف دیکھنے کی ضرورت محسوس نہ ہو۔

تحقیقی رپورٹ اپنے مندرجات، عبارت، اندازِ پیشکش کے لحاظ سے عام نگارشات سے مختلف اور مذکورہ نکات کی حامل ہوتی ہے۔ اسی سے مقالے کی علمی شان پیدا ہوتی ہے۔ رہی انتقادی بصیرت یا دانش اور فکری عمق اور گہرائی کی بات تو اس سلسلے میں کسی قسم کی معروضی ہدایت تحقیق کار کی کوئی مدد نہیں کر سکتی۔ یہ اس کی ذاتی اہلیت، محنت، مشق اور تجربے پر منحصر ہے کہ وہ کس بلند علمی سطح تک جا سکتا ہے اور کتنا وقیع تحقیقی کام پیش کر سکتا ہے۔ عالمانہ انتقاد تحقیق کی آخری منزل ہے۔ ادبی گروسے اسی کی توقع ہوتی ہے۔

انیسواں باب

مابعدیاتِ پیشکش

مقالہ تحریر کر لینا ہی کام مکمل کر لینا نہیں ہوتا۔ اس کے بعد بھی کئی مرحلے اور مقامات آتے ہیں۔ مقالہ نگاری کے بعد کے تمام مرحلے "مابعدیات" کی مجموعی اصطلاح سے بیان کیے جا سکتے ہیں۔ ان میں مقالے کی کمپوز کاری، جلد بندی، پیش کاری (جامعات میں مقالہ داخل کرنے، جائزے)، زبانی امتحان، اشاعت وغیرہ کے مراحل شامل ہیں۔

1- مابعدِ تحریر و تسوید

مقالہ نگاری کے بعد اسے جامعہ یا ادارے کی طے شدہ طرزی وضع، کمپوز کاری، جلد بندی وغیرہ کے مطابق تیار کرنا، پیش کرنا (متعلقہ شعبہ، جامعہ، ادارہ وغیرہ میں)، زبانی امتحان دینا، دفاع کرنا وغیرہ تحقیق انجام دینے کے بعد کے اہم مرحلے ہیں۔ یہاں ایک بات بہت ضروری ہے کہ زبانی امتحان یا دفاع کا اجلاس تحقیقی مقالہ حتمی طور پر داخل کرنے سے پہلے منعقد کرنا چاہیے۔ یہ طریقہ علم التعلیم کے میدان میں تو استعمال کیا جاتا ہے لیکن زبان و ادب کے شعبوں میں ایسا نہیں ہو رہا۔ ہمارے ہاں روایت یہ ہے کہ مقالہ ہر طرح سے مکمل کر کے جلد بندی کے بعد داخل کیا جاتا ہے جسے کم از کم دو ممتحن دیکھتے ہیں۔ اگر وہ دونوں اتفاق کر لیں تو ان میں سے ایک کو رسمی زبانی امتحان کے لیے بلایا جاتا ہے۔ چند منٹ کی گفتگو ہوتی ہے اور امکانی طور پر طالب علم کو کامیاب قرار دے دیا جاتا ہے اور اگر تبدیلی درکار ہو تو جلد بندی وغیرہ کے اخراجات دوبارہ برداشت کرنا پڑتے ہیں۔ کم از کم ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سطح پر تو یہ طریقہ متروک ہونا چاہیے۔ پہلے مرحلے پر حتمی مجلد مقالہ داخل کرانے کی اجازت نہیں دینی چاہیے کیونکہ اس کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی اور تحقیق کار کو خواہ مخواہ کے اخراجات برداشت کرنا پڑتے ہیں بلکہ مقالہ صرف کاغذوں کے پلندے کے طور پر جسے ایک کونے سے ٹیگ میں پرو دیا گیا ہو، دو چار نقول کی صورت میں جمع کرانا چاہیے۔ یہی نقول ان ممتحنین کو بھیج دی جائیں۔ ممتحنین کم از کم تین ہوں اور ان میں سے وہ جس امر پر متفق ہوں، اسے ملحوظ رکھا جائے۔ زبانی امتحان میں ایک ممتحن لازماً مقالے کا نگران رہا ہو۔ زبانی امتحان کو "مجلسِ دفاع" کی صورت میں منعقد کیا جائے۔ دفاع کے بعد اگر مقالے میں ترمیم و تنسیخ کی ضرورت ہو تو اسے انجام دے کر نئی شکل میں مگر "پہلی بار مجلد" کرا کے اور مجلس دفاع / ممتحنین کے دستخطوں کے ساتھ ادارے یا جامعہ میں داخل کرنا چاہیے۔

پی ایچ ڈی کی سطح پر تو "دفاع" کا طریق کار یہ ہے کہ یہ مرحلہ محض ڈگری نہیں دینے کا نہیں بلکہ

تحقیق کار کو "فاضلین" کی صف میں شامل کرنے کا ہوتا ہے۔ اس لیے دفاع کے لیے ممتحین کی ایک مجلس تشکیل کی جائے اور اس موضوع سے متعلق ماہرین کو بھی شرکت کی دعوت دی جائے۔ یورپ کی بڑی جامعات میں بھی روایت رہی ہے کہ ایک تحقیق کار کو فضلاء کی صف میں لانے کے لیے کئی گھنٹوں بلکہ کئی دنوں تک زبانی امتحان لیا جاتا تھا۔ ہمارے لیے پی ایچ ڈی کے امتحان میں شاید ایک گھنٹہ تک صرف نہیں کیا جاتا۔ ڈگریاں بانٹی جاتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کا وقار اور قبولیت ختم ہو رہی ہے۔

مجلسِ دفاع کے اراکین کم از کم اس ڈگری تک تعلیم یافتہ ضرور ہوں، جس سطح کے لیے مقالہ پیش کیا گیا ہو۔ جامعات میں یہ ایک روایت عام طور پر رائج رہی ہے کہ پی ایچ ڈی کا امتحان ایسے پروفیسر لے رہے ہوتے ہیں جن کے اپنے پاس وہ ڈگری نہیں ہوتی۔ یہ روش بنیادی طور پر غلط ہے خواہ وہ پروفیسر علمی مرتبے اور جامعاتی عہدے میں کتنا ہی بڑا ہوا سے کم از کم اس سطح کی ڈگری دینے کا حق حاصل نہیں ہے۔ جس تک وہ خود اپنے دور طالب علمی میں نہیں گزرا۔ موضوع یا ڈسپلن مختلف ہونے کی بات دوسری ہے۔ اس میں علیت کی گنجائش نکلتی ہے۔ ایسے ماہرین اور اساتذہ یا دوسرے مضامین کے افراد کو ضمنی یا ثانوی نگران اور ممتحن مقرر کیا جا سکتا ہے۔

دفاعی مجلس کے اراکین کی تعداد ہمیشہ طاق (تین، پانچ، سات) ہو تا کہ آخر میں رائے شماری بہتر طور پر کی جا سکے۔ خود شعبے کے سربراہ کی رائے اس میں شامل نہ ہو کہ اکثر فیصلہ کن رائے اسی کی شمار ہوتی ہے جو طالب علم کے "فائدے" یا "نقصان" میں جاتی ہے۔ سربراہ شعبہ اپنی مرضی سے اسناد تقسیم نہ کرتا پھرے۔

مجلس دفاع کا اجلاس ممتحین کی رپورٹ آجانے کے بعد منعقد ہو۔ ممتحن بھی اس مجلس کا رکن ہو سکتا ہے اور نگران بھی اور ضروری ہے کہ دوسرے ماہرین بھی شامل ہوں۔

مجلسِ دفاع کے اراکین کا انتخاب صرف دوسری جامعات کے پروفیسروں سے نہیں کرنا چاہیے جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے۔ یہ بات دراصل ایک باہمی رشوت کی صورت اختیار کر جاتی ہے کہ آپ میرے طلبہ کو پاس کریں اور میں آپ کے۔ یہ بات اکثر دیکھنے میں آتی ہے کہ دفاع کو محض ایک رسمی کارروائی ہی سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے دوسری جامعات کے اساتذہ کو شریک کیا جاتا ہے۔ خود اسی شعبے سے بھی دیگر اراکین شامل کیے جا سکتے ہیں لیکن زیادہ تعداد ایسے ماہرین سے لی جائے جو اس میدان میں نامور ہوں، خواہ وہ جامعات سے باہر کسی میدان میں خدمات انجام دے رہے ہوں لیکن ان کے پاس اس سطح کی ڈگری موجود ہو۔ خاص طور پر ڈاکٹریٹ کے مقالے کا ممتحن کم از کم اپنے میدان کا ماہر ہونا چاہیے۔ اس کا محض استاد/ پروفیسر ہونا کافی نہیں۔ جیسے صرف سائنس کا استاد کافی نہیں، سائنسدان بھی ممتحوں میں شامل ہو۔ گویا ایک خاص سطح کے فضلاء کسی نئے تحقیق کار کو اپنی صف میں شامل ہونے کا شرف بخشیں۔ علمی وقار اور قبولیت تو اسی طرز عمل سے پیدا ہو گی، جب آپ میدانِ عمل میں سرگرم محققین سے اخذ واستفادے کو اپنا علمی چلن بنائیں گے۔

مزید برآں مجلسِ دفاع میں شرکت کے لیے دوسرے اساتذہ اور طلبہ کو بھی بطور مشاہد (Observer) شامل ہونے کی اجازت ہونی چاہیے لیکن وہ عمل دفاع میں مخل نہ ہوں۔ وہ نہ تو سوال کریں اور

نہ ہی ان کی رائے لی جائے تا کہ وہ نتیجے پر اثر انداز نہ ہو سکیں لیکن اس سے انھیں طریق کار دیکھنے، سوال و جواب سمجھنے اور اپنا آئندہ کا لائحہ عمل طے کرنے کا موقع ملتا ہے۔

عام طور پر زبانی امتحان میں طالب علم کو ناکام/فیل نہیں کیا جاتا۔ اسے محض ایک رسمی کارروائی سمجھا جاتا ہے۔ یہ بھی ایک غلط روش ہے۔ زبانی امتحان ہی سے تو معلوم ہوتا ہے کہ تحقیق کار نے کیا واقعی یہ تحقیق انجام دی ہے اور کیا اس نے متعلقہ ماخذوں سے استفادہ کیا ہے نیز کیا کوائف کا تجزیہ اسی کے اپنے ذہن رسا نے کیا ہے؟

ڈاکٹر جوزف لیوائن نے اپنی ویب سائٹ میں دفاع کے موضوع پر آٹھ نکات کی صورت میں چند ہدایات دی ہیں، جنھیں ملحوظ رکھنا امیدوار کی کامیابی کے لیے ضروری ہوگا:

1- اپنی باری سے پہلے کسی اور مقالے کی مجلس دفاع میں شرکت کریں اور دیکھیں کہ اس مجلس کا عمل کس طرح سے انجام پاتا ہے۔

2- اپنی تحقیق کے بارے میں دوسروں کے ساتھ گفتگو کریں اور ان کے سوالات کو بغور سُنیں تا کہ آپ اپنے مقالے کو بہتر وضاحت کے ساتھ پیش کر سکیں۔

3- اپنے مقالے کے ابواب یا خلاصے کمیٹی کے ارکان یا شرکاء میں تقسیم نہ کرتے پھریں۔

4- یہ دفاع دراصل نگران اور آپ کا مشترکہ دفاع ہے یعنی اس لمحے خود کو اکیلا نہ سمجھیں۔

5- دفاع کے وقت معذرت خواہانہ رویہ نہ اپنائیں۔ پراعتماد گفتگو کریں۔ ہوسکتا ہے کہ کمیٹی کے ارکان کوئی نیا پہلو سامنے لائیں۔ ان کا شکریہ ادا کریں۔ اگر اسے شامل کیا جاسکتا ہے تو ضرور کریں۔

6- دفاع کی تیاری صرف تعلیمی پیشکش کے طور پر کریں یعنی پہلے خلاصہ بیان کریں (آٹھ دس صفحے) پھر کمیٹی کے ارکان تحقیق کے مختلف پہلوؤں پر سوال کریں۔ پراجیکٹر، ملٹی میڈیا، ٹرانسپرنسی وغیرہ کا استعمال بھی کیا جاسکتا ہے۔

7- اپنے دفاع کو ریکارڈ کریں۔ اس کے لیے کسی کو ٹیپ ریکارڈ دے کر بٹھایا جاسکتا ہے۔ اس سے بعد میں مقالے کو بہتر بنانے میں مدد مل سکتی ہے۔

8- اپنی تحقیق کے نتائج پر ایک مضمون تحریر کریں۔ یہ کام دفاع اور مقالے کی منظوری کے بعد ہو جانا چاہیے۔ یہی آپ کی پہلی تحریر ہو جو شائع ہو۔

علمی دفاع صرف امیدوار کا تحقیقی دفاع نہیں ہوتا بلکہ اس موضوع کا دفاع بھی ہوتا ہے جس پر تحقیق کی گئی ہو۔ اس میں مقالے کی کمزوریاں، نقائص اور اغلاط بتائی بھی جاتی ہیں اور اس موضوع پر نئی معلومات بھی فراہم کی جاتی ہیں۔ مقالے پر نظر ثانی کی ہدایت بھی کی جاسکتی ہے۔ دوبارہ زبانی امتحان یا دفاع کی بات بھی کی جاسکتی ہے۔ بلکہ زیادہ تر دوبارہ دفاع پر توجہ دی جانی چاہیے۔

2- مابعدِ دفاع

مقالے کی منظوری کی صورت میں صرف مقالے کی نوک پلک درست کرا کے ہی اسے مجلد کرانے کے بعد جامعہ میں داخل کرنے کی اجازت دی جانی چاہیے۔ اب اگر مجلس دفاع یا ممتحنین نے مقالے میں تبدیلی کی ہدایت کی ہو تو ان ہدایات کو کسی نہ کسی طور سمو کر مقالے کو از سر نو اور جلد بندی کے بعد جامعہ میں ڈگری کے تقاضے کے طور پر پیش کیا جائے، جو شعبے اور متعلقہ ممتحنین کے رسمی دستخطوں کے ساتھ منظور کیا جائے۔ اس کا ایک نسخہ متعلقہ شعبے میں اور ایک جامعہ یا ادارے کے مرکزی کتب خانے میں رکھا جانا چاہیے۔

بعض لوگ خوبصورت جلد پر سنہری حروف سے عنوان لکھواتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر گیان چند "سنہری حروف کو پڑھنا مشکل ہوتا ہے" تاہم اس کا انحصار جامعہ کی پابندیوں پر بھی ہوتا ہے۔ اکثر جامعات سائز، جلد بندی اور ان پر حروف کی طباعت کا رنگ مقرر کر دیتی ہیں۔

سند کی اطلاع یا اعلان نامہ جاری ہونے پر اس میں یہ بات بھی شامل ہو کہ آیا مقالے کی طباعت و اشاعت کی اجازت ہے یا نہیں اور اجازت کی صورت میں کیا جامعہ اس کا انتظام کرے گی یا نہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ ممتحنین تو اپنی رائے میں یہ لکھ دیتے ہیں کہ مقالہ قابلِ اشاعت ہے یا نہیں لیکن تحقیق کار کو اشاعت کے لیے اس کی از سر نو باقاعدہ اجازت لینا پڑتی ہے۔ اس وقت پھر سے ممتحن کی رائے تلاش کی جاتی ہے۔ اگر نتیجے کے اعلان میں یہ ایک آدھ سطر شامل کر دی جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔

3- مابعدِ سند

سند کی اطلاع کے بعد تحقیق کار اور خاص طور پر ادبی تحقیق کار کو اپنے مقالے کی اشاعت کی فکر دامن گیر ہو جاتی ہے۔ کسی جامعہ میں تو یہ طریق کار ہوتا ہے کہ حتمی مقالہ مطبوعہ صورت میں پیش کیا جائے اور سند کے اعلان کے بعد اسے شائع کرنے کی اجازت بھی دے دی جاتی ہے۔ کئی جامعات از خود مقالوں کی اشاعت کا بندوبست کر دیتی ہیں۔ ایسا عموماً ڈاکٹریٹ کے مقالوں کے سلسلے میں ہوتا ہے۔ اس سے نچلی سطح کے مقالوں کے صرف خلاصے شائع کرانے کی اجازت ہونی چاہیے۔ یہ چلن بھی عام ہے کہ مقالات کے خلاصے، نتائج وغیرہ جامعہ کے جرنل / جریدے میں شائع کر دیے جاتے ہیں۔ اب آن لائن / برقیاتی ویب سائٹ پر بھی خلاصے دے دیے جاتے ہیں، لیکن ہمارے ہاں ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ اکثر اوقات تحقیق کار مقالے کو اپنی پہلی اور آخری تصنیف سمجھ کر اسے اپنی زندگی میں شائع کرانے پر تُل جاتا ہے۔ ایسا ہونا بھی چاہیے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر کس لیے؟ کیا محض اپنی تسکینِ انا و پندارِ تحقیق کے لیے؟ کیا اس کے دیگر قارئین کہیں موجود ہیں؟ کیا کہیں کوئی اس کی اشاعت کا منتظر ہے؟ کیا اس کے لیے معاصرانہ جائزہ (Peer Review) درکار ہے، جس سے مقالے کی وقعت کا اندازہ ہو گا؟

اگر مقالے کی طباعت و اشاعت کے بعد بھی اسے لائبریریوں کی الماریوں ہی میں دفن ہونا ہے یا فٹ پاتھ پر پڑے رہنا ہے تو پھر یہ اخراجات اور وقت کا زیاں کیوں؟ مُردے کو جلد از جلد ٹھکانے لگ جانا چاہیے؟ دوسرا جواب یہ ہے کہ تحقیق اگر واقعی کسی علمی دشواری یا مسئلے کی بناء پر انجام دی گئی ہے تو مقالے کے

نتائج اس کے ازالے یا حل کے لیے شائع ہونے چاہئیں اور معاصرانہ جائزہ سامنے آنا چاہیے۔

پھر سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ افراد کتنے ہیں جو اس مقالے کے نتائج کے متوقع قارئین ہیں؟ پانچ، دس، پچاس یا ایک ہزار۔ ایک زمانہ تھا کہ ہمارے ہاں علمی کتابوں کی اشاعت ایک ہزار یا گیارہ سو ہوتی تھی۔ پھر یہ تعداد تعلیمی شرح بڑھنے کے علی الرغم گھٹنے لگی حتیٰ کہ مقتدرہ قومی زبان جیسا ادارہ بھی سو دو سو کی تعداد شائع کرنے پر آ گیا۔ معلوم ہوا کہ اہم علمی کتابوں کے طالبین سو پچاس سے زیادہ نہیں ہوتے۔ نیدرلینڈ کی ایک جامعہ (ایمسٹرڈیم) دفاع سے پہلے تین سو نسخے شائع کراتی ہے، جو ڈیڑھ سو سے زائد ماہرین تک پہنچائے جاتے ہیں اور وہ سب مل کر دفاع کی مجلس میں سندِ فضیلت عطا کرنے آتے ہیں۔ اس کے بعد صرف مقالے کا خلاصہ جرائد میں یا آن لائن شائع ہوتا ہے۔

اس مسئلے کا ایک اور حل بہت آسان ہے اور وہ ہے ''آن لائن پبلشنگ'' یعنی اپنا مقالہ جامعہ کی ویب سائٹ سے منسلک کر دیں جسے ضرورت ہو اپنا پرنٹر، کاغذ، جلد بندی کے اخراجات برداشت کرے اور مقالہ حاصل کرلے۔ کسی مقالے کی اشاعت سے تحقیق کار کی مالی منفعت کا تو سوچا بھی نہیں جاسکتا۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ اگر تحقیق واقعی کسی ایسی دشواری یا مسئلے کی بناء پر انجام دی گئی ہو جو کسی ادارے (تعلیمی، سماجی، سرکاری، غیر سرکاری) کے دائرہ کار میں آتی ہو تو پھر اس ادارے سے رجوع کیا جاسکتا ہے۔

اُردو اور پاکستانی زبانوں کے حوالے سے ایک ضرورت بہر حال درپیش ہوتی ہے کہ مقالوں تک رسائی ان سب جامعات کے طلبہ کو حاصل ہو جو برصغیر میں کسی بھی جگہ تحقیق کا کام شروع کرنا چاہتے ہوں۔ انھیں نہ صرف سابقہ تحقیقات کا علم ہو بلکہ وہ ان کے حسن و قبح سے بخوبی واقف ہوں اور یوں سابقہ ادبیات کے مطالعے کی شرط پوری کرسکیں۔ اس کے لیے قومی سطح پر ایسا کیا جاسکتا ہے کہ مقتدرہ قومی زبان یا انجمن ترقی اُردو / ترقی اُردو بیورو جیسا کوئی ادارہ ایک ویب سائٹ قائم کرے جس سے ذیلی اور ضمنی طور پر مقالات کا متن وابستہ ہو خواہ کوائفیہ (Database) کی صورت میں، خواہ برقیاتی (Online/e-mail) طور پر تاکہ متعلقہ طالب علم تھوڑے سے خرچ سے انھیں حاصل کر سکے۔

4- طباعت و اشاعت

کوئی بھی تحقیق، تحقیقی مقالہ یا رپورٹ صرف اسی صورت میں قابلِ اشاعت ہو، جب وہ مندرجہ ذیل شرائط پوری کرے:

1- اس سے کسی سماجی یا پیشہ ورانہ دشواری یا مسئلے کا حل نکلتا ہو۔

2- معاشرے کے متعلقہ افراد کو اس کی ضرورت ہو۔

3- وہ ایسی زبان میں لکھا گیا ہو جو خواناپذیر ہو اور ضرورت مندوں تک اس کا ابلاغ ہو سکے۔

4- اس سے مستقبل میں مزید تحقیقات کے امکانات روشن اور واضح ہوں۔

5- اسے مناسب کتابی صورت میں پیش کیا گیا ہو۔

یہ پانچوں امور تحقیق کار خود نہیں بلکہ مدیر، ناشر یا دوسرے افراد طے کریں۔

تحقیقی مقالے کی ہیئت جس کی حمایت اور طرف داری اب تک کی جاتی رہی ہے اور تصنیفی ہیئت جو قارئین کے لیے قابل قبول ہو، انتہائی مختلف بلکہ برعکس ہوتی ہیں۔ عام طور پر اس اختلاف کے بنیادی نکات حسب ذیل قرار پاتے ہیں:

1- مقالے میں تعارف اور سابقہ ادبیات کا مطالعہ شروع میں اور نتائج آخر میں دیے جاتے ہیں۔ تصنیف میں تعارف وغیرہ پس منظر میں اور صرف فرضیے اور نتائج پہلے باب میں شامل ہوتے ہیں۔ مقالہ اردو اصطلاحات سازی کو مطبوعہ صورت میں کچھ ایسا ہی بنایا گیا ہے۔

2- مقالہ طوالت اور تصنیف اختصار کی طرف مائل ہوتی ہے۔

3- مقالے میں جا و بے جا حوالے دیے جاتے ہیں، تصنیف میں زیادہ حوالے اس کی خوانا پذیری کو کم کر دیتے ہیں۔

4- مقالہ صرف اپنی عالمانہ پیشکش یا ادعا کا نام ہے جبکہ تصنیف قاری کی علمی ضروریات یا علمی دعووں کا تقاضا پورا کرتی ہے۔

5- مقالہ مختلف عمودی، ترچھی، افقی سمتوں میں پھیلا ہوتا ہے اور مختلف ابواب کی صورت اختیار کر جاتا ہے جبکہ تصنیف نتائج کو پہلے باب میں بیان کر کے صرف ان کی وضاحت ایک ہی افقی سمت میں کرتی رہتی ہے، اس لیے تصنیف کی صورت میں اس کی ابواب بندی دوبارہ کرنا پڑتی ہے۔

6- مقالہ تحقیقی زبان میں ہوتا ہے جبکہ تصنیف اسلوبیاتی محضر (Discourse) میں پیش کی جاتی ہے۔ یعنی تصنیف کی تحریر تحقیقی مقالے کی طرح پھس پھسی یا مغلق نہیں بلکہ رواں اور جاندار ہونی چاہیے۔

7- مقالے میں جامعاتی، امتحاناتی، ذاتی، شعبہ جاتی کئی طرح کی پابندیوں اور مصلحتوں کو ملحوظ رکھا جاتا ہے، تصنیف میں صرف موضوع کی ضروریات سامنے لائی جاتی ہیں۔ اس لیے مقالے کو از سر نو لکھنے کی ضرورت درپیش ہوتی ہے۔

5- از سرِ نو تدوین

اشاعت کے لیے مقالے کی از سر نو تدوین کریں یعنی اس میں مندرجہ بالا شرائط کی روشنی میں ترمیم اور تنسیخ کریں اور اضافے دیں۔ ایسا کرتے ہوئے خیال رکھیں کہ اشاعت کے لیے مقالے کی کم از کم اس کی دو تہائی تک تلخیص کر دیں اور باقی ماندہ مواد کے نصف حجم تک ضروری اضافے کریں۔ اس طرح مقالہ 33% + 16-1/2% = 49-1/2% یعنی نصف کے قریب ضخامت کا قابلِ اشاعت مسودہ بن جائے گا۔

ایسا کام ہر باب، اس کے ہر صفحے اور صفحے کے ہر پیراگراف میں انجام دینا چاہیے۔ اُردو اصطلاحات سازی میں ایسا نہیں کیا جا سکا۔ مطبوعہ ضخامت اصل مقالے سے بھی بڑھ گئی۔ اس کے دو اسباب تھے۔ ایک تو یہ کہ موضوع بہت وسیع تھا۔ تاریخی، تقابلی، اصولی ہر طرح سے ڈاکٹریٹ کی سطح کا جائزہ لیا جا سکتا تھا۔ گویا ایک میں تین مقالے تھے۔ نئے تحقیق کاروں کو ایسے موضوعات کی تقسیم اور تحدید کرنے کا مشورہ دیا جاتا ہے۔ دوسرے

یہ کہ وحید الدین سلیم کے بعد اب جدید تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایسی معلومات فراہم کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ جدید اصطلاحیات کے نقطۂ نظر سے اس میں وسعت پیدا ہوتی چلی گئی۔ تیسرے یہ کہ اسے مقالے کی بجائے اس موضوع پر ایک مستقل کتاب بنانا بھی درکار تھا۔

ڈاکٹر گیان چند نے مقالے کی از سر نو تدوین کے لیے ٹورنٹو یونیورسٹی پریس کے حوالے سے چھ نکات میں بعض عیوب پر نظر ثانی کرنے کے لیے کہا ہے۔ ان کا ذکر تبصرے کے ساتھ پیش ہے:

1- ناپختگی کا ازالہ کریں۔ (طرزِ تحریر، معلومات و کوائف کے تجزیے اور رائے دہی میں)۔
2- حشویات (غیر ضروری تفاصیل سے گریز)۔
3- دقت (دقیق اور غیر ضروری طور پر پھیلی ہوئی وضاحتوں کا خاتمہ کریں)۔
4- اختصاص (بعض اہم نکات میں غیر ضروری اختلافات، زحافات یا عیوب محض اپنا تخصص ظاہر کرنے کے لیے شامل نہ کیے جائیں)۔
5- جزویت (کسی جزو کو کل سمجھنے کی بجائے استقرائی منطق سے کام لے کر مزید مثالیں تلاش کی جائیں)۔
6- پندارِ تحقیق (خود کو محقق اعظم سمجھنے کی بجائے بس ایک نقطۂ نظر کے طور پر مقالہ مرتب کیا جائے)۔

اس حوالے سے گویا مقالہ نگار کے کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ وہ کم از کم پس منظری حصے حذف کر دے۔ اقتباسات گول کر دے۔ حوالے نکال دے۔ ضمیمے غائب کر دے۔ کہا جا سکتا ہے کہ پھر بچا کیا؟ جواب ہے "نتائج اور سفارشات"۔ اب کام صرف اتنا باقی رہ گیا کہ ان نتائج اور سفارشات کے لیے جن استدلال، حوالوں اور اقتباسات سے واقعی کام لیا گیا ہے مقالے میں صرف انھی کو قائم رکھا جائے۔ وہی ضمیمے دیں جو ناگزیر ہوں۔ جن معلومات کے بارے میں یقین ہو کہ اس موضوع پر اس درجے کے قارئین پہلے سے جانتے ہیں، انھیں نہ دیا جائے، خاص طور پر حواشی، تعلیقات، ضمیمے وغیرہ میں۔

ڈاکٹر گیان چند نے مقالے کے اختصار کے لیے درج ذیل نکات پیش کیے ہیں:

1- تمہیدی اور پس منظری حصے کم سے کم کریں۔
2- تکرار دور کریں۔
3- اقتباسات اور مقولات کم سے کم دیں اور جنھیں دیں، انھیں مختصر کر کے دیں۔
4- داستانوں، مثنویوں اور ناولوں کے پلاٹ کا خلاصہ نہ دیں۔
5- جدولیں کم کر دیں۔
6- کتابیات میں سے غیر اہم ماخذ نکال دیں۔

ان نکات میں انھوں نے یہ اضافہ بھی کیا ہے کہ ایسے پیراگراف مل جائیں گے جنھیں خارج کرنے سے کوئی نقصان نہ ہو گا یعنی ثانوی حیثیت کی تحریریں خارج کر دیں۔ اس میں یہ اضافہ بھی کیا جا سکتا ہے کہ توجہ صرف "اصل بات" پر رہے، خواہ وہ چند صفحات ہی میں کہی گئی ہو، قاری کو صرف اسی سے غرض ہے۔ ایسی

معلومات اور کوائف جو دوسری جگہوں سے مل سکیں، انھیں تصنیف میں شامل رکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ تصنیف کو قاموس یا انسائیکلوپیڈیا نہ بنائیں۔ سادہ لفظوں میں یہ کہ ناول کا سا وسیع کینوس نہ رکھیں، افسانے کی سی وحدت اختیار کریں۔

تحقیق شروع کرنے سے تصنیف کی صورت میں ڈھالنے تک ایک طویل عرصہ (تین چار برس) گزر چکا ہوتا ہے۔ اس اثناء میں نئے کوائف، نقطۂ نظر اور زاویے سامنے آ چکے ہوتے ہیں، انھیں مقالے میں جستہ جستہ متعلقہ مقامات پر شامل کریں اور تصنیف کو اس موضوع پر اب تک کی تحقیقات میں "حرفِ آخر" بنانے کی سعی کریں۔

مقالہ اُردو اصطلاحات سازی کی کتابی صورت

1- خاکہ تبدیل ہوا

...... خلاصہ نتائج وغیرہ آغاز میں آئے۔
...... اردو، انگریزی اور مسلم ممالک میں زبانوں کی پس منظری تاریخ۔
...... حصہ اول میں: علم اصطلاح۔
...... حصہ دوم: تقابلی موضوعاتی مطالعہ۔
...... حصہ سوم: اُردو اصطلاحات سازی کے اصول اور مسائل۔
...... حصہ چہارم: تاریخی جائزہ۔

کل: سولہ ابواب۔ مسلسل مطالعے کے نتیجے میں 263 لغات+146 اشاریے اور 425 دیگر ماخذ=کل: 1150 ماخذ ہوئے۔

2- دوسرا ایڈیشن

طبع دوم میں مزید جائزہ اور مطالعہ۔ کل: 301 لغات+ 481 اشاریے=782+ 436 دیگر ماخذ =1218 ماخذ۔

3- حتمی ایڈیشن

...... مطالعہ جاری ہے۔ 1500 سے زائد ماخذ اور بار بار کاٹ چھانٹ کا عمل جاری ہے۔ جس کی صورتیں اصطلاحی جائزے، اصطلاحی مباحث کی شکل میں شائع بھی ہو چکی ہیں۔ اب محض اس موضوع پر مستقبل کے قارئین کے لیے معلومات کی فراہمی درکار ہے۔

تحقیق میں مخصوص اصطلاحات اور مرکبات میں بات کی گئی تھی۔ اب ان کے متبادلات اور مترادفات کو بھی شریک کریں۔ یہ شراکت یا اضافہ اصل اصطلاحات کو قائم رکھتے ہوئے کیا جانا چاہیے۔

تحقیق میں بات ایک جملے میں ختم کر کے اگلے جملے میں نئی بات کی جاتی ہے۔ تصنیف میں وضاحت اور تشریح کے لیے نئے جملوں کا اضافہ کرنا پڑتا ہے۔ ایسا اضافہ ضرور کریں۔ کتاب کو زیادہ وضاحتی ہونا چاہیے۔

اشاعت کی ایک صورت مقالے کو دوسرے انداز یا اجزاء میں پیش کرنے کا نام بھی ہے۔ ایک صورت مختلف مختصر مضامین کے طور پر مختلف جرائد و رسائل میں بھجوانے کی ہے۔ کئی مقالہ نگار یوں بھی کرتے ہیں لیکن عام طور پر وہ مقالے کے ہر باب کو ایک ایک مضمون کی صورت میں شائع کرا دیتے ہیں۔ اصولاً یہ ہونا چاہیے کہ اپنے فرضیے، سابقہ ادبیات کا مطالعہ یا نتائج اور سفارشات کو ملا کر ایک مضمون یا مقالے کی نئی صورت دیں اور شائع کرائیں۔ ''اخبارِ اُردو'' کے ''اُردو اصطلاحات سازی'' نمبر اور "Termnet" دی آنا کے انگریزی جریدے میں انگریزی میں اُردو اصطلاحات سازی کا خلاصہ شائع کرایا گیا تھا۔

دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ اگر مقالہ عمودی انداز سے لکھا گیا ہے تو افقی طور پر اور اگر افقی طور پر لکھا گیا ہے تو عمودی انداز سے مرتب کر کے یا دونوں کے امتزاج سے نئے مضامین کی صورت میں تیار کر کے شائع کرائے جائیں۔ جیسے دفتری، قانونی، سائنسی اصطلاحات کے موضوعات اُردو اصطلاحات سازی کے مختلف ابواب میں مختلف کوائف کی صورت میں بکھرے ہوئے تھے یعنی اصولی، تقابلی اور تاریخی ابواب میں ان کے مختلف پہلو بیان ہوئے تھے۔ انھیں یکجا کر کے نئے مضامین کی صورت میں مختلف جرائد میں اشاعت کے لیے بھیجا گیا، پھر یہ مقالے الگ طور سے اصطلاحی جائزے اور اصطلاحی مباحث جیسی کتابوں کی صورت میں بھی اشاعت پذیر ہوئے۔ ان مقالوں اور کتابوں میں غیر ضروری حوالے بلکہ پاورقی نوٹ حذف کر دیے گئے۔ صرف کسی کسی مقالے میں کتابیات برقرار رکھی گئی۔ تحقیقی مقالے کے علی الرغم عام طور پر علمی مضامین میں حوالوں کی ضرورت نہیں ہوتی صرف ناگزیر صورت میں یا تحقیق کار کے پختہ کار نہ ہونے کے باعث اس سے توقع ہوتی ہے کہ وہ اپنے ماخذوں کی صحیح سمت، حوالہ یا صفحہ نمبر کو واضح کرے۔ کیونکہ عام علمی قارئین کو ان صفحات نمبروں سے کچھ بھی استفادہ نہیں کرنا ہوتا، پھر جرائد اور رسائل میں ان پر صفحات کیوں ضائع کیے جائیں۔ تاہم یہ فیصلہ کرنا مقالہ نگاروں اور متعلقہ جریدے یا ادارے کا کام ہے۔ اُردو اصطلاحات سازی کے زبانی امتحان ہی کے موقع پر سید امجد الطاف صاحب نے نتیجے کا اعلان کرتے ہوئے، اس کے پہلے باب ''اصطلاح کی تعریف'' کو ماہنامہ ''علامت'' لاہور میں شائع کرنے کی فیصلہ کن تجویز دی جس کے وہ خود مدیر تھے اور یوں یہ مقالہ سند کے لیے منظور ہوتے ہی شائع ہونا شروع ہو گیا۔ انھوں نے اس سے پاورقی حوالے خارج کر دیے۔ یہ ان کی اپنی صوابدید تھی۔ بعد ازاں کسی مضمون کو عام جرائد میں اور کسی کو خاص تحقیقی جرائد کی مخصوص ہیئت میں تیار کرنا دوسری طرح کی صوابدید تھی۔

6- مصنف کون؟

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کسی تحقیقی مقالے کا حقیقی مصنف کون ہوتا ہے؟ کیا تحقیق کار؟ طالب علم؟ نگران، سربراہ شعبہ؟ ارکانِ مجلس؟ اگر مصنفین ایک سے زیادہ ہوں تو پہلا نام کس کا ہو؟ کئی اساتذہ طلبہ کے کام اپنے ناموں سے شائع کر دیتے ہیں تو کئی طلبہ مقالے میں شامل دوسروں کی محنت کا اعتراف نہیں کرتے۔ ڈاکٹر کارل وُنش (Karl Wuensch) نے اپنے مضمون (1985ء، 2002ء) میں اس کا حل نکالا ہے جسے سٹینفرڈ کی طرح کی کئی جامعات، APA، اور ''جرنل آف سائیکالوجی'' وغیرہ تسلیم کرتے ہیں۔ اس کے

نزدیک:

"اگر مقالہ طالب علم کا مجوزہ تھا اور اسی نے زیادہ تر کام کیا، کوائف جمع کیے اور منظوری کے ایک سال کے اندر اسے اشاعتی صورت دے دی تو وہی پہلا مصنف ہوگا۔ نگرانِ مقالہ اس کے ساتھ شریک مصنف ہوگا اور اگر مجلسِ دفاع/ممتحین نے تجاویز شامل کیں تو انھیں بھی فہرست مصنفین میں شامل کیا جائے گا......

اگر عنوان کارل (نگران یا پراجیکٹ ڈائریکٹر) کا مجوزہ تھا اور اسی نے زیادہ تر کام کیا تھا تو وہی پہلا مصنف ہوگا اور طالب علم شریک مصنف ٹھہرے گا۔ اگر دونوں نے مساوی محنت کی ہو تو طالب علم پہلا مصنف ہوگا......

تصنیف کی صورت میں اصل کام مقالے کی اشاعتی ہیئت ہے۔ ایسی صورت میں وہی فرد پہلا مصنف ٹھہرے گا جس نے کتابی صورت عطا کی......

اگر طالب علم ایک خاص مدت (سال یا دو سال) کے اندر مقالے کی اشاعت میں دلچسپی نہیں لیتا تو کوائف کے حقوق اشاعت صدر شعبہ کو منتقل ہو جاتے ہیں......"

فروری 1996ء میں سٹوارٹ آلٹ مین (Stuart Altman) نے اپنے ایک مختصر سے مضمون میں اس موضوع پر روشنی ڈالی ہے جس میں اس نے مصنف کے حق کو اخلاقی تناظر میں دیکھا اور ایک اُصول متعین کیا "حقدار کو اس کا حق دو"۔ یعنی اگر کوئی عنوان طالب علم کو نگران یا کسی ادارے کی طرف سے تفویض کیا گیا تو پہلا حقِ تصنیف اسی نگران یا ادارے کا ہوگا اور تحقیق کار ثانوی حیثیت کا مالک ہوگا اور اگر تحقیق کار کی تجویز پر نگران کے مشورے شامل ہوتے رہے تو نگران اس مقالے کا شریک/دوسرا مصنف ہوگا۔ گویا کوئی تحقیقی مقالہ کسی فردِ واحد یا محض تحقیق کار کا حقِ تصنیف نہیں رکھتا۔ اس پر مستزاد یہ کہ اگر تحقیق کار ایک مقررہ مدت کے اندر اپنے نتائج شائع کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا تو اس کا پہلا حقِ تصنیف ختم ہو جاتا ہے۔ اگر اشاعتی صورت میں تسوید کسی اور نے کی ہے تو حقِ تصنیف اس دوسرے فرد کو حاصل ہو جاتا ہے۔

البتہ جہاں کسی فرد نے کسی ادارے سے معاوضہ لے کر، ملازمت کر کے یا کسی جزوی طور پر کوئی کام کیا تو اس کام کا کاپی رائٹ اس ادارے کو حاصل ہوگا۔ سرکاری اداروں میں کاپی رائٹ سرکار کو حاصل ہوتا ہے۔ کسی سیمینار یا کانفرنس میں پڑھے گئے مقالے کا کاپی رائٹ تحقیق کار اور منتظمین کو مساوی طور پر حاصل ہوتا ہے۔ حقوقِ دانش (Intellectual Property) کا معاملہ دوسرا ہے، وہ ہمیشہ مصنف/محقق/مترجم/تخلیق کار کو حاصل رہتے ہیں لیکن اس میں عوامی ملکیت اور ذاتی ملکیت دو مختلف اقالیم ہوتی ہیں۔ یعنی حقِ دانش (IP) تو مصنف ہی کو حاصل ہو لیکن اس کا کاپی رائٹ عوام یا حکومت کو حاصل ہو سکتے ہیں۔

7-مابعدِ اشاعت

اُردو اور پاکستانی زبانوں میں تحقیق یا تو ماضی پر ہوتی رہی ہے یا پھر ادبیات پر جو زبان کا محض پانچ

فی صد ہے۔ باقی 95فی صد یعنی غیر ادبی زبان میں سماجی، نفسی، قومی اور روزمرہ ضرورتوں کے حوالے سے تحقیق درکار ہے۔ انھیں کسی مقالے کی بنیاد نہیں بنایا جا رہا۔ اُردو لغات، قواعد، ترجمہ کاری، میڈیا، تدریس، سیاسی اور دفتری تقاضے، ٹیکنالوجی کے مسائل پر تحقیق افسانوں میں دیہاتی کرداروں اور ناولوں میں تانیث یا تحریروں میں اسطوریات کا بے سود مطالعہ کرنے سے کہیں زیادہ ضروری ہیں۔ اُردو اور پاکستانی زبانوں کے تحقیقی ڈیزائن یا ٹیکنیک نہیں۔ اصول تحقیق پر خاص توجہ نہیں۔

تحقیقی جرائد

تحقیق کا علم اور ڈسپلن اپنے مخصوص تقاضے رکھتا ہے۔ اس میں لسانیات اور شماریات کو بھی استعمال کرنا ہوتا ہے اور اُردو اور پاکستانی زبانوں کے شعبوں میں ان کا گزر تک نہیں۔

تحقیق اپنے اثرات ہی سے پہچانی جاتی ہے۔ اس کا جائزہ عالمی سطح پر ISI لیتی ہے۔ HEC نے بھی تحقیقی جرائد کے لیے پانچ شرائط مقرر کر رکھی ہیں۔ مگر اُردو کا کوئی جریدہ "Z" زمرے سے اوپر نہیں آسکا، سوائے ایک آدھ کے جو "Y" ہے لیکن "X" اور "W" سطح پر کوئی نہیں۔ اثراتی عامل کسی سال میں دیگر جرائد میں آنے والے حوالوں کی اوسط تعداد یا پانچ/سات سال کے تعدد کو کہتے ہیں۔ ایک لسانی عالمی جریدے کے جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اثراتی عامل 1.886 ہے جو بڑھ رہا ہے۔ یہ 47ویں نمبر پر ہے۔ ایک ادبی جریدہ 0.970 اثراتی عامل کا حامل ہے۔ جریدے کا سائز عام طور پر اثراتی عامل پر اثر انداز ہوتا ہے۔ 140 مقالات سالانہ کی کمی بیشی سے اثراتی عامل میں 22٪ سالانہ کی بیشی ہوئی ہے۔ مقالات کی شرح قبولیت بھی جریدے کو اہمیت دیتی ہے۔ اوسطاً شرح قبولیت 42٪ ہے۔ اُردو جرائد اس طرح کی کوئی ادارتی پالیسی نہیں رکھتے۔ پھر ان کے ہاں اوسطاً دو چار ہی میں اپنے معاصر تحقیقی جرائد کے حوالے ہوتے ہیں۔ ان جرائد کو "علم" کی ترقی کے لحاظ سے مقالات منتخب کرنے چاہئیں یعنی ان میں نسبتوں، تعلقات اور تلازمات کا نقش ہونا چاہیے۔

تحقیق اپنے اثرات (Impact) کے ذریعے یعنی اثرات کے مطالعے (Impact study) سے پہچانی جاتی ہے۔ اس کے لیے تحقیقی جرائد کے معیارات پر بات ہوتی ہے۔ یہ بات سب سے پہلے سرگودھا یونیورسٹی کی عالمی اُردو کانفرنس کے مقالے میں کہی تھی، پھر دوسری کتابوں میں بھی دہرائی۔ تاہم اُردو میں کوئی اور متعلقہ تحقیقی ماخذ یا ادبیات موجود نہیں۔ اس کی اشاریہ بندی (Indexation) کی جاتی ہے، جس سے اثرات کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر حافظ صفوان محمد چوہان نے جتنی بھی تشریح کی ہے، اُردو کا کوئی ایک تحقیقی جرنل عالمی سطح پر ابھی تک اپنا اثر نہیں جما پایا۔ ISI (بین الاقوامی سائنٹیفک اطلاع) میں کسی کا اندراج نہیں۔ ایک ڈاکٹر محمد میمن کا انگریزی جریدہ The Annual of Urdu Studies ہے، وہ بھی ابھی تک تراجم ہی کی بنیاد پر استوار ہے اور اس کا اثراتی عامل ابھی وضع نہیں ہوا۔ اُردو میں شائع ہونے والے تحقیقی جرائد اور رسالوں کی بات کریں۔ ہائر ایجوکیشن کمیشن نے ان کے لیے پانچ شرائط (ISI) کی مقرر کر رکھی ہیں۔ ابھی تک کوئی جریدہ ان پر پورا نہیں اتر رہا۔

تحقیقی جرائد کی جائزہ کاری ISI کا ایک اہم کام ہے۔ وہاں ہر سال جرائد کی منظوری کی فہرست تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ بیس ہزار سے زائد جرائد کا جائزہ لیا جاتا ہے اور ان کی دس فی صد تعداد منتخب ہوتی ہے تاکہ صرف اعلیٰ تحقیقی معیار رکھنے والے جرائد ہی شامل رہ سکیں۔ اس جائزہ کاری کے اصول اور معیارات کچھ یوں ہیں:

1۔ معیارات

(الف) اشاعت کا دورانیہ: جریدے کو طے کردہ دورانیے یا مدت میں مسلسل شائع ہوتے رہنا چاہیے۔ کم از کم سابقہ تین شمارے وقت پر شائع ہوئے ہوں۔

(ب) بین الاقوامی ادارتی روایات: جریدے کا نام معلومات مہیا کرتا ہو، مقالے کا عنوان موضوع کو بیان کرتا ہو، خلاصے، کتابیات اور حوالہ جات موجود ہوں، ہر مصنف کا مکمل پتا اور معلومات دی گئی ہوں۔

(ج) انگریزی میں عنوان اور خلاصہ: مقالہ کسی بھی زبان میں ہو، عنوان اور خلاصہ انگریزی میں بھی ضرور دیا گیا ہو۔ کلیدی الفاظ اور اصطلاحات کے انگریزی متبادلات موجود ہوں۔

(د) معاصر جائزہ (Peer Review): دیگر ساتھی جرائد میں اس پر جائزے اور تبصرے کیے گئے ہوں۔

2۔ ادارتی مواد

ایسے مواد پر مقالات جن پر پہلے کام نہ ہوا ہو۔ ابھرنے والے نئے موضوعات پر جریدہ شائع ہوتا ہو۔

3۔ بین الاقوامیت

جریدہ دوسرے ملکوں کے قارئین تک رسائی رکھتا ہو۔ یعنی وہاں خریدار موجود ہوں۔

4۔ حوالہ جاتی تجزیہ

جریدہ صرف اپنے میدان یا مضمون پر شائع ہو تو حوالہ جاتی تجزیہ آسان ہو جاتا ہے۔ عام طور پر پانچ سال اور زبان اور انسانیات کے موضوعات پر سات سال تک اثراتی عامل کا جائزہ لینا پڑتا ہے۔

5۔ برقیاتی جریدہ

بہتر ہے کہ جرائد اپنا مواد انٹرنیٹ پر بھی مہیا کریں۔

8- اثراتی عامل (Impact factor)

اسے ذرا تفصیل سے دیکھنا ہوگا، مثلاً اثراتی عامل عام طور پر کسی جریدے کے دیگر جرائد میں آنے والے حوالوں کی اوسط سالانہ تعداد یا تعدد کو کہا جاتا ہے۔ اس سے جریدے کی تحقیقی اہمیت کا اندیشہ ہوتا ہے۔ یہ اس تعدد کو کہتے ہیں جو کسی عام تحقیقی مقالے کے حوالہ جات کسی خاص سال یا عرصے عام طور پر پانچ سال اور زبان اور انسانیات کے موضوعات پر سات سال میں دوسرے مقالوں/ جریدوں میں آنے سے پیدا

ہوتا ہے۔ اس کے لیے عام طور پر:

1۔ تبصراتی مقالے (Review Article) دیکھے جاتے ہیں۔ ان کی اہمیت تحقیقی مقالے سے زیادہ ہے۔ کیونکہ ان میں مقالوں کا جائزہ آ جاتا ہے۔ علاوہ ازیں خطوط بنام مدیر، تبصرے اور دیگر ایسی تحریریں بھی اہم ہوتی ہیں جن میں حوالہ دیا گیا ہوتا ہے۔ اثراتی عامل معلوم کرنے کا فارمولا مثلاً:

(الف) 1992ء کے کل حوالے

(ب) 1992ء میں 91-1990ء میں شائع کرنے والے مقالوں کے حوالہ جات۔

(ج) 91-1990ء میں شائع ہونے والے مقالوں کی تعداد۔

(د) ب تقسیم ج = 1992ء کا اثراتی عامل۔

مختلف مضامین کا تنوع:

ہر مضمون کے تحقیقی مقالوں کے اثرات مختلف ہوتے ہیں۔ اس لیے ہر مضمون کا الگ الگ جائزہ لیا جاتا ہے۔

2۔ پانچ سال تک کا جائزہ لینا زیادہ مفید ہوتا ہے۔

فارمولا کچھ یوں ہے:

(الف) 1992ء میں 1987ء سے 1991ء تک کے مقالات کے حوالوں کا جائزہ

(ب) 1987ء سے 1991ء کے دوران میں شائع ہونے والے مقالات

(ج) الف تقسیم ب = پانچ سالہ اثراتی عامل

3۔ ذاتی حوالہ جات کو نظر انداز کرنے کے لیے نظر ثانی شدہ اثراتی عامل:

(الف) 91-1990ء میں شائع شدہ مقالوں کے حوالہ جات 1992ء میں

(ب) 91-1990ء میں شائع شدہ مقالوں کے ذاتی حوالہ جات 1992ء میں

(ج) الف تقسیم ب = کل حوالہ جات منفی حالیہ مقالوں کے ذاتی حوالہ جات

(د) 91-1990ء میں شائع شدہ مقالات کی تعداد

(ر) نظر ثانی شدہ ابتدائی عامل (ج تقسیم د)

4۔ عنوان کی تبدیلی سے یکساں اثراتی عامل کا جائزہ:

فارمولا:

(الف) 1992ء میں 91-1990ء میں شائع شدہ مقالوں کے حوالہ جات (الف1+الف 2)

الف1 = نئے عنوان کے ساتھ

الف2 = بعد کے عنوانات کے تسلسل کے ساتھ

(ب) 91-1990ء میں شائع شدہ مقالات (ب1+ب2)

ب 1 = نئے عنوان کے ساتھ

ب 2 = بعد کے عنوانات کے تسلسل کے ساتھ

(ج) یکساں اثراتی عامل (الف تقسیم ب)

ج 1 = الف تقسیم ب 1

ج 2 = الف 2 تقسیم ب 2

اثراتی عامل تحقیقی جرائد کی افادیت اور اثرات جاننے کا مفید آلہ ہے۔ بس اس میں ذاتی کوشش اور تبدیلی، تنوع اور فریب کے عناصر اور عوامل کو ملحوظ رکھنا ہوگا تا کہ اثرات کا صحیح ترین جائزہ لیا جا سکے۔

صرف اثراتی عامل ہی اُردو اور پاکستانی زبانوں کے تحقیقی جرائد کو تحقیق کی دنیا میں اعلیٰ سطح پر تسلیم کرا سکتا ہے۔ اُردو کے تحقیق کار اس بات کو جتنا جلد سمجھ جائیں اتنا ہی بہتر ہے۔

پاکستانی یونیورسٹیوں کے تحقیقی مقام کا جائزہ ISI کے تحقیق میں معاصر جائزہ (Peer Review) سے معلوم ہوتا ہے۔ یہ جائزہ ہر سال ان کی ویب سائٹ ISI web of knowledge پر شائع کیا جاتا ہے۔ اس میں سائنس (SCI-Expanded)، سماجی علوم (SSCI)، فنون اور انسانیات (ادبیات) (A&HCI) کے حوالے سے اثراتی مطالعہ (Impact Study) کا اشاریہ شائع ہوتا ہے۔ 28 فروری 2011ء کو ہائر ایجوکیشن کمیشن نے اخبار میں اشتہار دیا اور پاکستانی یونیورسٹیوں کے تحقیقی مقام کی فہرست شائع کی۔ اس کے مطابق چار برسوں (2007ء، 2008ء، 2009ء اور 2010ء) میں تحقیقی لحاظ سے پہلے نمبر پر قائد اعظم یونیورسٹی اسلام آباد تھی۔ 2007ء سے 2009ء تک کراچی یونیورسٹی دوسرے نمبر پر تھی۔ 2010ء میں آغا خان یونیورسٹی کراچی دوسرے نمبر اور کراچی یونیورسٹی تیسرے نمبر پر تھی۔ 2007ء سے 2009ء تک پنجاب یونیورسٹی تیسرے نمبر تھی مگر 2010ء میں چوتھے نمبر پر تھی۔ 2010ء میں پانچویں نمبر پر زرعی یونیورسٹی فیصل آباد، چھٹے نمبر پر کامسیٹس انسٹی ٹیوٹ آف انفارمیشن ٹیکنالوجی اسلام آباد، ساتویں نمبر پر گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور، آٹھویں نمبر پر سرگودھا یونیورسٹی آئی۔

ان پہلی دس یونیورسٹیوں میں سے کراچی، پنجاب، سرگودھا، جی سی لاہور اور پشاور کی یونیورسٹیوں میں اُردو کے شعبے موجود ہیں، مگر اس بات پر اُردو والوں کو خوش نہیں ہونا چاہیے کیونکہ ISI کی رپورٹ میں اُردو تحقیق کا کوئی اثراتی مطالعہ موجود نہیں۔

اس فہرست میں چوبیس ایسے ادارے شامل ہیں جن میں اُردو کی تدریس ہوتی ہے مگر ان کے اس تحقیقی درجے میں اُردو اور پاکستانی زبانوں کی کسی تحقیق کو بار حاصل نہیں۔ ان میں سے بہاالدین زکریا ملتان 11 ویں نمبر پر، سندھ (جام شورو) 15 ویں، اسلامیہ (بہاولپور) 24 ویں، جی سی (فیصل آباد) 19 ویں، ہزارہ (مانسہرہ) 22 ویں، وفاقی اُردو (اسلام آباد) 24 ویں، بلوچستان (کوئٹہ) 25 ویں، بین الاقوامی اسلامی (اسلام آباد) 27 ویں، لاہور ویمن جی سی (لاہور) 29 ویں، گومل (ڈیرہ اسماعیل خان) 30 ویں،

آزاد جموں کشمیر (مظفر آباد) 32 ویں، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی (اسلام آباد) 33 ویں، ایف سی سی (لاہور) 40 ویں، گجرات (گجرات) 42 ویں، شاہ لطیف (خیر پور) 59 ویں، اسلامیہ کالج (پشاور) 64 ویں، ایجوکیشن (لاہور) 70 ویں، نمل (NUML اسلام آباد) 75 ویں، بیکن ہاؤس (لاہور) 90 ویں نمبر پر ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی اُردو کے حوالے سے اس جائزے میں شامل نہیں۔

گویا اُردو تحقیق ابھی کسی بھی عالمی مقام پر موجود نہیں۔ 2011ء میں بھی پہلے نمبر پر قائداعظم یونیورسٹی تھی۔ پہلی دس یونیورسٹیوں میں زرعی یونیورسٹی فیصل آباد، آغا خان یونیورسٹی، پنجاب یونیورسٹی، کراچی یونیورسٹی، کامسیٹس (Comsats)، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور، پشاور یونیورسٹی، نسٹ (NUST) اسلام آباد اور بہاالدین زکریا یونیورسٹی شامل تھیں۔ وفاقی اُردو یونیورسٹی 25 ویں اور علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی 43 ویں نمبر پر تھی۔ جولائی 2013ء میں بڑی یونیورسٹیوں میں پہلے نمبر پر نسٹ اسلام آباد، دوسرے نمبر پر پنجاب یونیورسٹی، تیسرے نمبر پر کراچی یونیورسٹی، درمیانی یونیورسٹیوں میں پہلے نمبر پر قائداعظم یونیورسٹی، دوسرے نمبر پر گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور، تیسرے نمبر پر فاسٹ اسلام آباد، چھوٹی یونیورسٹیوں میں پہلے نمبر پر یونیورسٹی آف فیصل آباد، دوسرے نمبر پر بیکن ہاؤس لاہور، تیسرے نمبر پر پائیڈ (PIDE) اسلام آباد تھی۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کو شامل ہی نہیں کیا گیا۔

2014ء میں پہلے نمبر پر قائداعظم یونیورسٹی، دوسرے نمبر پر کامسیٹس، تیسرے نمبر پر پنجاب یونیورسٹی، الخیر 65 ویں نمبر پر اور آخری (67 ویں) نمبر پر پریسٹن یونیورسٹی ہے۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کو شامل نہیں کیا گیا۔

2016ء (رپورٹ 2015ء) میں پہلی دس یونیورسٹیوں میں پہلے نمبر پر قائداعظم یونیورسٹی، دوسرے نمبر پر پنجاب یونیورسٹی، تیسرے نمبر پر نسٹ، چوتھے نمبر پر کامسیٹس جو عمومی یونیورسٹیوں میں تیسرے نمبر پر، الخیر 67 ویں نمبر پر اور آخری (73 ویں) نمبر پر نذیر حسین یونیورسٹی کراچی۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کو شامل نہیں کیا گیا۔

یو ایس نیوز اینڈ ورلڈ کیر پورٹ 2016ء کے مطابق دنیا کی 400/750/ بلکہ 1000 بڑی یونیورسٹیوں میں ترکی کی 10، سعودی عرب کی 4 مگر پاکستانی یونیورسٹیوں میں سے کوئی بھی یونیورسٹی شامل نہیں تھی۔

ایسے جرائد جو اثراتی عامل کی اشاریہ بندی سے گزرتے ہیں "W" کے زمرے (Category) میں آتے ہیں جبکہ ایک پروفیسر بننے کے لیے "X" زمرے میں شائع شدہ تحقیقی مقالے قابلِ قبول ہوتے ہیں۔ مگر اُردو کا کوئی تحقیقی جریدہ "Z" زمرے سے بالا نہیں، سوائے اقبال اکیڈمی کے جریدے ''اقبال ریویو'' یا Kashmir Journal of Language, Muzafarabad, AJK کے جو "Y" زمرے میں آتے ہیں۔

اثراتی عامل ایک تحقیق کار Eugene Garfield نے وضع کیا تھا جو ISI کا بانی تھا۔ اب یہ ادارہ Thomson Reuters کا ایک حصہ ہے۔ ان کا رپورٹ میں جرائد کے اثراتی عامل کا اشاریہ شائع ہوتا رہتا ہے۔ اس پر تنقید بھی کی جاتی ہے کہ اثراتی عامل کا اشاریہ کبھی آڈٹ نہیں ہوتا، اس لیے اسکی وقعت کم ہو جاتی ہے یا جرائد اپنے ہی مقالات میں سابقہ جرائد کے حوالے سے بڑھا دیتے ہیں۔ لیکن انتہائی منضبط کوائف، تجزیے اور اشاریہ بندی کی بدولت یہ اعتراضات عموی ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس میں بہترین شماریاتی فارمولے استعمال میں لائے جاتے ہیں۔ تاہم ایک اعتراض یہ ہوسکتا ہے کہ خواہ جریدہ کتنے بھی اعلی عامل کا حامل ہو، اصل بات تو اس تحقیقی مقالے کے مندرجات اور معیار کی ہے جو اس میں شائع ہوا ہے لیکن ایک بات طے ہے کہ کسی جریدے کی تدوین کا اعلیٰ ہی اس کے اثراتی عامل اور زمرے کو طے کرے گا، چنانچہ لامحالہ اس میں شائع شدہ مقالہ اس کے کم از کم معیار پر تو پورا اترتا ہی ہوگا۔ سفارشی مضامین اور مقالے اس میں شائع نہ ہوتے ہوں گے۔ مقالات کے اثراتی عامل کا جائزہ اور طرح سے بھی لیا جاتا ہے۔ اسے مقالاتی سطح جدول (Almetrics) کہا جاتا ہے۔ اس میں مقالے پر فوری ردعمل آرا کو گنا جاتا ہے۔

اثراتی عامل کے جائزے میں ISI کی ویب (Web) پر تیئس (23) ہزار جرائد موجود ہیں۔ وہاں آپ کسی بھی جریدے کا عامل معلوم کر سکتے ہیں۔ اس میں آرٹس اور انسانیات کے شعبے کا اشاریہ الگ سے موجود ہے۔ یہ اشاریہ فی الوقت 1300 جرائد پیش کرتا ہے۔ گویا ابھی تک صرف اتنے جریدے رجسٹر ہوئے ہیں۔ ان میں نصف سے بھی کم تعداد زبان وادب کے جریدوں کی ہے۔ لسانیات کے کل 47 جریدے رجسٹر ہیں۔

زبان سے متعلق ایک عالمی جریدے کے اثراتی عامل کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ "Language" نام کا یہ انگریزی جریدہ Linguist Society (U.S) امریکہ سے 1925ء سے سہ ماہی شائع ہو رہا ہے۔ اس کا اثراتی عامل 2006ء میں 1.79 اور 2009ء میں 1.886 تھا۔ اس میں نوم چومسکی کے مقالات سب سے زیادہ موثر رہے۔ یہ جریدہ 47 لسانیاتی جریدوں میں چھٹے نمبر پر ہے۔

اسی طرح ایک اور عامل سہ ماہی جریدہ Language and Literature ہے جو Poetics and Linguistics Association کی طرف سے معروف ناشر Sage شائع کرتے ہیں۔ 2010ء میں اس کا اثراتی عامل 0.970 تھا۔ اس میں بہترین شائع شدہ مقالہ Jennifer R. Harding کا تھا۔ اب اُردو کے تحقیقی جرائد (جامعاتی یا غیر جامعاتی) کا جائزہ لیں تو یہاں تقریباً تمام جرائد "Z" زمرے میں آتے ہیں، جبکہ ان جریدوں کو "X" اور "W" زمروں میں آنا ہے۔ یہاں تک پہنچنے کے لیے دیگر شرائط کے علاوہ مقالات کے حوالہ جات کی اشاریہ بندی کی ضرورت ہے، جو ISI میں رجسٹریشن کے بعد ہوسکتی ہے۔ اس بات کا اعتراف "معیار"، اسلام نمبر 6 میں بھی کیا گیا۔

"اُردو کے تقریباً سبھی جرائد اس وقت کیٹگری Z میں ہیں۔ اس کی وجہ اُردو میں انڈیکسیشن کے نظام کا نہ ہونا ہے"۔ بعض نے اپنے مقالوں کی مختصر معلومات کا اشاریہ دینا شروع کیا ہے جو انڈیکسیشن نہیں۔

تحقیقی معیار اور HEC کے حوالے سے ایسا ہی ایک گریہ "معیار" نمبر 8، 2012ء میں بھی کیا گیا ہے۔

اثراتی عامل پر جریدے کا سائز (مقالات کی تعداد کے لحاظ سے) مثبت طور پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس کا ایک جائزہ ایم امین نے لیا ہے۔ اس کے مطابق چار ہزار جرائد کا جائزہ لینے کے بعد معلوم ہوا کہ جیسے جیسے جرائد میں مقالات کی سالانہ تعداد اشاعت بڑھتی ہے، ان کے اثراتی عامل میں بھی اسی طرح اضافہ ہوتا ہے۔ ایک اتفاقی نمونہ بندی سے 140 مقالات سالانہ کی یا اضافے سے اثراتی عامل میں 22 فی صد سالانہ کی یا اضافہ ہوتا ہے۔ اثراتی عامل کے علاوہ جو تیسری بات تحقیقی جرائد کو قابل قبول بنا سکتی ہے، وہ مقالات کی شرح قبولیت (Acceptance Rate) ہے۔ یعنی کسی جریدے میں موصول ہونے والے کتنے فی صد مقالات اشاعت کے لیے قبول ہوتے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق اسے نصف سے کم ہونا چاہیے یعنی مسترد مقالات کی تعداد قبول مقالات سے زیادہ ہونی چاہیے۔ ایک تحقیقی سروے میں تحقیق کاروں نے معاشیات کے تین جریدوں کی شرح قبولیت معلوم کی تو وہ 47٪، 51٪ اور 55٪ تھی۔ کاف مین ولز گروپ نے 500 جرائد کے سروے کے بعد معلوم کیا کہ Association of Learned and Professional Society Publishers کی اوسط شرح قبولیت 42٪ تھی۔ اُردو کے جرائد کی شرح قبولیت 80٪ سے زائد ہے۔ اسے کم از کم 50٪ تک آنا چاہیے۔ اس اعلیٰ سطح پر پہنچنے کی خواہش سے پہلے ان جرائد کو اپنا ادارتی جائزہ بھی لے لینا چاہیے کہ ان میں ابھی کون کون سی کمی واقع ہے۔ مثلاً:

1۔ ان کا باقاعدہ دفتر اور کوئی تکنیکی ایڈیٹر (ملازم) موجود نہیں ہوتا۔
2۔ مجلس مشاورت معاصر جائزہ (Peer Review) کا کام نہیں کرتی۔
3۔ ان کی اشاعت میں باقاعدگی نہیں ہوتی۔
4۔ مقالات منتخب کرنے کے لیے کوئی باقاعدہ زمرہ جاتی ادارتی پالیسی نہیں ہوتی اور مقالات باقاعدہ اپنے زمرہ جاتی معیار پر پرکھے نہیں جاتے۔
5۔ مسترد مقالات کا تناسب کوئی نہیں جسے منتخب مقالات سے زیادہ ہونا چاہیے یعنی شرح قبولیت 50٪ سے کم ہونی چاہیے اور اس کا باقاعدہ رجسٹر موجود ہونا چاہیے۔
6۔ ان مقالات میں دیگر تحقیقی جرائد میں شائع شدہ مقالات کے حوالے کثرت سے نہیں ہوتے بلکہ نہ ہونے کے برابر ہوتے ہیں۔
7۔ اشاریہ بندی کا ان کا اپنا کوئی نظام نہیں جس سے اپنا جائزہ خود لینے میں کوتاہی ہوتی ہے۔

مثال کے طور پر "دریافت" اسلام آباد نمبر 5، 2006ء ہی کو لے لیں، اس میں کل 16 حوالے رسائل وجرائد کے ہیں۔ شمارہ نمبر 9، 2010ء میں 21 حوالے آئے ہیں۔ "معیار" اسلام آباد، نمبر 4، 2010ء میں کل 33 حوالے رسائل وجرائد کے ہیں۔ "معیار" اسلام آباد نمبر 6، دسمبر 2011ء میں کل 56 حوالے رسائل وجرائد کے ہیں۔ ان میں بمشکل چھ سات حوالے تحقیقی جرائد کے ہیں۔ "تحقیق"، جام شورو نمبر

16، 2008ء میں 44 حوالے اور نمبر 19، جون 2010ء میں 21 حوالے ہیں۔ البتہ زیادہ تر تحقیقی جرائد کے ہیں۔ دیگر رسائل میں سے ''الزبیر'' بہاولپور، نمبر 4، 2008ء میں کل چار حوالے اور نمبر 5، 2008ء میں کل پانچ حوالے رسائل و جرائد کے ہیں اور وہ بھی تحقیقی علمی جرائد کے نہیں۔ ''الاقربا'' اسلام آباد، شمارہ نمبر 3، جولائی ستمبر 2012ء میں بمشکل دو حوالے رسائل کے ہیں اور وہ بھی غیر تحقیقی جرائد کے ہیں۔ ''پیغام آشنا'' نمبر 49، اپریل تا جون 2012ء میں اکثر مضامین میں ماخذ درج ہی نہیں۔ سوائے دو تین مقالات کے اور وہاں بھی چھ حوالے جرائد کے ہیں۔

لازم نہیں کہ اُردو اور پاکستانی زبانوں کا تحقیقی جریدہ جامعات ہی سے برآمد ہو۔ یہ نجی اشاعتی ادارے کی طرف سے بھی باقاعدگی سے شائع ہو سکتا ہے۔ شرط صرف ''علم میں اضافہ'' کی ہے۔ اُردو اور پاکستانی زبانوں کے تحقیقی مقالوں میں ''علم میں اضافہ'' کی شرط اس سے پوری نہیں ہوتی کہ یہاں کوئی مقالہ سابقہ تحقیق پر منحصر ہوتے ہوئے نئے جائزے پیش نہیں کرتا۔ محض اقتباسات اور حوالوں کے اندراج ہی کو تحقیقی مقالے کی شان سمجھ لیا جاتا ہے۔ مقالے میں مضمر یا ظاہر کوئی تحقیقی سوال، فرضیہ، مفروضہ اور تحدید موجود نہیں ہوتی۔ اس کی ایک بڑی وجہ اُردو اور پاکستانی زبانوں کی تحقیق میں مقالات اور جرائد کی بجائے ''کتابوں'' کو علمی ماخذ تصور کرنا ہے جو جدید علمیات اور تحقیق کی روشنی میں غلط ہے۔ یہ غلط رویہ جرائد کے حوالے زیادہ نہیں آنے دیتا بلکہ اکثر مضامین/مقالات میں سوائے کتابوں کے کوئی حوالہ نہیں ہوتا۔ جب ان جرائد میں شائع شدہ مقالوں کے حوالے ہی نہیں آئیں گے تو حوالوں کی اشاریہ سازی کس طرح سے ہوگی اور کسی مقالے کے ''اثراتی عامل'' کا جریدے کے ''اثراتی عامل'' کے حوالے سے کیوں کر پتا چلے گا۔ یقین مانیں کہ اگر اگلے سات برس میں آپ کے مقالے/مضمون/تبصرے، رسالے/جریدے کے کہیں حوالے نہیں لیے گئے تو اس کا سیدھا سادہ مطلب ہے کہ یہ علمی طور پر کسی بھی نوٹس لینے کے قابل نہیں تھے اور انھوں نے علمی ترقی پر کوئی اثر نہیں چھوڑا۔ بعد ازاں یہ مقالے محض کتابوں میں بند/محفوظ ہو کر رہ جائیں گے جو علمی ترقی کے لیے بیکار ہیں۔

کتابیں تحقیق کا علمی ماخذ اس لیے نہیں ٹھہرائی جا سکتیں کہ ان میں محض کوائف اور معلومات درج ہوتی ہیں، جنھیں مرتب کر دیا جاتا ہے۔ ان میں کوئی زاویۂ نظر (Point of View)، کوئی نسبتوں کا نقش (Pattern)، کوئی دانش کا راستہ بہت کم ہوتا ہے اور تحقیق کا رکوان آخری باتوں سے تعلق ہوتا ہے۔ بقول نیل فلیمنگ:

- کوائف کا ہجوم معلومات نہیں ہوتا
- معلومات کی جمع آوری علم نہیں ہوتا
- علوم کا اجتماع دانش نہیں ہوتا
- دانش کا مجموعہ صداقت نہیں ہوتا

اس کا سیدھا سادہ سا مطلب ہے کہ جب ہم کوائف (Data) جمع کرتے ہیں تو سیاق و سباق کے بغیر یہ بے معنی ہوتے ہیں تاوقتیکہ ان میں کوئی نسبت، تعلق یا تلازم نہ دیکھا جائے۔ مثلاً ''وقت''، ''5''، ''ج''

وغیرہ محض کوائف ہیں جب تک کہ ''وقت گزرتا ہے''، ''وقت کی بات''، ''5 سیر''، ''5 بار''، ''ج سے جہاز''، ''نکتہ ج'' نہ کہا جائے۔ تب یہ معلومات ہوں گی۔ یعنی کوئی نسبت، تعلق یا تلازم موجود ہے۔ معلومات انھی کا فہم ہیں۔ جب اس پر کیوں، کیا، کیسے جیسے سوالات کیے جاتے ہیں تو بات بصیرت اور تجربہ وواردات کی روشنی میں ان سے حاصل شدہ جوابات علم کہلاتے ہیں۔ یعنی نسبتوں، تعلقات اور تلازمات کا نقش (Pattern) علم ہوتا ہے جس سے دہرائے جانے اور پیش گوئی کرنے کو بنیاد ملتی ہے۔ علم حکمت علمی، عمل، طریق اور انداز پر منحصر ہوتا ہے۔ علم میں پیش رفت انھی باتوں میں پیش رفت سے ہوتی ہے۔ افسوس یہ ہے کہ اُردو تحقیق ابھی تک معلومات یا تلاش کے زمرے میں ہے اور اس کی بنیاد بھی کوائف نہیں بلکہ ذاتی آراء ہوتی ہیں اور ان آراء پر علم ہونے کا اصرار کیا جاتا ہے۔

کمپیوٹر سائنس میں پی ایچ ڈی کے لیے ''نالج مینجمنٹ'' کا مضمون وضع اور پیش کرتے ہوئے مجھے اس بات پر تاسف ہوتا ہے کہ میرے کمپیوٹر کے طلبہ اُردو اور پاکستانی زبانوں کے ''نالج مینجمنٹ'' (Knowledge Management) پر کوئی کام نہیں کر سکتے کیونکہ اُردو تحقیق میں علم/ Knowledge نام کی کوئی تحقیقی شے نہیں ملتی، بس، دریافت، معلومات یا کچھ حد تک کوائف۔ اُردو تحقیق کو اپنا راستہ بدلنا ہوگا اور اسے علم کی جدید تشریح اور تعبیر پر استوار کرنا ہوگا۔

سندی مقالہ خواہ کتنا ہی بہتر لکھا اور پیش کیا گیا ہو، طلبہ کی ایک مشق ہی تو ہوتا ہے اور یہ مشق اسی لیے کروائی جاتی ہے کہ تحقیق کار آگے چل کر ایسے مگر اس سے بہتر اور عمدہ مقالے تحریر کرے اور ایک پختہ کار محقق بن جائے۔ ان مقالہ نگاروں کی طرح ہو کر نہ رہ جائے جو ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی کی مانند اُردو سندھی کے لسانی روابط پر زندگی بھر فخر کرتے رہیں اور پھر بہتر یا ویسا ہی کوئی اور مقالہ نہ لکھ پائیں۔ اگر ایسا ہی کرنا ہے تو پھر ایک بھی مقالہ کیوں؟ اگر تحقیق کی آبلہ پائی کو زندگی کا اوڑھنا بچھونا نہیں بنانا تو پھر بہتر یہی ہے کہ سرے سے اس خارزار میں قدم ہی نہ رکھے جائیں۔

0

جدید تحقیق کے اپنے رموز ہیں اور یہ اپنا باطن صرف انھی پر آشکار کرتی ہے جو عمرِ نوح، صبرِ ایوب اور خزانہ قارون لے کر مسلسل محنت اور لگن کے ساتھ اس میں منہمک رہیں اور جو ہمیشہ اس سوچ کے ساتھ آگے بڑھتے رہیں کہ وہ بچہ ابھی پیدا نہیں ہوا جو سب سے زیادہ خوبصورت ہے۔ کم از کم قدرت اسی اُصول پر عمل پیرا ہے۔

اُردو اور پاکستانی زبانوں میں تحقیق کے گُرو کا ابھی پیدا ہونا ہے۔ اُردو اور پاکستانی زبانیں اسی کی منتظر ہیں۔ شرط جدید دبستانِ تحقیق پر عبور کی ہے جس کی اپنی رسمیات ہیں۔ ان پر عمل ہوگا تو تحقیق صحیح معنوں میں تحقیق کہلائے گی۔

00

ماٰخذ

اُردو کُتب

(علاوہ مقالہ جات)

1- ابن کنول، پروفیسر (مرتب)، تحقیق وتدوین، کتابی دنیا، دہلی، مئی 2006ء

2- اسد فیض، اُردو تحقیق: مسائل ومعیار، ہم عصر پبلی کیشنز، ملتان، 2001ء

3- احسان اللہ خان، ڈاکٹر، تعلیمی تحقیق اور اس کے اُصول ومبادی، بک ٹریڈرز، لاہور، 1978ء

4- اُصول تحقیق، جلد اول، کورس کوڈ نمبر 6743، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، 2009ء

5- اُصول تحقیق، جلد دوم، کورس کوڈ نمبر 6744، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، 2009ء

6- اعجاز راہی، ڈاکٹر، تحقیق اور اصول وضع اصطلاحات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 1987ء

7- آزاد، ڈاکٹر عبدالرشید، مبادیات تعلیمی تحقیق، ادارہ تالیف وترجمہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، جون 1994ء

8- تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، ادبی تحقیق کے اُصول، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 1992ء

9- جوئش، فاروق، ڈاکٹر، تعلیمی تحقیق اور میدانی مطالعات، جہانِ تحقیق پبلی کیشنز، کراچی

10- رشید حسن خان، ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، 1978ء

11- رفاقت علی شاہد، تحقیق شناسی، القمر انٹرپرائزز، لاہور، 2003ء

12- رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر، جامعات میں اُردو تحقیق، ہائر ایجوکیشن کمیشن، اسلام آباد، 2008ء

13- زبیری، نثار احمد، ڈاکٹر، تحقیق کے طریقے، فضلی سنز، کراچی، مارچ 2003ء

14- سلیم ملک، محمد، ڈاکٹر، اُردو تحقیق، پنجاب یونیورسٹی میں، ادارہ تالیف وترجمہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، جون 2007ء

15- شاہد، ایس ایم، تحقیقی مقالہ نویسی کا فن، مجید بک ڈپو، لاہور، 2001ء

16- شیخ، اقرار حسین، فن تحقیق اور لائبریری سائنس، دی بکس، راولپنڈی، 2012ء

17- شیخ، اقرار حسین، حوالہ جاتی ماخذات وخدمات، دی بکس، راولپنڈی، 2011ء

18- عباسی، عبدالحمید، ڈاکٹر، اُصولِ تحقیق، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، طبع چہارم 2015ء
19- عطش دُرّانی، ڈاکٹر، اُردو تحقیق (منتخب مقالات)، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 2003ء
20- عطش دُرّانی، ڈاکٹر، جدید رسمیاتِ تحقیق، اردو سائنس بورڈ، لاہور، 2005ء
21- عطش درانی، ڈاکٹر، اُردو کی لسانی ترقی، شاخِ زریں، اسلام آباد، جنوری 2011ء
22- عطش درانی، ڈاکٹر، اُردو اور لسانی پالیسی، شاخِ زریں، اسلام آباد، طبع سوم: 2014ء
23- عطش درانی، ڈاکٹر، اُصولِ ادبی تحقیق، نذیر سنز، لاہور، 2012ء
24- عطش درانی، ڈاکٹر، رہنمائے تحقیق تجویز برائے پی ایچ ڈی، شعبہ پاکستانی زبانیں و ادب، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، 2013ء
25- علوی، تنویر احمد، ڈاکٹر، اُصولِ تحقیق و ترتیبِ متن، دہلی، 1977ء
26- فضل حق، ڈاکٹر (مرتب)، فنِ خطاطی و مخطوطہ شناسی، دہلی یونیورسٹی، نئی دہلی، 1982ء
27- گیان چند، ڈاکٹر، تحقیق کا فن، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 2002ء
28- مطالعاتی رہنما۔ اُصولِ تحقیق (زبان و ادبیات)، ایم فل کورس شعبہ پاکستانی زبانیں و ادب، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، 2004ء
29- مطالعاتی رہنما۔ اطلاقی تحقیق، پی ایچ ڈی کورس، شعبہ اُردو، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، 2012ء
30- معین الرحمان، ڈاکٹر سید، اُردو تحقیق یونیورسٹی میں، یونیورسل بکس، لاہور، جنوری 1989ء

English Sources

1. Aarseth, Espen J., **Cybertext: Perspective on Ergodic Literature**, Johns Hopinks University Press, Baltimore and London, 1997.
2. Aclinsten, Peter, **Science Rules: A Historical Introduction to Scientific Method**, John Hopkins University Press, Baltimore, 2004.
3. Altick, Richard D., and John J. Fenstermaker, **The Art of Literary Research,** (4th ed.), Norton, New York,1993.
4. Anderson, T. W., & Rubin, H., **Statistical Inference in Factor Analysis**, In J. Neyman (Ed.), **Proceedings of the Third Berkeley Symposium on Mathematical Statistics and Probability** (pp. 111-150), University of California Press, Berkeley,1956.
5. APA, **Research Style Sheet**, Modern American Psychology

Association of America,New York, Fall 2004.

6. Awad, Elias M. & Hassan M. Ghaziri, **Knowledge Management,** Dorling Kindersley, New Delhi, 7th Impression, 2011.

7. Babbie, Earl, **The Basis of Social Research,** Wadsworth, Belmont, 1999.

8. Barnet, Sylvan, and Hugo Bedau, **Critical Thinking, Reading, and Writing: A brief Guide to Argument**, Boston: Bedford, 1993.

9. Bateson, Frederick Wilse, **The Scholar-Critic: An Introduction to Literary Research,** Routledge, London, 1972.

10. Bauer, Henry H., **Scientific Literacy and the Myth of the Scientific Method**, University of Illinois Press, Champaign, IL, 1992.

11. Blaxter, L, **How to Research**, The Open University, London, 1998.

12. Booth, Wayne C., Gregory G. Colomb, and Joseph M. Williams, **The Craft of Research**, University of Chicago Press, Chicago, 1995.

13. Brent, Doug, **Reading as Rhetorical Invention: Knowledge, Persuasion and the Teaching of Research-Based Writing,** Urbana: NCTE, 1992.

14. Bright, Wilson E., **An Introduction to Scientific Research,** McGraw Hill, New York, 1952.

15. Brooks, Peter, G. and Others, **The Cambridge History of Literary Criticism,** Cambridge University Press, Cambridge, 1999.

16. Bryant, F. B., & Yarnold, P. R., **Principal Components Analysis and Exploratory and Confirmatory Factor Analysis,** in L. G. Grimm & R R. Yarnold (Eds.), **Reading and Understanding Multivariate** , pp. 99-136), American Psychological Association (APA), Washington, DC, 1995.

17. Butler, C.S.(Ed.), **Computers and Written Text,** Blackwell, Oxford, 1992.

18. Burrows, J.F., **Computation into Criticism,** Clarendon Press, London, 1987.

19. Cassuto, Umberto The Documentary Hypothesis and the

Composition of the Pentateuch: Eight Lectures, translated from the Hebrew by Israel Abrahams. Varda Books, Skokie, IL, 2005.

20. Cattell, R. B.,**The Scientific Use of Factor Analysis**, Plenum, New York, 1978.

21. Comrey, A. L., & Lee, H. B., **A First Course in Factor Analysis**, Erlbaum, Hillsdale, NJ, 1992.

22. Correa, Della Da Sousa and W. R. Owens, (Ed.), **The Handbook to Literary Research**, The Open University, and Routledge, 2nd Edition, Oxon, 2010.

23. Davenport, Thomas H. & Prusak Lawrence, **Working Knowledge**, Harvard Business School Press, Boston MA, 2000.

24. Duncan, H.D., **Language and Literature in Society**, Chicago, 1953.

25. Easterby-Smith, M.,Thorpe, R. and Jackson, P., **Management Research**, 3rd ed., Sage Publications Ltd., London, 2008.

26. Easthope, Antomy, **Literary into Cultural Studies**, Routledge, London, New York, 1991.

27. Elbow, Peter, **Writing without Teachers**,Oxford University Press, New York, 1973.

28. Eliet, Simon and W.R. Owens, (ed.), **A Handbook to Literary Research**, Routledge, New York (The Open University, London), 1999.

28. Erikson, P. and Kovalainen, A., Qualitative Methods in Business Research, 3rd ed., Sage Publications Ltd., London, 2008

30. Angela Roskop Erisman (2012), A Literary Solution to a Literary Problem? -- Review of Baden, Joel S., The Composition of the Pentateuch: Renewing the Documentary Hypothesis. H-Judaic, H-Net Reviews. December, 2012.

31. Everitt, 1:1. S., **Multivariate Analysis: The Need for Data, and other Problems**, " British Journal of Psychiatry", 126, 227-240, 1975.

32. Feyerahend, Paul K., **Against Method**, (1975), 2nd Ed.,Velso, London, 1978.

33. Flower, Paul, **Research Philosophies- Importance and Relevance**, Issue, 1, Jan. 2009, [Blaiki, N.(1993),

Approaches to Social Enquiry, 1st ed., Polity Press, Cambridg and Kvale, S., (1996), *InterView*, 1st ed., Sage Publications, Ltd., London.]

34. Freelson, Bowers, **Bibliography and Textual Criticism,** Clarendon Press, 1964.
35. Galliers, R., **Information Systems Research, Practical Guidelines,** Blackwell, London, 1991.
36. Garfield, **Citation Indexing,** NewYork:John Wiley&Sons, 1979.
37. Garraghan, Gilbert J., **A Guide to Historical Method,** Fordham University Press, New York, 1946.
38. Garson, D. G. , **Factor Analysis: Statnotes**. Retrieved March 22, 2008, from North Carolina State University Public Administration Program, 2008. http://www2.chass.ncsu.edu/garson/pa765/factor.htm.
39. Gibaldi, Joseph, (ed.), **Introduction to Scholarship in Modern Languages and Literature,** (2nd ed)., MLA, New York, 1992.
40. Good, P., **Permutation Tests: A Practical Guide to Resampling Methods for Testing Hypotheses,** 2nd ed., Springer-Verlag, New York, 2000.
41. Gorsuch, R. L., **Factor analysis** (2nd ed.), Erlbaum, Hillsdale, NJ., 1983.
42. Grabes, Herbert, **Literary History and Cultural History,** Year Book of Literature, 2001.
43. Greetham, D.C., (Ed.), **Scholarly Editing: A Guide to Research,** Modern Language Associations, New York, 1995.
44. Greetham, David C., **Textual Scholarship: An Introduction,** Garland, New York,1st Ed. 1994-1998
45. Greetham, D.C., **Theories of the Text**, OUP. Oxford, 1999.
46. Guba, E. G., and Lincoln, Y. S., **Competing Paradigms in Qualitative Research,** Ch.6, in Denzin and Lincoln, **Handbook of Qualitative Research,** Sage Publishers, USA, 1994
47. Guilford, J. P., **Psychometric Methods** (2nd ed.), McGraw-Hill, New York, 1954.

48. Gumbrecht,Hans U., **The Powers of Philology: Dynamics of Textual Scholarship**, University of Illinois Press, 2003.
49. Habib, Rafey, **A History of Literary Criticism: From Plats to the Present,** Blackwell Pub., Cambridge, MA., 2005.
50. Hair, J. F. J., Anderson, R. E., Tatham, R. L., & Black,W. C. , **Multivariate Data Analysis** (4th ed.), Prentice Hall, Saddle River, NJ, 1995.
51. Harners, James L., **Literary Research Guide**, Modern Language Association, New York, 2008.(1st Ed. 1989).
52. Harpham, Geoffrey Gali & Ansgar Nunning, **New Prospects in Literary Research,** (ed.by Koen Hilberdink), Royal Netherlands Academy of Arts and Sciences, Amsterdam, 2005.
53. Hatch M. J.and Cunliffe, A. L. **Organization Theory** ,**2nd ed.,** OUP, Oxford, 2006.
54. Hatcher, L., **A Step-by-Step Approach to Using the SAS® System for Factor Analysis and Structural Equation Modeling**, SAS Institute, Inc., Cary, NC, 1994.
55. Hoover, D.L., **Langauge and Style,** University Press of America, Lonham, MD., 1999.
56. Howell, Margha and Walter Prevenier, **From Piliable Sources: An Introduction to Historical Method,** Cornell University Press, Ithoca, 2001.
57. Hutcheson, G., & Sofroniou, N. , **The Multivariate Social Scientist: Introductory Statistics using Generalized Linear Models**, Sage Publications, Thousand Oaks, CA, 1999.
58. Jerome, McGann, **A Critique of Modern Textual Criticism,** University of Chicago Press, Chicago, 1983.
59. John, Simon Peyten, **How to Write a Great Research Paper,** Microsoft Research, Cambridge, 2008.
60. Katre, S.M., **Introduction to Indian Textual Criticism,** Deccan College, Poona, 1954.
61. Kaufman-wills Group, **The Facts about Open Access**, ALPSP, 2005.
62. Kline, P. , **Psychometrics and Psychology,** Acaderric Pre ss, London, 1979.
63. Kuhn, Thomas, **The Structure of Scientific Revolution,**

University of Chicago Press, Chicago., 1962.

64. Lawley, D. N., & Maxwell, A. E., **Factor Analysis as a Statistical Method**, Butterworth and Co., London, 1971.

65. Literature Resource centre, **Guide to Conducting Literary Research,** The Gale Group,Detroit, Michigan, 1999.

66. Love, H., **Attributing Authorship: An Introduction**, Cambridge University Press, Cambridge, 2002.

67. Lye, John, **Theory Checklist**, Brock University, 2001.

68. Microsoft, **The Microsoft Manual of Style for Technical Publications,** 3rd.Ed., (Ed. by Jim Purcell, Microsoft, Redmond, 2004.

69. Minutes of 26th Meeting of the Board of Advance Studies and Research, January 21-22, 2013, Allama Iqbal University, Islamabad, 11 February, 2013.

70. Misak, Cheryl J., **Truth and the End of Inquiry,** O.U.P., Oxford, U.K., 1991.

71. Naifeh, Steven and Gregory White Smith, **The Mormon Murders, A True Story of Forgery, Deceit and Death,** St.Martin, 2005

72. Nasr,S.H., **Islamic Science**,World of Islam Festival Publishing Co. Ltd. Westerham, Kent 1976.

73. Newell, Allen, **Unified Theories of Cognition,** Harvard University Press, Cambridge, MA, 1990.

74. Noru?is, M. J. , **SPSS 13.0 Statistical Procedures Companion**, SPSS, Inc., Chicago,2005.

75. Nunnally,J.C., **Psychometric Theory**,(2nd Ed.),McGraw-Hill, New York, 1978

76. O, Leary, De L., **How Greek Science Passed to the Arabs,** London,1964.

77. Oliver, P, **Writing Your Thesis,** Sage Studies Skills, Sage Publications, London.

78. Orlinsky, Harry M. "The Textual Criticism of the Old Testament" in **The Bible and the Ancient Near East,** ed. by G., Ernst Wright, Doubledary, Garden City, 1965.

79. Oshim, A., & Hogue, A., **Writing Academic English,** Longmon Cheshire, White Plains, 1999.

80. Owens, W.R. Delia Desousa Correu, (Ed.), **A Handbook to**

Literary Research, 1999.

81. Parsons, C.J., **Thesis and Project Work-A Guide to Research and Writing,** George Allen and Unwin Ltd., London, 1973.
82. Patterson, Margaret C., **Literary Research Guide,** Gale Research Company, Detroit, Michigan, 1976.
83. Philips, E.M. and D.S. Pugh., **How to Get a Ph.D.,** Open University Press, Bukingham, England, 3rd Ed. 2000 (1st. 1994).
84. Philip M. Jr. and Ethan V. Manson, **Why Current Style Sheet Standards have Failed to Improve Documentation Engineering,** University of Wisconson, Malwanker, WI, USA.
85. Qurashi, M.M., S.S.H.Rizvi, **History and Philosophy of Muslims Contribution to Science and Computer Age,** University of Michigan Press, Ann Arbor, 1996.
86. Rajannan,Busnagi,**Fundamentals of Research,**American Studies Research Center, Hyderabad, 1979.
87. Robson,C., **Real World Research,** Blackwell, Oxford, 1993.
88. Roth, Audley J., **The Research Paper: Form and Content,** Woodsworth Publishing Co., Belmont, Califrnia, 1966.
89. Roscoe, J.T., **Fundamental Research Statistics for the Behavioural Sciences,** 2nd edition, Holt Rinehart & Winson, New York, 1975.
90. Saeed, Edward, **Humanism and Democratic Criticism,** Columbia University Press, New York, 2004.
91. Shafer, R. J., **A Guide to Historical Method,** The Dorsey Press, Illinois, 1974.
92. Shilingsburg, Peter, **Textual Scholarship: A Brief Introduction,** Garland, New York, 1994.
93. Sorenson, Sharon., **The Research Paper: A Contemporary Approach,**AMSCO, New York, 1994.
94. Sutherland, Katteryn, **Electronic Text: Investigations in Method and Theory,** Clarendon, Oxford, 1997.
95. Strunk, William, Jr.,and E.B.White, **The Elements of Style,** 3rd ed. MacMillan, New York, 1979.
96. Tanselle, G. Thomas, **The Rational of Textual Criticism,**

University of Pennsylvania Press, Pennsylvania, 1992.

97. Thackrey, Don, **University of Michigan Proposal Writer's Guide**, University of Michigan, 2007.

98. Timparnaw, Sebastiono,. Ed. & Tr.by Glenn W.Most, **The Genesis of Lachmann's Method,** University of Chicago, Chicago, 2005.

99. Turabian, Kate, **A Manual for Writers of Research Papers, Theses and Dissertations**, The University of Chicago, Chicago, 2007.

100. Tiwana, Amrit, **The Knowledge Management Toolkit**, Upper Saddle River, NJ: Prentice Hall, 2000.

101. Tylor, B.N. **Guide for the Use of the International Style of Units,** Fainthersburg MD: National Institute of Standards and Technology, 1995.

102. University of Chicago, **The Chicago Manual of Style**, 15th ed., University of Chicago Press, Chicago, 2003.

103. Walter, B.C., **The Way of Investigator**, W.W.Norten, New York, 1945.

104. Warren, Austin, **Theory of Literature**, New York, 1949.

105. Watson, George, **The Literary Thesis- A Guide to Research**, Longman London,1970.

106. Wellek, R., **Concepts of Criticism**, New Haven and London, 1963.

107. **Working Papers / Agenda Items of the 27th Meeting of the AIOU Board of Advance Studies and Research, to be held on 27-28th November 2013,** Allama Iqbal Open University, Islamabad, Vol i, P.1.

108. Zina O' Leary, **The Essential Guide to doing Research,** Sage Publication, Ltd., London, 2004.

and

109. **Workshop** on "Research Methodology", Material by Training Instructor: Ms. Noreen Akhter, Professional Development Center, National University of Science and Technology, (NUST), Islamabad, 27-28th Jan.2011.

Web:

1. en.wikipedia.org/wiki/Research
2. en.wikipedia.org/wiki/Scholarly_method
3. en.wikipedia.org/wiki/Scientific_method
4. en.wikipedia.org/wiki/Journal_of Higher_criticism
5. en.wikipedia.org/wiki/History_of_Scientific_Method
6. en.wikipedia.org/wiki/the_chicago_manual_of_style
7. en.wikipedia.org/wiki/A_manual_for_wrietrs_of _research _papers_and_dissertations
8. en.wikipedia.org/wiki/microsoft_manual_of_style _for_technical-publications
9. en.wikipedia.org/wiki/950_690
10. en.wikipedia.org/wiki/islam
11. en.wiktionary.org/wki/research
12. en.wikipedia.org/wiki/impact-factor
13. departments,dsu.edu/library/literary
14. webs.uidaho.edu/ifno_Literarcy/modules/module2/2
15. petec.ac.za/robert/resmeth
16. support.epnet,com/lrc/research guid
17. owl.english.purdue.edu/workshops/hypetest/research
18. esuohio.edu/academic/writingcenter/writproc.
19. pareouline.net/getin.asp?v=b&n=13
20. esuohio.edu/academic/writingcenter/writproc.
21. iupjournals.org/victorian/vic41-4mcg.
22. earlam.edu/~seidti/iam/text_crit
23. bible-researcher.com/bib-2
24. english.upenn.edu/~bushnell//eng-305/syllabus
25. cts.dmu.ac.uk/index.php?q=researchguide
26. textualscholarship.org/links
27. ies.sas.uk/camps
28. livesandletters.ac.uk/index
29. dhrama-haven.ag/science/myth-of-scientific-method
30. brocku.ca,
31. chicagomanualofstyle.org/home
32. uvic.ca/geru/stylesheet
33. pareonline.ent/getvnsp?v=68n=13
34. phys.unsw.edu.au/~jw/thesis
35. research.umich.edu/proposals/pwg/pwgcademic

36. deenislam.co.uk/midwife/dix/5
37. ntu.ac.uk/adapted_sports/about%20the%unit/16967gp...
38. slideshare.net/ninazski/language-research-method
39. back2college.com/writingresearchpaper
40. nia_dissertations.com/blog/research-proposal -40w-to/literary_research_paper
41. sunzi1.lib.hku.hk/hkjo/view/6/600126.
42. comp.dit.lie/dgordon/lectures/research_methods/research in.....
43. ahds.ac.uk/e-science/documents/lit-studies-challenges.
44. digitalhumanitis.org/companion/view?doeld=blackwell/
46. cs.nju.edu.cn/~gchen/isi/help/ HowToSelectjournals.html.
47. scientific.thompsonreuters,com/free/essays/ journalscitationreports/impactfactor
48. en.wikipedia.org/wiki/institute_for_scientific_ Information
49. slideshare.net/ninazski/language-research- method2
50. historicalmethodology.suite101.com/article.cfm/letters-
51. clas.ufl.edu/users/ufhatch/pages/02-TeachingResources..
52. historymatters,gmu.edu/mse/letters/
53. systems-thinking.org
54. thomsonreuters.com/content
55. hec.gov.pk
56. en.wikipedia.org/wiki/Documentary_hypothesis
57. usnews.com/education/best-global-universities/rankings
58. http://tribune.com.pk/story/1052728/hec-announces-u niversity-rankings/

****

پروفیسر ڈاکٹر عطش دُرّانی

(تمغۂ امتیاز، ستارۂ امتیاز)

اُردو اور پاکستانی زبانوں پر مائیکروسافٹ کے کنسلٹنٹ، چیئرمین انگ سافٹ انکار پوریشن، ایڈوائزر وفاقی ٹیکسٹ بک بورڈ، رکن قومی نصاب کونسل، رکن جائزہ مجلس پاکستان ریڈنگ پراجیکٹ (یو ایس ایڈ)، چیئرمین ذیلی مجلس برائے معیار بندی (مجلس وفاقی کابینہ نفاذ اُردو)، اُردو میں ایم اے، پی ایچ ڈی (پنجاب یونیورسٹی)، ایجوکیشن میں ایم اے (ادارہ تعلیم و تحقیق، پنجاب یونیورسٹی)۔ اُصول تحقیق (NUST) اور پراجیکٹ مینجمنٹ (COMSATS) میں اسناد۔

۲۲ رجنوری ۱۹۵۲ء کو ساہیوال میں پیدا ہوئے۔ ملازمت کا آغاز ۱۹۷۱ء میں نیشنل بک کونسل (فاؤنڈیشن) سے کیا۔ مجلس زبان دفتری لاہور سکرٹریٹ میں رہے۔ مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد سے بطور سربراہ دارالترجمہ ریٹائر ہوئے۔ ماہنامہ ''کتاب''، ''سیارہ ڈائجسٹ''، ''اُردو نامہ'' اور ''اخبار اُردو'' کے مدیر رہے۔ مرکز فضیلت برائے اُردو اطلاعیات کے پراجیکٹ ڈائریکٹر کے طور پر کمپیوٹر کو اُردو میں بدلا، ترجمہ کا سافٹ ویئر اور ڈیٹا بیس دیا۔ ادارہ تعلیم و تحقیق میں علم التعلیم کے استاد رہے۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی میں کمپیوٹر سائنس میں ڈائریکٹر ملٹی میڈیا اور پاکستانی زبانوں کے پروفیسر رہے۔ دو سو سے زائد کتابوں اور چار سو سے زائد مقالات کے مصنف ہیں۔ اُردو، پاکستانی زبانیں، اقبالیات، کمپیوٹر سائنس اور ایجوکیشن میں ایم فل، ایم ایس اور پی ایچ ڈی کے کئی مقالوں کے نگران رہے۔

پاکستانی اُردو، اُردو اصطلاحات سازی، اُردو اور لسانی پالیسی، اصناف اُردو کی مختصر تاریخ، اُردو زبان اور یورپی اہل قلم، تدریس اُردو، اُصولِ ادبی تحقیق، خواندگی یا تعلیم مسلسل، پاکستانی زبانوں کی تدریس اور **Principles of Textbook Development** اس میدان سے تعلق کی اہم تصانیف ہیں۔ تخلیقی تصانیف میں لمتاں سئین اور دیگر مجموعے، زمزمۂ محبت اور سوانحی ادب میں سلطان شہید (میسور کا شیر)، دیگر کتب میں پاکستان: ایک نظریہ یا تحریک، اسلامی

فکر و ثقافت اور بچوں کے لیے کتابیں اہم ہیں۔ ان خدمات کے پیش نظر ۱۴ اگست ۲۰۱۰ء میں صدر پاکستان نے ان کے لیے سول ایوارڈ "تمغۂ امتیاز" کا اعلان کیا اور ۲۳ / مارچ ۲۰۱۱ء کو عطا کیا۔ ۱۴ اگست ۲۰۱۵ء کو یوم آزادی کے موقع پر ان کے لیے دوسرے سول ایوارڈ "ستارۂ امتیاز" کا اعلان کیا گیا اور ۲۳ / مارچ ۲۰۱۶ء کو عطا کیا گیا۔

O

پیدائش: ساہیوال سے متصل چک نمبر ۸۵۔ ۶ آر، ۲۲ جنوری ۱۹۵۲ء

تعلیم: پی ایچ ڈی۔ اُردو اصطلاحات سازی ۔۱۹۹۱ء ۔ پنجاب یونیورسٹی، لاہور

ایم اے ایجوکیشن ۔۱۹۷۶ء ۔ ادارہ تعلیم و تحقیق، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

ایم اے اُردو ۔۱۹۷۲ء ۔ پنجاب یونیورسٹی، لاہور

Project Management **(P.) 6 days-2007- COMSATS, Islamabad, (Pak) &PMI (U.S.A)**

Project Management**, 15 days-2007-PPMI, Islamabad (Pak) & Bradford University, (UK.)**

PPRA, *Public Procurement Rules & Procedures* , 2days -2009 Islamabad

Research Methodology**, Jan.2011, NUST, Islamabad**

Curriculum and Textbook Development**, 5 days - Oct. 2012 - InternationalBureauofEducation,Geneva& UNESCO,Islamabad**

تعلیمی مضامین: اُردو، تعلیم، صحافت، شماریات، انتظام پراجیکٹ، طریق تحقیق، تدوین نصاب و درسی کتب

ادبی تلمذ: احسان دانش (ستارۂ امتیاز، نشانِ امتیاز)

دیگر اساتذہ: چودھری برکت علی، محمد اعجاز، برکات احمد دہلوی، اُلفت رسول، ڈاکٹر شمس الدین، ڈاکٹر مسز نسیم شوکت، ڈاکٹر احسان اللہ خان، ڈاکٹر عبدالرشید آزاد، پروفیسر منور ابن صادق، ڈاکٹر خوشی محمد، ڈاکٹر مشتاق احمد گورایا، ڈاکٹر مشتاق الرحمان صدیقی، ڈاکٹر محمد رفیع الدین ہاشمی (تمغۂ امتیاز)، ڈاکٹر محمد صدیق شبلی، میجر سہیل اقبال، پروفیسر پیٹرک ریان اور ٹام فرینک

ادارت: لاہور:۔ "معلومات"، "کتاب"، شاہکار "اسلامی انسائیکلوپیڈیا"، "تعلیم و تحقیق"، "اسلامی جمہوریہ"، "تعلیمات"، "سیارہ ڈائجسٹ"، "اُردو نامہ"

اسلام آباد:۔ "تعلیم مسلسل"، "ورلڈ اسلامک ٹائمز"، یونیسکو "نیوز لیٹر"، "اخبار اُردو"

مطبوعات: کتب :۔ ۲۵۰، مقالات:۔ ۲۷۰

تحقیقات: اُردو اصطلاحات سازی، پاکستانی اُردو، اُردو: جدید تقاضے، اُردو اطلاعیات، لسانی وادبی تحقیق اور تدوین، اُردو اور لسانی پالیسی

تخلیقات: اَناں سَین اور دیگر شخصیے، صورت گرانِ عصر، باتیں اُن کی، مکاتیبِ شوق، اہلِ قلم کی شوخیاں

ادارے: لاہور:- نیشنل بک سنٹر/کونسل/فاؤنڈیشن، فیروز سنز لمیٹڈ، مکتبہ شاہکار، ادارہ تعلیم و تحقیق، پنجاب یونیورسٹی، "سیارہ ڈائجسٹ"، مجلس زبانِ دفتری

اسلام آباد:- مقتدرہ قومی زبان، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، نیشنل بک فاؤنڈیشن، وفاقی ٹیکسٹ بک بورڈ، مجلس وفاقی کابینہ نفاذ اُردو

پراجیکٹ: لاہور :- "اُردو نصاب" IER،

اسلام آباد:- "ماڈل سکول پراجیکٹ" وزارت تعلیم & ADB، "عظیم کتب" مقتدرہ قومی زبان، "اُردو اطلاعیات" مقتدرہ قومی زبان، "اُردو ای کورس خواندگی" علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، "تربیتی ماڈیول" GIZ/ GTZ

لاہور:- "نصاب نیم رسمی تعلیم (NFE) پنجاب" محکمہ نیم رسمی تعلیم & JICA

اسلام آباد:- "نظر ثانی نیشنل بک فاؤنڈیشن ایکٹ، تجویز قومی زبان کمیشن

اثرات: خصوصی اُردو اور پاکستانی زبانیں، کمپیوٹر سائنس اور اطلاعیات، تحقیق، نصاب، لسانیات

خطابات اور ایوارڈ:- سول ایوارڈ: "تمغۂ امتیاز"، "ستارۂ امتیاز"، لسانی انجینئر،

Localization Guru of Pakistan,

Hero of Digital Divide (Unsung Hero of Pakistan)

عطش شناسی:-

مسرت خان زاہدی، کتابیاتِ عطش، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء، طبع دوم، جنوری ۲۰۱۱ء

مسرت خان زاہدی، دانائے رازِ اُردو، شاخِ زریں، اسلام آباد، ۲۰۱۱ء

نسرین زہرا، (مرتب)، مصاحباتِ عطش، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۱ء، طبع دوم، ۲۰۱۲ء، طبع سوم، ۲۰۱۳ء، طبع چہارم، ۲۰۱۶ء

سید اشفاق حسین بخاری (ڈاکٹر)، عطش نامہ، شاخِ زریں، اسلام آباد، ۲۰۱۳ء، طبع دوم، ۲۰۱۴ء، طبع سوم، ۲۰۱۶ء

سید اشفاق حسین بخاری، (ڈاکٹر)، باقیاتِ عطش، شاخِ زریں، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء، طبع دوم، ۲۰۱۶ء

سید اشفاق حسین بخاری، (ڈاکٹر)، مقالاتِ عطش شناسی، شاخِ زریں، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء،

طبع دوم، ۲۰۱۶ء
سید اشفاق حسین بخاری، (ڈاکٹر)، افتاں سخن: ایک مطالعہ، شاخِ زریں، اسلام آباد،
۲۰۱۵ء، طبع دوم، ۲۰۱۶ء
سلمیٰ ناہید، اک مہرباں صاحب کتاب، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۳ء
مدیحہ خان، ہمہ جہت دانش ور، شاخِ زریں، اسلام آباد، ۲۰۱۶ء
افشاں ملک، آثار و کارِ عطش، شاخِ زریں، اسلام آباد، ۲۰۱۶ء

Horst, Kristen Nehemiah, Ed., **Attash Durrani**, Dign Press, United States, International Book Market Service Limited, MU, 10, Jan. 2013, (Also published in UK and Germany) ISBN 978-613-9-91835-5

Gill, C.A., Ed., **Dr. Attash on Web Search**, Shakh-e-Zarreen, Islamabad, Mar. 2014.

For M.Phil & PhD Level

Lisani wa Adabi Tehqeeq-o-Tadween Ke Usool

(Urdu aur Pakistani Zabanun key leyae)

Prof. Dr. Attash Durrani, T.I., S.I.

National Book Foundation
Islamabad

A National Organization of Excellen publishing quality books on literature, Education and textbooks at affordable prices

(اُردو اور پاکستانی زبانوں میں)

لسانی وادبی تحقیق و تدوین کے اُصول

BOOKS GIVE US WINGS
NATIONAL BOOK FOUNDATION

ایسا موضوع ہے، جس کے لیے جدید ترین اصولوں اور تقاضوں، خاص طور پر مقرر کردہ معیاروں پر پورا اترنے کے رہنما اصولوں پر مبنی کتابوں کی اشاعت ضروری ہے۔ یہ کتاب اُردو اور پاکستانی زبانوں میں لسانی اور ادبی تحقیق اور عالمانہ تدوین کے اصولوں پر اسی نقطۂ نظر سے ممتاز ماہر تعلیم اور محقق ڈاکٹر عطش درانی سے تیار کرائی گئی ہے۔

پاکستان اور دنیا بھر میں جن کالجوں اور یونیورسٹیوں میں آج اُردو، سندھی، پشتو، پنجابی، سرائیکی، بلوچی، براہوی یا کسی بھی پاکستانی زبان کی تدریس ہو رہی ہے، وہاں تحقیق کے معیار کو بلند کرنے کے لیے یہ [illegible] جامع [illegible] یقیناً بہت مفید ثابت ہو گی۔ ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سطح کے لیے اگر اس میں بتائے گئے اصولوں اور تکنیکوں کو پیش نظر رکھ کر تحقیق کو فروغ دیا گیا تو اُردو اور پاکستانی زبانیں یقیناً تحقیق کی عالمی سطح پر نمایاں ہوں گی۔